TIGHT BINDING BOOK

TEXT CUT WITHIN THE BOOK ONLY

زمانہ

جلد ۶۰ | جنوری ۱۹۳۳ء | نمبر ۱

مرزا رسواؔ مرحوم

(از مولانا مرزا محمد ہادی صاحب عزیزؔ لکھنوی)

یاد ش بخیر لکھنؤ کی آبادی بھی کیا آبادی تھی جہاں ہر فن کے کامل، ہر علم کے ماہر گوشہ گوشہ میں نظر آتے تھے۔ ایک سجی سجائی محفل تھی جس میں علوم وفنون کی شمعیں روشن تھیں، ایک آئینہ خانہ تھا جس میں کمالات کے عکس نظر آرہے تھے۔ اُسی آئینہ کا ایک تابناک پرتو پروفیسر مرزا کی ذات گرامی تھی جس کو بقیۃ السیف اور یادگارِ رفتگاں کہنا بیجا نہیں۔ اس ذات کا فقدان علم وادب کے لئے ایسا عظیم الشان نقصان ہے جس کی تلافی کی امید نہیں کی جاسکتی۔

سالہا سال مرزا سے صحبت رہی، اُن کے حالات اُن کی زبانی بھی سُنے، رفتار گفتار سے بھی اندازہ کیا، اُن کی علمی مشغولیتیں بھی دیکھیں، اُن کے کارناموں پر بھی نظر ڈالی۔ آج جب وہ صورت پردۂ خاک میں چراغِ زیرِ دامن ہے، جی چاہتا ہے کہ اُن داستانوں کو بیان کروں جن کا حرف حرف آئندہ نسلوں کے لئے شمعِ ترقی ہے۔ اس تذکرے کی اکثر باتیں مرزا صاحب کی زبان سے سنی ہوئی ہیں۔ اکثر چشم دید حالات ہیں اور بعض باتیں مخلص دیرینہ شیخ ممتاز حسین صاحب عثمانی (اڈیٹر اودھ پنچ) کی بتائی ہوئی ہیں جن کو مرزا صاحب سے خاص خصوصیت تھی۔

له مرزا صاحب کا پورا نام اور سلسلۂ نسب یہ ہے:- مرزا محمد ہادی ابن آغا محمد تقی ابن آغا دلی ابن مرزا ذوالفقار علی بیگ اڈیٹن توپخانہ شاہی۔ ابن مرزا رشید بیگ ابن مرزا رحیم بیگ ماژندرانی۔

ولادت | لکھنؤ ایک عظیم الشان شہر ہے جس میں بیشمار محلے ہیں، بعضوں کے نام بھی اب لوگوں کو یاد نہیں رہے۔ انھیں محلوں میں کوچہ آفرین علی خاں بھی تھا جو باگ ٹولہ کے نام سے مشہور ہے، اُسی محلہ کے ایک مکان میں مرزا صاحب کی ولادت ۱۸۵۸ء میں ہوئی یہ سال عام الغدر تھا

سلسلۂ نسب مرزا صاحب کے اسلاف ماژندران سے دلی آئے اور وہاں سے آکر اودھ میں سکونت اختیار کی۔ آصف الدولہ کا زمانہ تھا، شرفا کی عزت ہوتی تھی، رفتہ رفتہ اُن کی رفاقت پر مامور ہو گئے۔ جاگیرات وعطیات شاہی سب نیض آباد میں رہے اور وہیں نسیًا منسیًا ہو گئے، یہاں نیا راگ اور نیا باجہ پھر شروع ہوا۔

نانا، نواب احمد علی خاں عرف آغا نتیر ابن حمایت علی خاں خواہرزادہ حسن رضا خاں نائب آصف الدولہ ثانی، طبا طبائی[1] خاندان سے تھیں، برادر مختار الدولہ کی اولاد سے جن کا سلسلہ سادات سے ملتا ہے۔ طبا طبائی خاندان کا مفصل ذکر حبیب السیر میں ہے۔ اسی خاندان میں سلیمان مرزا و ابراہیم مرزا پسران یوسف مرزا ہیں جن کے نام مرزا غالب[2] کے خطوط ہیں۔

خاندانی حالات | مرزا صاحب کے ایک بڑے بھائی بھی تھے جنھوں نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں والدین کے سامنے انتقال کیا، ان کا نام محمد ذکی تھا۔ ان کے بعد والدین کی تمام تر توجہ مرزا صاحب کی طرف مبذول ہو گئی اور بڑے لاڈ پیار سے پالے گئے۔

مرزا کی عمر سولہ برس کی تھی کہ ایک ہی سال میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا، مرزا کی پرورش اُن کی خالہ اور رشتہ کے ماموں سے متعلق ہو گئی۔ لیکن یہ دونوں مربی طماع تھے اور مرزا صاحب کے والدین نے جو متروکہ چھوڑا تھا ان دونوں نے اس پر مخالفانہ قبضہ کر لیا۔

ننہال کی طرف سے مرزا صاحب کو چند گاؤں ملے تھے جن کی تحصیل وصول مرزا کے والد نے کبھی نہیں کی، بلکہ بطور ایک مشترک جائداد کے ماموں اور خالہ کے قبضہ میں رہنے دی جو پھر مرزا صاحب کو واپس نہ ملی۔ مرزا صاحب کی زندگی اِن دونوں مربیوں کے لئے مفید نہ تھی اس وجہ سے مرزا صاحب پر سختی ہونے لگی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا صاحب اپنے والد کے ایک دوست شیخ محسن بخش یا شیخ حید بخش کے پاس چلے گئے۔ شیخ صاحب مشہور خطاط اور اعلیٰ درجے کے جعلئے تھے۔ بغیر کسی مشین کے صرف معمولی قلم دوات سے ہزاروں کے اسٹامپ بنا ڈالتے تھے چنانچہ شیخ صاحب پر مقدمہ قائم ہوا اور ایسی لمبی سزا پائی کہ جیل ہی میں مر گئے۔

---

[1] طبا طبا اسمٰعیل ابن ابراہیم بن حسن بن علی علیہم السلام کا لقب ہے، اُن کی زبان میں لکنت تھی، قاف کی جگہ طا بولتے تھے ہمیشہ قبا کو طبا کہا اسی سبب سے یہ لقب ہوا اُن کی اولاد کو سادات طباطبائی کہتے ہیں۔

[2] دیکھو رقعات غالب۔

شیخ صاحب کی آمدنی کا بہت بڑا حصہ مرزا صاحب کو اُن کی اُستانی کے ذریعہ سے مل جاتا تھا، مگر شیخ صاحب کی تاکید تھی کہ مرزا اُن کی صحبت میں نہ آئیں مبادا جعل سازوں میں اُن کا بھی شمار ہو تو ایک دوست کی اولاد کو ضرر پہونچے۔ تقریباً چار پانچ سو روپیہ ماہوار مرزا صاحب خرچ کرتے تھے۔

شیخ صاحب کے انتقال کے بعد مرزا کے وسائل آمدنی فروخت جائداد پر موقوف رہے۔ اُس زمانے میں مرزا کی وضع قطع لکھنؤ کے بانکوں کی سی تھی۔ سر پر ایک رنگین سیلا، جسم میں کسا ہوا انگرکھا، پانوں میں چوڑیدار گھٹنا، ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا۔ یہ سب کچھ تھا مگر با ایں ہمہ رنگینی و فضول خرچی و عیاشی مرزا صاحب کا مشغلہ کتب بینی کبھی ناغہ نہ ہوا۔ اور اسی میں اُن کے کمال کا راز مخفی تھا۔

تعلیم مرزا کے والد کو ریاضی اور نجوم سے بہت شوق تھا۔ مرزا صاحب نے فارسی کی تمام درسیات اور ریاضی میں اقلیدس اور حساب اور احکام نجوم کے بعض رسائل اپنے والد سے پڑھے، اُس کے بعد مختلف مولویوں سے عربی پڑھی۔ مولوی محمد یحییٰؒ صاحب سے شرح جامی تک پڑھ کے مولوی غلام حسنین صاحب کنتوری سے پڑھا اور مولوی کمال الدین صاحب سے منطق کی درسیات پڑھیں۔ ان اساتذہ کے نام مرزا صاحب نے خود بتلائے ہیں، اس کے بعد اپنی استعداد پر بھروسا کر کے کتب بینی شروع کی، اور اُس کو اس حد پر پہونچایا کہ آج جامعیت میں وہ ایک بے نظیر فرد تھے۔

اسی دوران میں مرزا نے انگریزی بھی پڑھنا شروع کی۔ اور تعلیمی مصارف ان عمارتوں کی فروخت سے حاصل کئے جو خواجہ باسط کے ٹیلے پر تھیں۔ یہ کئی مکانات تھے جو دادھیال کی طرف سے ورثہ میں ملے تھے۔ رفتہ رفتہ انٹرنس پاس کر لیا۔ انٹرنس کے پرائیویٹ امتحان میں پاس ہوتے ہی مرزا صاحب رُڑکی کالج میں مہندسی کی تعلیم حاصل کرنے چلے گئے اور خداداد مناسبت سے جو اُن کو ریاضی کے ساتھ تھی اور سیری کے امتحان میں پاس ہو گئے۔ پاس ہوتے ہی اورسیری کا عہدہ کوئٹہ اور بلوچستان ریلوے میں مل گیا اور بفراغت ریل کی پٹریاں بچھانے، عمارات کے نقشے تیار کرنے اور اسٹیشن بنوانے میں مصروف ہو گئے۔

؏ چین طبیعتیں کبھی نچلی نہیں بیٹھتیں، اتفاق سے قدیم کیمسٹری کا ایک عربی رسالہ مصنفہ افلاطون ہاتھ لگا۔ اس کو پڑھنا تھا کہ تمامتر توجہ کیمسٹری کی طرف مبذول ہو گئی۔ نوکری اور ذاتی اشغال سے مخالفت کا خیال کر کے مرزا نے فوراً استعفا دیدیا۔ کوٹھی کا تمام فرنیچر نیلام کر کے جدید کیمسٹری کے آلات ولایت سے منگوا لئے اور سیدھا لکھنؤ کا رخ کیا۔

مرزا وسائل رزق کی تلاش میں دوسروں کی منت گزاری سے قطعاً بے نیاز تھے۔ فارسی میں

---

[۱] مولوی محمد یحییٰ صاحب سر کٹے نالے کے پاس مسجد میں ایک بزرگ رہتے تھے درسیات خوب پڑھاتے تھے میں بھی اُن کی زیارت سے مشرف ہوا ہوں۔

پنجاب یونیورسٹی سے منشی عالم کا درجہ بھی پاس کر چکے تھے۔ نخاس مشن اسکول میں پرشین ٹیچری کی جگہ خالی تھی فوراً وہی قبول کرلی۔ مگر مصارف کیمیا سازی کے واسطے تنخواہ غیر مکتفی تھی اس لئے ایک لوہار کے لڑکے کے پڑھانے پر بایں شرط ٹیوشن کرلیا کہ بھٹی دکان بند ہوجانے پر مرزا صاحب کے تصرف میں رہیگی۔ لوہار نے بھی یہ شرط منظور کرلی۔

فلسفے سے مرزا صاحب کو ایک فطری ذوق ہمیشہ سے تھا، سید شہنشاہ حسین صاحب بی۔اے۔ وکیل مرحوم سے ملاقات تھی، اکثر آمدورفت رہتی تھی مگر جب کبھی کسی فلسفی مسئلہ کے متعلق مرزا صاحب اپنی رائے ظاہر کرتے تھے تو فوراً سید صاحب ازروئے طعن کہتے۔

"بھائی صاحب یہ فلسفے کے مسائل ہیں بغیر گراجویٹ ہوئے سمجھ میں نہیں آسکتے"۔

غیور مرزا نے طے کرلیا کہ بغیر کسی مدرسہ کی بنچیں توڑے ہوئے وہ گراجویٹ ہوجائیں گے، چنانچہ یہی ہوا، غالباً ۱۸۸۵ء میں اُنھوں نے پنجاب یونیورسٹی کا بی۔اے دلّی جاکر پاس کرلیا۔

مرزا صاحب کو اس بات سے چڑھ تھی کہ کسی بات میں انھیں عدم علم کا اقرار کرنا پڑے۔ اس لئے کوئی اجنبی لفظ جو اُن کے کانوں میں پڑتا تھا فوراً تحقیق پر آمادہ کردیتا تھا۔ عربی کی اصلیت دریافت کرنے کے لئے اُنھوں نے عبرانی زبان حاصل کی۔ فارسی کے لئے یونانی اور سنسکرت کا مطالعہ کیا۔ خداداد فہم وفکر کی بدولت وہ اتنی جلد ہر ایک چیز میں مہارت حاصل کرلیتے تھے کہ چند روز میں منتہی صاحبِ فن اُن سے مشورت لینے آیا کرتے تھے۔

اورنٹیل یونیورسٹی کلمبیا واشنگٹن امریکہ سے کسی مضمون کے صلہ میں پی۔ایچ۔ڈی کا ڈپلوما مل گیا۔ اس واقعہ کی اصل معلوم نہیں کہ کیونکر اور کس سلسلے سے، مگر حقیقت یہ ہے کہ مرزا کی ذات ایسے نمائشی اسناد سے مستغنی تھی، چنانچہ اُنھوں نے کبھی ان باتوں کو اپنے لئے باعثِ شرف و افتخار نہیں سمجھا۔

مرزا صاحب یوں تو جامعیت میں بے نظیر تھے مگر اُن کا اصلی ذوق علوم حکمیہ تھے۔ عربی، عبرانی، یونانی، انگریزی، فارسی، ہندی، سنسکرت کی زبانوں پر اچھا خاصہ عبور تھا۔ مشرقی اور مغربی دونوں علوم پر حاوی تھے۔ ایک مایۂ ناز ادیب و شاعر، منطق و فلسفہ وریاضی و ہیئت کے ماہر تھے۔ فلسفۂ قدیم وجدید کا نہایت تعمق سے مطالعہ کیا تھا اور اُس پر کامل عبور حاصل کرکے اسلامی عقائد و روایات کو نہایت پرزور دلائل سے صحیح فلسفہ کے مطابق ثابت کرنے میں شغف و انہماک رکھتے تھے، اور اس بارے میں اُن کا قدم تحقیق صراطِ مستقیم سے نہیں بھٹکتا تھا۔ اس موضوع پر اکثر و بیشتر مقالاتِ جلیلہ اون کے رسالہ

الحکم اور اشراق میں شایع ہو چکے ہیں جو نہایت قابل قدر ہیں۔
وہ دقیق فلسفے کے مسائل کو بلا تکلف اس طرح بامحاورہ، دلچسپ اور عام فہم اردو میں تحریر کرتے تھے کہ معمولی استعداد کا آدمی بھی سمجھ لے۔

تاہل | مرزا کی پہلی شادی فیض آباد میں ہوئی، حالانکہ اُن کی مرضی تھی کہ خالہ زاد بہن سے شادی ہو۔ "افشائے راز، عرف غریب خانہ" جو مرزا صاحب کا پہلا نقش ادبی ہے، اس میں در اصل خود اونھیں کے واقعات ہیں، اس کتاب میں جن لگن کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ مرزا صاحب کی پہلی منگیتر تھیں خاندانی نزاع کے باعث شادی نہیں ہوئی۔ موقع تو تھا کہ یہاں اس کے بعض اقتباسات لکھتا مگر یہ کام بعد میں بھی ہو سکتا ہے، اس وقت جو ضروری باتیں ہیں وہی لکھونگا۔

مرزا صاحب کی پہلی بی بی کچھ دنوں زندہ رہیں اور ایک خورد سال لڑکی چھوڑ کر انتقال کر گئیں۔ یہ صاحبزادی بھی پروان چڑھنے سے پہلے ہی داغ جدائی دے گئیں۔ مرزا صاحب پر اس کا بہت اثر ہوا مگر انھوں نے تمام آلام کو علمی ذوق پر قربان کر دیا۔ شادی کے بعد بھی مرزا ایک منٹ کے لئے طلب علم سے غافل نہ رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد دوسری شادی کی۔ بی بیاں تو متعدد ہوئیں مگر اولاد انھیں بی بی سے ہوئی۔ چنانچہ دو لڑکے اور ایک لڑکی ابتک موجود ہیں۔

رسالہ اشراق | سنہ ۱۸۸۶ء میں مرزا صاحب نے رسالہ اشراق جاری کیا اس رسالے میں مصنفات افلاطون کا مستقل ترجمہ ماہوار شائع ہوتا تھا منطق اور اخلاق و حکمت کے متعدد رسالے اردو میں اسی رسالہ کے ذریعے سے شائع ہوئے مگر پروپگنڈا کے فن میں مرزا صاحب ہمیشہ سے کچے تھے۔ اس لئے یہ رسالہ مقبول تو ہوا مگر محدود گروہ میں، بالآخر ڈیڑھ سال چل کے رہ گیا۔ صاحبان ذوق نے یہ نمبر جلد بندھوا کر کتب خانوں میں رکھ لئے۔ چنانچہ کاکوری کی انجمن اخوان الصفا میں اس کے مسلسل نمبر اب تک محفوظ ہیں اور اُن سے بیک نگاہ یہ پتہ لگتا ہے کہ اس وقت تک ایسا مفید رسالہ کوئی دوسرا جاری نہیں ہوا۔

رسالہ الحکم | غالباً سنہ ۱۹۱۶ء میں رسالہ الحکم جاری کیا، گولا گنج میں سنٹرل اسکول کے سامنے اس کا دفتر تھا۔ یہی زمانہ ہے جب میں مرزا صاحب کی خدمت میں روزانہ جایا کرتا تھا اور اُن کے کاموں میں اکثر شریک رہتا تھا۔ یہ رسالہ بھی چند سال چلا۔ اس میں بھی بہترین مقالات علمیہ کا ذخیرہ شائع ہوتا تھا

اردو شارٹ ہینڈ | اردو شارٹ ہینڈ کے اصطلاعات مرزا صاحب ہی کی ایجاد ہیں۔ جو آجتک رائج ہیں

نیرنج مرزائی | شاہزادہ مرزا محمد ہمایوں قدر مرحوم تیموری ڈپٹی کلکٹر سے مرزا صاحب نے ایک مرتبہ

زیچ محمد شاہی عاریت مانگی، شہزادہ صاحب نے دینے سے انکار کیا۔ مرزا نے پوچھا کیوں؟ تو جواب دیا کہ ایک سال میں آپ ایسی زیچ تیار کر دیں گے کہ زیچ محمد شاہی اُس کے آگے ہیچ ہو جائیگی اور میرا فخر خاندان خاک میں ملجائے گا۔ بات ہنسی میں ٹل گئی، مرزا غصے پی گئے۔ الغ بیگی اور بہادر خانی زیچیں مہیا کر لی گئیں، کئی سنسکرت کی زیچیں بھی بہم پہونچائی گئیں۔ سرکاری المانک اور رصد گاہوں کی رپورٹیں بھی فراہم کی گئیں۔ بعض عمدہ دُوربینیں اور آلات اسٹرانومی بھی اسی فقرو فاقے میں مول لئے۔ اصطرلاب کے اوراق خود ہی پیتل کی چادروں اور شیشے کے صفحات پر بنالئے، ربع مجیب جس کا نصف قطر پانچ فٹ سے زیادہ تھا کچھ بڑھئی کی مدد اور کچھ اپنی کاریگری سے دائرہ ہندسیہ کی مدد سے خط جنوب وشمال پر اس طرح نصب کر دیا گیا کہ ہر طرف گھوم سکے اور ستاروں کے ظل کی پیمایش میں آسانی ہو، کبھی رصد گاہ کالے پہاڑوں پر بنی کبھی مسکن خاص پر، الغرض دو سال کی جدوجہد میں زیچ مرزائی مرتب ہو گئی جو ابھی تک محفوظ ہے۔

دو برس کے بعد جو شہزادے صاحب سے ملاقات ہوئی تو مرزا نے کسی قدر ترش رو ہو کے کہا، "حضور زیچ تیار ہو گئی، اب آپ اپنی خاندانی زیچ سے مقابلہ فرمائیں، دیکھیں کون افضل و مکمل ہے، حضور مجھے افسوس ہے کہ اس کتاب میں جابجا انگریزی مصنفوں کا تذکرہ ہے، الغ بیگی اور بہادر خانی کا حوالہ ہے مگر آپ کے بزرگوں کے نام لینے کا فخر یہ کتاب حاصل نہ کر سکی۔"

ہدیہ سفینہ

مرزا صاحب کا ابتدائی زمانہ عیش پرستی میں گزرا، اُس زمانے کے رفیقوں میں نواب حسین مرزا پسر نواب ممتاز الدولہ بہادر ابھی تک موجود ہیں، مگر باوجود رندی و آزادی اُس وقت بھی مرزا کے عقائد مذہبی میں کبھی فرق نہیں آیا، نہ فلسفۂ جدید نے اُن میں تذبذب پیدا کیا، نہ انگریزی نے کوئی تغیر۔ آزادی میں بھی گناہ کو گناہ سمجھتے رہے۔

مرزا ایک شریف اور ممتاز خاندان کے معزز فرد تھے، اُن کی اسلامی تعلیم ابتدا ہی میں مکمل ہو چکی تھی، عربی فارسی کی درسیات ختم کرنے کے بعد اُنھوں نے انگریزی کی طرف توجہ کی، یا تو یہ اثر ہو یا اُن کی فطری شرافت جو کچھ بھی سمجھئے، مرزا صاحب مذہب کے ہمیشہ پکے رہے۔ اسلامی عقائد کو فلسفہ سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے چنانچہ رسالہ الحکم میں اُن کے اکثر مضامین ایسے شائع ہوئے ہیں۔

مرتے دم تک اُن میں مذہبی جوش رہا، اس کا سب سے بڑا ثبوت ان کی معرکہ آرا تصنیف "ہدیہ سفینہ" ہے۔ یہ کتاب شاہ عبد العزیز مرحوم کی کتاب تحفہ اثنا عشریہ کا جواب ہے۔ جو تقریباً پچیس چھبیس جلدوں میں ہے۔ ڈھائی سال کے عرصہ میں مرزا نے اس کو تمام کیا جس زمانہ میں رسالہ الحکم نکالتے تھے اس وقت کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کے

مجلدات مدرسۃ الواعظین میں محفوظ ہیں۔ میں نے اُن کی زبان سے بھی بعض مباحث اُس کے سُنے ہیں۔

مناظر فطرت سے شوق | مرزا کی طبیعت ایسی ہمہ گیر تھی کہ ہر علم سے لگاؤ اور ہر فن سے مناسبت تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ طبیعت کی رنگینی اور شگفتہ مزاجی نے دلچسپی کا کافی سامان بہم پہونچا دیا تھا۔ برسات کا زمانہ اکثر باغوں میں بسر ہوتا تھا۔ یارانِ ہم مشرب کا جمگھا ساتھ ساتھ بیچ میں مرزا بلبلِ ہزار داستاں بنے بیٹھے رہتے تھے۔ تمام جائداد میں جو تلف ہو گئی مرزا صاحب کو کتیا بیگم کے باغ سے نہایت محبت تھی، یہ باغ مرزا صاحب کا آبائی باغ ہے اور ان کے بعض عزیزوں کے قبضہ میں ہے۔

کتیا بیگم کی شہرت اس نامعقول نام سے یوں ہوئی کہ وہ باغ کی حفاظت اپنے مکان کی چھت پر بیٹھ کے خود کرتی تھیں، کوئی اجنبی آدمی جہاں داخل ہوا فوراً ڈانٹ بتاتی تھیں، اس ڈانٹ ڈپٹ نے اُنھیں کتیا بیگم کا لقب دلوا دیا۔

مرزا کو مطالعہ مناظرِ فطرت کا بہت شوق تھا۔ برسات کے قبل وہ شہر کے باہر ایک نہ ایک باغ اجارے پر لے لیتے تھے اور گرمیوں کی تعطیل سے برسات تک وہیں قیام رہتا تھا۔ کئی باغ لئے تو ٹھیکے پر مگر ہزاروں روپیہ درختوں کی تیاری روش پٹری کی درستی، کھپریلوں اور کوٹھریوں کی تعمیر میں اپنی جیب سے صرف کر ڈالے اور صرف ایک موسم بسر کر کے مالک باغ کے حوالے کر دیئے۔ ان کا تو قول تھا کہ:

"انسان کو بنی نوع انسان کے لئے مفید بننا چاہیئے، میں نے انھیں آراستہ کیا کہ دوسرے فائدہ اُٹھائیں۔"

ملازمت | مرزا کو زیادہ ہوس نہ تھی۔ تعلیمی پیشہ کسی قدر آزاد ہوتا ہے، اس لئے اسی صیغہ میں رہنا پسند کیا کوئٹہ اور بلوچستان میں اورسیری کے عہدہ پر رہے، اس کے بعد نخاس مشن اسکول اور کرسچین ہائی اسکول میں رہے۔ پھر بغیر کسی خواہش کے عیسائی مشن نے ریڈ کراس کرسچین کالج میں پروفیسری کے عہدے پر مقرر کر دیا اور اسکول سے ان کے خدمات قطع کر دیے۔ اس کالج میں تینتیس [۳۳] سال مرزا نے پڑھایا، کہنے کو تو عربی و فارسی کے پروفیسر تھے لیکن وہاں اُنھوں نے بطور معلم فلسفہ و تاریخ و ہیئت و کیمیا کا مدتوں کام کیا۔ اس جامعیت کے سبب سے باوجود کالج سے اکثر غیر حاضر رہنے کے پرنسپل نے کبھی ان سے باز پرس نہیں کی، جب جی چاہا نہ گئے، اکثر ایسا بھی ہوا کہ اپنے دوستوں میں سے کسی کو بھیج دیا۔

"بھائی جاؤ ایک گھنٹہ پڑھا دینا، میں تو آج چھب ناتھ کی چوکی پر کتیا بیگم کے باغ میں رہونگا۔"

اخلاق و اوصاف | مرزا صاحب نہایت سادہ مزاج، زندہ دل، احباب پرست، آزاد منش، مستغنی و بے پروا تھے جو ظاہر تھا وہی باطن، زمانہ سازی کی باتوں سے نفرت، ظاہری تکلفات سے طبیعت ناآشنا۔ جس سے دل صاف نہیں ہوتا تھا اُس سے ملنا بھی کبھی پسند نہیں کرتے تھے، کبھی کبھی صاف صاف منہ پر کہہ دیا کرتے تھے۔ سچے دوستوں سے نہایت خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے اور کوئی چیز اُن سے عزیز نہ رکھتے۔ مثنوی امید و بیم میں ان باتوں کا خود بھی اظہار کیا ہے۔

مجھکو نفرت ہے ریاکاری سے
چڑھ ہے عیاری و مکاری سے

دل سے ہوں خادمِ اربابِ وفا
میری طینت میں نہیں مکر و دغا

سوءظن کی بھی مجھے پروا ہی نہیں
بدگماں سے کبھی ملتا ہی نہیں

مجکو رغبت نہیں اِن باتوں سے
عار ہے ایسی ملاقاتوں سے

جن کی طینت میں نہ ہو شرّ و فساد
وہ سمجھتے ہیں مجھے نیک نہاد

زرِ بے غش ہے طبیعت میری
لوث سے پاک ہے طینت میری

میرا مسلک نہیں جز سادہ دلی
مجکو مطبوع ہے آزادہ دلی

فخر ہے خوبیِ فطرت پہ مجھے
ناز ہے حُسنِ طبیعت پہ مجھے

یہ شاعری نہیں بلکہ اُن کے اصلی جذبات اور سچے خیالات ہیں جن پر زندگی بھر عامل رہے۔

روپیہ جس زمانے میں اُن کے پاس ہوتا تھا تو کسی کے سوال کو رد نہیں کرتے تھے، یاران دیرینہ ہر وقت گھیرے رہتے تھے۔ جس نے جو مانگا دیدیا، بھولے اس قدر تھے کہ اکثر لوگوں کے فریب میں آجایا کرتے تھے، نازک مزاج بھی اتنے تھے کہ ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتے تھے۔ مولانا شبلی مرحوم کو مرزا سے خاص محبت تھی۔ مرزا کے اکثر اشعار ان کو یاد تھے جو احباب کے مجمع میں سنایا کرتے تھے۔ ندوۃ العلما میں فلسفہ کا لکچرار مقرر کرنے کی تجویز اُنھوں نے کی تھی، اس موقع پر یا کسی اجرتی کام کے متعلق مرزا نے ایک ماہ کا معاوضہ پیشگی طلب کیا، مولانا نے مزاحاً یہ مصرع لکھ بھیجا۔

قرار در کفِ آزادگاں نہ گیرد مال

مرزا صاحب بگڑ گئے اور سخت جواب لکھا، میں گیا تو مجھ سے سب واقعہ بیان کیا اُس کے بعد مولانا شبلی نے ندوہ کی لکچراری پر اصرار کیا، مرزا صاحب نے کہا "مجھے استخارہ منع آتا ہے" مولانا شبلی نے کہا کہ "ایک فلسفی اور استخارہ کا قایل ہو تعجب ہے"! مرزا نے کہا کہ "ایک مسلمان کی طرف سوءظن کرنے سے استخارہ کہیں بہتر ہے"

مرزا صاحب وسائل رزق کی تلاش میں کسی کی منت گزاری سے قطعاً بے نیاز رہتے تھے۔ ہمیشہ اپنی محنت سے اپنے مصارف پورے کئے۔

قومی معاملات میں نہایت فراخ دلی سے چندہ دیتے تھے۔ میں نے شیعہ کانفرنس کے ایک اجلاس میں دیکھا کہ نوٹوں کی گڈیاں اُن کی جیب میں ہیں اور چندوں کے مواقع پر سبقت کر رہے ہیں۔

مرزا صاحب غلطی کا ہمیشہ اعتراف کرلیا کرتے تھے، کبھی اصرار کرنا یا سخن میں تاویلیں کرنا اُن کا شیوہ نہ تھا، لیکن اس کے بار بار ذکر کرنے سے چڑھتے تھے۔ مرزا کی آنکھ میں مروت تھی، جب کوئی کسی بات پر اصرار

کرتا تو اُن سے انکار بن نہیں پڑتا تھا۔

مرزا صاحب اپنی دھن کے پکّے تھے جس زمانے میں جس چیز کی طرف مائل ہو گئے پھر دنیا ادھر کی اُدھر ہو جائے رات دن اُسی میں مشغول رہتے تھے۔

مرزا ایک طرف حکیم و فلسفی، ایک طرف شاعر، ایک طرف ادیب و منطقی، دوسری طرف بھوت پریت کے قایل، ایک طرف علما و فضلا کی صف میں، دوسری طرف پُرانی بڑھیوں میں بیٹھکر قصّہ کہانیاں سُنا کرتے تھے۔

بے پروائی اور استغنا کا یہ عالم کہ روپیہ ادھر آیا اُدھر خرچ ہو گیا، نہ مال کی پروا نہ اسباب کا خیال۔ ایک مرتبہ تمام اسناد اور ڈپلوما چوری ہو گئے مگر مرزا نے ذرا بھی پروا نہ کی۔ بات یہ ہے کہ نمود و نمایش سے مرزا کی طبیعت کو ہمیشہ تنفر رہا اور اُن کا مذاق علمی ہمیشہ قرون اولی کے علما و حکما کا تھا۔

مرزا کو دنیا اور سامانِ دنیا سے بہت کم تعلق رہا، خانہ داری کے امور میں اُن کو کوئی سلیقہ نہ تھا، نہ زینت و آرایش سے کوئی تعلق۔ اُن کے بیٹھنے کا کمرہ دیکھئے، ایک چٹائی بچھی ہوئی ہے، کونوں میں کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا وہ بھی بے ترتیب، کاغذات بکھرے ہوئے ہیں، کہیں لحاف پڑا ہوا ہے کہیں توشک، کہیں انگیٹھی رکھی ہوئی ہے اور دیوار سے تکیہ کئے ہوئے مرزا بیٹھے ہیں۔ ایک ڈِرخانچہ سامنے ہے اور برابر لکھتے چلے جا رہے ہیں، زیادہ تکلف کیا تو نیچے ایک کمل بچھا لیا۔

مرزا ہمیشہ کے رنگین مزاج تھے، بڑھاپے نے چہرہ پر جھرّیاں ڈال دی تھیں، بال سب سفید ہو گئے تھے کمر میں خم آ گیا تھا مگر دل اُسی طرح جوان تھا۔ لکھنؤ میں ایک مرتبہ مولوی عبدالماجد صاحب بی۔ اے نے دعوت کی میں بھی مدعو تھا، چلتے وقت خیال آیا کہ مکان راستہ میں ہے مرزا صاحب کو لیتا چلوں، مکان پر گیا تو مرزا صاحب اِس شان سے نکلے کہ سفید شیروانی پہنے ہوئے اور گلے میں پھولوں کا ایک موٹا سا گجرا پڑا ہوا جو سفید داڑھی کے قریب خاص بہار دکھا رہا ہے، مجکو دیکھکر ہنسی آ گئی مگر ضبط کیا، مرزا تاڑ گئے کہنے لگے "موسم کی بہار یہی ہے۔" اسی طرح دعوت میں گئے وہاں دیر تک شعر و شاعری رہی۔ سچ یہ ہے کہ مرزا کے بھولے پن اور سادگی کی کوئی حد نہ تھی فلسفہ میں جب منہمک ہوتے تو کسی بات کا ہوش نہ رہتا۔ اہل دنیا کے خیالات مختلف ہوتے ہیں کچھ لوگ معترض رہتے تھے، کچھ خلل دماغ بتلاتے تھے، مثنوی امید و بیم میں انھیں باتوں کی طرف اشارہ ہے:۔

ظاہر شرع پر واجب ہے عمل　　تاکہ باطن میں نہ کچھ آئے خلل
نہ کہ باطن تو ہو بالکل ابتر　　اور ظاہر پہ عمل ہو یکسر
یہ سمجھتے ہی نہیں مغزِ سخن　　سر بسر جہل سراسر کودن
اِن کی معقول ہے وہ نامعقول　　جس نے برباد کئے نقد واصول

جب ہو کچھ بحث تو لائیں وہ دلیل
غیر قوموں میں ہوں ہم جس سے ذلیل

جانتے ہی نہیں یہ علم کلام
عقلا کو ہے خطاب اُن سے حرام

نہ محقق نہ مُناظِر ہیں یہ
محض مغرور و مکابر ہیں یہ

کیا بتائیں گے ہمیں راہِ نجات
ہیں یہ خود گمرہِ کوئے ظلمات

بسکہ ہے جہل سے تاریک خیال
یہ سمجھتے نہیں باریک خیال

نہ قیاس ان کا نہ عقل ان کی ٹھیک
فلسفہ کفر ہے ان کے نزدیک

اہلِ تقلید سے رغبت ہے انھیں
اہلِ تحقیق سے نفرت ہے انھیں

فلسفے سے نہ ہو کیوں ان کو عناد
دشمنِ عقل ہیں یہ اہلِ فساد

ان کی تفصیل ہے بالکل مجمل
اُن کی تاویل سراسر مہمل

ان کی صحبت میں ہو ضایع اوقات
سوءِ ظن سے نہیں خالی کوئی بات

اہلِ حکمت کو بُرا کہتے ہیں
کچھ سمجھتے نہیں کیا کہتے ہیں

اُن کو ہرگز نہ سلجھتے دیکھا
اصطلاحوں میں اُلجھتے دیکھا

چند الفاظ جو ہیں وردِ زباں
اُن کو سمجھے ہیں یہ علم دو جہاں

جو مسائل کہ ہیں بالکل مردود
علم سے ان کے وہی ہیں مقصود

چند باتوں پہ ہے حکمت کا مدار
اور سب زعم میں ان کے بیکار

اُن کی حکمت ہے فقط خود رائی
نہ قیاسی ہیں نہ استقرائی

میندی میں ہے جو بین الدّفتین
اُن کے نزدیک ہے وہ عین الیقین

رائے انساں کی بدلتی ہی نہیں
بحث اس بات میں چلتی ہی نہیں

تجربہ سے نہیں اُن کو سروکار
نظریّات سے بالکل انکار

اِن کو آثارِ جہاں سے کیا کام
ان کو اسرارِ نہاں سے کیا کام

نہ زمانے کے جزو کل سے غرض
نہ ترقی نہ تنزل سے غرض

اگلے وقتوں سے محبت ہے انھیں
اہلِ یوناں سے ارادت ہے انھیں

سُن لیے ہیں جو کچھ ان کے اقوال
بس وہ کافی ہیں پئے استدلال

لہ کیونکہ فلسفہ کے معنی حبِ عقل ہیں۔
لہ فلسفہ مرادف حکمت ہے لہذا مذمت فلسفہ سراسر مخالفِ قولِ الٰہی ہے۔ من یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً۔

جو ارسطو نے کہا تھا سچ ہے　　جو کتابوں میں لکھا تھا سچ ہے
فکرِ دنیا سے ہیں ازبس مالوف　　اُن کی ہمت ہے اسی پر موقوف

اسی کے بعد ابنائے زمانہ کے حالات کا نقشہ کھینچا ہے۔

اِک جہاں محو ہے خودرائی میں　　لطف کیا قافیہ پیمائی میں
کون سنتا ہے ترانے تیرے　　وحشت افزا ہیں فسانے تیرے
دل عزیزوں کا دُکھا جاتا ہے　　رنگ چہروں سے اڑا جاتا ہے
اِن دنوں ہے یہ نصیحت بیکار　　لوگ ہیں جامِ ہوس سے سرشار
علم و حکمت کی انھیں فکر نہیں　　ایسی باتوں کا کہیں ذکر نہیں
اک زمانے کو ہے دولت کی تلاش　　علم ہے آلۂ تحصیلِ معاش
منفعیت کا زمانے میں ہے دَور　　مادّیت نے نکالے ہیں یہ طور
ہے جہاں حرص و ہوا پر مائل　　شاذ و نادر ہیں خدا کے قائل
وہ جو بنتے ہیں بظاہر دیندار　　اُن کو ہے حد سے زیادہ انکار
کوئی دل اُن کے ٹٹولے تو سہی　　رازِ سربستہ کو کھولے تو سہی
کیا کہوں منہ سے یہ کیا سمجھے ہیں　　زر کو کم بخت خدا سمجھے ہیں
خود غرض کو یہ سمجھتے ہیں فہیم　　خوُد غلط کو یہ سمجھتے ہیں حکیم
ان کی حکمت نہیں جز کذب و دروغ　　ہے جہالت کو زمانے میں فروغ
پختہ کاری کو زبوں کہتے ہیں　　ہوشیاری کو جنوں کہتے ہیں
حِرص نے ان کو کیا ہے گمراہ　　رحم و ایثار کو سمجھے ہیں گناہ
معصیت نام ہے ناداری کا　　مصلحت اسم ہے عیاری کا
ان کا انصاف ستم گاری ہے　　ان کا اخلاق ریاکاری ہے

آئندہ مرزا کی شاعری کے باب میں اس مثنوی کا ذکر کروں گا۔

حیدرآباد کا سفر مرزا کو لکھنؤ سے خاص محبت ہے، آخر زمانے میں دارالترجمہ عثمانیہ میں تقرر ہوا خدا جانے کن مجبوریوں سے منظور کر لیا مگر چلتے وقت ایک غزل میں یہ شعر کہتے گئے۔

دلّی چھٹی تھی پہلے اب لکھنؤ بھی چھوڑیں　　تھے دونوں شہر اپنے دونوں تباہ نکلے

شعر بتاتا ہے کہ ان کے دل پر لکھنؤ چھوڑنے کا خاص اثر تھا۔ حیدرآباد کے حالات کا مجھکو علم نہیں مگر یہ جانتا

ہوں کہ وطن کے اس قدر دلدادہ تھے کہ باپں پیرانہ سالی وکمزوری دوسرے تیسرے مہینے ضرور آیا کرتے تھے۔ نئی سڑک جو امین آباد کو گئی ہے وہیں کوئی کمرہ یا مکان کرایہ پر لے لیتے تھے۔

جب حیدر آباد سے آتے تھے تو مجکو ضرور بلواتے تھے، ایک دن گیا تو دیکھا مرزا صاحب ایک چارپائی پر بیٹھے ہیں اور ہارمونیم سامنے رکھا ہوا ہے۔ مجکو دیکھتے ہی کہا " آہا آئیے، اکبر کے جلوس کے وقت جو گیت گایا گیا تھا وہ سنئیے" باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ آجکل علم موسیقی کا شوق ہے اور کوئی کتاب بھی اس موضوع پر لکھ رہے ہیں۔ بعض وقت مرزا صاحب کی باتوں پر ہنسی آجاتی تھی مگر اُن کو کسی بات کی پروا نہ تھی، وہ اپنے خیالات میں مست رہتے تھے اور اپنے دل کو خوش رکھتے تھے۔

مدرستہ الواعظین کو عطیہ | مرزا صاحب کے مزاج میں ایثار اور طبیعت میں فیاضی تھی جس کی نمایاں مثال یہ ہے کہ جب حیدر آباد جانے لگے تو اپنا عظیم الشان کتب خانہ جو تمام عمر کا سرمایہ تھا مدرستہ الواعظین کو دیدیا۔ علمائے فرقۂ امامیہ میں شمس العلما مولانا سید نجم الحسن صاحب سے بہت ملاقات تھی۔ مولانا اکثر خود تشریف لیجایا کرتے تھے، خدا جانے اُن کی تحریک سے یا خود مرزا صاحب نے کتب خانہ جس میں ہزاروں کی تعداد میں ایک کافی سرمایہ تھا۔ مولانا کی خدمت میں بھجوا دیا جو آجتک مدرسہ میں محفوظ ہے۔

آخر حیدر آباد کی خاک دامنگیر ہوئی اور ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء روز چہارشنبہ کو مرزا صاحب نے دنیا کو خیرباد کہا۔ اُن کا چراغ زندگی نہیں بُجھا بلکہ محفل کمالات کی ایک روشن شمع ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی جس کی نظیر دنیا پیدا نہیں کرسکتی۔ انتقال کے وقت بچہتر سال کی عمر تھی۔ مرزا صاحب ترپ بازار راجہ مرلیدھر کے باغ میں مقیم تھے اور اسی باغ کے عقب میں ہمیشہ کے لئے آرام کیا۔

تصنیفات | (۱) فطرۃ الاسلام مطبوعہ (۲) ہدیۂ سفینۃ در علم کلام (۲۶ جلد۔ غیر مطبوعہ) (۳) جوزف آف لاجاک (ترجمہ) (۴) افلاطون کی حکومت جمہوریہ (۵) کتاب الاخلاق ارسطو۔ (۶) زیج مرزائی در ہیئت (غیر مطبوعہ) (۷) ابطال الرفارم (۸) رسالہ در توحید و اثبات واجب الوجود (۹) رسالہ در منطق استقرائی (غیر مطبوع) (۱۰) رسالہ در اصول مناظرہ (غیر مطبوع) (۱۱) رسالہ در علم النفس (غیر مطبوع) (۱۲) مصطلحات کیمیا (غیر مطبوع) (۱۳) رسالہ در اعمال اصطرلاب (غیر مطبوع) (۱۴) طلسمات (۱۵) امراؤجان (۱۶) ذات شریف (۱۷) شریف زادہ (۱۸) مرقع لیلیٰ مجنوں ڈرامہ منظوم (۱۹) افشائے راز (۲۰) بہرام کی رہائی (۲۱) خونی بھید (۲۲) خونی جورو (۲۳) مثنوی لذت فنا (۲۴) مثنوی بہار ہند (۲۵) مثنوی امید و بیم (۲۶) کلیات اردو۔ (قصائد مثنویات غزلیات کا ایک کافی ذخیرہ تھا جس کا پتہ نہیں۔)

ابھی یہ داستان ختم نہیں ہوئی بہت کچھ کہنا ہے اگر زندگی ہے تو۔

سنسکرت اور فارسی قواعد کی مطابقت

فارسی افعال

(از جناب سلیم جعفر صاحب)

یہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے کہ فعل کی اصل کیا ہے۔ مختلف ملکوں کے اہل تحقیق اپنی اپنی رائے کے مطابق مصدر۔ ماضی اور امر کو اصل فعل مان چکے ہیں اور اگرچہ اس پر سب کو اتفاق رائے ہے کہ فارسی میں اصل فعل امر ہے مگر یہ تحقیق اُسی وقت تک صحیح تھی جب تک کہ لسانیات نے جنم لیکر یہ ثابت نہ کردیا تھا کہ روئے زمین کی بہت سی زبانوں میں نہ صرف آپس میں تعلق ہے بلکہ ان میں بہت سی مشترک باتیں بھی پائی جاتی ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی اصل کی فرع ہیں۔

اصولِ لسانیات کی کسوٹی پر کسکر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ فارسی اور سنسکرت کی اصل ایک ہی ہے، اس کے تسلیم کرنے کے بعد فعل فارسی کی اصل کا پتا لگانا دشوار نہیں۔

سنسکرت میں مادہ (धातु) ایک مجموعۂ اصوات ہے جو اپنے ایک معنی رکھتا ہے مگر اس کو نہ اسم کہہ سکتے ہیں نہ فعل۔ اگر کچھ کہہ سکتے ہیں تو مخزنِ اشتقاق کہ جس کی ہیئت میں اصول مقررہ کے مطابق ردوبدل کرنے اور لاحقات و سابقات بڑھانے سے اسم و فعل وغیرہ سب کچھ بن سکتا ہے۔ اس لئے اس سے قطع نظر کرکے کہ اب تک اس خصوص میں مسلّمات کیا رہے ہیں یہ دکھایا جاتا ہے کہ فارسی کے مصدر و فعل کیونکر بنے۔ سنسکرت کے اصول صرف اس تاریک راہ میں شمعِ ہدایت کا کام دیتے ہیں۔

(مصدر)

اصل مصدر / مصدر کیونکر بنا

سب سے پہلے مصدر کو لیجئے۔ مصدروں کی اصل بھی مادّے معلوم ہوتے ہیں جو سنسکرت میں رائج ہیں۔ سنسکرت میں مصدر کا مقابل بھاو واچک سنگیا (भाव वाचक संज्ञा) کہلاتا ہے جس کے بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ مادہ میں ان اصولوں کے مطابق ردوبدل کرکے جو مستقبل کے بنانے میں کام آتے ہیں، آخر میں "تُم" (तुम) لگادیا جاتا ہے۔ اور کہیں اس ترمیم شدہ مادہ اور لاحقے کے درمیان इ یا ई بڑھایا جاتا ہے اور کہیں نہیں۔ اس اضافے کے قاعدے کلی نہیں ہیں۔

توضیح کی غرض سے فارسی کے مصدر "ستودن" کا یہاں تجزیہ کیا جاتا ہے۔ سنسکرت میں "سَتُ" (स्तु) مادّے کے معنے ہیں "سراہ"۔ یہ اصول مقررہ کے مطابق بدل کر "ستو" (स्तो) ہوگیا اس کے آخر میں "تُم" بھاو واچک کی علامت لگائی "ستوتُم" (स्तोतुम) ہوا۔ اب اس کے معنی ہوئے "سراہنا"۔ لفظ فارسی میں "ستودن" ہے۔ اسلئے یہ دیکھنا چاہیئے کہ "تُم" "دن" کیونکر ہوگیا۔ لسانیات کا ایک مسلمہ مسئلہ ہے کہ اصواتِ الفاظ میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے جس کا نام تغیر صوتی (Phonetic change) ہے چنانچہ اکثر الفاظ فارسی ایسے ہیں کہ اگر ان کی دال کو تے سے بدل دیا جائے تو سنسکرت ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے دو مشہور لفظ "پدر" اور "مادر" ہیں۔ سنسکرت والے ان کی جگہ "پتر" (पितृ) اور ماتر (मातृ) بولتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس تغیر کی مشابہت (Analogy) بھی موجود ہے۔ اکثر بھاو واچک ایسے ہیں جس میں "تم" کی صورت مسخ ہوگئی ہے مثلاً "دہ" (दह्) سے "دگدھم" (दग्धुम) تغیر صوتی نے اکثر ت کو د بنا دیا اور م (म) کو جو سنسکرت میں نون غنہ (अनुस्वार) مانا جاتا ہے۔ نون بالاعلان۔ اس لئے تم کا دن ہو جانا کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔

فارسی و سنسکرت مصدروں میں مطابقت

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ سنسکرت میں مادہ مصدر بننے سے پہلے تین منزلیں طے کرتا ہے۔ پہلے اس میں ترمیم کی جاتی ہے اور پھر اگر ضرورت ہوئی تو इट् یا इट् لگا دی جاتی ہے اس کے بعد لاحقہ مصدر یعنی "تم" بڑھایا جاتا ہے۔ فارسی مصدر میں بھی یہی تینوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ اگر کچھ فرق ہے تو اتنا کہ یہاں مادہ اور لاحقے کے درمیان جب ضرورت ہوتی ہے تو ہمیشہ یَ (इट्) بڑھاتے ہیں۔ علاوہ اس کے اکثر مادہ میں ترمیم بھی نہیں کرتے مثلاً "کرش" (कृष) (کھینچ) ایک مادہ ہے۔ تخریب صوتی (Phonetic Corruption) نے اس رَ (ऋ) کو خیرباد کہہ دیا اور صرف "کش" باقی رہا۔ اس میں इट् (ی) بڑھایا "کشی" بنا اور آخر میں علامت مصدر دن (तुम) لگا کر مصدر "کشیدن" بمعنی کھینچنا وضع کر لیا گیا۔

مادّے سے مصدر بنائے جانے کا ثبوت

مادہ سے مصدر فارسی کا بنایا جانا اس سے بھی ثابت ہے کہ جو مصدر عربی الفاظ سے بنائے گئے ہیں وہ صیغۂ امر سے نہیں بلکہ مادوں سے مشتق ہیں مثلاً رقصیدن، فہمیدن، غارتیدن، طلبیدن وغیرہ۔ اس سے بڑھکر یہ بات ہے کہ فارسی کے جو مصدر مادے میں ترمیم کر کے بنائے گئے ہیں مثلاً پوشیدن (مادہ पुष) انکا صیغۂ امر یہ ترمیم کردہ مادہ ہے جیسے پوش

عہ یہاں میں اپنے مضمون "قانون ابدال و مطالعہ افعال فارسی" مطبوعہ رسالہ زمانہ بابت ماہ جنوری ۱۹۳۲ء کے اس حصے کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جس کا تعلق تبدل حرف "ت" سے ہے۔

نہ کہ خود مادہ۔

مادوں پر سابقے لگا لگا کر معنے میں ترمیم کرنا

فعلی مادوں پر سابقے بڑھا بڑھا کر ترمیم معنی کرنا بھی سنسکرت کا اصول ہے۔ یہ بات فارسی کے مصدروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً ستادن (کھڑا ہونا مادہ: स्था) سے فرستادن (بھیجنا۔ مادہ = प्र + स्था) اور سابقہ بھی ایک ہی نہیں بلکہ دو دو سابقے بھی بڑھائے جاتے ہیں یہ بھی سنسکرت ہی کی تقلید ہے مثلاً برآوردن (= باہر لانا = प्र + आ + भृ)

اسم سے بھی مصدر بنائے گئے ہیں

مصدر کا بنانا صرف مادوں ہی پر منحصر نہیں رکھا گیا ہے بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ایک مادے سے پہلے اسم بنایا گیا اور پھر اس سے مصدر مثلاً "نام" (नाम) سے نامیدن اور "وار" (वारि) سے باریدن۔ یہ کوئی جدت نہیں۔ سنسکرت میں بھی یہ طریقہ جاری ہے کہ اسم سے فعل بنا لیا جاتا ہے بطور مثال "پتُرامِ" (पितरामि = میں اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتا ہوں) کو لیجئے۔ "پا" पा (بچا) سے पितृ بنا اور اس سے पितरामि

ایک استثنا

ایک جدت بھی نظر آتی ہے۔ آریوں کی اس شاخ نے مصدر سے بھی مصدر بنایا ہے۔ کندن تو "کھن" (खन्) سے بنا یا تھا ہی مگر اس کی ماضی "کند" سے "کندیدن" بھی بنا ڈالا۔ یہ جدت صرف اسی مثال پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے میرے نزدیک اس نظریے پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا جو میں ثابت کرتا چلا آرہا ہوں اور جس کے مزید ثبوت آگے چلکر پیش کرونگا۔

دو مصدروں کے صیغوں سے مطلب برآری

صفوۃ المصادر وغیرہ میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک ہی حرف کے تحت میں دو ہم معنی مصدر لکھے ہیں۔ ایک کی پوری گردان لکھی ہے اور دوسرے کی صرف ماضی اور اسم مفعول اور کبھی کبھی حاصل بالمصدر بتائے گئے ہیں۔ یہ انوکھاپن کیوں؟ جب مصدر بن گیا تو پھر قاعدے کے مطابق اور صیغے کیوں نہیں بنائے جاتے؟ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ بعض مصدروں کے صیغے اہل زبان کے استعمال نے زندہ رکھے اور بعض کے صیغوں کو ترک کر کے انھیں مٹا دیا مگر یہاں بھی قدم نے جادۂ تقلید سے لغزش نہ کی۔ سنسکرت میں "اس" (अस) اور "بھو" (भू) دو ہم معنی مصدر ہیں۔ پہلے کے صیغوں کی کمی دوسرے کے صیغے لے کر پوری کی گئی ہے۔

مصدر جعلی

مصدر جعلی بھی سنسکرت میں مستعمل ہیں۔ ایک اسم جامد اور ایک مادے کو ملایا اور ایک نیا مطلب ادا کر دیا۔ مثلاً "گربھ + بھر" (गर्भ + भृ = حاملہ ہونا) क्षिति + भृ (روئے زمین پر حکومت کرنا۔) अट्ट + भृ (لپٹیاں جانا) اس پر فارسی بھی عامل ہے جیسے دست افشانیدن (ناچنا) دست دادن (ہاتھ لگنا) دست گزیدن (افسوس کرنا) مگر اس قسم کے مصدروں کو خواہ وہ اردو کے ہوں خواہ فارسی کے

یا سنسکرت کے مصدر مرکب کہنا غالباً نامناسب ہوگا کیونکہ یہ دراصل محاورات کا رتبہ رکھتے ہیں۔ دو لفظ جو اپنے الگ الگ معانی رکھتے تھے، ان کی دلالتِ وضعی کو مدنظر رکھ کر ایک نیا خیال ظاہر کرنے کا کام لیا گیا ہے۔

چند مصدروں کے مادّے ذیل میں ایک مختصر سی فہرست مصادر فارسی کی درج کی جاتی ہے اس میں سنسکرت کے وہ مادّے دکھائے جاتے ہیں جن سے یہ مصدر بنے ہیں:۔

مصدر فارسی	معنی	مادّہ	معنی
آراستن	سنوارنا	आ + रच्	درست کرنا
آرامیدن	آرام کرنا	आ + राम्	آرام کرنا
آرمیدن	"	आ + रम्	"
آزردن	آزردہ ہونا	आ + हृ	صدمہ پہنچنا۔ رنج دینا
آشامیدن	پینا	आ + चम्	پینا
آشفتن	پریشان ہونا۔ کرنا	आ + क्षुभ्	بے چین ہونا۔ بدنما ہونا
افروختن	روشن کرنا۔ ہونا	अभि + रुच्	چمکنا
آمرزیدن	بخشنا	आ + मृज्	پاک صاف کرنا۔
آمیختن	ملنا۔ ملانا	आ + मिश्र	ملانا
ارزیدن	قیمت پانا	अर्ज्	کمانا۔ حاصل کرنا۔
استادن	کھڑا ہونا	आ + स्था	کھڑا ہونا
استردن	مونڈنا۔ صاف کرنا۔	उत् + स्तृ	کاٹنا
افزودن	بڑھانا	अभि, अपि + यु	جوڑنا۔ ملانا
افسردن	ٹھٹھرنا	अप + सृ	نہ چلنا۔ نہ بہنا
افشردن	نچوڑنا	अप + क्षर	قطرہ قطرہ ٹپکنا
افگندن	ڈالنا	अप + खन्	نہ کھودنا
انباردن	ڈھیر کرنا	अनु + भृ	بھرنا۔ پاٹنا
افتادن	گرنا	उत् + पत्	گرنا۔
انباشتن	ڈھیر کرنا	अनु + पश	باندھنا۔

انجامیدن	ختم ہونا	अन्त + यम, गम्	آخر تک جانا
اندودن	لپیٹنا۔ ملمع کرنا	अन्तर + दु	اندر جانا
اندیشیدن	سوچنا	अन्त + दृश्	نتیجہ دیکھنا

(ب)

باریدن	برسنا	वारि	پانی
بافتن	بُننا	वप्	بُننا
بخشیدن	بخشنا	भज	حصہ لینا۔ بانٹ لینا
برآوردن	باہر لانا	प्र + आ + भृ	دُور لے جانا
بُردن	لے جانا	भृ	لے جانا
برشتن	بھوننا	भ्रस्ज	بھوننا
برگشتن	پھرنا	प्र + गच्छ	دُور جانا
بستن	باندھنا	वस्	باندھنا
بودن	ہونا	भू	ہونا
بیختن	چھاننا	विज़, विच	جدا کرنا۔ تقسیم کرنا

(پ)

پالودن	صاف کرنا	प्लु	دھو ڈالنا
پختن	پکانا	पच्, पक्	پکانا
پذیرفتن	قبول کرنا	पश्चव, पश्चात + रफ्	پیچھے چلنا
پرداختن	سنوارنا	परि + तक्ष	تشکل کرنا۔ شکل وصورت بنانا
پرسیدن	پوچھنا	प्रच्छ	پوچھنا
پروردن	پالنا	परि + वृ	خدمت کرنا۔ سیوا کرنا
پُریدن	بھرنا	पृ, पूर	بھرنا
پژمردن	کمھلانا	पश्च + मृ	بعد میں مرنا
پژوہیدن	فکر کرنا	पश्च + ऊह्	بعد کی بات سوچنا
پوشیدن	پہننا	पुष	پہننا

فارسی	اردو	سنسکرت	اردو
پیچیدن	لپیٹنا	पिच्	لپیٹنا
پیراستن	سنوارنا	प्र+आ+रच्	خوب بنانا
پیمائیدن	ناپنا	प्र + मा	خوب ناپنا
پیوستن	ملنا ۔ ملانا	प्र + विश	خوب گھسنا

(ت)

فارسی	اردو	سنسکرت	اردو
تاختن	دوڑنا	तक्, तच्	جانا
تافتن	چمکنا	तप्	گرم ہونا
تپیدن	تڑپنا ۔ گرم ہونا	तप्	گرم ہونا ۔ جلنا
تراشیدن	کاٹنا	तृह	مارنا۔
ترسیدن	ڈرنا	त्रस	ڈرنا
تفتن	گرم ہونا	तप्	گرم ہونا
تفسیدن	"	तपस्	گرمی
تنیدن	تننا	तन्	تاننا

(ج)

فارسی	اردو	سنسکرت	اردو
جستن	کودنا	जस्	جانا

(چ)

فارسی	اردو	سنسکرت	اردو
چریدن	چرنا	चर्	چرنا ۔ چلنا
چشیدن	چکھنا	चष्	چکھنا
چیدن	چننا	चि	اکٹھا کرنا

(خ)

فارسی	اردو	سنسکرت	اردو
خراشیدن	چھیلنا	कृष	پھاڑ ڈالنا
خریدن	مول لینا	कृ, क्री	مول لینا
خروشیدن	شور کرنا	क्रुष	چلّانا
خستن	زخمی ہونا	खष्	مارنا ۔ ایذا دینا
خفتن	سونا	स्वप	سونا

فارسی		سنسکرت	
خوابیدن	سونا	स्वाप्	سونا
خواستن	چاہنا	स्व+ अस्	اپنے واسطے لینا
خواندن	پڑھنا	स्वन्	آواز کرنا
خوردن	کھانا	स्वद्	کھانا
خندیدن	ہنسنا	स्फंद	ہنسنا
(د)			
دادن	دینا	दा	دینا
درودن	کاٹنا	द्रु	ایذا پہنچانا
دریدن	پھاڑنا	दॄ	پھاڑنا
دمیدن	پھونکنا	ध्मा	پھونکنا
دوشیدن	دوہنا	दुह्	دوہنا
دویدن	دوڑنا	धाव	دوڑنا
دیدن	دیکھنا	दी (वेण,वेन)	دیکھنا
(ر)			
رخشیدن	چمکنا	रुच्	چمکتا ہوا۔ روشن
رزیدن	رنگنا	रञ्ज	رنگنا
رَستن	چھوٹنا	रह्	چھوٹنا
رُستن	اُگنا	रुह्	اُگنا
رفتن	جانا	रफ़्	جانا
رقصیدن	ناچنا	رقص	ناچنا
رمیدن	بھاگنا	रम् یا رم	بھاگنا۔ کھیلنا
رنجیدن	آزردہ ہونا	रञ्ज	غصہ کرنا
روئیدن	اُگنا	रुह्	اُگنا
رہیدن	چھوٹنا	रह्	چھوٹنا
ریدن	ہگنا	री	
(ز)			
زاریدن	رونا	हृ	
زدن	مارنا	हन्	مارنا

فارسی	معنی		سنسکرت	معنی
ساختن	بنانا	(س)	शुक	قوت وقوع پزیری۔ مدد کرنا
سپردن	سونپنا		स्पृ	دینا۔ عطا کرنا
سرشتن	گوندھنا		सृज	گوندھنا
ستودن۔ ستایدن	تعریف کرنا		स्तु	سراہنا
ستردن	مونڈنا۔ صاف کرنا		स्तृ	کاٹنا
سگالیدن	اندیشہ کرنا		सु+कल, गल	اچھی طرح سوچنا
سنجیدن	تولنا		सम+चि	برابر برابر اکٹھا کرنا یا چننا
سوختن	جلنا		शुच्	جلنا۔ چمکنا۔ جلانا
شستن	دھونا	(ش)	शुच्	صاف کرنا۔ پاک کرنا
شمردن	گننا		स्मृ	یاد کرنا
شنودن	سننا		श्रु	سننا
طرازیدن	نقش کرنا	(ط)	طراز	نقش
طلبیدن	چاہنا۔ بلانا		طلب	چاہنا۔ بلانا
غارتیدن	لوٹنا	(غ)	غارت	لوٹنا

(ف)

فتادن۔ فزودن۔ فسردن۔ فشردن۔ فگندن دیکھو تحتی الف

فارسی	معنی		سنسکرت	معنی
فرستادن	بھیجنا		प्र+स्था	نہ ٹھہرنا
فہمیدن	سمجھنا		فہم	سمجھنا
کافتن۔ کاویدن	کھودنا	(ک)	खव्	گزشتہ کا ظاہر کرنا
کردن	کرنا		कृ	کرنا
کشادن۔ کشودن	کھولنا		कृष्	پھاڑ ڈالنا۔ کھینچنا
کشتن	مار ڈالنا		"	تکلیف دینا۔ ایذا دینا
کِشتن	بونا		"	ہل چلانا۔ بونا
کندن۔ کندیدن	کھودنا		खन्	کھودنا
کوشیدن	کوشش کرنا		कुष्	کھینچنا۔ آزمانا۔ چکنا

فارسی	اردو		سنسکرت	اردو
کوفتن	کوٹنا		कुप्	کمزور کرنا
گرویدن	پھرنا	(گ)	कुर्द, गुर्द	کھیلنا
گرفتن	پکڑنا		ग्रभ्, ग्रह्	حاصل کرنا۔ منظور کرنا۔ لینا
گشتن	پھرنا		गच्छ	جانا
گفتن	کہنا		गुप	بولنا
لافیدن	فضول بکنا	(ل)	लप्	بک بک کرنا
لیسیدن	چاٹنا		लिह्	چاٹنا
مالیدن	ملنا	(م)	मल्	پکڑنا۔ قبضہ کرنا
مُردن	مرنا		मृ	مرنا
نازیدن	ناز کرنا	(ن)	नज्	لجانا۔ شرما
نالیدن	شور کرنا		नद (द= ल)	شور کرنا
نامیدن	نام رکھنا		नाम (णम)	نام
نوشتن	لکھنا		नि + पिष	لکھنا
نشستن	بیٹھنا		नि + सद, षद	بیٹھنا
نگاشتن: نگاریدن	لکھنا		नि + कृ	لکھنا
نمودن	دکھانا		नि + मा	دکھانا۔ ظاہر کرنا
نوردیدن	لپیٹنا		नि + वृ	گھیر لینا۔ احاطہ کرنا
نوشتن	لکھنا		नि + विश्	سپرد قلم کرنا
واخیدن	دُھنکنا	(و)	वष	ایذا دینا۔ مارنا
ورغلانیدن؎	بہکانا		पर, प्र + कल, गुल	دور جانا
وزیدن	ہوا چلنا		वज़, वह	جانا۔ بہنا
یافتن	پانا	(ی)	आप (आ= या)	پانا

نتیجہ بخوف طوالت مشتے نمونہ از خروارے پر قناعت کی جاتی ہے مگر اس کی کوشش بھی بے سود ہے کہ کم سے کم صفوۃ المصادر میں جتنے مصدر ہیں سب کا تجزیہ و تحلیل کرکے ثابت کیا جائے کہ فارسی مصدروں

؎ طریق تعدیہ ہے۔

کی اصل سنسکرت ہی کے مادے ہیں کیونکہ بابل۔ صور۔ قبرس۔ مصر۔ تھریس۔ مقدونیہ۔ یمن۔ آرمینیا اور عراق وغیرہ وقتاً فوقتاً عظیم الشان سلطنت ایران کے زیرنگیں رہ چکے ہیں۔ خود یہ ملک عربوں اور تاتاریوں کے سامنے سر تسلیم خم کر چکا ہے اور عہد ساسانی اور اس سے پہلے کا زمانہ اس پر ایسا گزرا ہے کہ جب ارامی یا پہلوی کا اس قدر زور شور تھا کہ اَوَستا تک کا ترجمہ اس میں ہو گیا۔ اگرچہ دستور اس ارامی ترجمے کو فارسی زبان میں لاحقے لگا لگا کر پڑھتے تھے جس کے باعث دھوکا ہوتا ہے کہ پہلوی بھی ایک فارسی بولی ہے۔ اس کے علاوہ آوازوں نے وہ وہ روپ بھرے ہیں کہ اکثر طائرِ خیال کی رسائی بھی ان تک دشوار ہے۔ مثلاً لفظ "دست" ہی کو لیجیے سنسکرت میں "ہست" تھا، اَوَستا نے اسے "زست" بنایا اور فارسی جدید میں بصورت "دست" جلوہ گر ہے۔ خود سنسکرت بھی یونانی کے اثر سے نہیں بچ سکی اس میں بھی لفظ "کیندر" (केन्द्र) کا ماخذ یونانی کا (کینٹن) Canton, مانا جاتا ہے۔ اس لئے کون کہہ سکتا ہے کہ کس کس زبان سے لفظ لیکر مصدر بنائے گئے ہیں۔ جو بات قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ فارسی نے صرف لفظ قرض لئے ہیں اور ان سے اپنے اصول قواعد کے مطابق مصدر بنائے ہیں جیسا کہ غارتیدن و طلبیدن وغیرہ سے ظاہر ہے۔ اس قدر مطابقت و ثبوت کے بعد بھی یہ کہنا کہ مصدر بنانے کا یہ طریقہ سنسکرت کے بھاو واچک سنگیا کی نقل نہیں ہے آفتاب پہ خاک ڈالنا ہے۔

حاصل بالمصدر | جب مصدر ہی سنسکرت کی بھاو واچک سنگیا کی نقل ہے تو حاصل بالمصدر کیوں نہ ہوتا۔ نامن (नामन) یا سنگیا بنانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ترمیم کردہ مادہ کے آخر میں "اِش یا اِس" (इस یا इष) بڑھایا جاتا ہے۔ فارسی نے صرف "اش" کو اختیار کیا اور اصل مادے یا اس کی ترمیم کردہ صورت میں اسے بطور لاحقہ لگانا شروع کیا جیسا کہ کشش پوشش وغیرہ سے عیاں ہے۔

طریق تعدیہ | فارسی نے تعدیہ ایک نرالے ہی طریقہ سے بنایا ہے اگرچہ اس میں بھی دائرۂ تقلید سے قدم باہر نہ نکل سکا۔ تعدیہ میں چونکہ ایک شخص دوسرے شخص کو صدور فعل کا آلہ و ذریعہ بناتا ہے اس لئے فارسی نے تصور کیا ہے کہ اس شخص کے اس فعل سے اس آلہ و ذریعہ میں جب اس سے فعل صادر ہوتا ہے تو ایک وصف یا حالت پیدا ہو جاتی ہے اس لئے پریرنارتھک (प्ररणार्थक) بھاو واچک سنگیا بنانے کے طریقہ پر عمل پیرا نہ ہوئی۔ پہلے مادہ سے اسم حالیہ بنایا اور اس کے آخر میں علامت مصدر مع یائے معروف (یدن) لگائی۔ سنسکرت میں اسم حالیہ (आत्मने पद वर्तमान गुणक्रिया) مادے یا ترمیم کردہ مادے میں "آن" (आन) لگانے سے بنتا ہے مثلاً "لِہ" लिह (چاٹ) سے "لِہان" लिहान (چاٹتا ہوا) اب پوشانیدن پر غور کیجیے صاف صاف نظر آتا ہے کہ "پش" (पुष) سے "پوش" (पोष) "پوشان" (पोषान) اور پوشانیدن بنا۔

لہ فارسی کی اس روش سے میں نے اپنے مضمون "مستعارات فارسی" مطبوعہ اخبار "ریاست" بابتہ ۲۸۔ دسمبر ۱۹۳۱ء میں بحث کی ہے۔

فاؤسٹ

(از مسٹر ہری کرشن سکسینہ، بی۔اے۔سی۔ٹی)

بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ فاؤسٹ یورپ کا بہترین ڈراما ہے۔ یہ جرمن فلسفی شاعر گوئٹے کی تصنیف لطیف ہے۔ اور پلاٹ وغیرہ کے لحاظ سے شکسپیر کے بعض ڈراموں سے بھی بڑھا ہوا سمجھا جاتا ہے۔ اور بعض نقادانِ سخن کا تو یہاں تک خیال ہے کہ شکسپیر اور ملٹن دونوں ملکر فاؤسٹ کے مصنف کی برابری کر سکتے ہیں۔ ملٹن کی تصانیف میں مذہبی عنصر قوی ہے جس کا بیّن ثبوت اس کا شاہکار گم شدہ فردوس (Paradise Lost) موجود ہے۔ شکسپیر کے ڈرامے جذبات و احساسات انسانی کی لطیف و نازک تصویریں تاریخی۔ سیاسی اور جذباتی زندگی و انسانی کمزوریوں کے مظاہرے ہیں لیکن فاؤسٹ فطرت انسانی کی بوقلمونیوں کا مرقع اور روحانی و نفسانی کشمکشوں کا نقشہ اور نجات ابدی کا ذریعہ ہے۔

قرون وسطیٰ کے عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ ساحر شیطان کے مُرید ہوتے ہیں اور صرف کلیسا ہی اُن کو اس قوی پنجہ سے رہائی دلا سکتا ہے۔ اسی خیال کی تائید میں ایسی بہت سی مذہبی کہانیاں بھی رائج تھیں جن میں دین عیسوی کے روحانی پیشواؤں نے ساحروں کی روحوں کو شیطان کے پنجے سے چھڑا کر مسیح کے حلقہ میں داخل کیا تھا۔ سولھویں صدی میں جب مذہبی انقلاب نے پوپ اور اس کے پیرووں کی چالاکیوں کو طشت از بام کیا۔ اور عوام کو پادریوں کی مافوق الفطرت قوتوں پر اعتماد نہ رہا۔ تو ان کہانیوں کا رنگ بھی بدل گیا اور عوام کا یہ عقیدہ ہو گیا کہ جو ساحر شیطان کے ہاتھ اپنی روح بیچ دیتا ہے۔ اس کو کوئی نجات نہیں دلا سکتا اور جب وہ مرتا ہے تو شیطان اس کی روح کو اپنے جہنم کی سلطنت میں بھیج دیتا ہے۔ اسی قسم کی کہانیوں میں سے فاؤسٹ کا افسانہ ہے۔ اس کی تاریخی اصلیت صرف اس قدر ہے کہ جان فاؤسٹ نامی ایک شخص مشہور عالم میلا نشتون کا ہمعصر اور ہموطن تھا۔ وہ ۱۵۱۶ء سے ۱۵۲۵ء تک ماڈل برون میں رہا۔ اس کے بعد وٹنبرگ میں آیا۔ یہاں اس نے اپنے آپ کو ساحر مشہور کیا اور اور یہ کہا کہ میرے ہی جادو کی بدولت جرمنی کے بادشاہ کو اطالیہ میں شکست ہوئی۔ میلا نشتون نے اُسے ان حرکتوں پر لعنت ملامت کی اور وہ گرفتاری کے خوف سے وہاں سے بھاگا۔ اور عرصہ تک مارا مارا پھرتے

کے بعد ورٹمبرگ کے کسی گاؤں میں مرگیا۔

سولھویں صدی کے نصف آخر میں اس کی زندگی کی مختلف رنگ آمیزیوں سے ایک عجیب و غریب افسانہ تیار ہوگیا۔ چنانچہ ۱۵۸۷ء میں اس کے متعلق ایک قصہ (Faustbuch) (کتاب فاؤسٹ کے نام سے) جرمنی میں شائع ہوا۔ یہی قصہ گوئٹے کے ڈرامہ کا ماخذ ہے لیکن گوئٹے کی قادرالکلامی قوت فسانہ نگاری۔ تخیلات کی بلند پروازی۔ تبحر علمی اور استعارانہ واقع نگاری نے اس معمولی سی داستان کو ایک اچھوتے اور شاعرانہ تخلیقی رنگ میں پیش کرکے یورپ کی علمی مذہبی۔ سیاسی معاشرتی اور تمدنی زندگیو کا ایک دلفریب مرکب تیار کردیا ہے اور جس طرح فاؤسٹ کا قصہ عام باشندگان جرمنی کا قومی قصہ تھا۔ اسی طرح اب گوئٹے کا ڈرامہ "فاؤسٹ" کل جرمن قوم کا قابل فخر علمی کارنامہ بن گیا ہے اور اس وقت اس کا شمار دنیا کے بہترین شاہکاروں میں ہے اور یہ یورپ کے ڈراموں کا سرتاج خیال کیا جاتا ہے۔

گوئٹے کے ڈرامے کا پلاٹ حسب ذیل ہے:۔

تمہیدی سین میں ملائکہ مقربین خالق کائنات کی حمد وثنا میں مصروف ہیں۔ شیطان بھی بارگاہ ایزدی میں حاضر ہے اور انسان کی خودپسندی اور گمراہی پر خندہ زن ہے۔ صدائے غیبی اس کی سرزنش کے لئے فاؤسٹ کا ذکر کرتی ہے جو شک اور تاریکی میں گرفتار ہونیکے باوجود خدا کی بندگی کرتا ہے۔ شیطان جواباً عرض کرتا ہے کہ "اگر مجھکو اجازت ہو تو میں فاؤسٹ کو آسانی سے بہکا سکتا ہوں"۔ ارشاد ہوتا ہے کہ "جبتک وہ دنیا میں ہے تجھکو بہکانے کی ممانعت نہیں۔ کیونکہ جبتک انسان راہِ طلب میں ہے اُس کا بھٹکنا لازمی ہے۔ انسان کا دست عمل جلد سو جاتا ہے اور اُسے آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے ہم اُسے تجھ سا مصاحب دیتے ہیں جو اُسے بہلائے اُبھارے اور آسمانی قوت تخلیق دے"۔ اس کے بعد شیطان فاؤسٹ کے بہکانے کے لئے روانہ ہوجاتا ہے۔ اگلے سین میں فاؤسٹ جو ادھیڑ عمر کا ایک پروفیسر ہے اپنے کمرہ میں بیٹھا نظر آتا ہے اس نے اپنی جوانی طلب علم میں صرف کی ہے لیکن علم سے اُسے تسکین حاصل نہیں ہوئی نہ وہ حسن وعشق کے مزے سے واقف ہے اور نہ مشاہدۂ فطرت کے کیف یا لذتِ عمل سے آگاہ ہے۔ ان فطری رجحانات کے روکنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی زندگی ہم آہنگِ وحدت ہونے کے بجائے ہنگامۂ انتشار بنکر رہگئی ہے۔ اور ابتک اس کی صرف یہی ایک آرزو ہے کہ علمی تحقیق اور تجربہ سے کائنات کی حقیقت معلوم کرے۔ اُس نے اپنی آدھی عمر اُس میں صرف کردی ہے۔ لیکن آخر میں اُسے یہی معلوم ہوا کہ علم انسان کی پہونچ سے باہر ہے، اب وہ یاس وحرمان کا شکار ہے۔ ایسی حالت میں وہ کائنات کا راز معلوم کرنے کے لئے فنِ ساحری کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ جادو کی ایک کتاب میں، عالم کبیر کا نقش دیکھتا ہے جس کا نوری

اور حیرت انگیز اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ جاتے ہیں اور سارا نظام کائنات چلتی پھرتی تصویروں کی طرح نظر آنے لگتا ہے اور وہ بے اختیار چلا اٹھتا ہے "سبحان اللہ ہر چیز کس ترتیب کے ساتھ کل کی تعمیر میں صرف ہوئی ہے۔ ہر شے کا نوائے زندگی نغمۂ کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہے" لیکن یہ منظر فوراً نظروں سے غائب ہوجاتا ہے اور فاؤسٹ کی تشنۂ دیدار روح تسکین حاصل کرنے کے بجائے اور بے قرار ہوجاتی ہے۔ اب فاؤسٹ پھر بیدلی سے جادو کی کتاب کے ورق الٹتا ہے اور اس میں ایک جگہ اس کو کرۂ ارض کی روح کا نقش ملتا ہے۔ وہ اس روح کو طلب کرتا ہے۔ چنانچہ یکایک ایک آتشین پیکر ظاہر ہوتا ہے مگر جب فاؤسٹ تاب نظارہ نہیں لاسکتا ہے تو روح اس کی خودپسندی کو پامال کرکے یہ کہتی ہوئی غائب ہوجاتی ہے کہ "تو ابھی میرا ادراک نہیں کرسکتا۔ صرف اسی چیز کا ادراک کرسکتا ہے جسکے تو قابل ہے"۔ یہ سُنکر فاؤسٹ ندامت سے بدحواس ہوجاتا ہے اور زہر ہلاہل سے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تاکہ مرکر کائنات کا بھید معلوم کرے لیکن اُسی وقت دفعتاً گرجا کے گھنٹوں کی آواز اور فرشتوں کا نغمہ سنائی دیتا ہے جس سے اُس کو معلوم ہوجاتا ہے کہ ایسٹر کی صبح ہوگئی اور ارض و سما میں مسیح کے دوبارہ زندہ ہونے کی خوشی منائی جارہی ہے۔ اور وہ زہر کی شیشی کو یوں ہی بغیر پیئے رکھ دیتا ہے۔

دوسرے سین میں فاؤسٹ اور اس کا شاگرد دونوں گھر سے باہر سیر کے لئے جاتے ہیں۔ یہاں ان کو اہل شہر و دیہات کے آدمی ایسٹر کی خوشی میں ناچ رنگ کے جلسوں میں مشغول نظر آتے ہیں۔ واگنر جو کتابوں کا کیڑا ہے ان جلسوں سے گھبراتا ہے اور وہاں سے آگے چلکر دونوں ایک پتھر پر بیٹھ جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہاں ایک کالا کتا چکر کھاتا ہوا آتا ہے۔ فاؤسٹ اُس کو خبیث روح سمجھتا ہے لیکن واگنر کے اطمینان دلانے سے وہ مطمئن ہوجاتا ہے۔ وہاں سے واپسی پر فاؤسٹ اپنے کمرہ میں پہونچتا ہے اور اُس کے ساتھ ہی وہ کالا کتا بھی چھلانگ مارکر اُس کے کمرہ میں داخل ہوجاتا ہے۔ فاؤسٹ اپنا دل بہلانے کے لئے انجیل کے باب پیدائش کی پہلی آیت پڑھکر اُس کے مطلب کی تشریح کرتا ہے اس پر کتا زور شور سے بھونکنے لگتا ہے اور اس کا جسم پھول کر بڑھنے لگتا ہے۔ اب فاؤسٹ کو یقین ہوجاتا ہے کہ وہ کتا ضرور کوئی خبیث روح ہے اور وہ جادو کی کتاب سے منتر پڑھنے لگتا ہے جس کے اثر سے تمام کمرے میں کہر چھا جاتا ہے۔ اس کہر کے اندر سے وہ روح جو کتے کی شکل میں تھی پادری کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ فاؤسٹ کے دریافت کرنے سے یہ بھید کھلتا ہے کہ وہ شیطان ہے جو فاؤسٹ کو بہکانے آیا ہے۔ اس وقت شیطان کی نظر ایک مخمسی حصار سحر پر پڑتی ہے جس کو کمرہ میں داخل ہوتے وقت اس نے نہیں دیکھا تھا اور قواعد سحر کے بموجب وہ بغیر اجازت اس حصار سے باہر نہیں نکل سکتا۔ جب فاؤسٹ کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیطان ہے تو اُس کو اجازت دینے سے انکار

1203

کرو دیتا ہے۔ اس پر شیطان جو مکر و فریب کا استاد ہے فاؤسٹ کو جادو کا تماشہ دکھانے کے بہانے سے اپنی ماتحت روحوں کو بلاتا ہے جو ایک دلفریب گیت سنا کر اسکو مئے نغمہ سے مدہوش کر دیتی ہیں۔ پھر وہ چوہوں کو بلاتا ہے جو سحری حصار کے ایک کونہ کو کتر دیتے ہیں اور وہ نکل جاتا ہے۔ دوسری بار شیطان ایک رئیس زادے کے لباس میں آتا ہے۔ اور فاؤسٹ کو دنیا کی سیر اور عیش و عشرت کی ترغیب دیتا ہے۔ فاؤسٹ اس نیت سے کہ اس طرح اس کو بنی نوع انسان کی حالت جانچنے اور اس کے ساتھ سچی ہمدردی کر کے اپنی انفرادی ہستی کو کل نوع کی ہستی میں فنا کرنے کا موقع ملیگا شیطان کی تجویز کو منظور اور اس کے ساتھ دوامی رفاقت کا عہد کرتا ہے اور شیطان بطور غلام فاؤسٹ کی فرمانبرداری کا عہد کرتا ہے۔ فاؤسٹ تیاری سامان سفر میں مشغول ہوتا ہے۔ لیکن اُسی وقت اس کا شاگرد آجاتا ہے اور شیطان فاؤسٹ کی شکل میں طالب علم سے مختلف علمی مسائل پر بحث کرتا ہے اور آخر میں اس کو یہ نصیحت کرتا ہے کہ تم بھی دیوتاؤں کی طرح نیکی و بدی دونوں کا علم حاصل کرو۔ طالب علم کے چلے جانے کے بعد شیطان فاؤسٹ کو ایک طلسمی چغہ پہناتا ہے اور آگ جلا کر بخارات پیدا کرتا ہے جو دونوں کو اڑا کر دوش ہوا پر لیجاتے ہیں۔

اگلا منظر شراب خانہ کا ہے۔ جہاں شرابی شراب پی رہے ہیں اور بازاری مذاق کر رہے ہیں۔ شیطان معہ فاؤسٹ وہاں آتا ہے اور شرابیوں کو جادو کی شراب پلاتا ہے لیکن شراب کے چند قطرے زمین پر گر پڑتے ہیں اور شعلہ بنکر بھڑک اُٹھتے ہیں۔ یہ حالت دیکھکر شرابی انتقام کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن شیطان کے جادو سے ان کو شراب خانہ انگور کا باغ نظر آنے لگتا ہے اور وہ ایک دوسرے کی ناک کو خوشۂ انگور سمجھکر چاقو سے کاٹ لیتے ہیں۔ اس اثنا میں فاؤسٹ اور شیطان وہاں سے روانہ ہو جاتے ہیں

اس کے بعد شیطان اور فاؤسٹ جادوگرنی کے باورچی خانہ میں نظر آتے ہیں۔ اس سین میں گوئٹے نے جادو کے سفلی پہلو کو نمایاں کیا ہے جس میں وہ یہ دکھاتا ہے کہ جادو کے شوق کی بدولت انسان کے ادنیٰ جذبات اُبھر آتے ہیں اور وہ بدمذاقی اور گندگی کے اُن تیرہ و تاریک گڑھوں میں گرتا ہے جنھیں شیطان بھی اپنی شان کے خلاف و پست سمجھتا ہے۔ یہاں شیطان فاؤسٹ کو۔ بوڑھے سے جوان ہونے کا ماءاللحم پینے کے لئے کہتا ہے لیکن فاؤسٹ تیار نہیں ہوتا اور کسی اور بہتر ترکیب کا خواہاں ہوتا ہے۔ اس پر شیطان جواب دیتا ہے کہ انسان کس کس طرح سادہ و پر مشقت زندگی بسر کرنے سے کھوئی ہوئی صحت حاصل کر سکتا ہے۔ چونکہ سادہ زندگی بسر کرنا فاؤسٹ کی طبیعت کے خلاف ہے اسلئے وہ ماءاللحم یعنی عرق شباب پیتا ہے۔ اس کے بعد فاؤسٹ کو ایک آئینہ ملتا ہے جس میں ایک نہایت حسین عورت نظر آتی ہے۔ لیکن یہ درحقیقت خود فاؤسٹ کے حسن نسوانی کے معراج کا عکس ہے۔ اس

سین میں گوئٹے نے یہ دکھایا ہے کہ تمام کائنات میں ایک ابدی حسن کا جوہر کارفرما ہے جو مختلف طریقوں سے انسانوں کو اپنی پست مادی زندگی سے بلند روحانی حیات سرمدی کی طرف کھینچتا ہے۔ اسی کی جھلک عاشق صادق کو اپنی معشوقہ کے حسن میں نظر آتی ہے۔ اور اگر انسان کی زندگی شہوانی لذات میں پھنس کر نہ رہ جائے تو وہ بام حقیقت تک پہونچ سکتا ہے۔

آئندہ سین میں فاؤسٹ جوان نظر آتا ہے، اور ایک دوشیزہ لڑکی گریٹشین پر عاشق ہو جاتا ہے۔ شیطان کی کوشش سے عاشق ومعشوق کی ملاقات ہوتی ہے۔ شیطان گریٹشین کو دارو بے ہوشی دیتا ہے جسے وہ اپنی ماں کو پلا دیتی ہے جو بیہوش ہو جاتی ہے۔ اس طرح میدان خالی پا کر فاؤسٹ و گریٹشین شراب وصل کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ گریٹشین کی ماں اس دوا کے اثر سے مرجاتی ہے۔ گریٹشین کی لغزش اور اپنی ماں کی موت کا حال اُس کے بھائی والنٹین کو معلوم ہوتا ہے جو فوج کا ایک سیدھا سادہ سپاہی ہے اور عارضی لغزش اور بدچلنی میں فرق نہیں کر سکتا ہے۔ اس لئے اپنی بہن کو سزا دینے اور اُس کے عاشق سے انتقام لینے کی غرض سے وہ اپنے وطن کو روانہ ہوتا ہے۔ جب وہ مکان کے نزدیک پہونچتا ہے تو اُس کو فاؤسٹ اور شیطان کھڑے ہوئے ملتے ہیں۔ چنانچہ فاؤسٹ اور والنٹین میں لڑائی ہوتی ہے اور شیطان کی مدد سے والنٹین زخمی ہوتا ہے۔ تلواروں کی جھنکاروں کی آواز سنکر پڑوسی جمع ہو جاتے ہیں اور شیطان فاؤسٹ کو لیکر بھاگ جاتا ہے۔ گریٹشین بھی شور وغل سنکر آتی ہے اور اپنے بھائی کو زخمی دیکھکر حواس باختہ ہو جاتی ہے۔ والنٹین اس پر فرضی اور حقیقی بدچلنی کا الزام لگاتا ہے اور اسی حالت میں مرجاتا ہے۔ گریٹشین اپنی ماں اور بھائی کی موت کے رنج اور عاشق کی جدائی کے صدمہ اور بدنامی و رسوائی کے خوف سے پاگل ہو جاتی ہے۔ اسی حالت میں اُس کے لڑکا پیدا ہوتا ہے مگر وہ اسے تالاب میں غرق کر دیتی ہے۔ اس جرم کی علت میں وہ گرفتار ہو کر موت کے انتظار میں گھڑیاں گزارتی ہے۔

فاؤسٹ مفرور ہے اور ان واقعات کا اُس کو علم نہیں۔ شیطان اُس کو گریٹشین کی طرف سے بےخبر رکھنے کے لئے والپرگس کی رات کا جشن دکھانے کو لیجاتا ہے جس میں جادوگرنیاں اور چڑیلیں شریک ہوتی ہیں۔ یہاں وہ فاؤسٹ کو اپنے خاص حلقے میں جگہ دیتا ہے اور فاؤسٹ اس کے اثر میں آکر جادوگرنیوں کے مجنونانہ ناچ میں شریک ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک طرف تو اس کے ساتھ ناچنے والی چڑیل کے منہ سے ایک سرخ چوہیا نکلتی ہے جس سے فاؤسٹ کو کراہیت پیدا ہوتی ہے اور دوسری طرف اس کو گریٹشین کا پیکر خیالی نظر آتا ہے اور عشق صادق کے اثر سے شہوانی عشق کا بھوت اُس کے سر سے اُتر جاتا ہے۔ فاؤسٹ شیطان کو لعنت ملامت کرتا ہے اور گریٹشین کو دیکھنے کے لئے اس کے ساتھ روانہ ہو جاتا ہے

گریٹشین قید خانہ میں بیٹھی نظر آتی ہے۔ فاؤسٹ اُس سے چلنے کے لئے کہتا ہے مگر وہ شیطان سے قدرتی نفرت کرتی ہے اور چونکہ فاؤسٹ شیطان کا حلیف ہے اس لئے وہ اس کے ساتھ جانے سے صاف انکار کردیتی ہے۔ اور اس طرح اس کی روح شیطان کے قبضہ میں جانے سے بچ جاتی ہے۔ فاؤسٹ کے جانے کے بعد گریٹشین سزائے موت پاکر قیدِ ہستی سے رہا ہو جاتی ہے۔ فاؤسٹ اس کے فراق میں تڑپتا ہے۔ آئندہ سین میں وہ حسنِ فطرت کے نظارہ میں محو نظر آتا ہے لیکن اس پر بھی شیطان جو ذوق عمل اور آرزوے لذت کی روح ہے اس کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتا اور اُس کے دل میں قوت و اقتدار کا شوق اُبھارتا ہے اور اُسے لیکر شہنشاہ کے دربار میں پہونچتا ہے۔ شیطان کے مشورے سے وہ مالی مشکلات کو دور کرنے کے لئے کاغذ کا سکہ چلاتا ہے اور شہنشاہ کی تفریح طبع کے لئے سحر و نیرنجات کا تماشا دکھاتا ہے۔ شہنشاہ فاؤسٹ سے فرمایش کرتا ہے کہ وہ قدیم یونان کی حسینہ ہیلن کی روح کو بلوائے۔ فاؤسٹ شیطان سے طالبِ امداد ہوتا ہے جو اس کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ وہ خود ہیلن کی روح کو لانے کے لئے عالمِ مثال کو جائے۔ فاؤسٹ اُمہات کی مدد سے جو صور و اعیان کی تخلیق کرتی ہیں ہیلن کی روح کو اپنے ساتھ لے آتا ہے مگر شہنشاہ اور اس کے درباریوں پر حسن کامل کے نظارہ سے کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ اس کی قدر دانی سے قاصر ہیں لیکن فاؤسٹ دل و جان سے اس پر عاشق ہوتا ہے اور عالمِ بیخودی میں پیکر مثالی سے ہم آغوش ہونے کے لئے بڑھتا ہے۔ یکایک دھماکے کی آواز ہوتی ہے اور تمام روحیں غائب ہو جاتی ہیں اور فاؤسٹ بیہوش ہوکر گرجاتا ہے۔ شیطان اس کو اُٹھاکر اس کے مطالعہ کے کمرہ میں پہونچا دیتا ہے مگر فاؤسٹ انسانی پُتلے کی مدد کے بغیر ہیلن کا وصال حاصل نہیں کرسکتا۔ فاؤسٹ کا شاگرد واگنر جو ایک مشہور عالم ہے کیمیاوی ترکیب سے انسانی پتلا بنانے میں مشغول ہوتا ہے۔ اور شیطان اس کام میں اس کی مدد کرتا ہے۔ چنانچہ شیشہ کے اندر ایک انسانی پتلا پیدا ہوکر شیطان اور واگنر سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ شیطان اس شیشہ کو اُٹھاکر فاؤسٹ کے پاس لاتا ہے۔ جو ابتک بیہوش پڑا ہے۔ پُتلا اپنی مخفی بصیرت سے یہ معلوم کرلیتا ہے کہ فاؤسٹ یونان کا خواب دیکھ رہا ہے اور وہ شیطان کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ وہ فاؤسٹ کو اسی حالت میں یونان لے چلے۔ واگنر بھی اس کے ساتھ جانا چاہتا ہے مگر پتلا اس کو منع کردیتا ہے۔ یونان پہونچکر یہ تینوں کلاسکی والپرگس کے جلسہ میں شریک ہوتے ہیں جہاں قدماء یونان کی روحیں جمع ہیں۔ یہاں پہونچکر وہ پتلا ٹوٹ جاتا ہے۔ اس سین میں گوئٹے نے حکماء کے کلاموں پر بصیرت افروز تنقید کی ہے۔ فاؤسٹ یونان میں جرمن طرز کا قلعہ بناتا ہے جہاں شیطان ہیلن کو بہکا کرلے آتا ہے اور پھر فاؤسٹ اور ہیلن کی شادی ہو جاتی ہے جس سے اس کے

ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے، جو ایک دن جوانی کے جوش میں ہَوا پر اڑتا ہوا گم ہوجاتا ہے۔ اور ہَیلین بھی اس کے پیچھے چلی جاتی ہے۔ مگر دونوں کے لبادے فاؤسٹ کے پاس رہ جاتے ہیں۔ جن کو لیکر وہ شیطان کے ہمراہ جرمنی کو واپس ہوتا ہے۔ لیکن راہ میں سمندر کے کنارے ایک قطعہ زمین کو دیکھکر جس کو سمندر نے ناہموار کردیا ہے غصہ کا اظہار کرتا ہے اور سیلاب کو روکنے کے لئے پشتے بنواکر آبادی بسانا چاہتا ہے فاؤسٹ کی تجویز کامیاب ہوتی ہے اور یہ بستی فاؤسٹ کی حکومت کے لئے موجودہ تہذیب و تمدن کا نمونہ بنجاتی ہے۔ لیکن فاؤسٹ کا محل ایک بڈھے کے جھونپڑے کی وجہ سے جس کو وہ چھوڑنا نہیں چاہتا ناممکل رہتا ہے۔ شیطان اس جھونپڑے میں آگ لگادیتا ہے جس سے جل کر بڈھا مرجاتا ہے۔ فاؤسٹ اس نظارہ کو دیکھکر افسوس کرتا ہے۔ مگر اس کو ایک امر ضروری سمجھکر مطمئن ہوجاتا ہے۔ اسی وقت چار روحیں آتی ہیں۔ ان میں سے ایک یعنی تشویش کی روح اس کے چہرہ پر کچھ دم کرتی ہے جس سے وہ اندھا ہوجاتا ہے۔ شیطان فاؤسٹ کی قبر کھدواتا ہے، فاؤسٹ اُس کی آواز کو سنکر یہ سمجھتا ہے کہ پشتے باندھے جارہے ہیں لیکن اسی وقت اُس کی موت آجاتی ہے۔ شیطان اُس کی روح کو لینے کے لئے بڑھتا ہے لیکن یکایک فرشتوں کا ایک نورانی گروہ آکر فاؤسٹ کی روح کو لیجاتا ہے اور شیطان دیکھتا رہ جاتا ہے۔

نیند

لوگ شب کی سکون بخش خاموشی میں کیسے چین وراحت کی نیند سوتے ہیں۔ مگر آہ حرماں نصیبی! مجھے ساری رات جاگتے بسر ہوجاتی ہے اور کوشش و ہزار جانفشانی کے باوجود یہ نعمت ازلی حاصل نہیں ہوتی

زندگی کی ناکامیاں کیسی بلائے بے درماں ہیں جنھوں نے ہمیشہ کیلئے میری دلی راحت کا خاتمہ کردیا۔ اللہ! دنیا کی ہر چیز سکون اور خاموشی میں ڈوب رہی ہے ایک لمحہ کیلئے میرے بیچارے مضطرب دل کو بھی چین دے۔

ہاں نیند جو اس اور سکون کی سچی دنیا ہے، زخم جگر کی مرہم ہو، مغموم دلوں کو بھی تھوڑی دیر کے لئے ہر درد اور حس سے بیخبر بنادیتی ہے آ اور مجھے بھی نا اُمیدی اور یاس کے خونی تیروں کی بوچھار سے بچالے۔

تو مجھ سے میرے نرم نرم تکیہ لیجا، میرے بچھونے میرا خاموش اور تاریک کمرہ میرے پھولوں کے ہار ایک پریشان دماغ لیجا، مجھے کوئی پرواہ نہیں تو سب کچھ لے لے، اور مجھے ایک حقیقی سکون دیدے جس کی راحت بخش موجوں میں ....

میں سراپا ڈوب جاؤں۔"!!!

(عصمت)

ہندوؤں سے چند حل طلب سوالات

(از پروفیسر سری رام شرما ایم اے)

(۱)

ہندوؤں کی قدامت پسندی ایک مسلمہ بات ہوگئی ہے۔ ہندو رسم و رواج کی عام پیروی دیکھکر اکثر لوگوں کا خیال ہوگیا ہے کہ خواہ گردوپیش کے حالات میں کتنی ہی تبدیلی ہوجائے لیکن ہندو اپنے طور وطریق اور طرزعمل میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتے ہیں۔ اس خیال کی تائید میں بعض لوگ ہندوؤں میں چھوت چھات کے مسئلہ کو پیش کرتے ہیں، بعض بیاہ کی قیود کا ذکر کرنے لگتے ہیں، اور بعض مذہبی عقائد کی دشواری کو زیربحث لے آتے ہیں۔ بہرحال عام طور پر یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ ہندو اپنے طرزعمل میں کسی طرح کی تبدیلی کرنا گوارا نہیں کرسکتے لیکن ہندوؤں کے رسم و رواج کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے پر یہ خیال فوراً باطل ثابت ہوتا ہے۔ جو لوگ ہندوؤں کو قدامت پرست سمجھتے ہیں، وہ اس بات کو نظرانداز کردیتے ہیں کہ جو زمانہ دوسری قوموں اور مذاہب کے لئے صدیوں کے برابر ہے۔ ہندوؤں کی زندگی میں وہ ایک آدھ سال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ریفارمر سبھی تعجیل پسند ہوتے ہیں۔ اگر ہندوؤں نے اُن کے خیال کے بموجب تھوڑے عرصہ میں کوئی خاص بُری رسم ترک نہیں کی تو وہ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان میں تبدیلی کرنیکی صلاحیت ہی نہیں ہے لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ آخر مختلف مقامات کے ہندوؤں کے رسم و رواج میں فرق کی کیا وجہ ہے؟ ہندوؤں کی سمرتیوں اور دھرم شاستروں میں مختلف رسوم کے متعلق کیوں اختلاف ہے؟ اس کو بھی جانے دیجئے، ہمارے موجودہ رسم و رواج اور شاستروں کے مقرر کردہ طریقوں میں اس قدر کیوں تفاوت ہے؟ مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہندو ہرگز اُتنے قدامت پسند نہیں ہیں جتنے کہ عام طور پر مشہور ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ باوقات مختلف ہندوؤں میں مذہبی اصلاح کے حامیوں کے ساتھ ساتھ اُن کے رسم و رواج کا تعین کرنے والے روشن دماغ بھی وجود میں آتے رہے ہیں، مثلاً بدھ، کمارل، شنکر اور دیانندجی کے علاوہ ان میں یاگیہ ولکیہ، گوتم، پاراشر، منا کشر، کلوک جیسے واضعان قانون اور رسم و رواج کے قائم کرنے والے بھی ظہور میں آتے رہے ہیں۔ اگرچہ مؤخرالذکر لوگوں کے نام اس قدر مشہور

نہیں ہیں۔ لیکن اِن معززین نے بھی ہندوؤں کی ہستی قائم رکھنے میں قابل قدر حصہ لیا ہے۔ افسوس ہم میں سے اکثر ان محسنوں کے نام تک سے آشنا نہیں جنھوں نے ہندوستان کے تمدن کو صدیوں میں ترتیب دیا۔ جب یونانی ہن اور وسط ایشیا کی دوسری قومیں یہاں داخل ہو رہی تھیں۔ ہم آج اِن بزرگوں کے نام سے بھی نا واقف ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے حملہ کے بعد ہندوؤں کی ہستی بچانے کے لئے اُن کے رسم و رواج میں ضروری ترمیمیں کر کے نیست و نابود ہونے سے بچایا۔ افسوس ان بزرگوں کے احسانات کی قدر شناسی درکنار آج ہم انھیں کے تجویز کردہ نسخوں کو غلط استعمال کر رہے ہیں۔ جن سمرتی کاروں نے جاری شدہ بدعتوں پر بھی اپنے نام کی مہر لگا کر انھیں جائز رسم و رواج کا درجہ عطا کیا تھا۔ اُن کا کبھی بھی یہ مدعا نہ تھا کہ آنے والی نسلیں اپنے زمانے کے نئے سوالات کا حل اپنے طریقہ پر نہ ڈھونڈھیں۔

یہاں پر یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ ہندو شاستروں کے اختلافات کی تہ میں بھی ایک طرح کی یگانگت موجود ہے چنانچہ بعض اصولوں کی بنا پر مختلف زمانے کے بزرگوں نے رسم و رواج کے جائز و ناجائز ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن تبدیل شدہ حالات کے مطابق نئے رسم و رواج قائم کرنے میں کبھی دریغ نہیں کیا گیا بہر حال اب وقت ہے کہ ہم اپنے رسم و رواج پر نظر ثانی کریں۔ مختلف صوبوں کے رسم و رواج کا اختلاف امتداد زمانہ سے جدید مسائل کا پیدا ہونا لازمی امر ہے۔ قانونی مجالس کا رسم و رواج پر نظر ثانی کرنے کا حق رکھنا اور جدید ضروریات کی بنا پر تمام امور کا طے ہونا، یہ تمام باتیں جتا رہی ہیں کہ ہندوؤں کو اپنے رسم و رواج پر نظر ثانی کا پورا موقعہ ہے۔ مختلف سوشل کانفرنسوں میں ایسے کئی سوالات پر آئے دن غور و خوض ہوتا رہتا ہے۔ مختلف صوبوں کی قانونی کونسلوں اور اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ سب ان سوالات پر غور کر سکتی ہیں۔ آریہ سماج اور بعض دوسری سبھائیں رسم قبیحہ کے خلاف آواز بلند کرتی رہتی ہیں۔ غرض اس طرح رسم و رواج میں ترمیم کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ لیکن ابھی تک ان سوالات پر پورے طور سے اور خالص ہندوانہ نقطۂ نگاہ سے غور کرنا باقی ہے۔ آریہ سماج نے اس مد میں بڑا قابل قدر کام کیا ہے، لیکن آریہ سماج بھی ابھی تک ان تمام سوالات پر پوری توجہ نہیں دے سکا ہے۔ اور اس کے پیش کردہ حل کو بھی کچھ عرصے تک عام ہندو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں۔ ہندو مہا سبھا البتہ اس میدان میں ملک کی بہت بڑی خدمت انجام دے سکتی ہے۔

(۲)

اس وقت ہندوؤں کے سامنے مندرجہ ذیل اہم مسائل ہیں:۔

(۱) ذات پات

ہر ہندو کا عام یقین ہے کہ ذاتیں صرف چار یعنی برہمن۔ کشتری۔ ویش اور شودر ہیں۔ لیکن فی زمانہ ملک

میں جس چیز کو ذات کہا جاتا ہے وہ بڑی مشتبہ چیز ہے۔ اگر ہم جنم کو ذات کی بنیاد مان لیں تو پنجاب کے کھتری، ارد وڑے اور جاٹ، صوبجات متحدہ کے ایبر، اگروال اور بنیئے، دکن کے سارے غیر برہمن اس وقت عجیب حالت میں ہیں۔ درحقیقت فی زمانہ مختلف ذاتوں کی بظاہر کوئی تمیز باقی نہیں رہی ہے۔ اتنی جاتیاں پیدا ہو گئی ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہے کہ کون شخص کس ورن سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک ہی ورن کے لوگوں کی ایک شاخ اپنے کو برہمن کہتی ہے اور دوسری کشتری۔ راجپوتانہ کے کشتری پنجاب کے راجپوتوں سے کنارہ کش رہتے ہیں غرض ہر طرف عجیب بے ہنگامی نظر آتی ہے۔ اور اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہندوؤں کی سب چھوٹی بڑی ذاتیں لے کر اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیا جائے کہ اُن کو چاروں ورنوں میں کیونکر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۲) ذاتوں کا باہمی تعلق،

اس بات کا فیصلہ کرنا بھی ضروری ہے کہ مختلف ذاتوں کے لوگوں کا آپس میں کیسا برتاؤ ہونا چاہیئے فی زمانہ ایک کہار حلوائی کی دوکان سے شہر کے بڑے بڑے لوگ مٹھائی خریدتے ہیں، اور اگر ضرورت ہو تو اُسے ساتھ بٹھلانے کے لئے بھی تیار ہیں، لیکن اس کے دوسرے بھائی کو جو اپنا پیشہ کرتا ہے اچھوت کا درجہ دیا جاتا ہے۔ صوبجات متحدہ کی حالت اور بھی خراب ہے، وہاں آپس کے برتاؤ میں اتنی بندشیں ہیں کہ دیہات میں دورہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں میں سے مہمان نوازی کی عادت ہی گم ہو گئی ہے۔ بہرحال ضرورت ہے، کہ ہم اس بات کا باقاعدہ فیصلہ کر دیں کہ مختلف جاتیوں کا آپس میں کیا برتاؤ ہونا چاہیئے

(۳) تیوہار

ہمارے تیوہاروں پر روایات اور قدامت کا اس قدر رنگ چڑھا ہوا ہے کہ بعض اوقات بڑے بڑے پنڈت بھی اُن کے متعلق پوری معلومات نہیں رکھتے۔ مختلف صوبوں میں بعض مقامی تیوہار بھی ہیں، اگرچہ چند تیوہار ہندوستان بھر میں رائج ہیں لیکن عام ہندوؤں کو نہ تو اُن کے صحیح طور پر منانے کا طریقہ معلوم ہے اور نہ وہ اُن کی حقیقت سے آگاہ ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم اس بارے میں بھی کچھ فیصلہ کریں۔ یہاں پر میری مراد مذہبی رسوم میں مداخلت کرنے کی نہیں ہے بلکہ ان تیوہاروں سے مجلسی ضروریات کی بنا پر بھی بہت کچھ فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے،

(۴) سنسکار

ہندوؤں کے سنسکاروں کا بھی یہی حال ہے۔ اس مد میں بھی بڑی ابتری پھیلی ہوئی ہے، ہر فرقہ کے مراسم سنسکار جدا گانہ ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ بلحاظ قومیت تمام ہندو کیوں نہ سنسکاروں کی یکسانیت پر عمل کریں۔ سنسکاروں کی تعداد، ان کا وقت اور طریقے، سب میں ضرورت ہے کہ ہمارے عالم رہنما اور پنڈت اپنا فیصلہ دیکر اپنے

بھائیوں کو راستہ دکھائیں۔

(۵) چھوت چھات اور کھان پان۔

ہندوؤں کے درمیان آپس کی چھوت چھات کا مسئلہ تو پہلے اور دوسرے سوال کے ماتحت آجاتا ہے لیکن اس بات کا فیصلہ کرنا بھی ضروری ہے کہ ہندوؤں کا غیر مذاہب کے لوگوں سے کیا برتاؤ ہونا چاہئے آجکل عجیب حالت ہے۔ لوگ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ، اور کوئی بھی اپنے طریقۂ عمل کے متعلق پوری واقفیت نہیں بہم پہونچا سکتا۔ یہ سوال ملکی لحاظ سے بہت اہم ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اس سوال پر بھی دور اندیشانہ نگاہ سے غور کیا جائے اور موجودہ حالات کا مطالعہ کرکے سب کے لئے ایک تسلی بخش حل سوچا جائے۔

(۶) سادھو

ہمارے ہاں سادھوؤں کی تعداد بھی بہت کثیر ہے، کیا ہم کو یہ تعداد رقائم رکھنے کی ضرورت ہے؟ اس وقت یہ جماعت بالکل بیکار ہے۔ اور یہ سوچنے کی بات ہے کہ وہ کس طرح اپنا اور دوسروں کا کلیان کر سکتے ہیں

(۷) مندر

یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے کہ کیا واقعی ہمارے بیشمار مندروں سے وہ مطلب پورا ہو رہا ہے جس کے لئے وہ بنائے گئے تھے۔ اگر نہیں تو اس مطلب کو پورا کرنے کے لئے کیا ذرائع اختیار کرنے چاہئیں کیا ان سے ہم مجلسی یگانگت قائم کرنے میں کچھ مدد لے سکتے ہیں؟ کیا ان کے ذریعہ سے ہندوؤں کی جہالت دور کرنے کا کام ہو سکتا ہے؟ یہ بھی غور طلب ہے کہ ہندو دھرم کی صحیح واقفیت پھیلانے میں یہ کیا حصہ لے رہے ہیں؟ انکا انتظام کس طرح ہونا چاہیئے؟ ان سوالات کا جواب سوچنا لازمی ہے۔

(۳)

ان کے علاوہ اور بھی کئی سوالات ہیں جن کی عقدہ کشائی بہت مشکل ہے لیکن جن کے گورکھ دھندے سے آزاد ہونا بھی ضروری ہے۔ مشکل یہ ہے کہ دنیا ہماری مشکلات کا کوئی لحاظ نہیں کرتی ہے۔ ہم خواہ سوراجیہ جیسی نعمت حاصل کرنے کے لئے کوشش کر رہے ہوں یا چپ چاپ دھرم کے پرچار میں مشغول ہوں بعض اوقات یک لخت ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جو کسی ایک سوال کو بڑی اہمیت دیدیتے ہیں۔ اور ہمیں یا ہمارے رہناؤں کو اُس کا حل ڈھونڈھنا پڑتا ہے۔ لیکن اس وقت اس میں غیر معمولی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خیال رہے کہ دوسرے لوگ بھی ان سوالات کا حل اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے حل کرنے میں مصروف ہیں۔ مشنری لوگ اپنے کتابوں کے ذریعے سے ہمارے چھوت چھات کے مسئلہ کا حل پیش کر رہے ہیں، کہیں ملکی رہنما موقعہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے برہمن اور غیر برہمن کے مسئلہ کو مٹانے کی کوشش

کر رہے ہیں سب سے بڑھکر کونسلیں ہاتھوں میں قانونی ہتھیار لئے اور عدالتیں ہرجانہ کی ڈگریاں لئے سوالات کا حل سنا رہی ہیں۔ اس لئے ہم کو بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے۔ ان جملہ مسائل کا حل جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے ہندو مہاسبھا خوب کر سکتی ہے۔ لیکن یہ کام ایک یا دو دن کے کرنے کا نہیں ہے۔ اس کا حل سوچنے کے لئے ایک مستقل کمیٹی کی ضرورت ہے، جو مختلف سوالات پر ہر ایک پہلو سے غور کر کے موجودہ ضروریات کے مطابق حل کر سکے جس طرح سے ہندوؤں کو ایک نظام میں لانے کے سوال پر اس وقت غور ہو رہا ہے وہ امید دلاتا ہے کہ ان سوالات کا کماحقہٗ فیصلہ سوچنے میں دیر نہ کی جائیگی۔

میرا وطن

مَیں اپنے وطن کی مٹی کے ایک ذرہ پر ساری کائنات نثار کر دوں، میرا وطن ہزار جنتوں سے بڑھ کر ہے۔

ہمالیہ اسکی عظمت کا گواہ ہے، گنگا اور جمنا کی لہریں اس کی تقدیس کے راگ گاتی ہیں۔

تاریخ اس کی شان و شوکت کا بیان کرنے سے عاجز ہے۔ میرا وطن وہ ہے جس کی مٹی کے ایک ایک ذرہ پر ساری کائنات نثار کی جا سکتی ہے۔

قدرت اپنے زندگی بخش ہاتھوں سے جس کی آرایش کرتی ہے، جہاں سب موسم باری باری سے آ کر اپنے روح پرور جلوے دکھاتے ہیں، جو زندوں کو نہیں بیجان چیزوں کو بھی پیارا ہے۔ جو ہزاروں جنتوں سے بڑھکر ہے وہی میرا وطن ہے۔

جس کی لافانی کہانیاں یادداشت کے پرانے پتھروں پر کندہ ہیں، جس نے لاکھوں بہادر اور تارک الدنیا پیدا کئے، جس کے آسمان پر چاند سورج نے سب سے پہلے روشنی کی وہی میرا وطن ہے۔

جس کو اپنی زبان کا ہمیشہ پاس رہا ہے، جس نے سونے کی لنکا فتح کر کے لنکا کے ایک بیٹے کے حوالے کر دی، جس کا جھنڈا اونچا لہرایا ہے، وہی میرا وطن ہے۔

تحفۃ المجاہدین

اور اُس کا مُصنّف

(از سید احمد اللہ قادری ایڈیٹر ”تاریخ“ حیدر آباد دکن)

تحفۃ المجاہدین ملیبار کے مسلمانوں کی سب سے پہلی اور سب سے آخری مشہور و معروف عربی تاریخ ہے۔ اس میں پرتگیزوں کے حملوں اور اُن کے مظالم کو بیان کیا ہے۔ یہ اس قدر مستند ہے کہ فرشتہ جیسے محقق نے اس سے اپنی تاریخ کا گیارھواں مقالہ اخذ کیا تھا۔

تحفۃ المجاہدین کے مصنف حضرت شیخ زین الدین معبری ہیں، ان کے جدِ اعلیٰ علی بن احمد المعبری تھے۔ یہ معبر کے رہنے والے اور وہاں کے مشاہیر عظام سے تھے۔ اس خاندان میں یہ سب سے پہلے بزرگ ہوئے ہیں جنھوں نے معبر سے نقل مکان کر کے کوشن (کوچین) کو اپنا دار القیام قرار دیا لیکن چند سال بعد اُنھوں نے یہاں کی بھی سکونت چھوڑ دی اور فونان میں جا کر بس گئے۔ ان کو اپنی زندگی میں فونان میں بہت بڑا مرتبہ حاصل ہو گیا تھا اور وہاں ”مخادیم فونانیہ“ کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔

ان کے اہل خاندان بھی علم و فضل اور زہد و اتقا میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اس خاندان کے چند افراد نے ایک مدرسہ اور خانقاہ بھی تعمیر کی تھی، مگر ان کا مدرسہ ایک عرصہ تک اسلامی علوم و فنون کی احیا کا بہت بڑا مرکز بنا ہوا تھا۔

پرتگالیوں سے قبل ملیبار میں عرب و عجم کی کثیر جماعتیں آیا کرتی تھیں مگر وہ سب کی سب اسی خانقاہ میں فروکش ہوتی تھیں اور یہ مدرسہ بھی اس زمانہ میں ایک جامعہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس میں عربی کے تمام شعبوں کی تعلیم ہوتی تھی۔ اس کی شہرت اور اہمیت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب امام الاساتذہ حضرت شیخ شہاب الدین ابن حجر المکی (ولادت سنہ ۹۰۹ھ / ۱۵۰۳ء وفات سنہ ۹۷۴ھ / ۱۵۶۶ء) ملیبار میں رونق افروز ہوئے تو ابتدا میں آپ نے اسی خانقاہ میں قیام فرمایا اور جب تک یہاں تشریف فرما رہے اس وقت

تک آپ کا یہ دستور تھا کہ روزانہ مدرسہ میں قدم رنجہ فرما کر تفسیر وحدیث کا درس دیا کرتے۔

شیخ علی (ابن احمد المعبری) کے فرزند شیخ زین الدین ابو یحیلی (المتولد ۱۳ شعبان ۹۰۳ھ/۱۴۹۸ء) بھی بڑے عالم وفاضل بزرگ اور اپنے عصر کے امام حدیث مانے جاتے تھے، آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، ان میں سے چند کتابوں کے نام یہ ہیں:۔

(۱) تحفۃ الاحیار اوقات پیغمبرؐ میں

(۲) مرشد الطلاب تصوف

(۳) سراج القلوب تصوف

(۴) شمس الہدیٰ

(۵) ارشاد القاصدین امام غزالی کی کتاب منہاج العابدین کا اختصار

(۶) شعب الایمان علامہ سید نور الدین کی تصنیف شعب الایمان فارسی کا عربی ترجمہ

(۷) کتاب الصفا من الشفا۔ قاضی عباس کی الشفا، کا اختصار

(۸) تسہیل الکافیہ کافیہ از ابن حاجب کی شرح۔

(۹) کفایۃ الفرائض کتاب الکافی فی الفرائض از صبروفی کا مختصر

(۱۰) حاشیہ الفیہ ابن مالک

(۱۱) حاشیہ تحفہ ابن الوردی

(۱۲) حاشیہ ارشاد ابن المقری

آپ نے ایک کتاب قصص میں بھی لکھی ہے، اس میں حضرت آدم سے حضرت داؤد تک مشہور انبیا کے حالات ہیں۔

سیرۃ النبی پر ایک کتاب تالیف فرما رہے تھے لیکن افسوس کہ کتاب ختم ہونے سے پہلے آپ کا چراغ زندگی گل ہوگیا۔

آپ عربی کے شاعر بھی تھے آپ کی منظومات میں تین قصائد بہت مشہور ہیں۔

(۱) ہدایۃ الاذکیا الی طریق الاولیاء تصوف

(۲) ارجوزہ تصوف۔

(۳) تحریض اہل الایمان علی جہاد عبدۃ الصلبان۔ اس میں جہاد کے محاسن بیان کیے گئے ہیں اور پرتگیزوں کے خلاف جہاد کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔

پہلا قصیدہ عرب وعجم میں بھی پسند کیا گیا ہے اس کی قبولیت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ میں اس کی شرح ہوئی ہے۔ اس کا نام "کفایۃ الاتقیا فی منہاج الاصفیا" ہے۔ اسے شیخ عارف باللہ سید ابوبکر بن سید محمد شطا الدمیاطی نے کیا ہے۔ یہ ۱۳۰۲ھ میں مصر میں طبع ہو چکی ہے۔ اس کی ایک اور شرح جاوہ میں بھی ہوئی تھی جس کا نام "سالم الفضلا" ہے۔ اس کے مصنف محمد نووی الجاوی ہیں یہ ۱۳۰۱ھ میں بمقام قاہرہ چھپی ہے۔ اس کے علاوہ اور دو شرحیں خود شیخ کے فرزند شیخ عبدالعزیز نے بھی کی ہیں، ایک طویل اور ایک مختصر۔

پہلی شرح یکم محرم ۹۹۳ھ کو فنان میں لکھی گئی اس کا نام مسلک الاتقیا ہے، یہ ۱۲۹۲ھ میں بولاق میں چھپی ہے۔

دوسری شرح کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے۔

شیخ عبدالعزیز کے فرزند شیخ زین الدین معبری ہیں، آپ ہی نے تحفۃ المجاہدین لکھی تھی۔ آپ کا سنہ ولادت کسی مقامی تاریخ سے معلوم نہیں ہوا البتہ تاریخ وفات کا علم ہوا، انھوں نے ۹۹۱ھ میں بمقام فونان انتقال فرمایا۔ ان کے زمانہ میں ابن حجرؒ ملیبار تشریف لائے تھے شیخ زین الدین کو ان سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ اور یہ شیخ کے ارشد تلامذہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں ابتک دو کتابیں دستیاب ہوئی ہیں

(۱) فتح المعین (۲) تحفۃ المجاہدین۔

فتح المعین شیخ عبداللہ الشنشوری خطیب جامع ازہر کی مشہور تصنیف قرۃ العین فی مہمات الدین کی شرح اور اس کے بعض مشکل مطالب کا حل ہے، اسے شیخ زین الدین نے ۹۸۳ھ میں تمام کیا ہے۔ اس پر متعدد علما نے حاشیے تحریر فرمائے ہیں جن میں سید احمد علوی سقاف اور شیخ عارف باللہ سید ابی بکر کا حاشیہ زیادہ مشہور ہے۔

پہلے حاشیہ کا نام ترشیح المستفیدین علی فتح المعین ہے جو ۱۲۹۵ھ میں تمام ہوا ہے۔

دوسرا حاشیہ اعانۃ الطالبین علی حل الفاظ فتح المعین کے نام سے موسوم ہے۔ یہ ۲۳ شوال ۱۳۰۰ھ کو بمقام مکہ معظمہ لکھا گیا تھا۔ اور مصر میں چھپ بھی گیا ہے۔

تحفۃ المجاہدین ابتدا ظہور اسلام سے شروع ہوئی ہے، اس میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی تعلقات کو اس طرح دکھایا ہے کہ اس زمانہ کی معاشرت کا نقشہ نظر کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔

۹۰۴ھ سے اس وقت سے جبکہ پرتگیزوں نے ملیبار پر تاخت وتاز شروع کی کتاب کا آغاز کیا ہے، اور ۹۹۱ھ تک کے حالات نہایت وثوق اور صراحت سے بیان فرمائے ہیں۔ اس کا بہت بڑا حصہ مصنف

کے چشم دید واقعات پر مبنی ہے اس لئے یہ بہت قابل قدر ہے، اس میں اکثر واقعات ایسے بھی ہیں جن سے خود مصنف کو بھی واسطہ رہا ہوگا۔

کتاب کے شروع میں ایک باب خاص طور سے جہاد پر لکھا گیا ہے، اس میں بتایا ہے کہ جہاد مسلمانوں پر فرض اور ان کی زندگی کا اہم ترین جز ہے۔ اس پر عمل کئے بغیر وہ دنیا میں کبھی کامیاب نہیں رہ سکتے۔

تحفۃ المجاہدین اکبر کے زمانہ کی یادگار ہے یہ وہ زمانہ ہے کہ دکن پر پانچ مختلف بادشاہ حکمران ہیں۔ ۹۸۵ھ کے ضمن میں خود اس کے مصنف نے اکبر کا سرسری طور پر حال لکھا ہے اور دعا کی ہے کہ اللہ اکبر کو ہدایت دے کہ وہ پرتگیزوں کو اپنے حدود سے نکال دے لیکن مقام حسرت ہے کہ شیخ کی یہ التجا مستجاب نہیں ہوئی بلکہ یہ آرزو کتاب ہی کے اوراق میں بند رہ گئی۔

شیخ ابتدا ہی سے بڑا احساس اور دردمند دل لیکر آئے تھے، انھوں نے کتاب کے ہر صفحہ پر مسلمانوں کی تباہی اور ان کی بے بسی کا دکھڑا رو دیا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ تمام مسلمان ان کے ماتم میں شریک ہوں اور وہ پرتگالیوں سے اپنے بھائیوں کے خون کا اچھی طرح بدلہ لیں۔

غالباً اسی بنا پر تحفۃ المجاہدین کا دیباچہ بیجاپور کے مشہور و باہنر فرماں روا سلطان علی عادل شاہ اول (۹۶۵ھ / ۱۵۵۵ء — ۹۸۷ھ / ۱۵۷۹ء) کے نام پر لکھا گیا تھا لیکن کتاب ختم ہونے سے تین سال قبل خود بادشاہ کا (۹۸۷ھ میں) انتقال ہوگیا۔

تحفۃ المجاہدین یورپ میں بہت مشہور و مقبول ہوئی ہے اس کے ترجمے انگریزی اور پرتگیزی زبانوں میں بھی ہوئے ہیں۔ انگریزی ترجمہ میجر رولینڈسن (J. Rowlandson) نے کیا ہے جو ۱۸۳۳ء میں لندن میں چھپ گیا ہے۔ پرتگیزی ترجمہ ۱۸۹۸ء میں لزبن میں شائع ہوا ہے جسے پروفیسر ڈیوڈ لوپز (D. Lopes) نے کیا تھا، یہ ترجمہ صرف پرتگیزوں پر ہے، باقی اذکار مترجم نے نظر انداز کر دیے ہیں۔

تاریخ فرشتہ کا گیارھواں مقالہ جو حکمرانانِ ملیبار پر ہے، وہ تحفۃ المجاہدین کا ناقص خلاصہ ہے، اسی نامکمل حصہ کو انڈرسن (Ander Son.) نے چند حواشی کے ساتھ ترجمہ کر کے تذکرہ ملیبار کے نام سے ۱۸۵۶ء میں ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں شائع کرایا۔

تاریخ فرشتہ کا انگریزی ترجمہ جسے برگس (J. Briggs) نے کیا تھا۔ اس میں بھی یہ حصہ موجود ہے فرشتہ کے جو ترجمے نولکشور کانپور اور جامعہ عثمانیہ کی جانب سے شائع ہوئے ہیں ان میں بھی یہ پایا جاتا ہے

تحفۃ المجاہدین کا اصل عربی متن عرصہ سے بہت نایاب ہے اور بہت کم اصحاب اس کی حقیقت سے واقف ہونگے۔ ۱۹۲۷ء میں جناب مولوی حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی

شرکت کے سلسلہ میں مدراس کا سفر فرمایا تھا۔ اس موقع پر ان کو تحفۃ المجاہدین کا ایک مخطوطہ مل گیا، اسی دوران میں معلوم ہوا ملیبار کے کسی خانگی کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ اور موجود ہے۔ انھوں نے اپنا مخطوطہ ملیبار بھیجکر اس سے اپنے مخطوطہ کا مقابلہ اور تصحیح کرائی۔ جب یہ منزل بھی ختم ہوگئی تو اپنے دوست خان بہادر مولوی ضیاءالدین صاحب کو (جو مدرسہ باقیات الصالحات ویلور کے چانسلر ہیں) نظر ثانی کے لئے دیا اس کے بعد اپنے ایک محققانہ مقدمہ کے ساتھ اصل کتاب شائع فرمادی۔ اس طرح سے علم دوست طبقہ کی ایک دیرینہ آرزو حکیم صاحب کے ہاتھوں پوری ہوئی۔

حکیم صاحب نے اس کا اُردو میں بھی ترجمہ کیا ہے جس میں آپ نے بہت سے حاشیے اور تعلیقات بھی تحریر فرمائے ہیں۔ یہ حصہ ان کے مشہور رسالہ "تاریخ" میں بالاقساط (جلد ۲ نمبر ۵-۶-۷ جلد ۳ نمبر ۹) شائع ہوچکا ہے۔ اور عنقریب کتابی شکل میں شائع ہونے والا ہے

مشہور مورخ اور اخبار الاندلس کے مترجم مولوی خلیل الرحمٰن صاحب نے اکتوبر ۱۹۳۲ء کے رسالہ "ہندستانی" میں تحفۃ المجاہدین کے اس ایڈیشن پر تبصرہ تحریر فرمایا ہے۔ اور کتاب کے خصوصیات اور اہمیت جتاتے ہوے لکھا کہ ظفرالوالہ کے مصنف نے اکثر معلومات تحفۃ المجاہدین سے اخذ کی ہیں اور بہت کچھ اسی پر انحصار کیا ہے لیکن واقعہ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ ظفرالوالہ کے مصنف نے تحفۃ المجاہدین اور اس کے مصنف کا "ظفرالوالہ" میں کسی جگہ حوالہ نہیں دیا اور نہ اس کے مصنف کا ذکر کیا ہے۔

مولانا کو حکیم صاحب موصوف کی اس عبارت سے اتفاق نہیں ہے۔

۱۷۔ شعبان ۹۲۸ھ کو مصنف کے جد اعلیٰ شیخ زین الدین ابو یحییٰ بن علی نے وفات پائی

واقعہ ایسا ہے کہ تحفۃ المجاہدین کے مصنف اور ان کے جد دونوں کے نام ایک ہی ہیں، غالباً اس اسمی توارد کے باعث تبصرہ نگار کو مغالطہ ہوا اور انھوں نے سہواً جد کو اصل مصنف خیال فرمایا۔

تحفۃ المجاہدین کی تاریخ تصنیف ۹۹۴ھ ہے لیکن مولانا خلیل الرحمٰن نے ۹۹۲ھ بتائی ہے حکیم صاحب نے ۹۹۴ھ لکھی ہے اور یہی صحیح ہے۔ اس کے لئے کتاب کا اصل متن دیکھا جائے۔ اس سے واضح ہوگا کہ ۹۹۰ھ یا ۹۹۱ھ میں پرتگالیوں نے ملیبار کی رعایا پر سختی شروع کی، دوسرے سال (یعنی ۹۹۳ھ میں) ملیبار کے سامری نے اہل پرتگال سے مصالحت کی اور (اس کے بعد) نئے سال (یعنی ۹۹۴ھ کے آغاز میں) پرتگیزوں کے نو وارد ... دار اور سامری کے مابین پیمانِ مصالحت ہوا اس سے خود واضح ہوتا ہے کہ تحفۃ المجاہدین ۹۹۴ھ کی تصنیف ہے۔

رام دُلارے کی جیت

از مسٹر علی عباس حسینی، ایم - اے۔

چھیدی پور کی اہیر ٹولی سے جو ملا ہوا آموں کا باغ ہے اُس میں بڑی چہل پہل تھی۔ نوہتیا اہیر کے ہاں رام گڈھ سے جو برات آئی تھی اسی میں اُتاری گئی تھی، متعدد چولھے روشن تھے، بڑی بڑی کڑھائیاں چڑھی تھیں، پوریاں "چھن رہی تھیں" ترکاریاں "بنائی" جا رہی تھیں۔ براتیوں کے سامنے کیلے کے پتے اور بڑے بڑے "پتر" رکھے تھے، جناتی گرم گرم پوریاں اور "بھاجی" ہر ایک کے سامنے "پرس" رہے تھے نوجوان براتیوں میں "لاگ ڈانٹ" تھی کہ دیکھیں کون سب سے زیادہ کھاتا ہے۔ جناتیوں نے بھی پوری پر پوری پیش کرنا شروع کر دی، کسی نے آدھ سیر کسی نے تین پاؤ، کسی نے سیر بھر پوریاں کھائیں، مگر رام دلارے کا پیٹ تھا کہ مٹکا، کسی طرح بھرتا ہی نہ تھا، وہ ایک "بیٹھک" میں ڈیڑھ سیر پوریاں "چڑھا گیا"۔ پھر جب ہارنے والے مقابل نے کہا کہ اس کی سند نہیں، پوریاں گھی میں تر تھیں، مزے کی تھیں، گرم گرم اور نرم نرم تھیں "تان کے کھا گئے" "روٹی کھاؤ تو البتہ جانیں مرد ہو" اس نے لڑکی والوں سے دو سیر آٹا، آدھ سیر دال اور پچیس تیس اُپلے منگائے، دال ایک ہانڈی میں چڑھا دی، آٹا کیلے کے پتے پر اپنے ہاتھ سے گوندھ ڈالا، اور اُپلوں کو مربع صورت میں ایک کے اوپر ایک "سریا کے" رکھا اور اُن میں آگ دکھا دی، جب اُپلے جل کے لہکتے ہوئے کوئلوں کی مانند ہو گئے تو اُس نے گُندھے ہوئے آٹے کی دس بارہ "بھوریاں" بنائیں اور انھیں اُس آگ میں ڈال کے ڈھک دیا۔ تھوڑی دیر بعد جب دال اور بھوریاں تیار ہو گئیں تو وہ چار زانو بیٹھ کے نہایت ہی اطمینان سے انھیں بھی اُڑا گیا۔ مقابل نے کان پکڑ کے کہا "بابا میں ہارا، تم آدمی نہیں راکشش ہو!"

جناتیوں نے طعنہ دیا، بہت سا کھا لینا بڑی بات نہیں، ہمارے ہاں بھینسیں ناند کی ناند صاف کر جاتی ہیں، کوئی "گن" ہو تو بات ہے۔ رام دلارے ہنس کے "برہا" گانے بیٹھ گیا۔ اب جناتیوں کی طرف سے

نوٹ: "مقامی رنگ" پیدا کرنے کے لئے اس فسانے میں بنارس کمشنری کے دیہاتیوں کی زبان لکھی گئی ہے۔

باقاعدہ مقابلہ شروع کردیا گیا جب یہ ایک برہا گا چکتا۔ وہ جواباً دوسرا گاتے، جیسے ہی وہ خاموش ہوتے یہ تیسرا شروع کردیتا۔ غرض یوں ہی سوال وجواب کا سلسلہ گھنٹوں جاری رہا۔ مگر ان میں اور رام دلارے میں فرق یہ تھا کہ وہ سنی سنائی چیزیں گاتے تھے اور یہ خوش الحانی یہ کہتا اور گاتا جاتا تھا۔ کئی کئی آدمیوں نے مل مل کے مقابلہ کیا، مگر اپنے بل بوتے پر کھڑا ہونے والا دوسروں کے سہارے پر بھروسا کرنے والوں کو ہمیشہ مار گراتا ہے۔ اس لئے رام دلارے کے آگے ایک کی بھی نہ چلی اور سب کے سب سیلی ہوئی آتشبازی کی طرح پھس پھسا کے رہ گئے۔

جناتیوں نے جب یہ دیکھا کہ برہے میں جیتنا محال ہے تو مقابلہ کا رُخ بدل دیا۔ "سُرکی" چھیڑ دی، یہ بلا کی چیز ہے، اس کا نہ اور ہے نہ چھور! "مہا بھارت ورامائن کے زمانہ سے قصہ شروع ہوتا ہے اور انتہا ہوتی ہے آج کل کے زمانے پر۔ جتنے قصے اور فسانے دیہاتوں میں بھولے بھٹکے یاد رہ گئے ہیں وہ سب اس میں شامل ہیں اور سب کی تان امیروں کی تعریف پر ٹوٹتی ہے۔ اس کا سلسلہ ہفتوں جاری رہ سکتا ہے، اس لئے جب جناتیوں نے "سُرکی" چھیڑی تو رام دلارے مسکرانے لگا، وہ جانتا تھا کہ حریف نے "برہے" میں شکست کھانے کے بعد "باقاعدہ پسپائی" کے لئے یہ صورت نکالی ہے۔ وہ خاموش تو ہوگیا مگر موقع بموقع اپنے وار سے باز نہ آیا، جہاں مقابل چوکا یا کوئی "کڑی" بھول کے اٹکا اس نے فوراً تصحیح کردی یا لقمہ دیدیا۔ غرض "سُرکی" میں بھی جیت کا سہرا اسی کے سر رہا اور جناتی کئی محاذ پر شکست کھانے کی وجہ سے جھلّانے لگے۔

جب دولھا کے باپ نے دیکھا کہ جناتیوں کے تیور اچھے نہیں ہیں اور رنگ میں بھنگ ہونے والا ہے، تو اُس نے اپنے ہفتاد سالہ تجربے سے کام لیا اور اپنے ساتھی نوجوانوں کو سمجھایا کہ رات زیادہ آئی، تھوڑی دیر سب لوگ سو رہیں، پھر صبح مقابلہ ہو رہیگا۔ بارے سب نے مان لیا، چلمیں بھری گئیں، اکڑوں بیٹھ کے، ہاتھ کا چونگا بنا کے، اور اُس میں چلم رکھ کے سب نے دو دو چار چار لمبے لمبے "کش مارے" اور وہیں درختوں کے نیچے، تاروں کی چھاؤں میں "انگوچھا بچھا بچھا کے لمبی تانی"۔ جاگا ہوا فتنہ یوں تھوڑی دیر کے لئے سو گیا۔

صبح سویرے ہی گاؤں میں شب کے مقابلے اور گاؤں والوں کی شکست کی خبر گرمیوں کی آگ کی طرح پھیل گئی، ہر شخص چاہے ہو یا پاسی، شیخ ہو یا برہمن، پرجا ہو یا زمیندار، اپنی اپنی جگہ بل کھانے لگا۔ گاؤں کی عزت کا ہر ایک کو خیال تھا، یہ ناک کٹنے والی بات ہی تھی کہ چار کوس سے برات آئے اور چھیدی پور والوں کو ہر بات میں ہرا کے چلی جائے۔ رام دلارے کھانے میں بھی جیتے اور گانے میں بھی۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا۔

مبھگ ہنسائی نہیں سہی جاتی تھی۔ اسی لئے اس "سورما" کو نیچا دکھانے اور اپنے ہاں کے اہیروں کا دل بڑھانے کے لئے ہر فرقے اور پیشے کا آدمی باغ میں آکے جمع ہوگیا۔

وہاں وقتی اکھاڑہ کھودا گیا تھا، جناتی اور براتی مل جل کے ورزش کرنے والے تھے، کوئی لنگوٹ کس رہا تھا، کوئی جانگھیا پہن رہا تھا، کسی نے ایک معمولی سی چیٹ سے ستر پوشی کرلی، اور کسی نے لنگی ہی کا "کاچھا" باندھ لیا۔ جوان ڈنڈ، بیٹھک، سپاٹے میں مشغول ہوئے، لونڈے اپنی کسرت کے کرتب دکھانے لگے۔ ان میں سے کوئی چند قدم دوڑ کے آتا اور بڑی پھرتی سے ہاتھوں پر ٹیک لگا کے ایک ساتھ کئی کئی قلابازیاں اس صفائی سے کھاتا کہ سوائے ہتھیلیوں اور پنجوں کے کوئی حصہ جسم خاک سے مس نہ ہوتا۔ کوئی دوڑ کے زمین سے ڈیڑھ دو گز بلند اُچکتا اور ہوا میں گرہ لگاتا۔ کوئی لاٹھی کے سہارے بہت لمبا اور بلند پھاندتا اور کوئی "جھٹھرا" ایسے صحیح نشانے سے پھینکتا کہ درخت کی جون سی پتی تاکتا وہی لوٹ کے زمین پر گرتی اور دوسروں پر "رپ" تک نہ آتا۔

رام دُلارے بھی انگڑائی لیتا ہوا اُٹھا اور لنگوٹ باندھ کے اکھاڑے میں اُتر گیا۔ پہلے اُس نے شانوں اور گردنوں پر مٹی لگائی، پھر ڈنڈ کرنے شروع کئے۔ جب اُن کی تعداد دو ڈھائی سو سے زائد ہوچکی تو وہ بیٹھک اور سپاٹا لگانے لگا، جب اُن کے اعداد بھی ڈنڈ کے قریب قریب پہنچ گئے تو وہ مگدروں کی اس جوڑی کی طرف متوجہ ہوا، جسے چھیدی پور میں دو ہی ایک آدمی اُٹھا سکتے تھے اور جو محض قوت کی آزمائش ہی کے لئے بنوائی گئی تھیں۔ رام دلارے اس جوڑی کو آدھ گھنٹے تک طرح طرح سے ہلاتا رہا، پھر براتیوں کے اصرار سے اس نے دس بارہ نوجوانوں کو زور کرایا اور اکھاڑے میں قدم گاڑ کے مبارز طلب نگاہوں سے جناتیوں کو دیکھنے لگا چھیدی پور والوں میں سے دو تین جوان جنہیں اپنے ورزشی جسم اور داؤ پیچ پر گھمنڈ ملتا تھا مقابلے کے لئے اکھاڑے میں اُترنے کا قصد رکھتے تھے، مگر رام دُلارے کی ورزش اور قوت کا حال دیکھ کے خاموش ہو رہے۔

رام دُلارے اور اُس کے ساتھی جب اکھاڑے سے نکلے تو جناتیوں نے تازہ تازہ دودھ سے بھری ہوئی بالٹیاں اور ایک جھوا بھر بھیگا ہوا چنا لا کے رکھ دیا۔ ہر ایک چنا "چابنے" لگا۔ رام دُلارے بھی ٹہل ٹہل کے جسم سکھاتا اور چنا کھاتا رہا۔ جب جسم خشک ہوگیا تو وہ ایک پوری بالٹی دودھ پی گیا، اور کپڑے پہن کے ایک درخت کے تنے سے سہارا لگا کے زمین پر بیٹھ گیا اور لڑکوں کی اُچک پھاند دیکھنے لگا۔

مگر اہیروں کی برات میں اُن کا ہیرو نچلا نہیں بیٹھ سکتا، یہ بات نہ لڑکے والوں کو بھاتی ہے اور نہ تماشائیوں کو۔ براتیوں کو یہ کد ہوتی ہے کہ جناتی کسی بات میں نہ جیتنے پائیں، جناتیوں کو یہ خیال رہتا ہے کہ ان کو کسی نہ کسی مقابلے میں تو ہرانا ہی چاہئے۔ اس لئے اس موقع پر بھی اب اصرار شروع ہوا کہ ناچ میں مقابلہ ہونا چاہئے۔ رام دلارے

اِس فن میں بھی براتیوں کی نظر میں یگانۂ روزگار تھا، اب اس سے بہتر موقع اس "کرتب" کے دکھانے کا اور کیا ہو سکتا تھا۔ قریب قریب گاؤں بھر جمع تھا "سب اِس بیر کے گُن دیکھنے آئے تھے"۔ بھلا یہ وقت خاموشی کا تھا؟ رام دلارے با وجود شدید اصرار کے پہلے تو ٹالتا رہا مگر جب اہیر ٹولی سے اہیرنوں نے اپنے گھروں کے سامنے کھڑے ہو کے طعنے دینا شروع کئے اور دو ایک ناچنے تھرکنے بھی لگیں تو اُسے بھی جوش آگیا اور وہ اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ پھر بھی ابتدا اس نے بھجن والے برہے سے کی۔

رام رام کی بھجن کرو۔ رام پر دھرو دھیان
محرم ہوئے وہی پہچانے۔ ایسا دیس ہمارا ہے
جہاں جہاں جائے بیرن ہو بیٹھے بھُن بھُن سے نیارا ہے
جات برن پوچھے نا کوئی، پوچھت نا گھر بھوارا ہے
جھلک بوند گرے جل ہی ماں، نا میٹھا نا کھارا ہے
سندر مدل بیچ نوبت باجے، مُرلی بین ستارا ہے
محرم ہوئے وہی پہچانے، ایسا دیس ہمارا ہے
رام رام کی بھجن کرو۔ رام پر کرو دھیان[1]

مگر جوں جوں جوش بڑھتا گیا اور اہیرنوں کی طرف سے جواب ملتا گیا، وہ فی البدیہہ برہے موزوں کرتا گیا۔ ہر برہے کے بعد وہ اہیروں کا ناچ ناچتا تھا۔ کبھی کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کے محض سر و سینہ زور زور سے ہلاتا تھا کبھی صرف کولھے اور کمر کو حرکت دیتا تھا اور کبھی ایک پاؤں کی ایڑی پر لٹو کی طرح بڑی تیزی سے گھومتا تھا۔ اہیرنیں بھی ہاتھ چمکا چمکا کے اور گالیاں دے دیکے ناچتی جاتی تھیں، اور ہر برہے کا جواب گیت سے دیتی تھیں، مگر کیلے کے درختوں میں کھجور کے پیڑ کی مضبوطی کہاں؟ جہاں دو چار سخت جھونکے آئے اور وہ دُہرے ہو گئے!

---

[1] رام رام کرو اور اسی کا دھیان رکھو۔ ہم جہاں کے ہیں اُسے سوائے محرم اسرار کے کوئی نہیں جانتا۔ ہم (اس دنیا میں) جہاں جاتے ہیں اجنبی ہی معلوم ہوتے ہیں۔ نہ کوئی ہم سے ہماری ذات کی بابت دریافت کرتا ہے اور نہ کوئی ہمارا وطن پوچھتا ہے (حقیقت یہ ہے کہ) ہم جہاں کے ہیں اسے سوائے محرم اسرار کے اور کوئی نہیں جانتا۔ جب پانی کی بوند پانی ہی میں مل جاتی ہے تو اُس کے ذائقے میں کوئی فرق نہیں ہوجاتا اور جب مختلف باجے ایک ساتھ بجتے ہیں تو اُن کی آوازوں میں تفریق نہیں کی جاسکتی۔ (حقیقت یہ ہے کہ ہم جہاں کے ہیں اُسے سوائے محرم کے کوئی نہیں بتا سکتا، اس لئے بس رام رام کرو اور اسی کا دھیان رکھو۔

جب اہیرنوں نے دیکھا کہ اُن کے ہاں گیتوں اور گالیوں کا ذخیرہ ختم ہو چلا ہے اور بیاہ کا سارا کام مقابلے کی وجہ سے بند ہوا جاہتا ہے تو اُن میں سے دو تین دوڑی ہوئی نولاکھی کے پاس پہنچیں۔ اُس نے عمر کی صرف اٹھارہ بہاریں دیکھی تھیں کہ اچانک گرفتارِ خزاں ہوگئی تھی۔ جوان شوہر گونا کراتے ہی سُرگ باش ہوگیا تھا۔ وہ اب بیوہ تھی، نہ اُس کی مانگ میں "سیندور" تھا نہ ہاتھوں میں چوڑیاں اور نہ بدن پہ رنگین ساری۔ اس کے لئے تو اب گھر کا ایک کونا تھا، خاموشی تھی اور سپید کپڑے۔ وہ بیاہ برات میں کیا منہ لیکے جاتی۔ ایسے گھر میں تو اس کی موجودگی ہی بدشگونی کے لئے کافی سمجھی جاتی۔

مگر سکھیاں بھلا اس وقت ان باتوں کو کہاں دھیان میں لاتی تھیں۔ گاؤں بھر کی ناک کٹ رہی تھی۔ رام دلارے ہر بات میں جیتتا چلا جارہا تھا۔ اہیر اس کے مقابلے سے عاجز آچکے تھے، اب کیا اہیرنیں بھی اپنے مردوں کی طرح کم ہمت تھیں کہ "ہاتھ پاؤں ڈال کے بیٹھ رہتیں"۔ نولاکھی ناچنے گانے کی ماہر تھی، جوان تھی، بال بچوں والی نہ تھی، شادی بیاہ کا اُسے کام کاج نہ کرنا تھا۔ اس سے زیادہ اس مقابلے کے لئے کوئی موزوں نہیں ہوسکتا تھا۔ بس سب مِل کے اُسے کھینچ لائیں۔

نولاکھی کو پس وپیش اس لئے تھا کہ اس کی بیوگی کے زمانہ میں اُس کے پاس بہت سے منچلے اہیروں کی طرح رام دُلارے کا بھی پیغام آچکا تھا، وہ جانتی تھی کہ وہ کشتی اور پہلوانی کی طرح ناچنے گانے میں بھی مشاق ہے۔ تب سے وہ اس کا تذکرہ سُن سُنکر اس کی جھلک دیکھنے کے لئے بےچین بھی ہورہی تھی۔ اس کا یہ بھی جی چاہتا تھا کہ وہ رام دلارے کو اس مقابلے میں ہراکے یہ دکھادے کہ اس کا "حوصلہ کرنا" ہر ایک کا کام نہیں۔ مگر جتنی رام دلارے تک پہونچنے اور اُس کے مقابلے کی خواہش بڑھتی اتنی ہی شرم بھی بڑھتی تھی۔ وہ اسی "ہیس بیس" میں تھی کہ سکھیوں نے زبردستی ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔ اور وہ دل ہی دل میں جھینپتی، شرماتی، نظریں نیچی کئے چلی۔

آموں کے باغ کے پاس پنچکر اُس نے پہلی بار مقابل پر نظر ڈالی، دیکھا ایک جوان کھڑا ہے۔ گندمی رنگ، گول چہرہ، چمکتی ہوئی آنکھیں، کانوں میں موٹی موٹی "مرکیاں"۔ گلے میں اشرفیوں کا کنٹھا، سانڈ کا سا سینہ، "باگھ" کی سی کمر، ساری سج دھج پہلوانوں کی۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے دل میں بڑے زور سے چٹکی لی۔ یہ تو مرے ہوے سوامی سے ملتی جلتی ہوئی صورت تھی! گھبراکے جھجکی، مگر سکھیوں نے ڈھکیل کے سب کے آگے کردیا۔

براتیوں میں سے کئی ایک نولاکھی کو پہچانتے تھے، اُس کے حُسن اور اُس کے ناچ کے اکثر گھایل تھے۔ اس لئے رام دُلارے کے گرد بیٹھے ہوئے مجمع میں ایک اضطرابی لہر سی دوڑ گئی۔ رام دلار

نے اس کیفیت کو محسوس کیا اور وہ ناچتے ناچتے ٹھٹک کے رُک گیا۔ اہیروں نے ایک دوسرے کے پہلو میں کہنیاں ماریں اور بولے "اب مکابلا برابر کا بھوا۔ رام دُلارے ایک ترپھ، نولاکھی دوسری ترپھ!"

رام دُلارے نے نولاکھی کا نام سنتے ہی اسے بغور دیکھا۔ "بادل ماں جیسا چندرما چمکے" ویسا ہی میلی ساری میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس پر آفت "گیُوا ایسی بڑی بڑی مدبھری آنکھیں اور ہنس ایسی لمبی اور بیڑھی گردن" سڈول بھرا بھرا جسم "نئے پودے کی طرح نرم نرم ہاتھ پاؤں"، "پھُرتیلے پچھیڑے کی ایسی بوٹی بوٹی پھڑکتی ہوئی"۔ "بڑی سند جان پڑی" ایسا معلوم ہوا کہ جیسے اس نے نولاکھی کو دیکھا ہی نہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ کئی لبریز جام بھی چڑھا لئے اسلئے کہ وہ اپنے میں عجیب طرح کی سرخوشی محسوس کر کے ایک پرانا برہا ناچ ناچ کے گانے لگا:۔

ایک سمے میں ہری روپ بدل لال، دھیلیں بیدکا بھیس
کھوری کا کھوری گھومے بیدوا، سہر ماں کو نو ہے بیماری؟
اپنے محل سے نکلن رادھکا، دیکھلن بیدا صورت تمہاری
آؤ نہ بیدا میری نگریاں، پہچانو میری بیماری
نا دیکھوں توری سر وی گرمی، نا دیکھوں توری بیماری
تم ناری اس بھنگ بھئی ہو، بگڑ گئی ہے سب ناری
آؤ نہ بیدا میری نگریاں، کھدمت کر بے تمہاری
اور دیب ہم دھن دولت، اور و جاگہ جمیداری
اور دیبا گوکلا کا رجوا، بیٹھل کر یہا بیہاری

---

۵۱ اب مقابلہ برابر کا ہوا، رام دُلارے ایک طرف نولاکھی دوسری طرف۔

۵۲ ایک بار کرشن نے بھیس بدلا اور وید بنکے گلی گلی گھومنا اور پکارنا شروع کیا کہ اس شہر میں کوئی بیماری تو نہیں ہے؟

۵۳ (یہ صدا سنتے ہی) رادھا اپنے محل سے نکل پڑیں اور وید کی صورت دیکھ کے پہچان کے بولیں "اے ویدجی، ادھر آئیے، ذرا میری بیماری تو پہچانیئے۔" انھوں نے کہا "میں تمہاری بیماری بھلا کیا پہچانوں گا، تم تو خود ایسی آفت روزگار ہو کہ تمھیں دیکھتے ہی میری نبضیں چھوٹی جاتی ہیں۔" اس پر رادھا بولیں "اچھا میرے پاس تو آئیے، میں آپ کی خدمت کرونگی، آپ کو روپیہ پیسہ، جگہ زمینداری سب کچھ دوں گی۔ گوکل کا راج نذر کروں گی۔ بس ٹھاٹھ سے بیٹھ کے حکومت کیجئے۔" وید نے جواب دیا "مجھے تمہاری دولت تمہاری زمینداری، اور تمہارے راج کی خواہش نہیں۔ میں تو محبت کا بھوکا ہوں، سو اگر تم مجھے اپنا شوہر بنالو تو البتہ میں راضی ہوں!"

ناچا ہوں تو دھن دولت، نا لیبوں تو رجگہ جمد اری
ناچا ہیں گو کلا کا رجوا، ناہیں کربے بیھا ر ی
ہم چاہیں رسوں کا کلیا، ہم ہی پُرس توں ناری

آخری ٹکڑا "ہم ہی پُرس تون ناری" رام دلارے نے آگے بڑھکے اور تولاکھی کی طرف اشارہ کر کے اس اس طرح کولھے کو حرکت دے کے گایا کہ سارا مجمع ہنستے ہنستے بیتاب ہوگیا۔ تولاکھی بھی دل ہی دل میں کٹ گئی۔ مگر حریف کے پہلے ہی وار میں جھجک کے پیچھے ہٹ جانا شکست ماننے کا پیش خیمہ تھا۔ اور وہ اس کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ ہمیشہ اس طرح کے مقابلوں میں ورّ رہی تھی، اس لئے قبل اس کے کہ رام دُلارے کچھ اور کہہ سکے اُسنے اِس بِرہے کی آخری کڑی حد درجہ تحقیر آمیز لہجہ میں ہاتھ چمکا کے گا دی۔

"نیا پر چڑھ کے گول کاٹے لا کنہیا آکھر جتیا کا توں آہیر!"[1]

اہیرنوں اور سنا تیوں نے اِس حاضر جوابی پر اسس زور کا قہقہہ لگایا کہ رام دلارے اور اُس کے ساتھی بالکل ہی جھینپ گئے۔

ناگن نے سپیرے کا پہلا وار خالی ہی نہیں دیا بلکہ خود چوٹ کر گئی!

گھنٹوں مقابلہ ہوتا رہا۔ دونوں نے اس قدر برہے اور گیت گائے کہ گلے پڑ گئے۔ اب خاموش ناچ کا جواب ناچ سے دیا جا رہا تھا۔ رام دلارے نے کُرتہ اُتار کر پھینکدیا تھا" دھوتی کا کاچھا کس لیا تھا تولاکھی نے ساری کا آنچل کمر میں لپیٹ لیا تھا اور "پھینٹی" لنگی کی طرح یوں کھینچ کر پیچھے کھونس لی تھی کہ گوری گوری پنڈلیاں صاف دکھائی دیتی تھیں۔ چہرے پر پسینے کی بوندیں گلاب کی پتیوں پر شبنم کے قطروں کی طرح جھلک رہی تھیں۔ آنکھیں خون سے بھری کٹوریاں ہو رہی تھیں، ہونٹ بالکل شفتی تھے، مگر مسکراہٹ سے دانتوں کی بتیسی بار بار چمک اُٹھتی تھی اور کمر اور کولھے کی حرکت برابر مشین کی طرح جاری تھی۔

رام دُلارے کو زیادہ تکان نہ تھی، وہ مرد تھا، پہلوان تھا، بن بیاہا تھا، وہ دس بارہ گھنٹے ایک طرح ناچ سکتا تھا۔ مگر مقابل کوئی مرد نہ تھا، ایک نازک اندام سیم بدن عورت تھی، پھر بھی وہ گھنٹوں سے کھڑی برابر کا مقابلہ کر رہی تھی، ہر برہے کے جواب میں کوئی برہا یا گیت گاتی، جب تک گلا نہ پڑا تھا خاموش نہ ہوئی تھی ناچتی بھی اس خوبی اور دلفریبی سے تھی کہ جسم کی ہر حرکت اور اعضا کی ایک ایک جنبش بوڑھے "پھونس" اہیروں کے دل و دماغ میں آگ لگا دیتی تھی۔ اس کا استقلال یہ بتاتا تھا کہ وہ بات پر جان دیدیگی مگر ہار نہ مانے گی۔

---

[1] کنھیا کشتی پر چڑھ کے چکر لگاتے ہو، یعنی ہر پھر کے اپنے ہی مطلب کی کہتے ہو، آخر تم ذات کے اہیر ہی ہونا!

انداز کہتا تھا کہ تھک کے چور ہوگئی ہے، مگر مسکراہٹ بتاتی تھی کہ جب تک دم میں دم ہے ناچے جائیگی۔
رام دلارے نادیدہ عاشق تھا، پیغام بھیج چکا تھا، آج اس باہمت مقابلہ نے اس کے دل میں وہ جذبۂ ایثار پیدا کر دیا جو وفور محبت ہی کے بعد ممکن ہے۔
اس نے دفعتہً انگڑائی لی اور مسکراتا ہوا آگے بڑھا، نولاکھی ناچتے ناچتے گھبرا کے ٹھٹکی پھر سنکگڑی ہوئی گئی
رام دلارے نے اس کے قدموں کی طرف ہاتھ لے جا کے کہا "دیوئی جی ہم ہار گئی لیں، تہارا اس ناچ اِہ دیس مال کیھو کا نا آوت!" بجانیتوں نے اس پر خوب خوب تالیاں بجائیں اور فقرے کسے، اہیروں نے گالیاں دے دیکے "ہار گوا! ہار گوا!" کا شور مچایا۔ مگر نولاکھی نے رام دلارے پر ایک چھلکتی ہوئی نظر ڈالی اور سر جھکائے چپکی اپنے جھونپڑی میں چلی گئی۔ نگاہیں کہتی تھیں کہ رام دلارے کے شکست مان لینے نے جیت کو ہار بنا دیا اور ہار کو جیت!
سپیرے نے ناگن کو جڑی سنگھا کر مدہوش کر دیا تھا، اب وہ اس کے قابو میں تھی۔

اس واقعے کے پندرھویں دن رام دلارے چھیدی پور پھر آیا، دن بھر اہیر ٹولی میں رہا، شام کو جب رام نگر واپس جانے لگا تو نولاکھی سرخ چادر اوڑھے اس کے پیچھے پیچھے تھی اور سکھیاں بابل گا رہی تھیں مگر رام دلارے کا انداز ہی نرالا تھا، وہ بائیں کاندھے پر لاٹھی رکھے اُسے الٹے ہاتھ سے سنبھالے تھا، اور دہنا ہاتھ کبھی کان پر، کبھی کمر پر رکھتا اور مستانہ وار ناچتا اور گاتا جاتا تھا۔

رام رام کی بھجن کرو، رام پر دھرو دھیان
محرم ہوے وہی پہچانے۔ ایسا جوڑا ہمارا ہے
جہاں جہاں جائے اپنی ہو بیٹھے، ایسا موہن پیارا ہے
انکھیاں اِہ کی کھنجر ایسی، چلیا اہ کی دھارا ہے
دیکھو پیچھو ایہر دیکھو، ای ہی ہمرا پیارا ہے
اہی سے ہار کے اِہ کے جیتا، اِی ہے گھات کٹارا ہے
ایسی گھتیا نا کوئی جانے، جانے رام دلارا ہے!
محرم ہوئے وہی پہچانے، ایسا جوڑ ہمارا ہے
رام رام کی بھجن کرو، رام پر دھرو دھیان

---

۵۱ دیوی میں ہار گیا۔ تمہارا سا ناچ اس ملک میں کسی کو نہیں آتا۔
۵۲ ہار گیا ہار گیا۔ ۵۳ رام رام کرو اور اسی کا دھیان رکھو۔ میرے کفو کو سوائے خاص خاص لوگوں کے ہر ایک نہیں پہچان سکتا

وہ ہر کڑی پر رک کے کھڑا ہو جاتا، کولھے اور کمر کو حرکت دیتا، پھر ناچتا ہوا نولکھی کے گرد گھومتا اور آگے بڑھتا۔ نولکھی شرماتی، لجاتی، بدن چراتی، مگر گھونگھٹ سے "تیر نیم کش" مارنے سے باز نہ آتی تھی۔ ہاں ہاں، سپیرے کے منتروں نے ناگن کو ایسا رام کیا تھا کہ وہ اب اس کے گلے کا ہار تھی!

جواہر پارے

خدا اس بات کو پسند کرتا ہے کہ دردمندوں اور مصیبت زدوں کی مدد کی جائے۔

تم جہاں کہیں رہو خدا سے ڈرتے رہو۔ اور نیکیوں سے بدیوں کو مٹاتے رہو، اور لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آتے رہو۔

جو آدمی زمین والوں پر رحم نہیں کرتا آسمان والا یعنی خدا بھی اس پر رحم نہیں کرتا۔

جو رحم نہیں کرے گا، اس پر رحم نہیں کیا جائیگا، جو معاف نہیں کریگا وہ معاف نہیں کیا جائے گا۔

قریبی رشتہ داروں کے ساتھ بھلائی سے پیش آنا عمر کو دراز کرتا ہے، اور چھپا کر خیرات کرنا غصہ کو فرو کرتا ہے۔

نیکی وہ ہے جس سے انسان کی روح کو سکون ہو اور دل میں اطمینان پیدا ہو، اور گناہ وہ ہے جس سے نہ انسان کی روح کو سکون ہوتا ہو اور نہ دل میں اطمینان پیدا ہوتا ہو۔

وعدہ ایک طرح کا قرض ہے۔ کم بختی ہے اس کی جو وعدہ کرے اور پھر اس وعدہ کے خلاف کرے۔

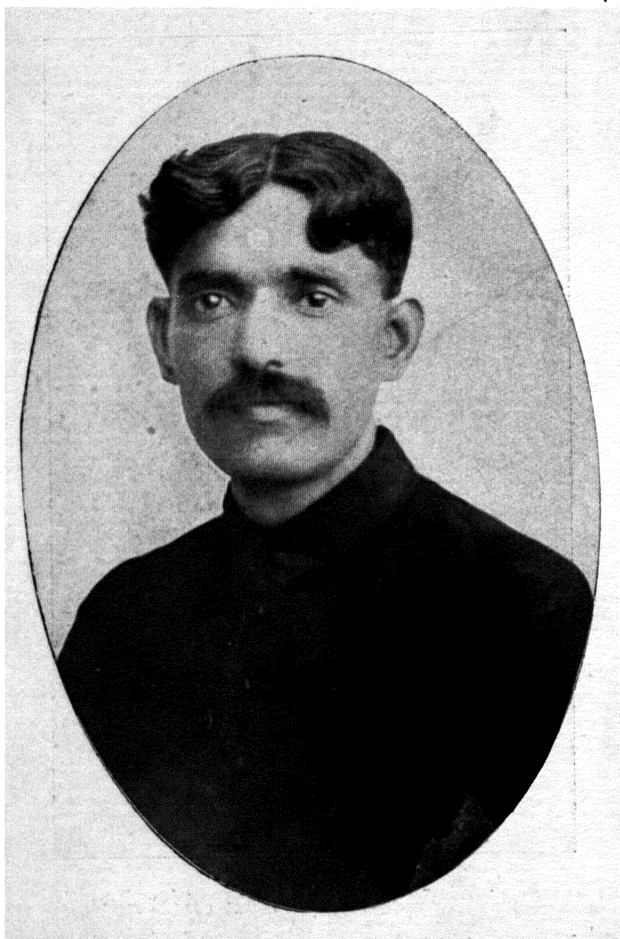
قناعت ایک ایسی دولت ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔

مال و دولت کو بیجا اڑانے سے پرہیز کرو۔ اور میانہ روی اختیار کرو۔

امانت میں ایمانداری کرنا روزی کو کھینچ لاتا ہے۔

کاموں میں کام وہی اچھا ہے جس میں نہ افراط ہو نہ تفریط ہو، یعنی میانہ روی ہو۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) وہ جہاں جاتی ہے اپنی موہنی اور پیاری صورت کی وجہ سے دل میں گھر کر لیتی ہے۔ اسکی آنکھیں خنجر ہیں، اس کی چال میں دریا کی روانی ہے۔ اے پنچو ادھر دیکھو، یہی میری پیاری ہے۔ اسی سے ہار کے میں نے اسے جیت لیا یہی ترکیب سب سے زیادہ کارگر تھی۔ ایسی چالیں سوائے رام ملارے کے دوسروں کو نہیں آتیں۔ یہی تو وجہ ہے کہ) مجھے کوئی کبھی سوائے مخصوص لوگوں کے ہر کس و ناکس نہیں پہچان سکتا۔ (اور اسی لئے فرض ہے کہ) رام رام کرو اور اسی کا دھیان کرو!



منشی سکھدیوپرشاد سنہا بسمل الہ آبادی



مسٹر پرکاش چندر ایم-اے-پی-اچ-ڈی (لندن)

آپ رسالہ زمانہ کے قدیم قدردان رائے بہادر بابو مرلی لال صاحب ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ و سشن جج بنارس کے فرزندارجمند ہیں۔ الہ آباد یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونیکے بعد آپ مزید تکمیل تعلیم کی غرض سے انگلستان تشریف لیگئے اور دو سال کے بعد لندن یونیورسٹی سے پی-ایچ-ڈی کی ڈگری حاصل کرکے اب ہندوستان واپس آگئے ہیں۔

تنقید کتب

جذباتِ بسمل

یہ منشی سکھ دیو پرشاد بسمل الہ آبادی کے شاعرانہ کلام کا مجموعہ ہے جسے منشی کنہیا لال صاحب ایم۔ اے، ایل ایل بی، ایڈووکیٹ الہ آباد و سابق ایڈیٹر رسالہ "چاند" (اردو) نے مرتب کر کے انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد سے شائع کیا ہے[1] اس کی تقطیع بڑی، کاغذ عمدہ چکنا اور کتابت و طباعت نہایت نفیس اور دیدہ زیب ہے۔ آرٹ پیپر پر اکیس[21] تصویریں بھی ہدیۂ ناظرین ہیں جن میں تیرہ[13] تصاویر یک رنگی اور فن مصوری کی شاہکار ہیں۔ لکھائی چھپائی صفائی کے اعتبار سے اس کتاب کو انڈین پریس کے حسنِ طباعت کا ایک دل خوش کن نمونہ سمجھنا چاہیئے۔

شروع میں آنریبل سر عبد القادر صاحب نے ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں "جذبات بسمل" کی خوبیاں بوجہ احسن نمایاں کی گئی ہیں۔

منشی سکھدیو پرشاد سنہا بسمل حضرت نوح ناروی کے شاگرد رشید ہیں، شاعری کی طرف آپ کا اوائل عمر ہی سے رجحان طبع تھا، جذبات بسمل کے دیکھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت بسمل کی طبیعت خزن ملال اور رنگینی و مستی کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے بعض مقامات پر اِن کا طائر فکر بڑی دور کی خبر لاتا ہے مثلاً:۔

نزدیک سے کب دور سمجھتا ہوں میں — یہ شیوہ و دستور سمجھتا ہوں میں
ہر سانس انا الحق نہ کہے کیوں بسمل — اپنے کو جو منصور سمجھتا ہوں میں

آپ کی بعض رباعیات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ یونان کے حکما، رواقئین تشکگین (Stoics) کی طرح فلسفہ قنوطیت (Pessimism) یعنی دنیا ہیچ است و کار دنیا ہمہ ہیچ کے قایل ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

کچھ سوچ سمجھ کر ہو نثار ہستی — اُترے گا کبھی دوش سے بار ہستی
بھولو نہ بہت باغ جہاں پر بسمل — دو دن کے لئے ہے یہ بہار ہستی

---

[1] مطبوعہ انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد۔ قیمت للعہ/

کیا تذکرہ وہم و گمانِ ہستی　　　مٹ جائیگا اک روز نشانِ ہستی
مٹی کا گھروندا اِسے سمجھو بسمل　　　ذرّوں سے بنا ہے یہ مکانِ ہستی

اسی طرح ایک مصرع میں فرماتے ہیں " دھوکے کی یہ ٹٹی ہے بہارِ ہستی "
دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

دنیا میں جس نے رہ کر دنیا کو ہیچ سمجھا　　　وہ اِس کا راز سمجھا وہ اس کا پیچ سمجھا

منجملہ دیگر اصنافِ سخن کے بسمل صاحب کو سیرت نگاری میں بھی دستگاہ حاصل ہے۔ سری کرشن جی، مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، اور مسٹر بال گنگا دھر تلک پر جو نظمیں آپ نے لکھی ہیں اُن میں فنِ سیرت نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔

بسمل صاحب اپنے کلام کی رو سے ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، اور "با مسلماں اللہ اللہ با ہنوداں رام رام" کے اصول پر عمل کرتے ہیں۔ درحقیقت شعرا کا مذہب "مذہبِ عشق" ہوتا ہے، حضرت بسمل کو بھی ہر جگہ معبودِ حقیقی نظر آتا ہے۔

مجھے ہے واسطہ دیر و حرم دونوں سے اے بسمل　　　کہ میں ہندو ہوں ہندو میں مسلماں ہوں مسلماں میں
مطلب ہے عبادت سے مجھ کو، مطلب ہے پرستش سے مجھکو　　　جس در پہ جھکایا سر میں نے، کعبہ تھا وہی بتخانہ تھا
رہا نگاہ کے آگے کبھی حرم کبھی دیر　　　کہاں کہاں پھرے ہم اُن کی جستجو کرتے
ہمیں ہے واسطہ ہر مذہب سے بسمل　　　نہیں ہے کوئی بھی مذہب ہمارا

جو لوگ فلسفۂ اتحاد سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ ہندوستان کی نجات اتفاق و اتحادِ باہمی میں مضمر ہے، لیکن بعض دراندازاور غرض آشنا افراد ایسے ہیں جو لیڈری، ایڈیٹری، مولویت اور پنڈتائی کے بھیس میں نفاق و شقاق کی چنگاریاں اس طرح چھوڑتے چلے جاتے ہیں کہ ہندو مسلمان اور دیگر فرقوں میں آئے دن سر پھٹول رہتی ہے۔ حضرت بسمل ان نفاق انگیزوں اور فتنہ پردازوں کی یہ تخریبی حرکتیں دیکھ دیکھ کر خون کے آنسو روتے ہیں اور اس طرح درسِ اتحاد و عمل دیتے ہیں ؎

ہنستا ہے زمانہ دل میں، اسے سوچو تو سہی سمجھو تو سہی　　　اے شیخ و برہمن اب رکھو مذہب کا رونا ایک طرف
ہندو بھی مسلمان بھی رستہ سے بھٹک کر　　　میدانِ ترقی کی سڑک کوٹ رہے ہیں
آپس کی لڑائی سے ہوا نفع یہ بسمل　　　رشتے جو محبت کے تھے وہ ٹوٹ رہے ہیں

جس سے جھگڑا ہو، اُٹھے جس سے زمانے میں فساد　　　ایسے مضمون کبھی اخبار میں لکھا نہ کرو

غلط ہے ختم آپس کی لڑائی ہو نہیں سکتی
کدورت آگئی دل میں صفائی ہو نہیں سکتی

فقط ان مذہبی جھگڑوں سے ملتی سب کو روٹی ہے
نہ اب داڑھی وہ داڑھی ہے نہ اب چوٹی وہ چوٹی ہے

اب ہے نہ میل جول نہ الفت کا رنگ ہے
آپس کی نوک جھونک ہے آپس کی جنگ ہے

سنگھٹن ہے تو کہیں تنظیم ہے
کام اب لڑنے کا یوں تقسیم ہے

اگرچہ بسمل کی طبع رواں میں حد درجہ کا تنوع ہے مگر بعض مخصوص مضامین ان کے دل کو اس قدر پسند ہیں کہ وہ ان پر ہر پھیر کے طرح طرح سے تم فرسائی کرتے ہیں۔ مثلاً بسمل صاحب وادی ایمن اور کوہ طور کی بہت سیر کرتے ہیں اور مختلف آن بان کے ساتھ کوہ طور پر جاتے ہیں۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:۔

کلیم سے یہ کہا برق نے سر طور
مجھے تو آپ کی آنکھوں کو آزمانا تھا

اللہ رے برقِ حسن کی یہ گرم جوشیاں
موسیٰ کو ہوش بھی نہ رہا طور جل گیا

کہتی ہے جس کو خلق تجلیِ برقِ طور
ہلکی سی وہ جھلک تھی تری جلوہ گاہ کی

نور حق میں اسے سمجھتا ہوں
طور پر جو چراغ جلتا ہے

دوسرے بسمل صاحب انگڑائیاں بھی بہت لیتے ہیں، اور یہ خصوصیت ان کو لکھنؤ اسکول کے تتبع سے حاصل ہوئی ہے۔ حالانکہ آجکل خود لکھنؤ والے ایسے مضامین ترک کرتے جاتے ہیں۔ یہاں ہم مثال کے اشعار بخوف طوالت نظر انداز کرتے ہیں۔

چوتھی خصوصیت بسمل کی یہ ہے کہ ان کا طائر فکر تنکے بہت چنتا ہے۔ قسم قسم کے تنکے چنکر نئے نئے آشیانے بناتا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

آشیاں کا تو کوئی ذکر ہی کیا اے صیاد
جمع تنکوں کو کبھی برق نے ہونے نہ دیا

چننے تھے باغ میں آ آ کر انھیں اہل جنوں
آشیاں کا مرے تنکا کوئی بیکار نہ تھا

ممکن نہیں کہ جمع نہ ہوں وہ بہار میں
تنکے ادھر ادھر جو مرے آشیاں کے ہیں

ہر طرف پھرتا ہوں اپنے آشیاں کے واسطے　　　چار تنکوں کی ہوس میں اس قدر برباد ہوں

جناب بسمل بھی مشہور و معروف اساتذہ کے کلام سے اکتساب مضامین کرتے ہیں، اور شراب کہنہ کو نئے جام و صراحی میں سلیقہ کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

غالب کا شعر ہے:۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں　　　خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

اسی مضمون کو بسمل صاحب اس طرح لکھتے ہیں:۔

وہی اب پھول بن بنکر نکلتے ہیں گلستاں میں　　　ہوئے تھے دفن جتنے خوبرو شہر خموشاں میں

حضرت داغ کا مشہور مطلع ہے:۔

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں　　　مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

اسی مضمون کو بسمل صاحب یوں پیش کرتے ہیں:۔

مشتاق ہم بھی جلوۂ کون و مکاں کے ہیں　　　پردے ذرا اُٹھاؤ، یہ پردے کہاں کے ہیں

وزیر کا مشہور شعر ہے:۔

چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر　　　زمین کوئے جاناں رنج دیگی آسماں ہو کر

بسمل صاحب یہی مضمون اس طرح لکھتے ہیں:۔

ستاتی ہے فلک بنکر جہاں کی سرزمیں ہم کو　　　دلِ ناداں لئے جاتا ہے پھر دیکھو وہیں ہم کو

اُستاد داغ کا مشہور مطلع ہے کہ

عرصۂ حشر میں اللہ کرے گم مجھکو　　　لاؤ پھر و ڈھونڈتے گھبرائے ہوئے تم مجھکو

اسی مطلع کا چربہ بسمل صاحب یوں اتارتے ہیں:۔

طریق عشق میں بس ایک، یہ ہے آرزو میری　　　کہ میں ہو جاؤں گم کرتے پھریں وہ جستجو میری

اُستاد داغ کا مشہور مطلع ہے کہ ؎

دل مست چھلک نظر سے کہ پایا نہ جائے گا　　　جو رلا اشک سے پھر زمیں سے اُٹھایا نہ جائیگا

یہی مضمون بسمل نے اس طرح قلمبند فرمایا ہے ؎

خاک ہونگا خاک ہو کر خاک میں مل جاؤں گا　　　کیوں گراتے ہیں نظر سے آپ کیوں دل سے مجھے

بہر حال اس قسم کے بہت سے اشعار ہیں جن میں کسی نہ کسی مشہور استاد کے شعر سے اکتساب مضمون کیا گیا ہے۔ زبان میں بھی کہیں کہیں اعتراض کی گنجائش رہ گئی ہے۔ مثلاً:۔

مجھے ہے واسطہ دیر و حرم دونوں سے اے بسملؔ　　کہ میں ہندو ہوں ہندو میں، مسلماں ہوں مسلماں کا

محاورہ "ہندوؤں میں ہندو اور مسلمانوں میں مسلمان ہونا" ہے۔

کہیں جو شیشہ و ساغر کو ہم نے دیکھ لئے　　نظر میں پھر گئی صورت شراب خانے کی

اس میں "دیکھ لئے" کے بجائے "دیکھ لیا" ہونا چاہیئے۔

بلا تھا ان کا لڑکپن ستم ہے انکا شباب　　غضب کی صورتیں دونوں ہیں دو زمانے کی

اس شعر میں "دو زمانوں" ہونا چاہیئے۔

کیا کریں آن پر تصدق ہم کہ مشکل ایک ہے　　کہنے سننے کو ہیں دو پہلو مگر دل ایک ہے

اس شعر میں "سننے" غلط ہے۔ بات کہنے سننے کو ہوتی ہے پہلو "کہنے سننے" کو نہیں ہوتا۔ صرف "کہنے کو" ہو سکتا ہے۔

بہارِ گل کا عالم دیکھ کر سر اپنا دُھنتا ہوں　　مری تقدیر میں کانٹے ہیں، میں کانٹوں کو چنتا ہوں

دوسرے مصرعہ میں "کانٹوں کو" "چنتا ہوں" غلط ہے۔ "کانٹے" "چنے جاتے ہیں، کانٹوں کو چنا نہیں جاتا۔

امید ہے کہ ان معدودے چند غلطیوں کی طبع ثانی میں اصلاح ہو جائیگی۔ ہم نے بسملؔ کی توجہ صرف اس خیال سے دلائی کہ آپ کا خود یہ ارشاد ہے:۔

نظم میں یونہیں جو الفاظ تراشی ہوگی　　بالیقیں آپ کی بھی خانہ تلاشی ہوگی

ستیہ برتی مہانند (ناول)

یہ کتاب آریہ سماج کے رکن رکین سوامی درشنانندجی سرسوتی مرحوم کی اردو تصنیف ہے جسے ایک ہندی ناول کہنا چاہیئے۔ مختصراً اس میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ جہاں دھرم کے ساتھ کوئی لگن ہوتی ہے تو وہ بلا سیم و زر کے بھی بالآخر پوری ہی ہو کر رہتی ہے اور ادھر ہی شخص خواہ اپنی دولت کے سہارے عارضی طور پر کامیاب ہی کیوں نہ ہو جائے لیکن اُسے انجام کار نیچا ہی دیکھنا پڑتا ہے۔ کتاب اگرچہ دیگر ناولوں کی طرح دلچسپ نہیں پھر بھی مذہبی نقطۂ خیال سے دلکش ہے۔ اور اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ نہ صرف آریہ سماجیوں بلکہ عوام کیلئے بھی مفید ہے۔ اس کی چھپائی معمولی مگر صاف ہے۔ حجم ۱۴۴ صفحات۔ قیمت ۱۰ر

لہ یہ اور ذیل کی تمام کتابیں سوامی درشنانند سرسوتی کی تصنیف ہیں۔ اور ان کے پبلشر پنڈت وزیر چند شرما مالک ویدک پستکالہ متصل ہری گیان مندر لاہور ہیں۔ شائقین انھیں اسی پتہ سے طلب فرمائیں۔

تتو دیا رشی کی کتھا

اس کتاب میں لائق مصنف نے مکالمہ کی صورت میں یہ دکھلایا ہے کہ مکتی اور بندھن کے متعلق ہندو فلاسفی کے مشہور شاستروں نیائے، ویشیشک، سانکھیہ وغیرہ میں کوئی اختلاف باہمی نہیں ہے۔ ضمنی طور پر دیگر مذہبی مسائل بھی حل کئے گئے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں تکرار کا نقص رہ گیا ہے۔ بہرحال سوامی جی کی قابلیت مسلمہ ہے۔ محققانہ اور مذہبی رجحان والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت دلچسپ و مفید ثابت ہوگا۔ خود سانکھیہ شاستر کے ایک سوتر سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس کا مصنف کپل ایشور کی ہستی کا مُقِر تھا۔ اس کا حجم ۱۰۴ صفحات اور قیمت ۸ر ہے۔

کُستما چند رُودے

سوامی جی مرحوم نے کتاب کی ابتدا میں آریہ سماج کے موجودہ رویہ کے متعلق چند قابل غور باتیں لکھی ہیں۔ اس میں اس مسئلہ سے بھی بحث کی گئی ہے کہ حصول نجات کے لئے کونسا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اور اس راستہ میں کس قدر مشکلات و ترغیب حائل ہیں۔ اس کتاب میں ضمنی طور پر یہ بات بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ چھ شاستروں میں اختلاف نہیں بلکہ مکمل اتفاق ہے۔ صرف ان کا طرز بیان مختلف ہے۔ کتاب سوال و جواب کے پیرایہ میں لکھی گئی ہے البتہ جا بجا پنجابی محاورات کی بھرمار ہے کتاب میں ۵۴ صفحات ہیں اور قیمت ۶ر ہے۔

اوپنشد پرکاش

یہ کتاب چھ اوپنشدوں یعنی ایش، کین، کٹھ، پرشن، منڈک، ماندوکیہ کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں سنسکرت کے اصلی اشلوک بھی دیدیئے گئے ہیں اور دقیق روحانی مسائل کو نہایت عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے، لیکن اگر مصنف کا یہ مقصد تھا کہ اس ترجمے سے اردو داں اصحاب مستفید ہو سکیں تو ان کو ہندی الفاظ کی اس قدر بھرمار نہ کرنی چاہیئے تھی جو ہے۔ اگر اس نقص کو رفع کر دیا جائے تو یہ کتاب بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کا حجم تقریباً ۲۰۰ صفحات اور قیمت ۱۲ر ہے۔

سانکھیہ درشن

یہ کتاب سنسکرت سوتروں مختصر ترین بیانات میں ہے۔ دنیا میں سوتروں کا لٹریچر صرف ہندوستانی

رشیوں کا دماغ ہی پیدا کر سکتا ہے۔ سوامی جی مرحوم کی عالمانہ تفسیر نے اس کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ البتہ اونبشدوں کی طرح اس میں سوتروں کے لفظی معنی نہیں دیے گئے اور یہ کمی کھٹکتی ہے۔ اسکی چھپائی بھی صاف نہیں ہے کتاب میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ تین قسم کے دکھوں (۱) جو اپنے جسم سے پیدا ہوتے ہیں (۲) جو دیگر جاندار وں سے پہونچتے ہیں، اور (۳) جو بجانب خدا ہیں) کا قلع قمع کر دینا ہی انسانی زندگی کا مقصد اعلیٰ ہے جس کا نتیجہ مکتی (نجات) ہے چنانچہ دکھ کیا ہے؟ وہ کس طرح پیدا ہوتا اور دور کیا جا سکتا ہے، یہی باتیں مع تمام ضروری امور کے بتلائی گئی ہیں۔ خدا۔ روح اور مادہ کے متعلق بھی اس کتاب میں کافی بحث ہے۔ سوامی جی کی تفسیر نے سوتروں میں تسلسل ظاہر کرتے ہوئے انھیں بہت کچھ قابل فہم بنا دیا ہے حجم ۱۴۱ صفحات قیمت ۱۲؍

ویشیشک درشن

یہ کتاب بھی سوتروں میں ہے اور مہرشی کناد جی کی مشہور تصنیف ہے۔ اس میں ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ سوتروں کے لفظی معنی بھی نہیں دیے گئے ہیں۔ درشنوں کے سلسلہ میں اس کا نمبر نیائے درشن کے بعد دوسرا ہے۔ پس اس کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے نیائے درشن کا مطالعہ کر لیا جائے۔

اس کتاب کو روحانی سائنس کی کتاب کہنی چاہیئے جس میں جوہر، عرض، حرکت، عام، خاص اور صفاتی تعلق کی صراحت کی گئی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انھیں چھ امور کے موافق اور مخالف صفات کے علم سے کل اشیاء کی ماہیت ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ مکتی (نجات) ہے۔ اس سلسلہ میں ایسی بہت سی ضمنی باتوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کا جاننا طالبان دھرم کے لئے ضروری ہے۔ لطیف و نازک روحانی مسائل کو جس خوبی کے اس میں حل کیا گیا ہے اس پر بے اختیار کلمہ تحسین و آفرین نکلتا ہے۔

موضوع مشکل ہے اس لئے چند مقامات میں مفہوم کا سمجھنا دشوار ہو گیا ہے۔ ہماری رائے ہے اگر نظر ثانی کے وقت کہیں کہیں مزید صراحت کے ساتھ عبارت بھی درست کر دی جائے تو سمجھنے میں زیادہ سہولت ہو۔ ظاہر ہے کہ ہندی الفاظ کی اتنی کثرت بھی اردو میں ناگوار معلوم ہوتی ہے اسکا حجم ۲۶۴ اور قیمت ۱۲؍ ہے۔

ترجمان القرآن

یہ ایک چھوٹا سا مذہبی رسالہ ہے جو ۲۰×۳۰ کی تقطیع پر مولانا ابو محمد مصلح حیدرآباد دکن کے اہتمام سے ماہوار شائع ہوتا ہے اسکی قیمت پانچ روپیہ سالانہ ہے۔ رسالہ کا مقصد قرآن اور علوم قرآنی کی اشاعت ہے۔ ہر پرچہ میں کسی مسلمان بزرگ کے سوانح حیات بھی ہوتے ہیں مضامین عموماً مولویت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ بہر حال جو حضرات قرآن اور علم القرآن کے دلدادہ ہیں ان کے لئے یہ رسالہ دلچسپ ہوگا۔

یادِ رفتگاں

پچھلے ماہ ہندوستان کے تین خاص طور پر معزز افراد رحلت گرائے عالم جاودانی ہوئے۔ ذیل میں ہم ان مرحوم محسنین کے مختصر حالات زندگی ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

سر بی۔ این۔ شرما مرحوم

۱۸۶۷ء — ۱۹۳۲ء

سرزمین اندھرا کا یہ فرزند دلبند ۱۸۶۷ء میں عالم وجود میں آیا۔ ہندو کالج وزاگاپٹم اور پریزیڈنسی کالج مدراس میں علوم و فنون کی تکمیل کرکے سب سے پہلے مدرسی اختیار کی، لیکن کچھ عرصہ بعد اس مشغلہ سے جی گھبرا گیا تو آپ وکالت کا امتحان پاس کرکے قانونی موشگافیوں کی طرف راغب ہوئے۔ قدرت نے طبعِ رسا، عقلِ فہیم اور ذکاوتِ نکتہ رس عطا فرمائی تھی اس لیئے آپ نے بہت جلد اپنے پیشہ میں ایک ممتاز درجہ حاصل کرلیا اور سیاسیات میں بھی اس قدر ترقی کی کہ کئی مرتبہ اپنے ضلع سے مدراس کونسل ماقبل از اصلاحات کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں آپ انگلستان تشریف لے گئے اور وہاں سے واپسی پر پرانی امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے غیر سرکاری ممبر منتخب ہوگئے۔ جہاں آپ کی عدیم المثال طلاقت لسانی اور بےنظیر قوت مناظرہ و مباحثہ کے لیئے ایک وسیع میدان ملا۔ ۱۹۱۳ء میں آپ نے اولین آندھرا پراونشل کانفرنس کی صدارت فرمائی۔ آپ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے سب سے پہلے ایک ذمہ دار گورنمنٹ آف انڈیا کا مطالبہ کیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں جو وفد انڈین نیشنلزم کو ترقی دینے کے لیئے ولایت گیا تھا اس کے آپ بھی ایک رکن خاص تھے۔

آپ نے اپنی محنت و جفاکشی سے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں بہت جلد ایک ممتاز پوزیشن حاصل کرلی۔ آپ ارادہ کے مستقل اور اپنی دھن کے پکے تھے۔ خودداری کے ساتھ آپ میں نمایاں طور پر احساس خود مختاری بھی تھا۔ ۱۹۱۶ء میں آپ نے مسٹر سی۔ وجے راگھواچاریہ کو شکست دی اور مسٹر سری نواس شاستری کے ساتھ مدراس کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ مالیات کے مسائل میں آپ کو یدِطولیٰ حاصل تھا، اور جب کبھی آپ کسی مالی مسئلہ پر بحث کرتے تھے تو وہ بحث نہایت سیر حاصل ہوتی تھی۔ آپ نے مختلف کمیٹیوں کے ممبر کی

حیثیت سے بھی ملک کی نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔ عرصہ دراز تک آپ ایک پرجوش کانگریسی رہے لیکن امرتسر کانگریس میں آپ نے لارڈ چیمسفورڈ کی حمایت میں ایک پرجوش تقریر کی جس کی وجہ سے آپ کی کانگریسی پوزیشن میں زوال آ گیا۔ اس واقعہ سے سات ماہ کے اندر آپ وائسرائے کی اگزیکیٹو کونسل کے ممبر مقرر ہو گئے اور ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۵ء تک اسی عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔ اس کے بعد دوسرے وائسرایوں کے بھی آپ معتمد رہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ ریلوے ریٹس ایڈوائزری کمیٹی کے چیرمین مقرر ہوئے اور اپنی حیات تک اس عہدہ پر ممتاز رہے۔ آپ میں یہ خاص بات تھی کہ آپ کسی عمدہ موقعہ کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے اور جہاں تک ہو سکتا تھا ملکی مفاد کا خیال رکھتے تھے۔ ۸۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کو ۶۵ سال کی عمر میں بمقام وزاگاپٹم آپ کا انتقال ہوا اور ملک کی ایک بہت بڑی ہستی اٹھ گئی۔

خواجہ کمال الدین مرحوم

۱۸۷۰ء ۱۹۳۲ء

آپ کی ولادت ۱۸۷۰ء میں بمقام لاہور ہوئی، آپ خواجہ عزیز الدین صاحب کے منجھلے صاحبزادے اور خواجہ عبد الرشید صاحب مشہور شاعر کے پوتے تھے۔ آپ کے جد امجد سکھا شاہی کے زمانہ میں لاہور کے قاضی تھے۔ ۱۸۹۳ء میں آپ نے بی۔ اے کا امتحان دیا اور فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئے۔ اس کے بعد چار سال تک اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسری کی پھر وہیں کے پرنسپل ہو گئے۔ ۱۸۹۷ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کر کے چھ سال تک پشاور میں پریکٹس کرتے رہے۔ ۱۹۰۳ء میں لاہور آ گئے جہاں چیفکورٹ لاہور کے نامور وکلا میں شمار ہونے لگے۔ اسی زمانہ میں آپ نے تقریباً تمام ہندوستان کی سیر و سیاحت کی اور اسلام پر متعدد لکچر دیئے۔ آپ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں کورٹ کے ممبر اور فیلو تھے۔ آپ کی وکالت خوب چلتی تھی مگر تبلیغ اسلام کا شوق آپ کو اس قدر دامنگیر ہوا کہ ۱۹۱۲ء میں اپنا کاروبار چھوڑ کر آپ یکہ و تنہا ولایت چلے گئے اور اشاعت اسلام کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ ۱۹۱۳ء میں آپ نے اپنے صرف خاص سے انگریزی زبان کا مشہور رسالہ "اسلامک ریویو" شاہجہاں مسجد ووکنگ (انگلستان) سے جاری کیا۔ ۱۹۱۴ء میں اس کا اردو ترجمہ "اشاعت اسلام" لاہور سے جاری کیا۔ ان دونوں رسالوں کی آپ نہایت قابلیت و جانفشانی سے بیس سال تک اڈیٹری کرتے رہے۔ یہ دونوں رسالے اشاعت اسلام کے لئے وقف ہیں۔ ۱۹۱۳ء میں آپ شاہجہاں مسجد ووکنگ کے امام مقرر ہوئے۔ آپ نے تقریباً سو مذہبی رسالے اور کتابیں تصنیف کی ہونگی۔ یوں تو آپ کا تعلق خاص طور پر احمدی (قادیانی) فرقہ سے تھا لیکن یورپ میں آپ

عام اسلام ہی کی تبلیغ کرتے تھے اور اس میں آپ کا طریقِ عمل مرنجاں و مرنج اور غیر فرقہ وارانہ رہا۔ آپ کی بدولت بہت سے انگریز مرد و عورت مسلمان ہوئے۔ آپ نے عمر بھر سادہ زندگی بسر فرمائی اور جو کچھ پس انداز ہو سکا وہ سب تبلیغ اسلام کے لئے وقف کر گئے ہیں۔ ۱۹۱۴ء میں جب آپ سخت علیل ہو گئے تھے آپ نے ایک ٹرسٹ بنا کر اپنی تمام جائداد جو تقریباً ۱½ لاکھ روپیہ مالیت کی ہے ووکنگ مسلم مشن کے نام وقف کر دی اور اپنی کل تصنیفات اور اسلامک ریویو کا حقِ ملکیت بھی ووکنگ مسلم مشن اور لٹریری ٹرسٹ لاہور کے نام منتقل کر دیا۔ آپ محبت و اخلاق، ایثار و تقویٰ کے مجسمہ تھے۔ آپ کی تقریر عام پسند ہوا کرتی تھی گھنٹوں بولتے رہتے تھے اور کبھی نہ تھکتے تھے

سردار شیو دیو سنگھ اوبیرائے

افسوس کہ ۲۴۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کو سردار شیو دیو سنگھ اوبیرائے ممبر انڈیا کونسل کا لندن میں انتقال ہو گیا۔ پنجاب کی سکھ جماعت کے مشہور رکن اور حکومت کے خیر خواہ تھے۔ آپ کا دولت خانہ ولایت میں بمقام پٹنی تھا۔ بظاہر صحت اچھی تھی مگر کرسمس کے قبل والی شام کو یکایک طبیعت علیل ہو گئی۔ فوراً ڈاکٹر طلب کیا گیا مگر افاقہ ہونے کے بجائے حالت رفتہ رفتہ ردی ہوتی گئی اور دو ہی گھنٹہ میں آپ رہگرائے عالمِ جاودانی ہو گئے۔ تجہیز و تکفین کی رسم ۲۸۔ دسمبر ۱۹۳۲ء کو بمقام گولڈرس گرین سکھ پنتھ کے اصول پر ادا کی گئی۔ آپ کے فرزند رشید سردار تارا سنگھ جی گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں لندن تشریف لے گئے تھے اس لئے اس افسوسناک موقع پر آپ بھی موجود تھے۔ ان کے علاوہ انڈیا کونسل کے افسران اور بڑے بڑے حکام کے قائم مقامان، مہاراجہ صاحب بردوان، مسٹر بی۔ داس ممبر اسمبلی، سر شادی لال، ڈاکٹر شفاعت احمد خاں، سینڈھرسٹ کالج کے سکھ طلبا، نمائندگان چیف پنجاب ایسوسی ایشن وغیرہ بھی موجود تھے۔ سردار صاحب کے پھول ہندوستان لائے جائیں گے۔

ڈاکٹر ہیم چندر سرکار

افسوس کہ سادھارن برہما سماج کے مشہور مبلغ ہیم چندر سرکار ایم اے۔ ڈی۔ ڈی کا طویل علالت کے بعد ماہ دسمبر ۱۹۳۲ء میں انتقال ہو گیا۔ آپ کو امریکن مدرسہ دینیات سے ڈی۔ ڈی (فاضل الٰہیات) کی اعزازی ڈگری ملی تھی اور آپ نہایت متقی اور پرجوش کارکن تھے۔ بنگالی اور انگریزی زبانوں میں آپ نے چند سوانح عمریاں اور کتب دینیات بھی تصنیف فرمائیں۔ آپکی بصارت جواب دے چکی تھی مگر آپ اپنے کام میں آخر دم تک منہمک رہے۔ آپ نے چند قابل قدر کتابیں بھی شائع کیں۔

مشاہیر عالم

امریکہ کے جدید پریسیڈنٹ مسٹر روزویلٹ

جس طرح سونا آگ میں تپ تپا کر کندن بن جاتا ہے اسی طرح انسان کی فطرت صالحہ آلام و مصائب عسرت و ناداری کی آتش استقلال آموز میں تپ کر معراج کمال کو پہونچ جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال تو زمانہ نومبر ۱۹۳۲ء میں زیر عنوان "مسٹر رامزے میکڈانلڈ وزیر اعظم برطانیہ" ہدیۂ ناظرین کرام کی جا چکی ہے آج دوسری مثال مسٹر روزویلٹ جدید پریسیڈنٹ ریاستہائے متحدۂ امریکہ کی پیش کی جاتی ہے۔

آپ کا پورا نام "فرینکلن ڈلن روزویلٹ" ہے آپ ۱۸۸۲ء میں ایک غریب و نادار امریکن خاندان میں پیدا ہوئے۔ تندہی و جانفشانی فطرت ثانیہ تھی اس پر طلب علم کا شوق۔ آپ نے ذاتی محنت اور مشقت سے پڑھ پڑھا کر تکمیل علوم و فنون کی اور وکالت کا امتحان پاس کر لیا۔ چونکہ طبیعت نکتہ رس اور عقل فہیم عطیہ قدرت تھی اس لئے آپ نے اپنے پیشہ میں بہت جلد اس قدر شہرت و اعزاز حاصل کر لیا کہ تمام امریکہ میں آپ کی قانون دانی اور طلاقت لسانی کا ڈنکا بجنے لگا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ امریکہ کے پریسیڈنٹ مسٹر تھیوڈور روزویلٹ تھے۔ انھیں کی تحریک و ترغیب سے آپ نے قانونی موشگافیوں کو خیرباد کہا اور میدان سیاسیات میں داخل ہو کر طبع رسا کے جوہر دکھانے لگے۔ تیس سال کی عمر میں آپ سٹیٹ سینٹر کے عہدۂ جلیلہ پر مامور ہوئے اور غیر معمولی انہماک و قابلیت کے ساتھ اپنے فرائض منصبی ادا کئے۔ چونکہ آپ کو مفاد عامہ کا ہمیشہ خیال رہتا تھا اس لئے آپ کی شہرت و ہر دلعزیزی میں روز افزوں ترقی ہوتی رہی حتی کہ ۱۹۱۳ء میں پریسیڈنٹ ولسن نے آپ کو فوج بحری کے نائب سکریٹری کا عہدہ سپرد کیا۔ اس عہدہ کی بڑی اہمیت اس سے معلوم ہو سکتی ہے کہ سابق صدر امریکہ مسٹر تھیوڈور روزویلٹ بھی اس پر فائز رہ چکے تھے ۱۹۲۱ء کا زمانہ آیا اور مسٹر ولسن کا عہد صدارت ختم ہو گیا۔ اس وقت مسٹر روزویلٹ کا اثر سیاسی دنیا میں اس قدر تھا کہ ان کا جدید پریسیڈنٹ منتخب ہو جانا کچھ بھی مشکل نہ تھا لیکن بدقسمتی سے عین اُسی زمانہ میں ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ علاج معالجہ سے خیر جان تو بچ گئی لیکن ان کا ایک پاؤں ہمیشہ کے لئے بیکار ہو گیا جس سے وہ چھڑی کے سہارے نقل و حرکت پر مجبور ہو گئے۔

نیز پچھلے انتخاب کے دوران میں بھی آپ کے مخالفین نے اس بات پر بہت زور دیا کہ ایک

لنگڑے آدمی کو جمہوریہ امریکہ کا صدر منتخب نہ ہونا چاہیئے کیونکہ وہ ضرورت کے وقت ملکی خدمت میں معمولی دوڑ دھوپ سے بھی معذور ہیں۔ لیکن آپ کے حامیوں نے یہ جواب دیا کہ ایک چلتے ہوئے دماغ کو پاؤں کی ضرورت نہیں ہے وہ اپنا سب کام دوسروں کے ہاتھ پاؤں سے کرا لیگا۔

بہرحال فالج سے صحت یابی کے بعد مسٹر روزویلٹ نے پھر وکالت شروع کردی لیکن اس مرتبہ آپ نے اپنی وکالت کے ساتھ پبلک خدمات کا سلسلہ بھی جاری رکھا اور جب ۱۹۲۴ء میں انتخاب صدر کا مسئلہ پھر شروع ہوا تو آپ نے مسٹر آل اسمتھ کی زبردست حمایت کی، اُن کی تائید میں بہت سی دھواں دھار تقریریں کیں۔ چنانچہ جب مسٹر موصوف منتخب ہوگئے تو ان کی نظروں میں مسٹر روزویلٹ جان سے زیادہ عزیز ہوگئے۔

۱۹۲۸ء میں جب ریاست نیویارک کی گورنری خالی ہوئی تو مسٹر روزویلٹ کے احباب نے آپ کو اس عہدہ کے لئے تجویز کیا چونکہ آپ بہت ہردلعزیز ہیں اس لئے آپ کے مخالفین کی کچھ پیش نہ گئی اور آپ نیویارک اسٹیٹ کے گورنر ہوگئے۔ آپ نے اس عہدۂ جلیلہ کی پبلک خدمات اس خوبی اور خوش اسلوبی سے انجام دیں کہ تمام امریکہ کے دل میں گھر کرلیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جدید انتخاب صدر میں آپ کو ایسی شاندار کامیابی حاصل ہوئی کہ مسٹر ہوور کے مقابلے میں آپکو اہل امریکہ کے آٹھ لاکھ ووٹ زیادہ ملے۔ اب آپ ۴۔ مارچ آیندہ سے جمہوریہ امریکہ کی صدارت کا چارج لے لیں گے۔

مسٹر روزویلٹ ایک زبردست سیاست داں اور خاص قابلیت کے مدبر ہیں۔ معمولی حیثیت سے ترقی کرکے امریکہ کا پریسیڈنٹ بنجانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ لیکن جب خدا کی مہربانی ہوتی ہے تو قسمت بھی یاوری کرتی ہے۔ آپکی زندگی اُن لوگوں کے لئے جو ترقی کرنیکی طلب صادق رکھتے ہوں ایک نمونہ ہے۔

نوٹ:۔ اب معلوم ہوا ہے کہ ریاست ہائے امریکہ نے کثرت رائے سے اپنے دستور اساسی میں ترمیم کردی ہے جسکی رو سے نومبر کے انتخابات کے بعد کانگریس کا پہلا اجلاس اکتوبر کے بجائے ۲۔ جنوری کو منعقد ہوا کرے گا اور نئے پریسیڈنٹ اور وائس پریسیڈنٹ ۴ مارچ کے بجائے ۲۰۔ جنوری کو حلف لیا کریں گے۔ چنانچہ اب پریسیڈنٹ روزویلٹ ۲۰۔ جنوری ۱۹۳۳ء کو اپنے عہدہ کا چارج لے لیں گے۔ ایڈیٹر

عالمِ نسواں

اِس تحت میں وقتاً فوقتاً طبقۂ نسواں کی اصلاح و ترقی کی ضروری خبریں ہدیۂ ناظرینِ زمانہ کرنے کا خیال ہے، اِس دورِ انقلاب میں جبکہ قدیم معاشرت کی پرانی عمارتیں ہر طرف سے رفتہ رفتہ منہدم ہو رہی ہیں، عورتوں کے ذہنی معیار، اُنکے نقطۂ نظر، خیالات اور روزمرہ زندگی میں جو تغیّرات عظیم رونما ہو رہے ہیں اُن سے کسی ذی ہوش اہلِ ملک کو بے خبر نہ رہنا چاہیئے۔ ہمکو امید ہے کہ ناظرینِ زمانہ کیلئے یہ عنوان نہایت دلچسپ ہو گا۔ ایڈیٹر

آل انڈیا لیڈیز کانفرنس کا ساتواں جلسہ ۲۹۔ دسمبر ۳۲ء کو قیصر باغ لکھنؤ میں لیڈی نیلکنٹھ کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ مختلف مقامات سے نامور خواتین شریک جلسہ ہوئیں، جن میں خاص طور پر قابلِ ذکر رانی لکشمی بائی (گوالیار) ڈاکٹر مسز میتھو لکشمی ریڈی (مدراس) لیڈی فرامجی، اور مسز ہنسا مہتہ (بمبئی) ہیں۔ بیگم وسیم صاحبہ صدر مجلس استقبالیہ نے اپنے خیر مقدمی ایڈریس میں منجملہ دیگر امور کے صیغۂ تعلیم سے تعلیم نسواں کے لئے کافی رقم کا مطالبہ کرتے ہوئے موجودہ طریقۂ تعلیم سے بحث کی اور نظامِ معاشرت میں انقلاب کی ضرورت پر زور دیا۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ خواتین کو سیاسی اُلجھاؤ میں نہ پڑنا چاہیئے۔ لیڈی نیلکنٹھ صاحبہ نے اپنی صدارتی تقریر میں ارشاد فرمایا کہ جہیز کی رسم، شادی بیوگان سے گریز، کثرتِ ازدواج اور طلاق کی عدم موجودگی ہندوستانی عورتوں کی ترقی میں سدِ راہ ہیں۔ آپ نے تفریقِ ذات کو اِن تمام خرابیوں کی بنیاد قرار دے کر ان کا واحد علاج تعلیم نسواں تبلایا۔ موجودہ طریق مناکحت پر نکتہ چینی کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ یہ اخلاق اور انسانیت دونوں کے خلاف ہے کہ لڑکے اور لڑکی سے مشورہ کئے بغیر زن و شو کے تعلقات قائم کر دیئے جائیں۔ آپ نے عورتوں کے لئے بعض مزید حقوق کی بھی وکالت کی، اور قانون وراثت کی ترمیم اور لڑکیوں کی لازمی تعلیم کی ترویج پر زور دیا۔

راجکماری امرت کنور، مسز آصف علی، بیگم حبیب اللہ، مس خدیجہ بیگم، بیگم فیروز الدین، سکینہ بیگم، حاجیہ تاج بیگم، مسز برج لال نہرو، مسز ہنسا مہتہ، ڈاکٹر ریڈی صاحبہ، ڈاکٹر مسز سکھ ٹھنکر، مسز سروجنی مہتہ، مسز دلیش پانڈے، مسز امتیاز فاطمہ، مسز فریدون جی نے اس کانفرنس میں سرگرم حصہ لیا۔ اور مخلوط طریقۂ انتخاب، عورتوں کیلئے حقِ طلاق اور ضبطِ تولید (برتھ کنٹرول) کے ریزولیوشن پاس ہوئے۔ اس اجلاس میں "انجمن ترقیِ نسواں" کی طرف سے ایک یادداشت بھی پیش کی گئی جس میں عورتوں کی طرف سے حسب ذیل مطالبات درج تھے:۔

(۱) جائداد کی ملکیت اور ذرائع معاش کے متعلق عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق حاصل ہوں۔

(۲) عورتوں کے مساوی کام کی مساوی اجرت دی جائے۔

(۳) باکار و بیکار دونوں قسم کی عورتوں کے لئے خاص اوقات میں مخصوص رعایتیں دیجائیں، مثلاً زمانۂ زچگی

میں با تنخواہ رخصت ملے، طبی امداد مفت ہو، سات گھنٹے سے زائد کام نہ لیا جائے، اور رات کے وقت اور مضر صحت حالات میں کام نہ لیا جائے۔

(۴) عورتوں کو بھی مساوی سیاسی حقوق دیئے جائیں اور ووٹ کے حق کے لئے دولت کی قید اٹھا دی جائے۔

(۵) عورتوں کو بھی فسخ نکاح کا حق دیا جائے۔ اور بچوں کی پرورش کے لئے نان و نفقہ دلایا جائے۔

(۶) ضبط تولید اور پرورش بچگان کے متعلق ہدایات کا انتظام کیا جائے۔

(۷) میڈیکل نگرانی میں اسقاط حمل کی اجازت دی جائے۔

ہم ان تمام باتوں پر کوئی رائے زنی کرنا نہیں چاہتے ہیں، اور گو اس پروگرام کی کئی مدیں بحث طلب ہیں تاہم اس میں شک نہیں کہ کئی مطالبات ایسے اہم اور ضروری ہیں کہ انھیں اہل ملک اور گورنمنٹ دونوں کو فوراً مان لینا چاہیئے۔

ملک میں اعلیٰ تعلیم نسواں کا رواج ترقی پر ہے۔ اس طرف کئی سال سے ملک کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے کئی کئی لیڈی گریجویٹ فارغ التحصیل ہو کر سندیں لیتی ہیں۔ صوبۂ متحدہ کی گورنمنٹ کو عورتوں کی اعلیٰ تعلیم پر توسیع و ترقی کا کافی خیال ہے چنانچہ آنریبل وزیر تعلیمات نے امسال صوبے کی ایک ہندوستانی خاتون کو انگلستان جا کر فن تعلیم میں درجۂ فضیلت حاصل کرنے کا موقع دیا ہے۔ گورنمنٹ تعلیمی اخراجات کے علاوہ تقریباً دو سال تک ۲۱۶ دو سو سولہ پونڈ سالانہ کے حساب سے وظیفہ دیگی۔ اس کے متعلق تمام درخواستیں ۲۵۔ فروری ۳۲ء تک صاحب ڈائرکٹر تعلیمات صوبۂ متحدہ الہ آباد کے نام آنا چاہیئے۔

آنریبل وزیر تعلیمات صوبۂ متحدہ کی اہلیہ محترمہ مسز کیلاش سریواستویہ صاحبہ قانونی کونسل صوبۂ متحدہ کی نامزدہ ممبر کی حیثیت سے عورتوں کی اصلاح و ترقی کی بہت سی تجویزیں کونسل میں پیش کر چکی ہیں، آپ ہی کی کوشش سے صوبہ کی میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں نامزدگی کے ذریعہ لیڈی ممبروں کی شمولیت کا قانون پاس ہوا ہے۔ چنانچہ آگرہ و اودھ کے ہر میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ میں کم سے کم ایک لیڈی ممبر نامزدہ سرکار موجود ہے۔ کانپور کے تازہ انتخاب میونسپل بورڈ میں دو لیڈیاں عام حلقۂ انتخاب سے ممبر منتخب ہوئی ہیں اور ایک لیڈی سرکاری نامزدہ ممبر ہے۔ اس طرح شہر کانپور کے انتظامات میں تین خاتونوں کو دخل دیا گیا ہے۔ اور کانپور میونسپل بورڈ نے مسز سوشیلا دیوی سریواستویہ کو اپنا نائب صدر منتخب کیا ہے۔

تعارفِ شاعری

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش، ایم۔ اے)

(۱)

شاعری کیا ہے؟ معمہ ہے ابھی تک راز ہے
ہم سے پوچھو تو کہیں گے عشق کی آواز ہے

تارِ دل پر رقصِ مضرابِ بتِ طناز ہے
دستِ شاہد میں ربابِ عاشقِ جانباز ہے

لغزشِ مستانۂ رندانِ محشر ساز ہے
ایک تمہیدِ قیامت حشر کا آغاز ہے

یا حریمِ حسن میں اک شوق دست انداز ہے
شاعری اس شوق کا چھپنا ہوا اک راز ہے

حسن و خوبیِ نہاں کا ایک افشا راز ہے
مادی نغموں کے اندر روح کی آواز ہے

مرغِ جاں قیدِ قفس میں محوِ سوز و ساز ہے
طائرِ دل یادِ حق میں زمزمہ پرداز ہے

عشق کے جذبوں کی کروٹ حسن کا انداز ہے
شاعری اک سحر ہے جادو ہے یا اعجاز ہے

حسنِ نازاں کے لئے آغوشِ عاشق باز ہے
شاعریِ دلچسپ تصویرِ نیاز و ناز ہے

پیکِ چشمِ ناز کھا کر سبزہ زارِ عشق میں
خون آلودہ غزالِ دل کی جست و تاز ہے

شعلہ ہائے دل کا مظہر مدفنِ سوزِ نہاں
گرم جوشوں کے لئے سامانِ آتش باز ہے

شاعرِ درد آشنا کی ہے یہ فریاد و فغاں
جوشِ ہمدردی میں اک ڈوبی ہوئی آواز ہے

شاعری یادِ خدا ہے دیکھ کر قدرت کی شان
مظہرِ عالم میں دیدِ عکسِ عالم ساز ہے

شاعری ہے حبسِ تن میں بال جنبانیِ روح
جانبِ حق بازِ جاں کی حسرتِ پرواز ہے

یا کہ ہے یہ نیم شب میں آسماں سے گفتگو
نطقِ دردِ دل ہے اپنے شوق کا اعجاز ہے

شاعری ہے چوم لینا غنچہ و گل برگ و بار
یادِ بوئے یار میں اک مضطرب انداز ہے

شاعری اک نغمۂ کیفِ دلِ مدہوش ہے
واہ کے اندر سوز ہے اور دل کے باہر ساز ہے

(۲)

شاعری کیا ہے؟ بیانِ دلِ رقت انگیز
اپنے جذباتِ لطیفہ کا بیان دل آویز

یا کہ اسپِ دلِ مجروح کی ہے جست و خیز
کھائی میں عشق کی اور درد کی جس نے مہمیز

یا کہ یہ ضبط شکن جذبہ کا اک نعرہ ہے
زلزلہ خیز ہے جو اور ہے محشر انگیز

یا کہ یہ حسن و صداقت کی ہے داد و تحسین
عاشقِ زار کے نغموں کی صدا دل آویز

یا کہ ہے مشعلِ تمیزِ بد و نیکِ جہاں
دورِ ظلمت میں ہے اک شعلۂ دل جلوہ ریز

یا کہ یہ شاعرِ ہمدرد کی غمخواری ہے
بن کے جو نکلی ہے فریاد و فغاں غم انگیز

حالتِ خواب میں یہ روح کی اک کروٹ ہے
مرغِ جاں ہوئے خدا پا کے ہوا زمزمہ ریز

کہنے والے کے لئے چارۂ بیتابیِ دل
سننے والے کے لئے درد فزا نشترِ تیز

زندہ دل راہیِ صادق کو ہے شورِ "لبیک"
سونے والوں کے لئے ایک صدائے برخیز

شاعری کیا ہے؟ دلِ حسن طلب کی تنقید
دفترِ حسن پہ عاشق کی نوشتہ تمہید

کلامِ ریاضؔ

مرے دل کے ارمان مر کر نہ نکلے
جو دل میں چبھے پھر وہ نشتر نہ نکلے

کلیم آئے تو کھل کے جلوہ دکھایا
ہم آئے تو پردہ سے باہر نہ نکلے

ہماری نظر حشر میں شیخ پر تھی
وہ سر پر لئے حوضِ کوثر نہ نکلے

چمن میں جو ہم آئے چھٹ کر قفس سے
مہینوں نشیمن سے باہر نہ نکلے

نہ بولے کوئی کوہکن کی لحد پر
کہیں لے کے دیوانہ پتھر نہ نکلے

رہا ہے جو اس دل میں ہنگامہ آرا
وہی جلوہ آرا ہے محشر نہ نکلے

نشیمن میں گزرے کئی موسمِ گل
قفس میں جو ٹوٹے تھے وہ پر نہ نکلے

یہ بت ہاتھ آئیں تو ہیں نرم و نازک
ٹٹولا جو ان کو تو پتھر نہ نکلے

بٹھایا ریاضؔ اس طرح ضعفِ دل نے
بہار آئی ہم گھر سے باہر نہ نکلے

مُطربہ

(از جناب فطرت واسطی اسسٹنٹ ایڈیٹر شاہکار)

چل رہی ہیں مطربہ کی انگلیاں کس جوش میں ۔۔۔ کیف کی دنیا لیئے بیٹھی ہے وہ آغوش میں

چھیڑتی ہے تارِ بربط کچھ عجب انداز سے ۔۔۔ پھونکتی ہے رُوح اُنمیں اک ادائے ناز سے

بھر رہی ہے وہ نوائے ساز میں اک برقیت ۔۔۔ مرتعش ہیں تارِ آہن جاگ اُٹھی موسیقیت

گاہ نغمہ کو ملاتی ہے صدائے ساز سے ۔۔۔ گاہ اونچے سر میں تانیں بھرتی ہے انداز سے

گاہ مدھم سر میں دکھلاتی ہے وہ تکمیلِ فن ۔۔۔ گاہ بھرتی ہے کھرج کس شان سے وہ سیمتن

ساز سے آوازِ نغمہ اتنی ہم آواز ہے ۔۔۔ ساز ہے بے مطربہ، یا مطربہ بے ساز ہے

معجزہ ہے مطربہ کی حکمرانی ساز پر ۔۔۔ تارِ بربط کہتے ہیں لبیک ہر آواز پر

یہ نوازش کا کرشمہ ہے کہ معراجِ غنا ۔۔۔ ذرہ ذرہ وجد میں ہے رقص میں موجِ صبا

مطربہ ورد آشنا ہے شاعری کی جان ہے ۔۔۔ شاعروں کے دل سے پوچھو جنکا یہ ایمان ہے

روح پرور لَے سے اُسکی اک جہاں مسحور ہے

مطربہ، یا ساحرہ، یا آسمانی حور ہے

چاند یا پھول

(از جناب طالب چکوالی، بی-اے-ایل ایل-بی)

یاسمیں زارِ فلک میں دو ستارے، ایک رات
محوِ سرگوشی تھے، کیا شے ہے جہاں میں ماہتاب؟
کیا یہ بحرِ نورِ یزداں کا ہے نورانی حباب؟
نور سے جس کے منور ہے فضائے کائنات!

چھاؤں میں تاروں کی سارے قمقمے افلاک کے
مستِ صہبائے منور، مجھ کو کرتے ہیں سلام
کہتے ہیں تجھ کو خبر ہے آسماں کی لاکلام
بھید سب تجھ پر عیاں ہیں عالمِ ادراک کے

چاند کیا ہے؟ کچھ بتا معلوم ہے تجھکو اگر
دلنوازی اسمیں کیوں ہے پھول سی نزہت ہے کیوں؟
ہے تعجب پھول کی بھی چاند سی فطرت ہے کیوں؟
یہ ہوا پیدا زمیں سے اور فلک ہے اس کا گھر!

اِک صدائے نرم و شیریں مثلِ آوازِ سروش
دل کی گہرائی میں اُتری سوزِ نغمہ کی طرح
سازِ دل کو اُس نے چھیڑا لطفِ زخمہ کی طرح
اور میں سب کچھ سمجھ کر بھی تھا مثلِ گل خموش

گل زمیں کا چاند ہے اور مہ فلک کا پھول ہے
پھول میں خوشبو ہے جو وہ چاند میں ہوتی ہے ضو
عکس گل مہتاب ہے اور عکسِ مہ گل نو بنو
بھید کچھ ان میں سمجھتا ہے جو اسکی بھول ہے

حُسن دونوں کو ملا ہے ایک ہی دربار سے
ایک ہی در کے ہیں دونوں خادمانِ نُور فام
ایک ہی نورِ ازل ہے جس کا طالب فیضِ عام
ہے عیاں مہتاب سے، گل سے، مرے اشعار سے!

آخری گناہ

(از حضرت مرزا یگانہ لکھنوی)

کعبہ کی طرف دوڑ کے سجدہ کرلوں   یا دَیر کا آخری نظارہ کرلوں
کچھ دیر کی مہمان ہے جاتی دنیا   اِک اور گنہ کرلوں کہ توبہ کرلوں

(نیرنگ دہلی)

جذبات فراق

(از مسٹر رگھوپت سہائے فراق ایم۔ اے۔ الہ آباد یونیورسٹی)

منتشر ہو تو سراپردۂ امکاں ہو جائے
درد ہستی جو مجسم ہو تو انساں ہو جائے

دلِ پُر داغ جو کھل جائے گلستاں ہو جائے
خاکِ حسرت اگر اڑ جائے بیاباں ہو جائے

ہم رہیں ہوش میں تو ہوش ہی زنداں ہو جائے
جوشِ وحشت ہو تو وحشت ہی بیاباں ہو جائے

ہائے رے بوالعجبی عرصہ گہِ ہستی کی
کبھی دنیا کبھی صحرا کبھی زنداں ہو جائے

سہل ہو کر ہوئی دشوار محبت تیری
اسے دشوار بنالیں تو کچھ آساں ہو جائے

نیک و بد دور رہا، علم و ہنر دور رہے
ہم یہ کہتے ہیں کہ بس آدمی انساں ہو جائے

عشق کو عرضِ تمنا میں بھی اتنی پس و پیش
حسن کے واسطے انکار بھی آساں ہو جائے

یاد آتی ہے جب اپنی ہیں تڑپ جاتا ہوں
میری ہستی ترا بھولا ہوا پیماں ہو جائے

کچھ مداوا بھی ہو مجروح دلوں کا اے دوست
مرہمِ زخم ترا جور پشیماں ہو جائے

ہاں تری چشم سیہ مست پہ ایماں اپنا
آہ ایماں ہی اگر دشمنِ ایماں ہو جائے

خیر ہم ہوش سنبھالیں سرِ محفل لیکن
کیوں جنوں خیز ترا عشوۂ پنہاں ہو جائے

وصل اور ہجر یہی ہے کہ محبت تیری
بن کے اک خوابِ گراں خوابِ پریشاں ہو جائے

در و دیوار نہیں اب ستمِ یار نہیں
ہم یہ کہتے ہیں بیاباں سے کہ زنداں ہو جائے

ہائے نیرنگیٔ پیراہنِ وحشت کہ جسے
پھاڑیے تو جیب ہے، دیکھیے تو گلستاں ہو جائے

رُک گئی راہِ جنوں راہ کی آسانی سے
ہائے وہ وسعتِ صحرا ابھی کہ زنداں ہو جائے

یہ بھی سچ ہے کوئی فرقت میں پریشاں کیوں ہو
یہ بھی سچ ہے کوئی کیونکر نہ پریشاں ہو جائے

عشق کا شکوۂ معصوم کرے کیا اس وقت
اپنی فطرت پہ اگر حسن پشیماں ہو جائے

ہوش و غفلت سے بہت دور ہے کیفیتِ عشق
جس کی ہر بے خبری منزلِ عرفاں ہو جائے

رخصتِ مستی بھی محبت میں ہے اک بارِ گراں
اس سے ملنا ہے اگر بے سر و ساماں ہو جائے

عشق اب بھی ہے وہی محرمِ بیگانہ نما
حسن یوں لاکھ چھپے لاکھ نمایاں ہو جائے

جھلملاتی ہے سرِ بزم جہاں شمعِ خودی
جو یہ بجھ جائے چراغِ رہِ عرفاں ہو جائے

ہم تو جیتے ہیں کسی اور ہی عالم میں فراق
دل کو ہونا ہے پریشاں تو پریشاں ہو جائے

علمی خبریں اور نوٹ

کچھ دنوں سے اردو رسالوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے چنانچہ ۱۹۳۲ء میں مندرجہ ذیل نئے رسالے جاری ہوئے :-

لاہور سے : گلچیں ۔ یادگار ۔ موج بہار ۔ الماس ۔ جہانگیر ۔ فانوس ۔ کارواں ۔

کلکتہ سے : آئینہ ۔ فلم اسٹیج ۔ حیدرآباد دکن سے : سفینۂ نسواں ۔ ترجمان القرآن ۔

دہلی سے : کامیاب ۔ آئینہ ۔ آگرہ سے : ندیم امرتسر سے : کندن ۔

ملتان سے : بولتی تصویر جلندھر سے : مسلمہ ۔ گورداسپور سے : پاسبان

فیروزپور سے : ریاض لکھنؤ سے : میخانہ مظفر نگر سے : حکیم الہند کراچی سے : زبان ہند

ان کے علاوہ بہت سے رسالوں نے اعلیٰ اعلیٰ سالنامے شائع کئے ہیں جس زبان میں اتنے رسالے شائع ہوں اُسکی ترقی میں بظاہر کس کو شک ہو سکتا ہے ۔ لیکن بند ہونے والے یا اشاعت ملتوی کرنے والے پرچوں کی تعداد بہت ہے ان کی مفصل فہرست یہ ہے :-

الماس لاہور ۔ گلچیں لاہور ۔ خیالستان لاہور ۔ حسن خیال میرٹھ ۔ تنقید کلکتہ ۔ طور دہلی ۔ نقاش میرٹھ ۔ عفت دہلی ۔ الایمان دہلی ۔ چمن امرتسر ۔ ادب لکھنؤ ۔ کائنات لاہور ۔ جام جہاں نما لکھنؤ ۔ مبصر لکھنؤ ۔ رفیق بلند شہر ۔ تفریح بجنور ۔

پچھلے نمبر میں ہم نے اردو رسائل کی بے بضاعتی کا کچھ حال لکھا تھا ۔ حال ہی میں ہمارے ایک نامور دوست نے جو اردو کے مشہور و معروف مصنف ہیں اور دو سال سے ایک اعلیٰ درجہ کا دلچسپ رسالہ شائع کر رہے ہیں ہمکو لکھا ہے کہ

اس رسالے نے "دو سال میں خون چوس لیا" پانچ ہزار سے زیادہ کا نقصان ہوا ۔ اب دم نہیں ہے لوگوں نے تعریفیں بہت کی ، مگر اس تعریف کی قیمت سخت تھی ، آخر ہمت ہار بیٹھا ، میرا تو یہ خیال ہو گیا ہے کہ اعلیٰ درجہ کے پرچوں کے لئے کوئی میدان ہی نہیں ہے ، پست مذاق کی چیزیں لکھئے ، جو کچھ آجائے رطب و یابس چھاپ دیجئے ، گرے ہوئے حملے کیجئے ، پھر خریداروں کی کمی نہیں لیکن پاکیزہ مذاق کی چیزیں ہوں تو کوئی پروا نہ کرے گا ۔ ہاں چھپا چھپا کر مفت بانٹتے جائیے ۔ لینے والے بہت نکل آئیں گے ۔

قدردانان امور کے لئے یہ حالت ناقابل برداشت ہونا چاہیئے ۔ جب تک یہ حالت قائم رہیگی اردو ادب کی خاطر خواہ ترقی ناممکن ہے

دوسری زبانوں کی علمی و ادبی ترقیوں کا کیا معیار ہے، ممالک غیر میں کس پیمانہ پر علم و ادب کی اشاعت ہو رہی ہے؟ اور اولوالعزم قومیں اس میدان میں کیا کر رہی ہیں، اس کا کچھ حال جمہوریہ روس کے سرکاری دارالاشاعت کی کارگزاریوں سے معلوم ہو سکتا ہے۔ پانچ سال گذشتہ کا واقعہ ہے کہ ۱۹۲۷ء میں سویٹ اسٹیٹ ایڈیٹوریل آفس نے چار ہزار مختلف موضوعات پر سات کروڑ چالیس لاکھ کتابیں شائع کی تھیں جن کی مجموعی لاگت کا اندازہ تین کروڑ چالیس لاکھ روبل (روسی سکہ) کیا گیا ہے۔ صرف ایک مصنف میکسیم گورکی کی بیس لاکھ جلدیں طبع کی گئی تھیں۔

اس ماہ کے ماڈرن ریویو نے وھٹیکر المانک ۱۹۳۳ء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اکتوبر ۱۹۳۱ء لغایۃ ستمبر ۱۹۳۲ء میں انگلستان میں ۱۴۵۶۴ نئی کتابیں شائع ہوئیں، اس کے مقابل میں تمام ہندوستان میں ۳۰-۱۹۲۹ء میں انگریزی و دیگر یوروپین زبانوں میں ۲۲۳۲ کتابیں اور مختلف ہندوستانی زبانوں کی ۱۵۰۱۴ کتابیں شائع ہوئیں۔ اس کے مقابلے میں بنگال کی کیفیت ملاحظہ ہو جس کی ادبی ترقی کی ہندوستان بھر میں دھوم ہے۔ اور جس کی آبادی بھی برطانیہ کلاں اور آئرلینڈ سے زیادہ ہے، بنگال میں ۳۱-۱۹۳۰ء میں ۵۳۲۴ مطبوعات شائع ہوئے جن میں ۳۹۰۳ کتابیں اور ۱۴۲۱ رسالے تھے کتابوں میں ۳۷۵۰ جدید مطبوعات اور ۱۴۵ مکرر ایڈیشن تھے۔ کل مطبوعات میں سے ۷۷۵ کتابیں سررشتہ تعلیم سے متعلق تھیں۔ ہمعصر ماڈرن ریویو تمام حسابات لگانے کے بعد لکھتا ہے کہ سال بھر میں بنگال کے لٹریچر میں مستقل دلچسپی کی صرف ۱۴۷ کتابیں شائع ہوئیں جس کا مطلب یہ ہے کہ بنگال جس کی آبادی برطانیہ و آئرلینڈ کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہے، ان ممالک میں شائع ہونیوالی کتابوں کی تعداد کا صرف ⅟۱۰۰ حصہ شائع کرتا ہے اور حجم و نوعیت وغیرہ کے لحاظ سے نظم و افسانہ کی معدودے چند کتابوں کو چھوڑ کر بنگال اور برطانیہ کی ادبی ترقی کا کوئی موازنہ ہو ہی نہیں سکتا۔

اب جاپان کے اخباروں کی ترقی کا حال سنیئے۔ جاپان کی آبادی تقریباً ۶½ کروڑ ہے لیکن اس ترقی یافتہ ملک میں ۱۱۳۷ روزانہ اخبارات اور ۲۰۵ ہفتہ وار و ماہوار رسالے شائع ہوتے ہیں۔ اس میں سے دو روزانہ اخبار "اوساکا نیچی" کے تیرہ لاکھ اور "ٹوکیو اساہی" کے بیس لاکھ خریدار ہیں۔ ایک اور اخبار "ٹوکیو نیچی نامی" کی آٹھ لاکھ اشاعت ہے ان اخباروں کی مالی حالت کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ چھ سال ہوتے "اوساکا مے نیچی" کی کمپنی نے اپنے اخبار کے لئے بتیس ۳۲ لاکھ روپیہ کی لاگت سے اوساکا میں ایک عظیم الشان عمارت تیار کرائی تھی "ٹوکیو نیچی" کی عمارت بھی ایسی ہی ہے "اساہی" کمپنی نے بھی ٹوکیو میں تقریباً اڑتیس ۳۸ لاکھ روپیہ کی لاگت سے ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک ہشت منزلہ عمارت تعمیر کرائی ہے ۱۹۲۵ء میں "مے نیچی" کمپنی نے اپنا ہوائی جہاز تمام جاپان پر اڑایا جس کے مقابلہ میں اساہی کمپنی نے اپنا ہوائی جہاز جاپان سے پورپ ... روس کے راستہ سے برلن تک بھیجا تھا "مے نیچی" کمپنی نے ٹوکیو اور اوساکا کے درمیان سلسلۂ مراسلات قائم کرنے کے لئے پانچ ہوائی جہاز خریدے تو اس کے جواب میں اساہی کمپنی نے ایک پورا ہوائی بیڑہ قائم کر دیا۔ اور ۱۹۲۳ء میں جب جاپان میں ہولناک زلزلہ آیا اور سلسلۂ مراسلات بند ہو گیا تو "مے نیچی" کمپنی نے خبریں

فراہم کرنے کے لئے سات لاکھ روپیہ صرف کیا اور ہوائی جہازوں سے خبریں منگوائیں اور نامہ بر کبوتروں سے بھی کام لیا۔ "اساکا مے نچی" کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں ۴۵۰ آدمی ہیں، دفتر میں ۲۰ کمپوزیٹر اور صیغہ طباعت میں ۴۵۰ آدمی اور صیغۂ جہاز میں ۲۹۵ آدمی یعنی کل ۲۴۶۵ آدمی کام کرتے ہیں۔ اساہی کمپنی میں بھی اسی کے قریب آدمی ہیں۔

ان کمپنیوں کے جو اخبار چھپتے ہیں وہ اس قدر کثیر التعداد ہیں کہ ان کا ٹائپ ایک ہی مرتبہ کے استعمال میں گھس جاتا ہے۔ اس لئے کارخانہ میں ٹائپ ڈھالنے کے آٹھ آٹھ کارخانے جاری ہیں۔ دونوں کارخانوں میں اعلیٰ قسم کی ۱۵-۱۵ روٹری مشینیں چلتی ہیں جاپانی اخبارات کی آمدنی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مے نچی کمپنی کو ایک سال میں اشتہارات سے ایک کروڑ ۲۳ لاکھ اور خریداروں سے پونے دو کروڑ روپیہ کی آمدنی ہوئی۔ اور مصارف نکالکر ۶ لاکھ روپیہ خالص منافع ہوا۔ جاپانی اخبار نویسوں کے اثر اور وقعت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ گو جاپان کے سرکاری وزراء کو ۱۶ ہزار سے بھی کم تنخواہ ملتی ہے لیکن مے نچی کے چیف ایڈیٹر کی سالانہ تنخواہ چالیس ہزار روپیہ ہے۔

اب برطانیہ کی نوآبادیوں کے علمی ذوق کا بھی کچھ حال سن لیجئے کناڈا میں اس وقت ستانوے روزانہ اخبارات ہیں جن کی اشاعت بارہ لاکھ یومیہ ہے۔ ان روزانہ اخباروں میں پچیس ہزار آدمی روزانہ کام کرتے ہیں جن کو تیس لاکھ پونڈ ادا کیا جاتا ہے۔ سولہ لاکھ پونڈ ہر سال خبریں چھاپنے پر خرچ ہوتا ہے۔ اور تقریباً اسی لاکھ پونڈ اخباروں پر خرچ کیا جاتا ہے۔ اسی لاکھ پونڈ سے ایک کروڑ پونڈ تک عمارات اور دیگر ضروری سامان پر خرچ ہوتا ہے۔

کیلیفورنیا کے اخبار نویسوں کی انجمن کو حال میں یہ دلگی سوجھی کہ انھوں نے اپنے خریداروں سے یہ دریافت کیا کہ عورت اور اخبار میں کون کون سی باتیں مشترک ہیں۔ بہترین جواب کے لئے ایک خاص انعام بھی مقرر کیا گیا چنانچہ بہت سے لوگوں نے دماغ لڑا لڑا کر جوابات بھیجے مگر انعام کا مستحق وہ شخص قرار دیا گیا جس نے لکھا تھا کہ عورت اور اخبار کی یکساں کیفیت ہے اور جس طرح ہر شخص کی خاص عورت ہونا چاہیئے اسی طرح ہر شخص کو اپنے لئے ایک خاص اخبار خریدنا چاہیئے۔ کیونکہ ہمسایہ کسی اور شناسا کی عورت یا اخبار سے واسطہ رکھنا بعید از شرافت ہے۔

بعض دوسرے اصحاب نے بھی بہت معقول جوابات لکھے ہیں جن کو اس انجمن نے خاص طور پر پسند کیا ہے۔ مثلاً ایک صاحب نے لکھا ہے کہ عورت اور اخبار دونوں کی یکساں خصلت ہے۔ دونوں کو ہر وقت نئی نئی خبروں کی تلاش رہتی ہے اور جو کچھ ان کو معلوم ہو جاتا ہے اس کو دوسروں سے بیان کئے بغیر انھیں چین نہیں آتا۔ ایک اور صاحب نے لکھا ہے کہ جس طرح عورت کے بشرے سے اُس کے اندرونی جذبات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اخبار کے مضامین ایڈیٹر کے خیالات کا آئینہ ہوتے ہیں۔ ایک اور ستم ظریف نے لکھا کہ دونوں یکساں ضروری ہیں اور گو بعض اوقات بیبیاں تکلیف دہ اور باعثِ اختلاف ثابت ہوتی ہیں لیکن ان کے بغیر گذر نہیں ہوتا۔ یہی حال اخباروں کا ہے کہ ان کے بعض مضامین کتنے ہی ناپسندیدہ ہوں لیکن فی زمانہ کوئی آدمی انھیں پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ہم کو یہ سنکر بہت افسوس ہوا کہ ہمارے مکرم دوست اور زمانہ کے پُرانے مضمون نگار مسٹر ہرگوند پرشاد صاحب نگم ایم۔ اے دہلوی صرف ۵۲ سال کی عمر میں ۲۰ دسمبر ۱۹۳۲ء کو رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے۔ مرحوم ایک نیک نفس اور صلح کل محب وطن تھے۔ مرنجاں مرنج طبیعت پائی تھی اور ہندو مسلمان عیسائی سبھی سے اُن کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے۔ دوستوں کی خاطرداری کا خیال اور وطن عزیز کی خیرخواہی ان کی طبیعت ثانی ہوگئی تھی۔ ایک عرصہ تک آپ لاہور کے پرانے اخبار اور لالہ دینا ناتھ صاحب کے مشہور اخبار ہندوستان لاہور کے ایڈیٹر رہے۔ اور دہلی کے بعض مشہور اخبارات کے ایڈیٹوریل اسٹاف سے بھی آپ کا تعلق رہا۔ حال ہی میں آپ کی ایڈیٹری میں کراچی سے زبان ہند نامی ایک رسالہ جاری ہوا تھا لیکن اس کے دو ہی ایک نمبر شائع ہوسکے کہ آپ کو سفر آخرت درپیش ہوگیا۔

آپ نے ۱۹۰۰ء لغایت ۱۹۱۳ء زمانہ میں کئی سنجیدہ مضامین اپنے نام سے اور چند ظریفانہ مضامین بلبل پنج دہلوی" کے نام سے لکھے تھے جن کی اسوقت ملک میں بڑی قدر ہوئی تھی۔ جن صاحبوں نے "کنجوس مکھی چوس" کا "بلبل خانہ" اور "ماسٹر الہی بخش" کا پرمذاق مضمون پڑھا ہوگا اُن کے دلوں میں اُن کی اعلیٰ ظرافت کی یاد اب بھی تازہ ہوگی۔ گو ایک عرصہ دراز سے کاروباری مصروفیتوں کے باعث آپ زمانہ کے لئے کوئی مضمون نہیں لکھ سکے لیکن زبان اُردو کے لیے آپ کی خدمت کا سلسلہ آخر دم تک قائم رہا۔ خداوند تعالیٰ غریق رحمت کرے۔

اس نمبر سے زمانہ میں کئی جدید عنوان قائم کئے گئے ہیں اور حجم میں بھی اضافے کا خیال ہے۔ جو پروگرام اسوقت ہمارے پیش نظر ہے اس کی تکمیل کے لئے زمانہ میں ہر ماہ کم سے کم بتیس۳۲ صفحات کا اضافہ ہونا چاہیئے۔ ان صفحات کے متعلق اگر ضروری تصاویر کا انتظام کیا جائے تو ہر مہینہ چار پانچ صفحات تصاویر کے بڑھ جائیں گے۔ اس نمبر میں حال کے اہم مسائل کے ذیل میں دو مضامین لکھے گئے تھے جو عدم گنجایش کی وجہ سے اس مرتبہ درج رسالہ نہیں ہوسکے آئندہ ہر پرچے میں ہدیۂ ناظرین کئے جائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ زمانہ میں ہر ماہ یاد رفتگاں، مشاہیر عالم اور نسوانی تحریکات کے مختصر تذکرے کے علاوہ واقعات عالم اور دنیا کے اہم مسائل پر مفصل و مستند مضامین بھی شائع ہوتے رہیں، لیکن اس کے لئے رسالہ کی آمدنی میں فوری اضافہ کی ضرورت ہے اور اس کی صورت توسیع اشاعت کے سوائے اور کوئی نظر نہیں آتی ہے۔ کیا ہمارے ناظرین اس طرف توجہ فرماکر اور اپنے علم دوست احباب سے زمانہ کی خریداری کی سفارش کرکے ہمکو شکریہ کا موقعہ دیں گے؟ ہمارا خیال ہے کہ آجکل کے تبدیل شدہ حالات میں زمانہ اپنے ناظرین کی بیش از بیش خدمت کرسکتا ہے لیکن ؎

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

جب تک رسالہ کی اشاعت میں ترقی نہ ہوگی ہمارے حوصلے پورے نہ ہوسکیں گے۔ لہٰذا قدردانان زمانہ کو ہماری امداد پر کمربستہ ہو جانا چاہیئے۔



ڈی ایس
ڈاکٹر ایس - کے - برمن
لمیٹڈ
کلکتہ



پچاس برس سے مشہور و معروف دیسی پیٹنٹ دواؤں کا ہندوستانی وسیع کارخانہ

دافع امراض مستورات و مقوی

ڈابر اشوکا رشٹ (رجسٹرڈ)

(خرابی حیض و رطوبت کو دُور کرنے والی مشہور آیورویدک دوا)

اس کے استعمال سے حیض باقاعدہ ہوتا اور رطوبت یعنی سرخ و سفید مواد کا آنا فوراً رفع ہوتا ہے۔ رحم کی کمزوری اس کے استعمال سے دور ہو کر حمل قرار پاتا ہے اور حاملہ عورت کی مندرجہ ذیل علامتیں مثلاً بخار۔ کمی بھوک۔ دھات اور سوجن وغیرہ اچھے ہوتے ہیں

قیمت فی شیشی ڈیڑھ روپیہ ۱؎۸
محصولڈاک ایک روپیہ دو آنہ ۱؎۲

پشٹینا (رجسٹرڈ)

(مقوی باہ کی گولیاں)

اس کے استعمال سے نامردی۔ جریان۔ تھوڑی محنت سے تھکاوٹ۔ جوانی میں بوڑھوں کی سی حالت اور کمزوری وغیرہ دور ہوتی ہیں۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ دو آنہ ۱؎۲
ڈاک محصول ایک سے تین شیشیوں تک سات آنہ ۷؎

نوٹ

اس دوا کے دوران استعمال میں کبھی کبھی ہماری بنائی ہوئی جلاب سے معدہ صاف کرتے رہنا چاہیئے۔

ڈابر جنتری سنہ ۱۹۳۳ء بلاقیمت مفت منگا کر ملاحظہ فرمائیے۔

نوٹ ہماری دوائیں ہر جگہ ملتی ہیں بغرض بچت محصول ڈاک اپنے مقامی ہمارے ایجنٹ سے خریدئیے۔

صیغہ نمبر ۶۷ پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴ کلکتہ

ایجنٹ: کانپور نیا گنج میں محمد حنیف محمد نصیر، اور بابو رام غلام شیو غلام

زمبک استعمال کیجئے

اور اپنے جلدی امراض سے نجات حاصل کیجئے



حیوانی چربی سے پاک صاف

جادو اثر جڑی بوٹیوں کا مرہم

جلن پیدا کرنیوالا اکزیما۔ خارش کھجلی۔ اور دیگر امراض جلدی سے نجات حاصل کرنیکے لئے زمبک استعمال کیجئے۔ یہ عجیب و غریب مرہم سخت سے سخت امراض میں مبتلا جلد کو مکمل طور پر شفا دے گی۔

زمبک اس قدر نفیس ہوتی ہے کہ جلد کی گہرائی میں پیوست ہوجاتی ہے۔ یہ کہنہ امراض جلد کو انکی جڑوں سے اکھاڑ پھینکتی ہے۔ زمبک درد کو اس طرح دور کرتی ہے گویا جادو کے اثر سے یا امراض کے زہریلے جراثیم کو تلف کرتی ہے۔ جب زمبک جلد کو امراض سے قطعی نجات دلا لیتی ہے۔ تو یہ نئی جلد پیدا کرتی ہے

زمبک نایاب اور قیمتی جڑی بوٹیوں کے تیلوں سے تیار ہوتی ہے۔ اس کی ضمانت کی جاتی ہے کہ زمبک جانوروں کی چربی سے قطعی مبرا ہے۔ اکزیما کھجلی۔ زہر خوردہ زخموں۔ بہنے والے زخموں۔ درد۔ سوجے ہوئے پاؤں۔ کٹے ہوئے مقامات۔ کھرونچ۔ جلے ہوئے مقامات۔ کیڑے مکوڑوں کے ڈنک والے مقامات کو شفا سے بچانے میں لاثانی ہے

تمام دوا فروش زمبک چھوٹے چھوٹے ٹکیسوں میں ۱۰؍ اور ۱۲؍ فی ٹکیس فروخت کرتے ہیں۔

ایجنٹ:۔ سمتھ اسٹین اسٹریٹ اینڈ کمپنی لیمیٹڈ۔ انٹالی۔ کلکتہ۔

درد کو دور کرتی اور نئی جلد پیدا کرتی ہے۔

زمبک Zam-Buk

پیپس Peps

کھانسی ۔ زکام ۔ نزلہ ۔ گلے کے زخم اور سوزش کو

سانس کے ساتھ فائدہ پہونچانیوالی عجیب و غریب ٹکیاں

ہندوستان کی آب وہوا میں پھیپھڑوں، سینے کی بیماری اور گلے کو اچھا کرنے کے لئے "پیپس" کی بے نظیر اور حیرت انگیز دوا خاص طور پر تیار کی گئی ہے.

جونہی "پیپس" کی ٹکیہ منہ میں گھلتی ہے، اس سے طاقتور شفابخش انجرے اُٹھتے ہیں اور سانس کے ساتھ سیدھے پھیپھڑوں میں پہونچتے ہیں۔ گلے کی نسوں اور سانس لینے کی نازک نلیوں کے واسطے بہت زود اثر تسکین دہ اور شفابخش دوا ہے

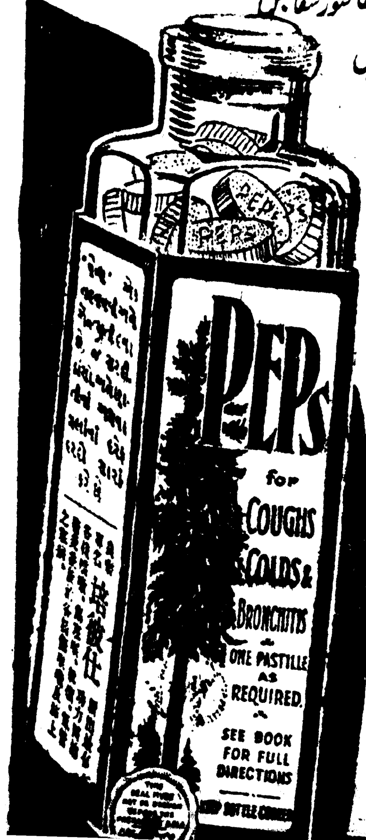
"پیپس" کی ٹکیاں گلے میں پھنسنے والا بلغم نکالتی اور ہوائی نلیوں کو صاف کرتی ہیں۔ ان سے تکلیف دہ کھانسی بھی رفع ہو جاتی ہے.

یہ آپ کو ناگہانی کھانسی۔ ٹھنڈ۔ گلے کے زخم۔ ورم۔ دمہ اور دوسری سینہ اور پھیپھڑوں کی بیماری سے محفوظ رکھے گی.

پیپس کی ہر ایک ٹکیہ پر نقرئی غلاف چڑھا ہوا ہے

تمام دوا فروش ایک روپیہ فی شیشی میں "پیپس" فروخت کرتے ہیں.

ایجنٹ:۔ مسیرز اسمتھ اسٹین اسٹریٹ اینڈ کو لمیٹڈ اسٹالی کلکتہ



فہرست مضامین

زمانہ جلد ۶۰ جنوری لغایتہ جون سنہ ۱۹۳۳ء

تصاویر: مرزا رسوا مرحوم۔ منشی سکھدیو پرشاد بسمل الہ آبادی۔ نواب حیدر یار جنگ بہادر علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی۔ منشی تلوک چند محروم۔ اکبر اعظم کا دربار۔ ہر آیڈولف ہٹلر چانسلر جرمنی۔ پنڈت پدم سنگھ شرما مرحوم۔ ہز اکسلنسی نواب صاحب چھتاری گورنر یو۔پی۔ سید حسین امام مرحوم

مضامین نثر

۲۷- تنقید کتب

۲۸ - یادرفتگاں

۲۹ مشاہیر عالم

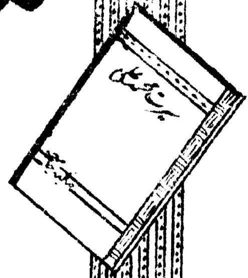
۳۲ - خط و کتابت

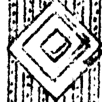
حصہ نظم

احمد

سیرت محمد علی

شایع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی





سیرت کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ صحیح اندازہ کر سکیں گے کہ محمد علی کا دل اسلامی جذبات سے کس قدر لبریز تھا۔ اور قوم و ملک کے لئے اس نے کیا خدمات انجام دیں۔ تمام حالات آپ سیرت میں پڑھیں۔

۲۰×۲۶/۸ کے سائز پر تقریباً ۶۰۰ صفحات
کتابت و طباعت نہایت عمدہ
متعدد فوٹو

قیمت تین روپے

مکتبہ جامعہ میں اردو کی کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہر وقت موجود رہتا ہے

مکتبہ جامعہ دہلی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

زمانہ

مرتبہ: دیانرائن نگم بی۔اے

جلد ۶۰ | فروری سنہ ۱۹۳۳ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

تصاویر:- نواب حیدر یار جنگ بہادر علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی۔ منشی تلوک چند محروم بی۔اے۔

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت فی پرچہ ۸ آنہ | قیمت سالانہ پانچ روپیہ

قیمت سالانہ ممالک غیر سے مع ششماہی صہ ہندوستان کے لئے ششماہی تین روپیہ

زمانہ

جلد ۶۰ — فروری ۱۹۳۳ء

نسیم مرحوم کی یاد

از سید اظہر علی صاحب آزاد

جن پاک نفس بزرگوں نے اُردو ادب کی بنیاد ڈالی، یا ترقی کی راہ میں گامزن ہو کر آیندہ نسلوں کے لئے نشانِ راہ چھوڑ گئے، ہم اُن کے بارِ احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

جس طرح انگریز چاسر اور اسپنسر کو بھول نہیں سکتے، اسی طرح ہم ولی دکھنی اور میر کو نہیں بھول سکتے۔ انگریز سالہا سال سے ملٹن اور شیکسپیئر پڑھتے آئے ہیں اور کبھی سیر نہیں ہوتے، اُسی طرح انیس اور آتش کے مطالعہ سے ہمیں بھی کبھی سیری نہیں ہو سکتی۔ جس طرح انھیں اپنے نامور شعرا کیٹس۔ بائرن۔ شیلی۔ اسکاٹ۔ ٹینیسن وغیرہم سے عشق ہے اُسی طرح ہم سودا۔ مومن۔ درد نسیم۔ داغ۔ امیر وغیرہم پر جان دیتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں احساس ہے کہ ہماری شاعری دنیا کی ترقی کرنے والی اقوام کی شاعری سے ابھی بہت پیچھے ہے اور قبل اس کے کہ ہم بھی آگے نکل جانے والی صفوں کے برابر پہونچ سکیں۔ ہمیں مدتوں مسلسل محنت کرنا پڑیگی۔

اگرچہ ۱۹۰۵ء میں "اودھ پنچ" لکھنؤ کے صفحات میں شرر اور چکبست مرحوم کی زبردست معرکہ آرائی ہو چکی ہے۔ فریقین کے موافق اور مخالف سلسلۂ مضامین جاری رہ چکا ہے، لیکن بقول نسیم

> پر بحرِ سخن سدا ہے باقی — دریا نہیں کار بند ساقی

زبان جب تک زندہ ہے نقادانِ فن کا قلم رُک نہیں سکتا۔ نئی نئی تحقیقاتیں ہونگی۔ تازہ بتازہ

انکشافات کا سلسلہ جاری رہیگا۔ اور یہی زبان کی حیات اور ہماری قومی زندہ دلی کا ثبوت تسلیم کیا جائیگا۔ یہ ایک ناقابلِ انکار واقعہ ہے کہ ہمارا فنِ تنقید ابھی تک ابتدائی حالت میں ہے۔ زبان اور محاورہ کے محاسبہ سے ہمارا فن شروع ہوتا ہے اور اسی نقطہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء کی معرکہ آرائی بھی اس نقطہ سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

چکبست اور شرر کے مشہور معرکہ میں جو امور طے پا چکے ہیں اُن پر دوبارہ لکھنا تحصیل حاصل اور بے ضرورت ہے۔ البتہ جن امور کے متعلق مجھے کوئی نئی بات عرض کرنا ہے صرف انھیں پر بحث کرنا چاہتا ہوں۔ کتاب وہی ہے اُس میں کوئی اضافہ کر نہیں سکتا نہ اُس حد سے باہر جا سکتا ہوں۔

موجودہ زمانے کی زبان کو معیار قرار دیکر گلزارِ نسیم کی زبان میں لاکھوں کیڑے ڈالے گئے ہیں اور آخر میں یہ کہا گیا ہے کہ نہ سب اعتراضات ہی صحیح ہیں اور نہ سب جواب ہی۔ یہ مثنوی آج سے ایک صدی قبل کی تصنیف ہے۔ اگر اُردو زبان ایک صدی گذر جانے پر بھی اُسی نقطہ پر موجود رہتی جہاں ایک صدی پہلے تھی تو یہ ایک مردہ زبان کہے جانے کی مستحق تھی۔ لیکن ہر زندہ زبان ترقی کرتی ہے۔ اور دنیا کی کوئی زندہ زبان اگر آج سے سو برس قبل کی زبان سے مقابلہ کر کے دیکھی جائیگی تو یہی صورت پیش آئیگی جو یہاں نظر آرہی ہے کسی شخص کو کوئی حق نہیں ہے کہ دنیا کے کسی ادیب یا شاعر سے یہ امید رکھے کہ اسکی زبان صدیوں بعد کی زبان سے مختلف نہو گی۔ ایسا اعتراض سرتاپا لغو اور اُس پر التفات کرنا تضیع اوقات ہے۔ میر اور ولی کی زبان آج ویسی ہی عجیب و غریب نظر آتی ہے جیسی فیری کوئن (Fairy Queen.) کی زبان۔ مگر نہ انگریز فیری کوئن کو دریا برد کر سکتے ہیں اور نہ ہم میر اور ولی کا کلام میاں چراغ علی کے حوالہ کرنے کو طیار ہیں چاہے ہمارے بچے اُن کے اشعار سُنکر ہنس پڑیں۔

نسیم اپنے وقت کے کاملِ فن اُستاد تھے جیسا کہ ان کا کلام ثابت کر رہا ہے۔ اُن کے اُستاد آتش مرحوم اُستادوں کے استاد تھے۔ نسیم کی تصنیف پھر اس پر آتش کی نظر ثانی اور پھر اغلاط! اس سے بڑھکر اور کیا ادبی کفر ہو سکتا ہے؟

اس سے بھی سخت الزام جو شرر اور اُنکے ہمخیال حضرات نے عاید کرنا چاہا تھا یہ ہے کہ گلزارِ نسیم کے بعض اشعار تہذیب کے دائرہ سے باہر ہیں۔ شاعر کی نظم اور نثار کی نثر اُس کے زمانہ

کی سوسائٹی کے مذاق کی محدود چار دیواری سے باہر کہیں نہ گئی نہ جا سکتی ہے
یں نظم یا نثر ایک آئینہ ہے جس کے اندر اُس زمانہ کی سوسائٹی کے خط و خال صاف
ہیں جس زمانے میں جس قسم کی چیز کی مانگ اور قدر ہوتی ہے، جو چیز عموماً پسند کی جاتی ہے
مہیا کرنی پڑتی ہے۔ تسنیم کے زمانہ کے قریب کی اور بھی مثنویاں مثلاً مثنوی میر حسن، طلسم الفت، زہر عشق
وغیرہ ہیں۔ کیا ان میں سے ایک مثنوی بھی اس عیب سے پاک ہے؟ یہ عیب ایک نہیں لاکھ بار ہو
لیکن باوجود اس کے یہی مثنویاں زبان اُردو کے صحیفے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔
کیا یورپ کا علم ادب اس عیب سے پاک ہے؟ قارئین کرام کتب مندرجہ ذیل خود ملاحظہ فرمائیں

1. The Athenian Comedies.

2. Lyeistrata of Aristophanes.

3. The Sixth Satire of Jovinal

4. Prior's Tales.

اور وہ مکالمہ ضرور ملاحظہ فرمائیں جو سقراط اور اُس کے شاگرد فیڈرس (Phaedrus) کے درمیان
ایک چشمہ کے کنارے ہوا تھا جہاں خوش الحان طیور اپنے نغموں سے بہشت بریں کی فضا پیدا
کر رہے تھے۔

جو زمانہ اُردو ادب پر اب سے سو برس پہلے گذر چکا ہے وہی دَور سترھویں صدی میں
انگلستان کے ادب پر بھی گذرا ہے۔ نہ ایسی تصانیف کو انگلستان یا یورپ کے اور ممالک نے
اپنے دائرۂ ادبیہ سے خارج کر دیا ہے اور نہ ہم کر سکتے ہیں۔ ادب کی بہترین کتابیں پڑھ چکنے کے
بعد ایسی چند کتابیں پڑھ لینے سے ہمارے بچوں کے اخلاق پر بُرا اثر نہیں پڑ سکتا اگر اُن کے استاد
اُنھیں پہلے ہی سمجھا دیں کہ تحصیل ادب کا اصلی مقصد کیا ہے اور کتاب پڑھتے وقت اُنھیں کن
کن امور کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

ایک بات اور ہے، ہر زمانہ کا ادبی معیار یکساں نہیں ہوتا، اس کا مدار سوسائٹی کی ذہنیت
پر ہے۔ ایک زمانہ میں جو تحریریں ایک حد تک منافی متانت سمجھی جاتی ہیں زمانۂ مابعد میں وہی
تحریریں فحش اور حیا سوز سمجھی جانے لگتی ہیں، اور ناقابل درگذر خیال کی جاتی ہیں۔ اڈیسن
(Addison) اپنے زمانہ کے مہذب ترین نثاروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ مگر بعض موقعوں پر
اس کا طرز ادا موجودہ زمانہ میں ناقابلِ برداشت خیال کیا جاتا ہے اور کم و بیش یہی حال

Massinger اور Fletcher کا ہے اور اُن ادبی تصانیف کا بھی جو چارلس ثانی کی واپسی کے زمانے میں شائع ہوئیں۔ مثلاً ہماری ازدواجی زندگی کی کامیابی کا مدار محض اس امر پر ہے کہ بیوی نیک نہاد، کریم النفس اور پاکباز ہو۔ سول وار (Civil War) سے قبل کا لکھا ہوا شاید ہی کوئی ایسا ڈراما دستیاب ہو جس میں بیاہی عورت سے ناجائز تعلق رکھنے والے مرد میں ساری دنیا کی خوبیاں نہ دکھائی گئی ہوں اور غریب شوہر میں سیکڑوں عیوب، خامیاں اور کمزوریاں نہ پیدا کردی گئی ہوں۔ زندہ دل آشنا فاتح اور کامیاب بنا کر اسٹیج پر لایا جاتا ہے۔ شکست، ندامت، ذلت اور رسوائی بدنصیب شوہر کے حصہ میں آتی ہے۔ Fallstaff کا یہی حال ہوا Brisacel کا یہی انجام Elder Brother میں ہوا اور Uhaldo اور Recardo کا یہی نقشہ Massinger کی "Picture" میں پیش نظر ہے۔ ایلزبتھ اور جیمس کے زمانہ کے ڈراما نگار سب ایک ہی استاد کے شاگرد نظر آتے ہیں، اور ایام Restoration سے چالیس سال کے اندر کے ڈراما نویسوں نے بدکاری کو ایک فعلِ مستحسن قرار دیا ہے۔ گویا یہ فعل اُن کے نزدیک ایک فنِ لطیف ہے۔ جس کے بغیر کسی بھلے آدمی کا اخلاق اور اُس کی تربیت۔ ناقص اور نامکمل اور ناتمام رہی جاتی ہے۔

یہ حال تو انگلستان کا تھا۔ اب میں ایک مثال خاص ہندوستان کی دیتا ہوں۔ بہارِ دانش کی سی فحش کتاب ہمارے آبا و اجداد کے زمانے میں مدت دراز تک نصاب تعلیم میں داخل رہ چکی ہے۔ لیکن باوجود اس کے زمانہ شاہد ہے کہ اُن کے اخلاق ہمارے اخلاق سے بدرجہا بہتر تھے۔ وہ ہم سے زیادہ حیادار، باوضع اور بات کے دھنی تھے۔ دوست احباب ہمسایہ کے حقوق کی نگہداشت میں ہر طرح ہم سے اچھے تھے۔ خاصکر ہندو مسلم اتحاد کا جو روح افزا نظارہ اُن کے زمانہ میں تھا اگر اُسکا عشرِ عشیر بھی مرنے سے پہلے میں دیکھ سکوں تو خوش مرونگا۔

اِن سب باتوں پر غور فرما لینے کے بعد انصاف فرمائیے کہ تسنیم پر کیا الزام آتا ہے؟

جس طرح میر اور آتش کی غزل گوئی آپ ہی اپنا جواب ہے۔ جس طرح انیس مرحوم کے مرثیے جواب نہیں رکھتے اُسی طرح گلزارِ تسنیم مثنوی نگاری کی معراجِ کمال ہے اور تسنیم نے چمنستانِ ادب میں وہ پھول کھلائے ہیں جو قیامت تک سرسبز و شاداب رہیں گے۔ مختصراً کچھ نمونے قارئین کرام کے نذر ہیں:۔

گل کا جو الم چمن چمن ہے	یوں بلبلِ خامہ نعرہ زن ہے
گچیں نے وہ پھول جب اڑایا	اور غنچۂ صبح کھل کھلایا

وہ سبزۂ باغِ خوابِ آرام	یعنی وہ بکاؤلی گل اندام
جاگی مرغِ سحر کے غل سے	اٹھی نکہت سی فرشِ گل سے
منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی	پُرآب وہ چشمِ حوض پائی
دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے	کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل	جھنجھلائی کہ کون دے گیا جُل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون	ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اُس پہ اگر پڑا نہیں ہے	بو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے
نرگس تو دکھا کدھر گیا گل	سوسن تو بتا کدھر گیا گل
سنبل مرا تازیانہ لانا	شمشاد انھیں سولی پہ چڑھانا
تھرائیں خواصیں صورتِ بید	ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید
نرگس نے نگاہ بازیاں کیں	سوسن نے زباں درازیاں کیں
پتا بھی پتہ کو جب نہ پایا	کہنے لگی کیا ہوا خدایا؟
اپنوں میں سے پھول لیگیا کون	بیگانہ تھا سبزہ کے سوا کون؟
شبنم کے سوا چرانے والا	اوپر کا تھا کون آنے والا؟
جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے	جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے
گلچیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا	غنچہ کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار پڑا نہ تیرا اچنگل	مشکیں کس لیں نہ تونے سنبل
او بادِ صبا ہوا نہ بتلا	خوشبو ہی سونگھا پتا نہ بتلا
بلبل تو چہک اگر خبر ہی	گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے
تھی لبکہ غبار سے بھری وہ	آندھی سی اُٹھی ہوا ہوئی وہ
بیوقت کسی کو کچھ ملا ہے	بتا کہیں حکم بن ہلا ہے!

اشعار بالا اس موقعہ کے ہیں جب تاج الملوک گل بکاؤلی چُرالے جاچکا ہے۔ اور بکاؤلی نے پہلی بار حوض کو پھول سے خالی پایا ہے۔

ذیل کے اشعار اس موقعہ کے ہیں کہ جب حالاً تاج الملوک کو بکاؤلی کے سامنے۔ حاضر لاتی ہے۔ اور بکاؤلی پوچھتی ہے کہ کیوں جی تم ہی وہ شخص ہو جو میرا پھول چرالے گئے تھے؟ بتاؤ اب تمہاری کیا سزا ہے؟

اس سوال کے جواب میں تاج الملوک کہتا ہے:۔

مشکیں زلفوں سے مشکیں کسواؤ کالے ناگوں سے مجھکو ڈسواؤ
تلوار سے قتل ہو جو منظور ابرو کے اشارے سے کرو چور
زنداں میں جو زندہ میجا ہو اپنے دلِ تنگ میں جگہ دو

ذیل کے اشعار اُس وقت کے ہیں کہ تاج الملوک کو بکاؤلی کی ماں نے جزیرۂ طلسم میں قید کر دیا ہے اور بکاؤلی تاج الملوک کے فراق میں دیوانی ہوگئی ہے۔

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں
جامہ سے جو زندگی کے تھی تنگ کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ
صورت میں خیال رہ گئی وہ ہیئت میں مثال رہ گئی وہ
آنے لگے بیٹھے بیٹھے چکر فانوس خیال بن گیا گھر

یہ مثنوی کے نمونے تھے۔ ذیل کے نمونے نسیم کی غزلیات سے اخذ کئے گئے ہیں۔ غزل گوئی کی شان بھی ملاحظہ ہو:۔

سمجھا ہے حق کو اپنی ہی جانب ہر ایک شخص یہ چاند اُس کے ساتھ چلا جو جدھر گیا
کوچۂ جاناں کی ملتی تھی نہ راہ بند کیں آنکھیں تو رستہ کھل گیا

کیا عارفانہ شعر فرمایا ہے، سبحان اللہ وصلِ علیٰ۔

جنوں کی چاک زنی نے اثر کیا واں بھی جو خط میں حال لکھا تھا وہ خط کا حال ہوا

یعنی لکھا تھا کہ تمہارے فراق میں جامہ دری کی نوبت آگئی ہے، چنانچہ اُنھوں نے خط کے بھی پُرزے پُرزے اُڑا ڈالے۔

دل بدل آئینہ ہے دیر و حرم حق جو پوچھو ایک دَر ہے دو طرف
کفر و ایماں دونوں جانب کی سُنے اس لئے گوشِ بشر ہے دو طرف

سنئیے کیا مست شعر فرمایا ہے:۔

قلقل سنا کے چھیڑتے ہیں مے پرست کو شیشے سرود یاد دلاتے ہیں مست کو

فارسی ضرب المثل ہے "سرود بمستاں یاد دہانیدن"۔

شاگردِ خواجہ آتش ہندی جو ہے نسیم کہتے ہیں پارسی کہ یہ آتش پرست ہے

"پارسی" اور "ہندی" اور بالخصوص "آتش پرست" کی داد دینا ناممکن ہے۔

جب ملے دو دل مخل پھر کون ہے بیٹھ جاؤ خود حیا اُٹھ جائیگی

خاکساری وہ ہے کہ ذرّوں پر روز باران نور ہوتا ہے

نورٌ علیٰ نور، کیا لاجواب شعر فرمایا ہے۔ اور ملاحظہ ہو، شاعری کی معراج کمال ہے۔

تیرہ دل کی بزم میں جام شراب آتا نہیں جانب ظلمات ہرگز آفتاب آتا نہیں

عشق کے زینے کے آگے آسماں بھی پست ہے سر جھکایا ہے فرشتوں نے بشر کے سامنے

سبحان اللہ وصل علیٰ۔ اب ایسا شعر آتا ہے جس پر حضرت مصنف کا ساری عمر عمل رہا۔ شاہی دربار میں آپ کے احباب موجود تھے، دربار حضرت کو ہاتھوں ہاتھ لیتا تھا، احباب بس اتنا ہی چاہتے تھے کہ آپ ایک مرتبہ "ہاں" فرمادیں، مگر نہ کہنا تھا نہ کہا، فرماتے ہیں:۔

منت دلا کسی کی نہ اصلاً اُٹھائیے مرجائیے نہ نازِ مسیحا اُٹھائیے

ذیل کا شعر مرنے سے دو تین گھنٹے پہلے ارشاد فرمایا تھا:۔

پہونچی نہ راحت ہم سے کسی کو اور اذیّت کوش ہوئے

جان پڑی تب بارِ شکم تھے، مرکے وبالِ دوش ہوئے

آپ کا سال پیدائش ۱۸۱۱ء اور سال وفات ۱۸۴۳ء ہے، یعنی صرف بتیس برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ افسوس یہ جنّتی روح اتنی قلیل مدت کے لئے دنیا کو عاریت ملی تھی۔ اے کاش عمر طبعی تک پہونچے ہوتے تو نہیں معلوم ہماری آئندہ نسلوں کے لئے اور کیا کیا میراث چھوڑ جاتے۔ دیوان کا بعض شعر پڑھکر تو یہ خیال گذرتا ہے کہ اپنے قبل از وقت مرجانے کا علم شاید انھیں پہلے ہی سے تھا۔ فرماتے ہیں:۔

دیکھے وہ گلشن جو دن دو دن رہے یاں مثلِ گل ہم تو شبنم ساں نسیم اک دم کے ہیں مہمانِ صبح

عشرت آباد چمن سے تجھے کیا تُو تو نسیم نکہتِ گل کی طرح ہونے کو برباد آیا

جاں نکل جائے گی تن سے اے نسیم گل کو بوئے گل ہوا بتلائے گی

دنیا فانی ہے، رہے نام اللہ کا، کیسے کیسے باکمال بزرگ تہ خاک ہوگئے۔

کسی استاد کے کلام کے مقبول عام ہونے کا اس سے بہتر کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ اس کے بعض اشعار یا مصرعے ہر کس و ناکس کے نوکِ زبان بنکر ضرب المثل بن گئے ہوں پہلے مثنوی میں سے ایسے اشعار اور مصرعے منتخب کرکے پیش کرتا ہوں۔ (مصرعے)

سورج کو چراغ ہے دکھانا

بیٹھا تو گرا، گرا تو بیہوش
گڑ سے جو مرے تو زہر کیوں دو
تھوڑا لکھا، بہت سمجھنا
آپ اپنی قضا کا نوحہ خواں تھا
کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں

(اشعار)

پل مارنے کی ہوئی جو دیری سبحان اللہ شان تیری!
گل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں غربت زدہ کیا وطن بتاؤں
گھر بار سے کیا فقیر کو کام کیا لیجئے چھوڑے گاؤں کا نام
آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجئے جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجئے
کیا لطف جو غیر پردہ کھولے جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے
ہر ذرہ کا چمکے گا ستارہ قائم جو زمین و آسماں ہے
درویش رواں رہے تو بہتر آبِ دریا بہے تو بہتر
قسمت سے مفر ہے اب نہ مامن پتھر کے تلے دبا ہے دامن
طالع سے کسے تھی ایسی امید نکلا ہے کدھر سے آج خورشید

اب دیوان سے اسی قبیل کے اشعار میں سے تھوڑے سے نمونے منتخب کر کے پیش کرتا ہوں۔

جب نہ جیتے جی مرے کام آئیگی کیا یہ دنیا عاقبت بخشائے گی
گر یہی ہے اس گلستاں کی ہوا شاخِ گل اک روز جھونکا کھائیگی
صندلی رنگوں سے مانا دل ملا دردِ سر کس کے ماتھے جائیگی
یا ہاتھ توڑے جائیں گے یا کھولیں گے نقاب سلطانِ عشق کی یہی فتح و شکست ہے
لائے اس بت کو التجا کر کے کفر توڑا خدا خدا کر کے

اربابِ ذوقِ سلیم کے لئے اتنے ہی نمونے بس ہیں۔

شرر اور چکبست کی معرکہ آرائی میں منشی سجاد حسین صاحب مرحوم ایڈیٹر اودھ پنچ نے اس امر کے ثبوت میں کہ گلزارِ نسیم ایک ہندو شاعر کی تصنیف ہے محض ایک ہی مصرعہ ساری مثنوی میں سے منتخب کر کے پیش کیا تھا: "شب کی پوشاک بدلی ساری" اس طویل مباحثہ میں اس سے زیادہ کوئی ثبوت

پیش نہیں کیا گیا۔ حالانکہ درحقیقت نہ اس بحث کی گنجائش ہے کہ یہ مثنوی سوا حضرت نسیم مرحوم کے کسی اور کی تصنیف ہے اور نہ ثبوت کی ضرورت۔ اگر ثبوت ہی پیش کرنا ضروری سمجھا جائے تو ایسے ثبوت کی مثنوی میں کمی نہیں ہے۔ قارئین کرام اشعار ذیل ملاحظہ فرمائیں:۔

بے وقت وہ راگ خوش نہ آیا — بے فصل وہ پھاگ خوش نہ آیا

دہقان کی زوجہ کے کھُلے بھاگ — کھانے لگی نوچ نوچ کر ساگ

کنیا تھی غرضکہ راس اس کی — پوری نہ ہوئی وہ آس اس کی

اشعار متذکرۂ بالا میں "پھاگ" اور "بھاگ" اور "کنیا راس" ہندو شاعر کے نوکِ قلم کا نقش اپنے ساتھ لائے ہیں

انداز سے اس نے لے کے مالا — کاندھے پہ بکھاؤلی کے ڈالا

مسلمان شرفا لکھنؤ کی زبان میں "مالا" کی جگہ "ہار" کا لفظ مستعمل ہے، ہندو شرفا مالا بولتے ہیں۔ دہلی کی زبان میں البتہ ہندو مسلمان سب "مالا" ہی بولتے ہیں۔ اور "مالا" کو مؤنث بولتے ہیں۔ لکھنؤ میں "مالا" مذکر ہے۔

بارانِ گلاب و بارشِ گل — ہو کر بڑھے آگے باتجمل

"بارانِ گلاب و بارشِ گل" کا بھی ہندو شرفا کی باراتوں میں عام رواج ہے، اور یہاں بھی بارات ہی کا حال بیان ہو رہا ہے۔

وہ معتقد اس کے پاؤں چھو کر — اُٹھا چھاتی پہ رکھ کے پتھر

پاؤں چھونے کی رسم خاص ہندو شرفا کی ہے۔

چوٹی ہے مری تو ہاتھ ان کے — چل آکے چلا میں ساتھ ان کے

یہ شعر تاج الملوک کی زبان سے ادا ہو رہے ہیں اور اس کی مخاطب شاہزادی چتراوت ہیں۔ مسلمان شاعر کہ چوٹی رکھتا ہی نہیں بھلا ایسا شعر کہاں سے کہیگا اور کیونکر کہے گا۔ ایسا شعر تو مسلمان شاعر کہہ ہی نہیں سکتا۔

میں نے مانا کہ امانت نے اپنی اندر سبھا میں بھی راجہ اندر کا دربار سجایا ہے لیکن اندرا سن کا ایسا مکمل نقشہ امانت یا کسی مسلمان شاعر کے فرشتے بھی نہیں کھینچ سکتے تھے۔ ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:۔

اندرا سن امر نگر ہے شہر ایک — خلقت ہے وہاں کی زندہ دل نیک

اندر ہے بادشاہ اُس کا — آسن ہے تخت گاہ اُس کا

مضموں وہ قضا سے اس قدر ہی — اس بستی کا نام امر نگر ہے

یزدانیوں کا ہے مسکن اس میں روحانیوں کا نشیمن اس میں
لکھتے ہیں مورخانِ ہندی آباد ہوا یہ ہے وہ بستی
راجہ کہ کمال پارسا ہے مقبول جناب کبریا ہے
خالق نے دیا ہے فوق اُس کو نغمہ سے ہے ذوق وشوق اُسکو
انساں کا سرود و رقص کیا ہے پریوں کا ناچ دیکھتا ہے
باری باری سے جو پری ہے راجہ اندر کی مجرائی ہے

کہا جاتا ہے کہ گلزار نسیم میں آمد کا نام نہیں محض آورد ہی آورد ہے۔ اور وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ تناسب لفظی کی کوشش نے یہ عیب پیدا کر دیا۔ تناسب لفظی نسیم کے زمانہ کی شاعری اور نثاری کی خصوصیات میں داخل تھا۔ نسیم اس دائرہ سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ لیکن نسیم کی شاعری کا یہ سحر ہے کہ آورد میں بھی آمد کا لطف پیدا کر دیا ہے اور جب تک سرسری نظر سے دیکھا جائے ہر شعر آمد کے رنگ میں رنگا ہوا نظر آتا ہے۔ روانی کا ایک بے پناہ دریا بہا دیا ہے جس کی رو میں آورد بھی چلی جا رہی ہے اور خیال نہیں گذرتا کہ کہیں آورد ہے بھی یا نہیں۔ اوپر کے اشعار پڑھکر خود ملاحظہ فرما لیجئے۔ سب سے آخری نمونہ میں آورد کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے اور مثنوی میں ایسے بہت سے نمونے موجود ہیں۔

اُردو خواں شعرا کی دلچسپی مدنظر رکھکر مجھے بعض ایسے امور پر قلم اُٹھانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جن پر پُرانے فیشن کے اُردو خواں مصنفین نے توجہ نہیں فرمائی لیکن جن پر توجہ فرمانے کی شدید ضرورت ہے۔ بیسویں صدی کی دنیا ترقی کے میدان میں بہت آگے بڑھ چکی ہے اور جو شخص ایک ہی جگہ زمین پکڑے بیٹھا رہ جائے گا وہ وہیں چھوٹ رہیگا۔ کوئی پیچھے پھر کر دیکھنے والا بھی نہیں ہے کہ کون چھوٹ گیا، کیا ہوا، کہاں رہ گیا؟

اس حصۂ مضمون پر قلم اُٹھانے سے پہلے میرا فرض ہے اور صاف عرض کر دونگا کہ گلزار نسیم کے افسانہ یا پلاٹ کی بیشمار خامیوں کے ذمہ دار نسیم نہیں اور ہرگز نہیں ہیں۔ یہ افسانہ اُن کا گڑھا ہوا نہیں ہے۔ مثنوی کی ابتدا میں وہ خود فرماتے ہیں۔

افسانۂ گلِ بکاؤلی کا افسوں ہو بہارِ عاشقی کا
ہر چند سنا گیا ہے اِس کو اُردو کی زبان میں سخنگو
وہ نثر ہے دادِ نظم دوں میں اِس مے کو دوآتشہ کروں میں

جس کے معنی ہیں کہ یہ قصہ بُرا بھلا جیسا کچھ ہے نسیم کو نثر میں موجود ملا۔ نسیم نے اُسے نظم کر دیا۔

اُس قصہ یا پلاٹ کے عیوب نقائص اور خامیوں کا بار نسیم کی گردن پر نہیں ہے۔ لیکن غالباً اِن خامیوں پر ایک سرسری نظر ڈال لینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

پورب میں ایک تھا شہنشاہ　　سلطان زین الملوک ذی جاہ

بیسویں صدی کی دنیا ایسا قصہ نہیں سنتی، یہ نسیم ہی کی شاعری تھی جس نے ایسا قصہ بھی سُنا ہی کے چھوڑا۔ کسی ادنیٰ درجہ کے بازاری شاعر نے نظم کیا ہوتا تو کوئی پڑھا لکھا تربیت یافتہ آدمی ہاتھ بھی نہ لگاتا۔ کون بادشاہ تھا، کس ملک میں، کب، کس زمانہ میں، بادشاہ کا نام فرضی نہ ہونا چاہیئے۔ تاریخ سے سند حاصل کرنا پڑیگی۔ ملک بھی فرضی نہیں ہوسکتا۔ نقشہ اور جغرافیہ میں موجود ہونا چاہیئے۔ "پورب میں" کے کچھ معنی نہیں ہوسکتے۔ زین الملوک نامی کسی ملک کا کوئی بادشاہ نہیں گذرا ہے۔ "فردوس" اور "ارم" جو نام بتائے گئے ہیں۔ دنیا کا نقشہ اور جغرافیہ ان سے خالی ہیں۔

خالق نے دیئے تھے چار فرزند　　دانا، عاقل، ذکی، خردمند

آگے چلکر بجائے عقلمندی کے ہمیشہ ان سے حماقتیں ہی سرزد ہوئیں۔ تاج الملوک قصہ کا خاص ہیرو ہے۔ لیکن حماقت میں اُس نے بھی اپنا حصہ باقی نہیں چھوڑا۔ کہاں تو یہ احتیاط تھی کہ اس بکھیڑ بھاڑ کے ساتھ گل بکاؤلی لیکر گھر واپس جانا مصلحت نہیں۔ محمودہ اور دلبر کو دریا کی راہ روانہ کیا اور خود تن تنہا فقیر کا بھیس بدل کر خشکی کی راہ چلا۔ حالانکہ جہاں تک قیاسات کو دخل ہے۔ اُس کا دریا کی راہ جانا ہی نسبتاً بہتر نظر آسکتا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کے بھائی قید سے آزاد ہوئے ہیں۔ اور اُسی راہ گھر واپس جائیں گے۔ یہ پہلی حماقت تھی۔ دوسری حماقت جس راہ اُس کے بھائی واپس آنے والے تھے اسی راہ پر ایک راہ نشین اندھے فقیر پر پھول کا اثر آزمانا تھا۔ تیسری حماقت ایک اجنبی شخص "وزیر فرخ" کی موجودگی میں ساری داستان کہہ سنانا تھی۔ ان تمام حماقتوں سے بڑھ چڑھکر وہ حماقت تھی جس کی بدولت گل بکاؤلی ہاتھ سے کھودیا۔ کہاں تو وہ احتیاط تھی اور کہاں یہ حماقت کہ جب چاروں بھائی سامنے آتے ہیں اور اناپ شناپ جنگلی پھولوں کو گل بکاؤلی کہتے پھرتے ہیں تو آپ طیش میں آکر فرماتے ہیں کہ فضول مت بکو وہ گل بکاؤلی نہیں ہے۔ گل بکاؤلی یہ ہے۔ دیکھ لو۔ اتنی بھی عقل نہیں کہ وہ چار ہیں اور آپ اکیلے۔ باپ سے سرخروئی حاصل کرنے کی فکر میں یہ بھی ہیں اور وہ بھی۔ بھلا وہ اس آسانی سے ہاتھ آتا ہوا پھول دیکھکر چھوڑ دینگے!

یہاں ایک بات اور قابل توجہ ہے کہ فرخ کی موجودگی میں جب تاج الملوک بادشاہ سے تخلیہ کی درخواست کرتا ہے۔ بادشاہ بلا استثنا سب کو باہر چلے جانے کا حکم دیتا ہے اور تمام حاضرین تعمیل

کرتے ہیں لیکن فرخ اپنی جگہ سے جنبش نہیں کھاتا ہے۔ نہ بادشاہ کو اپنے صریحی حکم کی خلاف ورزی بد دماغ کرتی ہے اور نہ تاج الملوک بھی ایک اجنبی کے سامنے ساری داستان سنا دینے میں تامل کرتا ہے۔

راجہ اندر بکاؤلی کا سامنا ہوتے ہی اُس میں آدم زاد کی بو پاتا ہے اور اُسے جلا دینے کا نادری حکم صادر فرماتا ہے۔ لیکن وہیں اُسی صحبت میں تاج الملوک موجود ہے، آدم زاد کی بو راجہ اندر محسوس نہیں کرتا۔ راجہ اندر کا طبلہ نواز تاج الملوک سے گفتگو کرتا ہے اور اُسے اپنا طبلہ بھی حوالہ کر دیتا ہے مگر آدم زاد کی بُو اس میں نہیں پاتا۔ پریاں آتی ہیں، بکاؤلی تخت پر بیٹھکر ہوا پر اُڑتی ہے تاج الملوک تخت کا پایہ پکڑکر لٹک جاتا ہے۔ بکاؤلی اور تخت نشین پریاں نہیں دیکھتی ہیں تو نہ دیکھیں مگر کمال یہ ہے کہ کاندھے پر تخت لیکر اڑانے والے دیو زاد بھی اندھے بن جاتے ہیں اور پائے سے لٹکا ہوا آدمی زاد اُنھیں نہیں سوجھتا۔ نہ آدمی کی بُو اُن کی ناک میں جاتی ہے۔ یہی واقعہ ایک یا نہیں دو شب برابر ہوتا ہے، تاج الملوک دو مرتبہ اسی طرح جاتا ہے اور واپس آجاتا ہے، یا دوسرے الفاظ میں اسی طرح چار مرتبہ تخت کے پائے سے لٹک کر جاتا آتا ہے!

بکاؤلی کی ماں تاج الملوک کو دریائے طلسم میں پھینک دیتی ہے، وہ ایک طلسمی جزیرہ میں محبوس ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک چشمہ میں نہا کر نکلتا ہے تو عورت بن جاتا ہے۔ ایک مرد اُسے اپنے گھر لیجاتا ہے وہ عورت بن گیا تھا حاملہ ہوتا ہے اور بچہ جنتا ہے۔ پھر دوسرے چشمہ میں نہا کر مرد بنجاتا ہے مگر نہایت ہی بدشکل، ایک دیونی اُسے اپنا شوہر سمجھکر ایک لکڑیوں کا گٹھا اُس کے سر پر لاد دیتی ہے اور حکم دیتی ہے کہ جا بیچ لا۔ شاہزادہ گٹھا سر پر لاد لیتا ہے اور جب دیونی نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے تو گٹھا پھینکدیتا ہے۔ ان واقعات سے پہلے وہ اس طلسمی جزیرہ کے ایک درخت کے عجیب الاثر پھل پھول، شاخ چھال اور گوند پا چکا ہے۔ شاخ کی لاٹھی اُس کے پاس موجود ہے جس کی بے پناہ ضرب سے ایک دیو آن واحد میں مر گیا تھا۔ چھال کی ٹوپی موجود ہے جسے سر پر رکھ کر وہ ہر ایک کی نظر سے غائب ہو سکتا ہے۔ لاٹھی کے سرے دونوں ہاتھوں میں لیکر وہ ہوا پر اُڑ سکتا ہے۔ لیکن حیرت کا مقام ہے کہ وہ مخرلہ عورت بن جانا گوارا کر لیتا ہے، نہ لاٹھی سے کام لیتا ہے نہ ٹوپی سے، اور اس کے مقابلہ میں لکڑیوں کا گٹھا سر پر لاد لینا تو کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے!

دیو سے مقابلہ کے موقعہ پر تاج الملوک لاٹھی کے دونوں سرے ہاتھوں میں پکڑ کر ہوا پر اُڑ رہا ہے دیو بھی اُڑکر مقابل ہو جاتا ہے۔ تاج الملوک اپنی لاٹھی کی ضرب سے دیو کو مار ڈالتا ہے، یہ لڑائی ہوا پر ہوتی ہے

لیکن جب آڑنے کی ترکیب یہ ہے کہ لاٹھی کے دونوں سرے دونوں ہاتھوں میں ہونا ضروری ہے تو دیو کو لاٹھی مارنے کے لئے جس وقت ایک ہی سرا تاج الملوک کے ہاتھ میں رہ گیا تھا خود اُسی کو زمین پر گر کر پاش پاش ہو جانا چاہیئے تھا!

اس طلسمی جزیرہ کے واقعات یہ ہیں کہ تاج الملوک جس درخت کے پھل پھول چھوتا ہے وہ ہاتھ لگاتے ہی غائب ہو جاتے ہیں اور ہوا کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ لیکن اسی طلسمی جزیرہ میں طلسمی نہیں اصلی گائیں چر رہی ہیں۔ کیا چر رہی ہیں جبکہ ہر پھول پھل ہوا ہی ہوا ہے؟ ان گایوں کا دودھ اصلی دودھ ہے اور گوبر واقعی گوبر ہے؟

تاج الملوک کی کیا عمر ہوگی جب بکاؤلی پتھر کا نصف حصہ جسم بن جانے کے بعد ایک دہقان کے گھر جنم لیتی ہے، اور پیدا ہو کر سنِ شعور کو پہونچتی ہے، اور دوبارہ تاج الملوک کو ملتی ہے؟ اگر قصہ کے کل واقعات پیش نظر رکھکر اندازہ کیا جائے تو عجب نہیں اگر اس کی عمر ساٹھ برس کی ٹھہرے جبکہ بکاؤلی کی عمر کم و بیش بارہ سال تھی!

فسانہ میں کہیں نہیں کہا گیا ہے کہ بکاؤلی کا پھول کوئی طلسمی پھول تھا۔ اگر ایسا ہی تھا تو اُس پھول اور اُس درخت کے باقی اور خواص سب وہی ہونا چاہیئے جو قانون فطرت کے مطابق ہوں۔ قصہ میں یہ امر صاف کر دیا گیا ہے کہ تاج الملوک نے محض ایک ہی پھول توڑا تھا۔ بعض درخت ایک ہی پھول کا ہوتا ہے، لیکن کیا یہ پھول ہمیشہ شاداب رہتا ہے اور اس کا شباب ازلی اور ابدی ہے؟ اگر وہ ایک ہی پھول والا درخت نہیں تھا تو اُس میں اور پھول اور کلیاں بھی ہونگی۔ پھر اُس ایک پھول کے چُرائے جانے پر یہ قیامت برپا کرنا عقل کی بات نہ تھی۔ اگر وہ ایک ہی پھول تھا تو آخر کب تک قائم رہ سکتا تھا۔ قصہ سے ظاہر ہے کہ کافی مدت تک قائم رہ چکا تھا۔ ہر کمالے را زوالے۔ آخر اُس کی پنکھڑیاں ایک ایک کرکے جدا ہو جاتیں اور پھول فنا ہو جاتا۔ ایسے پھول پر اتنا حشر برپا کرنے کے کیا معنی ہو سکتے تھے! اگر یہ پھول طلسمی تھا تو محافظانِ طلسم اُسی وقت سے خبر دینا شروع کر دیتے جب تاج الملوک نے پہلی مرتبہ دیو کو حلوہ کھلا کر اس سے اعانت کا وعدہ لیا تھا، اور حمالہ حمایت کرنے کی کبھی جرأت نہ کرتی۔ اگر کرتی تو تاج الملوک اُسی کے گھر سے گرفتار ہو جاتا۔ یا زیادہ سے زیادہ جس وقت دیو زاد جو ہے بنکر سرنگ کھودنے چلے ہیں سب کے سب پکڑ لئے جاتے، جیسا کہ طلسم ہوشربا وغیرہ میں ہوا کرتا تھا۔

باپ کے کور چشم ہوتے ہی تاج الملوک گھر سے نکال دیا جاتا ہے، تھوڑی مدت بعد وہ دلبر سے ملتا ہے اور دلبر اُسے شادی کا پیام دیتی ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ وہ اس عمر کا تھا جس میں عموماً شادی

کی جاتی ہے۔ ادھر وہ گھر سے نکلتا ہے، ادھر چاروں شاہزادے معہ لشکر گل بکاؤلی کی تلاش میں گھر سے نکلتے ہیں۔ راہ میں لشکر دیکھکر تاج الملوک ایک سپاہی سے ہمکلام ہوتا ہے اور دریافت کرتا ہے کہ کس کی فوج ہے اور کہاں جارہی ہے؟ سپاہی سارا حال کہہ سناتا ہے۔ نہ سپاہی تاج الملوک کو پہچانتا ہے اور نہ تاج الملوک ہی فوج کی وردی تک پہچانتا ہے نہ اُسے اتنی بھی عقل ہے کہ اس کے باپ کی سلطنت کے اندر کسی اور بادشاہ کی فوج کیونکر داخل ہوسکتی تھی! علی ہذا جب شاہزادے اُس سے پھول چھینتے ہیں اور تاج الملوک فقیر کے بھیس میں ہے شاہزادے تاج الملوک کو مطلق نہیں پہچانتے۔

بکاؤلی یکایک تاج الملوک کی تلاش میں تن تنہا گھر سے غائب ہوجاتی ہے۔ زین الملوک کے دربار میں فرخ وزیر بنکر رہتی ہے۔ تاج الملوک سے ملتی ہے، اُسے اُس کے باپ سے ملاتی ہے۔ اُسی کی زبانی پھول چرائے جانے کی ساری داستان سنتی ہے اور خاطر خواہ تحقیقات کرلینے کے بعد یہاں سے بھی یکایک غائب ہوجاتی ہے۔ بکاؤلی معمولی پری نہیں شاہزادی ہے۔ اس کے ماں باپ زندہ ہیں اس کی یکایک گم گشتگی اور اتنی مدت تک غائب رہنے پر اس کے ماں باپ کا یہ تغافل اور یہ استغنا قانونِ فطرت کے خلاف ہے۔ اس دراز مدت کے اندر نہ اُسے کوئی یاد کرتا ہے نہ کوئی جستجو ہوتی ہے اور نہ اُس کی واپسی پر کوئی متنفس اس سے اتنا بھی پوچھتا ہے کہ تم کہاں غائب ہوگئی تھیں، اور اتنے عرصے تک کہاں رہیں؟ بعینہ اسی طرح شاہزادی چترادت باپ ماں سے بے کچھ کہے سنے تاج الملوک اور بکاؤلی کے ساتھ تخت پر بیٹھکر ہوا ہوجاتی ہے اور اُس کے ماں باپ نہ اُسے یاد کرتے ہیں نہ تلاش کرتے ہیں؟

تاج الملوک حمالہ دیونی کا بال آگ پر رکھتا ہے۔ ایک شدید آندھی اُٹھتی ہے جو حمالہ کی آمد کی خبر دیتی ہے۔ لیکن وہی حمالہ جب تاج الملوک کو ساتھ لیکر واپس آتی ہے تو بکاؤلی کی ماں کو خبر بھی نہیں ہوتی جو اُس وقت بکاولی سے سرگرم گفتگو ہے۔ حمالہ کو ہوا سے زمین پر اُترنے سے پہلے ہی علم ہوجاتا ہے کہ بکاؤلی کی ماں موجود ہے اور وہ اُسے وہاں سے کچھ فاصلہ پر اتارتی ہے۔ اگر حمالہ ساحرہ ہے اور عموماً دیو اور پریاں سحر جانتی ہیں تو بکاؤلی کی ماں کا اس فن سے محروم رہنا سخت تعجب خیز ہے! تعجب پر تعجب یہ ہے کہ حمالہ کے آنے پر آندھی کیوں نہیں آتی!

راجہ اندر کا عطیہ نولکھا ہار کیا قدر و قیمت رکھ سکتا ہے جب حال یہ ہے کہ بکاؤلی اُسے اپنے پکھاوجی کے گلے میں ڈال دیتی ہے اور بھول جاتی ہے۔ اسی طرح بکاؤلی کی بارہ دری کی کیا وقعت باقی رہتی ہے جب معمولی دیوزاد جو پریوں کے ادنیٰ خدام کے درجہ کے ہوتے تھے بعینہ اسی کی دوسری نقل دم کے دم میں بناکے تاج الملوک کے لئے طیار کردیتے ہیں اور بے جگری کا یہ عالم ہے کہ قیمتی قالین اور جواہرات

کے ڈھیر کے ڈھیر جو زین الملوک کی آمد کے اہتمام میں جنگل میں سجا دیئے گئے تھے، بادشاہ کی سواری ادھر آگے بڑھتی جاتی ہے اُدھر پیچھے کا سارا سامان لٹا دیا جاتا ہے۔

سحر و ساحری، جن و پری یا اسی قبیل کی اور مافوق العادت باتیں ادبی تصانیف میں داخل کرنا عیب نہیں بلکہ جائز ہے، اور یورپ کا ادب بھی ان سے خالی نہیں ہے۔ لیکن رابطہ اور تسلسل ہونے کی ضرورت ہے جو بات کہی جائے وہ اپنے دائرۂ حدود اور مستثنیات کے اندر ممکن نظر آئے۔ انمل بے جوڑ باتیں نہ کہی جائیں جن کی کوئی چول سیدھی نہ ہو۔ شاعری قانون فطرت کے عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہونا چاہیئے، اور شاعر وہی ہو سکتا ہے جو فطرت انسانی کا ماہر ہو۔

مثنوی گلزار نسیم کی تاریخ تصنیف خود مصنف ہی کے مصرعہ "تو قیع قبول روز لیش باد" سے نکلتی ہے یعنی ۱۲۵۴ھ ہے۔ اس مثنوی نے گرم و سرد زمانہ کی کم و بیش ایک صدی دیکھی ہے۔ اُس زمانے سے آج تک سحر البیان کی مثنوی سے لیکر احمد علی شوق مرحوم کے ترانۂ شوق تک جو اس سلسلہ کی آخری کڑی ہے کتنی مثنویاں لکھی گئیں اور کئی مثنویاں اپنی اپنی حدود کے اندر کامیاب بھی ہوئیں لیکن گلزار نسیم سے بڑھ جانا تو کارے دارد گلزار نسیم کے پائے کی بھی کوئی دوسری مثنوی عالم وجود میں نہ آسکی بعضوں نے کہنا شروع کر دیا کہ شوق نے نسیم کی مثنوی کا جواب لکھا ہے۔ شوق سے نہ رہا گیا، اُنھوں نے خود تردید فرمائی اور لکھا کہ "اگرچہ بحر میں نے بھی وہی اختیار کی ہے لیکن میں نے ہرگز گلزار نسیم کا جواب نہیں لکھا ہے، البتہ لکھتے وقت گلزار نسیم میرے پیش نظر تھی۔ اس کے بعد خود اعتراف فرماتے ہیں کہ نسیم کے ایک شعر:۔

چھالے پڑیں گال اگر چھوئے ہوں　　　کالے ڈسیں بال اگر چھوئے ہوں

کے مقابل میں شعر کہتے وقت" دانتوں پسینہ آگیا"۔ اور یہ حال ہمارے وقت کی بڑی سے بڑی ہستی ترانۂ شوق اور عالم خیال کے مصنف اور سب سے بڑے نقادِ فن کا تھا۔

خوشی کا مقام ہے کہ مثنوی کے ابتدائی حصہ میں نسیم نے جو دعا مانگی تھی بارگاہِ احدیت میں وہ لفظ بلفظ مقبول ہوئی۔ ایک ایک شعر پڑھکر خود ہی انصاف فرمایئے دعا مقبول ہوئی یا نہیں۔

یارب مرے خامہ کو زباں دے　　　منقارِ ہزار داستاں دے

منقار ہزار داستاں مل گئی یا نہیں!

افسانۂ گلِ بکاؤلی کا　　　افسوں ہو بہارِ عاشقی کا
خوبی سے کرے دلوں کو تسخیر　　　نیرنگِ نسیم باغِ کشمیر

"نیرنگِ نسیم باغِ کشمیر" کا کیا کہنا، دلوں کے تسخیر کا عالم گواہ ہے!

نقطے ہوں سپندِ خوش بیانی　　ہر دل ہو حصارِ سحر خوانی

جو نکتہ لکھوں کہیں نہ حرف آئے　　مرکز پہ کشش مرے پہونچ جائے

ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کا پیغام

چندر نگر میں بنگال کے ہندوؤں کی کانفرنس ہوئی جس میں ڈاکٹر ٹیگور نے مندرجہ ذیل پیغام ارسال فرمایا

"ہم کتوں کو چھوتے ہیں مگر آدمی کے سایہ سے بھاگتے ہیں۔ بلی چوہے کھاتی ہے اور آدمی کی جھوٹی روٹی پر گذارہ کرتی ہے۔ یہ چیزیں کھا کر وہ منہ بھی صاف نہیں کرتی۔ اس حالت میں وہ برہمن کی گود میں بیٹھ سکتی ہے اور اس سے وہ ناپاک نہیں ہوتا۔ مچھلی غلاظت کھاتی ہے وہی مچھلی برہمن اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے مگر اوس سے اُسکا جسم ناپاک نہیں ہوتا۔ مہتر کے پیشہ میں جو غلاظت ہے وہ ہم سب کے جسموں میں بھی ہے۔ ماں بھی تو اپنے بچے کا میلا صاف کرتی ہے۔ مگر اس سے نفرت نہیں کیجاتی بلکہ اسکا احترام ہوتا ہے۔ ماہی گیر عورت مچھلی پکڑنے کیلئے گہرے کیچڑ میں جاتی ہے مگر اسکی وجہ سے اسکو غلیظ نہیں ٹھہرایا جاتا۔ جب وہ کیچڑ سے باہر آکر صاف ہو جاتی ہے تو پھر اسکے اور دوسری عورتوں کے درمیان کوئی فرق نہیں رہتا۔ جن پیشوں کو ہم ادنیٰ کہتے ہیں وہ ہماری حاجتوں کے پورا کرنے کیلئے ہیں۔ حالات کے مطابق ہم کوئی بھی پیشہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس ذہنیت سے زیادہ قابل نفرت اور کوئی بات نہیں کہ ہم ان لوگوں سے نفرت کریں۔ جو ہمارا کام کرتے ہیں۔ ان اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو مندر میں جانے سے کوئی نہیں روکتا جو اپنی بداعمالیوں سے ہریجنوں کے اخلاق کو بگاڑتے ہیں مگر ہریجنوں کو مندروں کے پاس نہیں پھٹکنے دیا جاتا۔ یہ خیال کرنا حماقت ہے کہ جس طرح پانی سے بدن کا میل اُتر جاتا ہے اسی طرح نہانے سے دل کا میل بھی دور ہو جاتا ہے۔ اگر یہ اصول ہو کہ جس کا جسم میلا اور غلیظ ہو گا۔ اسکو مندر میں داخل نہیں کیا جائے گا تو میں پوچھتا ہوں کہ کیا جس برہمن کو کوئی قابل نفرت بیماری ہوتی ہے اسکو سوسائٹی اور مندروں سے نکال دیا جاتا ہے؟ اگر کسی کو میلے بدن کی وجہ سے مندروں سے دُور رکھا جائے تو میں اس میں کوئی ہرج نہیں دیکھتا۔ مگر پرماتما اس کو معاف نہیں کرتا کہ تمام فرقہ کو اچھوت سمجھا جائے اور یقیناً اس نے ہندوستان کو بھی اس گناہ کے لئے معاف نہیں کیا۔ اگر جنم کی بنا پر کسی کو ادنیٰ قرار دینے کے اصول کو تسلیم کریں اور اگر یہ کہیں کہ وہ گورے رنگ کی وجہ سے ہندوستان پر حکومت کرنے کا مستحق ہو تو پھر ہندوستانیوں کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیئے۔

سنسکرت اور فارسی قواعد کی مطابقت

(۲)

(از جناب سلیم جعفر صاحب)

تصریف

تصریف مروجہ کی ترتیب پر ایک نظر

صرف کبیر کی جو ترتیب صفوۃ المصادر میں ہے اس پر ایک نظر ڈالنے سے خیال ہوتا ہے کہ یہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں چھ طرح کے ماضی لکھے جاسکتے ہیں اور دوسرے حصے میں مضارع سے لیکر اسم مفعول تک۔ اگر صفوۃ المصادر کو مستند نہ مانا جائے، اور اس کی کوئی وجہ بھی نہیں کہ اس کو مستند مانا ہی جائے، تو بھی قواعد فارسی کے مصنف پہلے ماضی سے بحث کرتے ہیں اور پھر مضارع اور حال وغیرہ سے۔ ماضی میں وہ جملہ اقسام ماضی کو شامل کر لیتے ہیں۔ اس لئے اس ترتیب کو قبول عام ضرور حاصل ہے اور اس کا عرصے سے رائج ہونا چاہتا ہے کہ اس سے کچھ بحث کی جائے۔ ترتیب زیر بحث کی تہہ میں اس خیال کی جھلک نظر آتی ہے کہ تمام صیغے جن کا زمانۂ گذشتہ سے تعلق ہے وہ ایک جگہ جمع کر دئے جائیں۔ پھر مضارع اور حال، کیونکہ عام خیال ہے کہ مضارع سے حال بنایا جاتا ہے۔ اس کے بعد مستقبل اور مستقبل کے بعد امر و نہی وغیرہ۔ مستقبل تک کی ترتیب ترتیب زمانی سے مطابقت رکھنے کے باعث درست معلوم ہوتی ہے کیونکہ ماضی و حال و استقبال زمانے کی یہی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ امر و نہی، اسم فاعل و اسم مفعول کو ترتیب زمانی سے کوئی واسطہ نہیں مگر انھیں اس ترتیب میں شامل کرنا ضروری تھا اور شامل کر لئے گئے تاہم ان میں تقدیم و تاخیر کی گنجایش تھی شاید اس خیال سے کہ امر و نہی فعل ہیں اور ایک ایسی ترتیب میں جس کا زیادہ تر تعلق فعل سے ہے فعل کو تقدم حاصل ہے ان کو مستقبل کے بعد ہی جگہ دے دی گئی۔ اسم فاعل اور اسم مفعول کو فعل سے کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ یہ ایسے مشتقات ہیں جو اسم مانے جاتے اور صفت کا کام دیتے ہیں اس لئے ان کو اول تو اسمائے صفت میں جگہ دینی تھی اور وہاں نہیں تو ان کے لئے موزوں جگہ اسم ہے۔ لیکن اتنی سی نسبت کی بنا پر کہ وہ فعل سے بنائے جاتے ہیں انکو بھی اسی ترتیب میں داخل کر دیا گیا۔

یوں تو یہ ترتیب درست ہی ہے لیکن سنسکرت کے اصول قواعد کے لحاظ سے اس میں ذرا سی کسر ہے۔ سنسکرت میں تصریف افعال کی ترتیب "صورت" (Mood = नियम) اور "زمانہ" (Tense = काल) پر مبنی ہے۔ صورتیں چھ ہیں۔ خبریہ (स्वार्थ) امکانیہ واحتمالیہ (शतचर्य) امریہ (अनुमत्यर्थ) شرطیہ (आशंसार्थ) دعائیہ (आशीर्वादार्थ) اور مصدریہ (भाववाचक)۔ صورت خبریہ کے علاوہ سنسکرت جدید نے اور صورتوں کے ماضی و حال و استقبال کو خیرباد کہہ دیا۔ اب ان کے محافظ وید مقدس ہی ہیں۔ اس لئے جن جن زمانوں کا جن جن صورتوں سے تعلق ہے ان کو انھیں کے تحت میں رکھنا چاہیئے۔

سنسکرت کی رو سے تصریف کی ترتیب یہ ہونی چاہیئے:۔

صورت خبریہ = حال۔ ماضی مطلق۔ ماضی قریب۔ ماضی بعید۔ مستقبل۔

صورت امکانیہ واحتمالیہ = ماضی تمنائی و احتمالی۔ مضارع۔

صورت امریہ = امر و نہی۔

مصدر بابوں میں تقسیم کئے جانے چاہئیں

سنسکرت کے مادے دس بابوں (गणों) میں منقسم ہیں۔ ہر باب میں صورت خبریہ کے بعض زمانے اور صورت ہائے امریہ و امکانیہ کے بنانے کا طریقہ الگ الگ ہے۔ تصریف فارسی میں بھی اس کا پتا چلتا ہے۔ فرمودن سے فرماید اور گزیدن سے گزیند وغیرہ سے خیال ہوتا ہے کہ فرمودن و فرسودن وغیرہ کے مادے دسویں باب سے تعلق رکھتے ہیں جو چاہتا ہے کہ ترمیم کردہ مادے میں لاحقات لگانے سے پہلے اس کے آخر میں "اے" (अय) بڑھایا جائے۔ یا دیدن و شکستن وغیرہ کے مضارع دیکھکر گمان ہوتا ہے کہ ان کا تعلق پانچویں یا ساتویں یا نویں باب سے ہے کیونکہ ان بابوں میں حال بنانے کے لئے بالترتیب नु - न - ना (نُ۔ نَ۔ نا) بڑھانا پڑتا ہے۔ یہ بات ایک طرف تو اس کا مزید ثبوت بہم پہونچاتی ہے کہ مادے ہی اصل فعل ہیں اور سنسکرت و فارسی ایک ہی شجر معرفت کی دو شاخیں۔ اور دوسری طرف اس کی متقاضی ہے کہ مصدر محض تختی تہجی کے لحاظ سے ترتیب نہ دیے جائیں بلکہ بابوں کو مدنظر رکھکر یہ ترتیب بھی تقسیم کردی جائے یا یوں کیا جائے کہ پہلے مصدر بہ لحاظ مادہ بابوں میں تقسیم کردیئے جائیں اور پھر ہر باب کے مصدر بہ لحاظ تختی تہجی رکھے جائیں۔

فعل

فعل کے اقسام مختلفہ سے بحث کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ذکر کیا جائے کہ

مسٹ تمنا بھی اسی میں شامل ہے۔

ازمنۂ اولی میں زبان نے جب ترقی و نمو کی ہے تو پہلے پہل کون سے صیغے بنائے گئے کیونکہ جبتک اس کا تعین نہ ہوگا، یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ سامع کو وحدت و جمعیت اور حاضر و غائب کا فرق سمجھانے کے لئے جو طریقہ انسان نے اختیار کیا ہے وہ کس زمانے سے مخصوص ہے۔ پروفیسر ہوٹنی نے زبان کے پہلے واحد الاجزاء (Monosyllabic) اور پھر کثیر الاجزاء (Polysyllabic) بن جانے کے متعلق جو بحث کی ہے اُس سے مستنبط ہوتا ہے کہ سب سے پہلے جو صیغے بنائے گئے وہ زمانۂ حال پر دلالت کرتے تھے۔ پروفیسر موصوف کا یہ نظریہ معقول نظر آتا ہے۔ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتے ہی انسان کو یا تو کسی زمانے کا قطعی کوئی احساس و خیال ہی نہیں ہو سکتا یا ہو سکتا ہے تو سب سے پہلے زمانۂ موجودہ یعنی اس شے کا جو آنکھ کھولتے ہی اس کے سامنے آئے۔ زمانۂ گذشتہ کا خیال بعد میں آئے گا اور اس وقت جبکہ وہ دو واقعات میں تعلق و ترتیب قائم کرکے یہ فیصلہ کرے گا۔ ان میں سے بلحاظ ترتیبِ وقوع کون کس سے پہلے واقع ہوا۔ اگر بفرضِ محال اس ترتیب کی نوبت ہی نہ آئے یا اس کا حافظہ اس قدر کمزور ہو کہ واقعات کے ظہور پزیر ہوتے ہی ان کا خیال اس کے دل سے بالکل جاتا رہے یا اس کا واہمہ اتنا ناقص ہو کہ وہ تسلسل زمان کو بالکل نہ سمجھ سکے اور ساعتِ موجودہ کے بعد دوسری ساعت کے آنے اور اس میں واقعات کے ظہور پزیر ہونے کا تصور نہ کر سکے تو بھی آنکھوں کے سامنے جو شے ہر لمحہ و ساعت موجود ہے اس کا تصور اس کے لئے لازمی و لابدی ہے۔ مختصر یہ کہ زمانۂ حال کا تصور ہونا اور سب سے پہلے ہونا ناگزیر ہے۔ حالانکہ زمانۂ گذشتہ یا آئندہ کا تصور موقوف و منحصر ہے چند کیفیات و شرائط پر۔ اس تمہید کے بعد ہم مطلب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

حال و مضارع

سنسکرت میں حال (वर्तमान) و مضارع (शत्तयर्य) کی عجب کیفیت ہے۔ حال کبھی کبھی اپنے مخصوص معنی کے علاوہ استقبال کے معنی میں بھی آتا ہے مثلاً (कदा त्वांपश्यामि) (میں تجھے کب دیکھوں گا) اور کبھی امر کے بھی جیسے तत् कुमः (میں اس کو کروں)۔ مضارع کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کے بہت سے معنی ہیں، محل و موقع کا جیسا تقاضا ہو وہی سمجھ لو۔ مثلاً यस्योभावः स्यात (جسکا جو مزاج چاہیے) اور अप्राम कालव चनं ब्रवन प्रामयाद अपमानम (بے موقع بولنے والا ذلیل ہوتا ہے اور ہوگا) فارسی نے مضارع کو محض حال (گویند تلک ہمال روز فتح یافت) و استقبال (ع۔ گرم تا کے باند ایں بازار) کے معنی سے آراستہ کیا اور حال سے جب جی چاہا

عــه صفحہ ۲۰۰ لسان و مطالعہ لسان مصنفہ پروفیسر ڈبلو۔ ڈی۔ ہیوٹنی مترجمہ حمید اللہ خان صاحب صف زئی پروفیسر آویرشین گورنمنٹ کالج اجمیر

استقبال (حالا بندہ رخصت می شوم) کے معنی بھی لے لئے مگر تعداد منبع فعل (وحدت و جمعیت فاعل) اور فعل سے صدور فعل- اس کا تعلق بہ لحاظ مکان و انتساب صدور فعل [یعنی بات کرنے والا صدور فعل جس کی ذات سے منسوب کر رہا ہے وہ بوقت کلام اس جگہ موجود (حاضر) ہے یا نہیں (غائب) اور موجود ہے تو کس حیثیت سے - بہ حیثیت اس شخص کے جس کی جانب صدور فعل ایک غیر شخص منسوب کر رہا ہے (مخاطب) یا بہ حیثیت اس کے جس کا کلام صدور فعل کو خود اس کی ذات کی طرف منسوب کرتا ہے (متکلم)[۵]] معین کرتے چلے تو کچھ لاحقات سنسکرت کے حال سے لئے تو کچھ مضارع سے اور یوں سامان تصریف بہم پہنچا کر ایک ایسا قاعدۂ کلیہ بنا لیا جس پر وہ باستثنائے صیغۂ واحد غائب ہر حال میں عامل رہے:-

وہ لاحقات جو حال سے لئے گئے			وہ لاحقات جو مضارع سے لئے گئے		
वर्तमान प्रस्मै पद			शत्त्यर्थ प्रस्मै पद		
अन्यपुरुष -			मध्यम पुरुष		
एक बचन	अति	د	एक बचन	इ: *	ی
" बहु "	अन्ति	ند	" बहु "	एत	ید
उत्तम पुरुष			उत्तम पुरुष		
एक बचन	मि *	م	बहु बचन	एम	یم

* ان کے سوا سب میں अ بڑھا ہوا ہے۔

۵ یہاں کوئی بات خلاف مسلمات نہیں کہی گئی ہے، بالعموم فاعل کی تین حالتیں مانی گئی ہیں- غائب- حاضر- متکلم جن کی بنیاد "انتساب" و "مکان" پر رکھی گئی ہے: "انتساب" پر اس طرح کہ کلام کرنے والا صدور فعل کو اپنی طرف منسوب کر رہا ہے (متکلم) یا غیر کی طرف (حاضر و غائب) اور "مکان" پر اس طرح کہ صدور فعل جس کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ وہاں موجود (حاضر و متکلم) ہے یا نہیں (غائب)۔ انتساب و مکان ہر ایک سے یہ دو شقیں پیدا ہوئیں۔

انتساب = (۱) انتساب نفسی یعنی متکلم (۲) انتساب غیری یعنی غائب و حاضر

مکان = (۱) موجود یعنی حاضر و متکلم (۲) غیر موجود یعنی غائب۔

فرق و امتیاز کے لئے دونوں میں سے قدر مشترک کو الگ کر کے بلحاظ وصف اس کا نام تراشا گیا اور باقی کے دو ناموں میں "مکان" کا لحاظ کیا گیا۔

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ جسے اصطلاح قواعد میں متکلم کہتے ہیں وہ نہ ہو تو تینوں حالتوں میں سے کوئی بھی پیدا نہیں ہو سکتی قواعد میں متکلم محض اس واسطے متکلم نہیں ہے کہ وہ باتیں کرتا ہے۔ بلکہ وہ صدور فعل کا منبع خود کو بتاتا ہے اس لئے متکلم ہے- پھر یہی دو اور ہستیوں کو وجود میں لاتا ہے- جن میں سے ایک وہیں موجود ہے جہاں وہ خود ہے اور اس سے وہ کہتا ہے تجھ سے فلاں فعل صادر ہوا۔ اور دوسرے وہاں موجود نہیں جہاں وہ خود ہے مگر اس کا ذکر کرتا اور اس کی نسبت کہتا ہے کہ فلاں فعل کے صادر ہونے کا وہ باعث ہے۔

یہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ سنسکرت کی "ت" فارسی میں اکثر "د" سے بدل گئی ہے علاوہ اس کے جو فرق نظر آتا ہے وہ تغیر صوتی کا کرشمہ ہے۔ اس کو تاویل لا یعنی پر محمول کرنا حقایق کا خون کرنا ہے۔ رفع التباس کے لئے ایرانیوں نے مضارع پر "می" بڑھا کر "حال" بنانا شروع کیا۔ یہ لفظ وہ کہاں سے لائے اس کے لئے سنسکرت میں کون سی مشابہت موجود تھی جس نے شمع ہدایت کا کام دیا؟ اس کا پتا نہیں لگتا۔ لیکن خیال ہوتا ہے کہ شاید "سم" (सम) سے "ہمی" اور "ہمی" مخفف ہو کر "می" رہ گیا۔

مستقبل

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل عربوں، ایرانیوں اور ہندیوں سب کے لئے دقتیں پیش کرتا رہا ہے اگرچہ ذہن میں اس کا تصور صاف صاف پیدا ہو چکا تھا اور زمانہائے گذشتہ و موجودہ سے وہ ایک بالکل الگ اور نئی چیز سمجھا جاتا تھا۔ مگر زمانۂ موجودہ سے اس کا تعلق اتنا گہرا اور زمانۂ گزشتہ سے اتنا دُور نظر آتا تھا کہ انھوں نے اسے زمانۂ گزشتہ سے تو بالکل الگ کر دیا لیکن زمانۂ موجودہ سے الگ نہ کر سکے۔ عربوں نے حال کے لئے جو صیغہ بنایا اسی سے استقبال کا کام لیا۔ سنسکرت والوں نے اس خیال کو اسم فاعل ترکیبی اور حال کے صیغوں کو ملا کر ظاہر کیا۔ فارسی نے اپنی بہن سنسکرت کا اسی وقت تک ساتھ دیا جب تک امتداد زمانہ نے اس کے خط و خال پر اپنے گہرے نقش مرتسم نہ کئے جب دونوں بہنوں کو بچھڑے صدیاں گزر گئیں اور عادات و اطوار میں اتنا فرق پڑ گیا کہ ظاہر بیں نظریں انھیں دیکھ کر ماں جائی بہنیں کہنے سے دریغ کرتی ہیں تو اس نے بھی سنسکرت کا ساتھ چھوڑ دیا اور اپنی ڈھائی اینٹ کی مسجد الگ بنائی۔ جس ترکیب سے ایرانی زمانۂ استقبال ظاہر کرتا ہے اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بارہ میں خیالات میں تو اس کے بھی وہی گنجلک ہے جو عربی اور سنسکرت بولنے والوں کی پائی جاتی ہے مگر اس کے نزدیک آئندہ زمانے میں کسی فعل کے وقوع پزیر ہونے کا اظہار مرادف ہے اُس کے اُس زمانے میں وقوع پزیر ہونے کی خواہش کے۔ اب سے چند صدی پہلے کا ایک بزرگ کہتا ہے ؎

رفتم از کوئے تو اے خو بہ جفا کردہ بہ گو   صرف اوقات بہ آزار کہ خواہی کردن؎

اور اس کی انتصار پسند اولادمیں سے ایک بحالتِ وجد یوں نغمہ سرا ہوتا ہے ؎

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند   چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

سنسکرت میں مستقبل کی دو قسمیں ہیں، قریب و بعید۔ اس نے اس کی پرواہ ہی نہ کی۔ مستقبل تو مستقبل

؎ قواعد سنسکرت مصنفۂ مونیر ولیم مترجمۂ جانی بہاری لال صہ ۵۰-۳۵۶

؎ جامع القواعد صہ ۲۲ و ۲۱۶ از پروفیسر آزاد۔

ہی ہے کیا قریب کیا بعید۔

امر

مصدر کے بیان میں کہا جا چکا ہے کہ مادہ قبل اس کے کہ اس سے کچھ مشتق کیا جائے چند مقررہ اصول کے مطابق اکثر صورت بدلتا ہے۔ یہ صورت سنسکرت میں کلام ناقص (प्रातिपदिक अपूर्णपद) سے موسوم ہے۔ امر میں بھی اور زمانوں کے صیغوں کی طرح بغرض امتیاز زمانہ و فاعل کلام ناقص کے آخر میں علامتیں بڑھا کر کلام تام بنایا جاتا ہے۔ ویدوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صیغۂ واحد حاضر امر کی علامت धि تھا جو تصنیف مہابھارت کے وقت हि سے بدل گیا اور یہ دونوں علامتیں بھی سنسکرت جدید میں پہنچ کر قلیل الاستعمال ہوگئیں یہاں تک دو ہزار مادوں میں سے قریب قریب تین چوتھائی میں گر جاتی ہیں۔ فارسی میں کثرت قلت پر غالب آگئی اور اس نے اصول ہی یہ مقرر کر لیا کہ کلام ناقص سے صیغۂ واحد حاضر امر کا کام لے۔ مثلاً "پچ" (पिच) مادہ بہ معنی پٹنا ہے اسمیں جب ترمیم کر کے کلام ناقص بنایا جائے گا تو یہ "پیچ" (पेच) ہو جائے گا۔ یہی مصدر پیچیدن کا امر ہے
اس روش کا نتیجہ یہ ہوا کہ "حال کے اہل تحقیق" اس دھوکے میں پڑ گئے کہ "فارسی زبان میں امر اصل فعل ہے۔ ان کا دھوکا کھانا بجا ہے، وہ جانتے ہی نہیں کہ امر کیونکر بنا اور فعل و اسم وغیرہ بنانے سے پہلے ایک چیز جسے مادہ کہتے ہیں وہ چند اصول کے مطابق کلام ناقص بنتا اور پھر ہر رنگ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اگر انھیں یہ بات معلوم ہوتی تو اپنے کلام کی تائید میں جو دلیل پیش کرتے ہیں نہ کرتے۔ وہ ہرگز نہ کہتے کہ "اس سے مضارع، حال، نہی، اسم فاعل وغیرہ کتنے صیغے نکلتے ہیں" اس لئے یہ اصل ہے۔ اس معاملے میں پروفیسر آزاد مرحوم بھی کوئی قطعی رائے نہ قائم کر سکے، اس کی دو وجہیں تھیں، ایک طرف تو انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ افعال مشتقہ کی اصل کیا ہے، دوسری طرف یہ دقت تھی کہ گو ابتدائی زمانہ میں فارسی اصول سنسکرت کی پابند رہی، زمانۂ ما بعد میں جب لوگ حقیقت سے بے خبر ہوگئے اور خیال پیدا ہو گیا کہ امر ہی اصل اشتقاق ہے تو اکثر مصدر بعض مصدروں کے امر سے بنا ڈالے۔ مثلاً خواستن سے خواہ بطور امر بولا جاتا تھا اس سے خواہیدن گھڑ لیا گیا۔ جہاں کہیں ماضی و مضارع میں اختلاف ہے اکثر اس کا سبب وہی ہے جس کی طرف بحث مصدر میں اشارہ کیا جا چکا ہے یعنی دو مصدروں کے صیغے ملا کر مطلب برآری۔

سنسکرت میں امر کے صیغہائے غائب و متکلم بھی ہیں لیکن فارسی نے انھیں ترک کر دیا۔

ع۵ ص۱۶ جامع القواعد مصنفہ پروفیسر محمد حسین آزاد

نہی

اسکو ایسی کوئی خصوصیت حاصل نہیں کہ ایک الگ صیغہ مانا جائے جتنے فعل ہیں وہ مثبت و منفی دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں، امر بھی اسی طرح مستعمل ہے۔ اگر اس کے اشتقاق کا کوئی خاص قاعدہ ہوتا تو یہ کہنا بجا ہوتا کہ اس کا رتبہ کسی صیغے سے کم نہیں۔ سنسکرت میں نفی فعل کے لئے "ن" (न) "نو" (नो) "نہہ" (नहि) بمعنی نہیں "اور "ما" (मा) "ما سم" (मास्म) بمعنی "مت" آتے ہیں۔ فارسی امر کے سوا، تمام صیغوں میں "نَ" لگا کر نفی اثبات کرتی ہے لیکن اس کی نفی کے لئے شروع میں "مَ" لگاتی ہے پھر بھی "نَ" سے پرہیز نہیں۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ سنسکرت بھی امر پر मा لگا کر نہی بناتی ہے : माका र्षीः (مت کر)۔

اسم فاعل

قواعد نویس بحث اسم میں اس کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کی دلالت و استعمال اس کے منبع و طریق اشتقاق سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان اوراق میں طریق اشتقاق پر زور دیا گیا ہے اس لئے بحث فعل میں اس کا بیان قابل عفو سمجھا جائے۔

اسم فاعل کا مقابل سنسکرت میں प्रस्मै पद वाली वर्तमान गुण क्रिया معلوم ہوتی ہے۔ فارسی والے کہتے ہیں کہ امر کو کسرہ دیکر "ندہ" لگا دو۔ سنسکرت والوں کا مقولہ ہے کہ مادے میں ترمیم کرو، پھر صیغہ جمع غائب حال کا حرف آخر گرا کر کلام ناقص بناؤ اور کلام تام بنانے کے لئے اس کی تصریف اُس طرح کرو جس طرح اُس کلام ناقص کی کرتے ہو جس کا حرف آخر "ت" (त्) ہوتا ہے۔ اس پر یہ بھی اضافہ کرتے ہیں کہ نون غنہ کبھی قایم رہے اور کبھی گر جائے گا۔ مراد یہ کہ ترمیم کردہ مادہ کے آخر میں کبھی "اَت" (अत) اور کبھی "انت" (अन्त) لگ کر کلام ناقص بنتا ہے۔ اس کلام ناقص کی صورت فاعلی بہ حالت واحد ایک ہائے مختفی چاہتی ہے۔ ادبی سنسکرت میں اس صیغے کی جو صورت نظر آتی ہے وہ خوش الحانی وغیرہ کی رعایت سے مسخ ہو جاتی ہے۔ مثلاً पचन्तस् صورت بدلے ہوئے पाचान ملے گا۔ مگر ہر سنسکرت داں جانتا ہے کہ اصل شکل کیا ہے۔ فارسی نے صرف اصل پر نگاہ رکھی اور اپنی عادت کے موافق "ت" کو "د" سے بدل دیا۔

"گُن کریا سمبندھی کرترو اچک نام" (गुण क्रिया संबंधी कर्तृ वाचक नाम) کے کلام ناقص بنانے کا طریقہ اسم فاعل کے طریقے سے ایک حد تک ایسی مطابقت رکھتا ہے کہ خود بخود طبیعت اس طرف مائل ہوتی ہے کہ اس کو اسم فاعل کا مترادف ماننئے۔ مثلاً مادہ میں "اِن" (इन) کا لگایا جانا یا جن مادوں کے آخر میں "آہ" (आः) ہو ان میں "ی" (य) کا بڑھانا۔ لیکن چو امر اس خیال سے مانع

ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس میں "ت" یا "د" کہیں نہیں آتی کہ کلام تام بنانے کے لئے ہائے مختفی بڑھا کر فارسی کے اسم فاعل کا "مطابق" (Correspondant) پیش کر دیا اور کہا جائے کہ فارسی نے اصل ہیئت قایم رکھی۔

اسم مفعول

یہ سنسکرت کا "کرمن واچیہ بھوت گن کریا" (कर्मणि वाच्य भूत गुण क्रिया) ہے جس کا کلام ناقص مادہ میں "ت" بڑھا کر بنایا جاتا ہے اور جس میں ہ کے اضافہ سے کلام تام بنتا ہے مثلاً "کرت" (कृत) سے "کرتہ" (कृतः)۔ فارسی نے कृत کو "کرد" بنایا اور ہ زیادہ کر کے اسم مفعول "کردہ" بنایا

ماضی

سنسکرت نے زمانہ ماضی میں تین قیدیں لگادی ہیں، ان سے وہ ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ وقوع فعل کو کتنی مدت گزری۔ جو کام آج سے پہلے ہوچکا وہ ختم تو ہوچکا لیکن اُسے گزرے بہت زمانہ نہیں ہوا تو اس کے لئے ایک ایسا صیغۂ فعل تراشنا لازمی ہے جو زمانۂ قریب ظاہر کرے اور گزشتہ کے دامن کو موجودہ سے باندھ دے (अनद्यतन वा अपूर्ण भूत) پھر ایک ایسا صیغہ بھی ہونا چاہیئے جو بتائے کہ کام کو کئے ہوئے مدت مدید گزری (प्रोक्त भूत) اور جب کہ ماضی قرب وبُعد کو نظر انداز کر کے بنا ڈالیگئے تو وہ صیغہ کیوں نہ ہو جس کو قرب بعد دونوں ہی سے کوئی تعلق نہ ہو اور صرف زمانۂ ماضی میں ظہور فعل پر دلالت کرتا ہو۔ کیونکہ قرب وبُعد کا مسئلہ تو اعمال دماغی کی دوسری منزل ہے، سب سے پہلے جو شعور ہوگا وہ تو اتنا ہی ہوگا کہ فعل وقت حاضرہ میں نہیں ہوا اس سے پہلے ہی یعنی زمانِ گزشتہ میں ہوچکا ہے۔ پس اساس وبنیاد تو یہی ماضی ہے (अनियत भूत)

ماضی کی حقیقی قسمیں یہی تین ہوسکتی ہیں لیکن یہ تعین محض امتداد زمانہ پر مبنی ہے۔ اور اسباب بھی تو پیدا ہوسکتے ہیں جو بے تاب جلوہ ہوں مثلاً متکلم کی معلومات ناقص مانع ہے کہ وہ ایک امر کی نسبت اس پیرائے میں گفتگو کرے جس سے وثوق مترشح ہو اور سامع کے دل میں اس کے وقوع پزیر ہونے کا یقین ہوجائے اس لئے وہ چاہتا ہے کہ اسلوب کلام سے اس کی راست بازی پر حرف نہ آئے۔ لیجئے اب شک واحتمال پیدا ہوگیا۔ اسی طرح وہ کبھی فعل کا جاری رہنا اور کبھی آرزوؤں کا خون ہوجانا ظاہر کرنا چاہتا ہے لہذا وضع افعال سننے والے کے دل میں کیوں نہ خیال استمرار وتمنا پیدا کرے۔ اس طرح امتداد زمانہ اور اسباب مختلفہ نے ملکر چھ ماضی بنا ڈالے اگرچہ سنسکرت میں تین ماضی حقیقی معنی میں موجود ہیں لیکن ان سے زمان گزشتہ میں کسی کام

کی تکمیل ظاہر کرنے کا کام بہت کم لیا جاتا ہے۔ اکثر یہ غرض مرکب صیغوں سے کام لے کر پوری کی جاتی ہے۔ یہ صیغے کبھی "اَس" (अस् = ہونا) اور کبھی "بھُو" (भू = ہونا) کے صیغے "کرمن واچیہ بھوت گُن کریا" (कर्मणि वाच्य भूत गुण क्रिया) سے ملا کر بنائے جاتے ہیں۔

سنسکرت کا ساتھ چھوڑنے کے بعد فارسی نے اختصار و سادگی پر بہت نظر رکھی اس لئے اس نے حقیقی ماضیوں میں سے صرف ایک کو جو قیدوں سے آزاد تھا اصل مانا اور اس کے لئے مفرد صیغے رہنے دیے، اور باقی ماضی دو دو صیغے ملا ملا کر بنانے شروع کئے۔ ماضی قریب بالکل اسی طرح بنایا جیسے سنسکرت بناتی تھی یعنی اسم مفعول کے آخر میں مادہ "اَس" (अस्) کے صیغۂ واحد غائب حال "اَستِ" (अस्ति) لگا کر۔ ماضی بعید میں ایک ماضی ملا دیا۔ ماضی احتمالی میں مضارع بڑھا دیا تکرار و استمرار کے لئے ماضی مطلق پر "می یا ہمی" اور تمنا کے لئے ماضی مطلق کے آخر میں صیغہ حال کے لاحقات لگا دیئے۔ ماضی مطلق ہمیشہ سے کلام ناقص میں "اَت" (अत = त्) بنایا جاتا تھا۔ اس نے تقلید کی۔

مصدر و امر کے بیان میں مفصل بحث کر کے بتایا جا چکا ہے کہ مادّہ اصل فعل ہے۔ ماضی مطلق نے اس نظریہ کا ایک مزید ثبوت پیش کر دیا۔ اور اس وجہ پر روشنی ڈال دی جس نے ایک گروہ کو اس طرف مائل کیا کہ وہ ماضی کو اصل اشتقاق سمجھے۔ سنسکرت میں ماضی مطلق کا لاحقہ अत یا त ہے اور مصدر کا तुम اس لئے جن بزرگوں کے علم و تبحر کے دائرہ سے مطالعۂ سنسکرت خارج تھا ان کا دھوکا کھانا بالکل طبعی تھا اور جس قسم کے نظریے پروفیسر آزاد مرحوم نے جامع القواعد (ص ۱۴۱) میں پیش کئے وہ سرتاسر معقول۔

طور مجہول

یہاں تک فعل کے طور معروف سے بحث کی جاتی رہی ہے، اب اس کا طور مجہول بیان کیا جاتا ہے۔ سنسکرت نے طور مجہول بنانے میں بہت دریا دلی سے کام لیا ہے۔ فعل متعدی (سکرمک کریا = सकर्मक क्रिया) ہی سے مجہول نہیں بنائے بلکہ فعل لازم (اکرمک کریا = अकर्मक क्रिया) کو بھی نوازا ہے۔ اگرچہ اس کو برابر کا حصہ نہیں دیا۔ فعل لازم سے جو صیغہائے مجہول بنائے گئے ہیں (بھاو کرمن واچیہ = भाव कर्मणि वाच्य) ان کی تصریف صرف صیغۂ واحد غائب ہی میں کی جاتی ہے، اور صیغے نہیں آتے۔ فعل متعدی سے جو مجہول کے صیغے آتے ہیں ان میں ایک باریک فرق بھی پیدا کیا ہے، جس کا مدار نوعیت فعل ہے۔ اگر معنی فعل سے یہ ظاہر ہو کہ اس کا کوئی

فاعل ہے تو اس کا نام "کرمن" (कर्मन) ہے اور اگر اس سے یہ مطلب نکلے کہ فعل کا اثر فاعل کی ذات ہی پر پڑتا ہے تو اس کو "کرمن کرتا" (कर्मन कर्ता) کہتے ہیں۔ مثالیں بالترتیب یہ ہیں:۔

(۱) भूयते त्वया تجھ سے ہوتا ہے۔ (۲) तुप्यते وہ پیٹا جاتا ہے۔ (۳) भिद्यते काष्ठं لکڑی کٹتی ہے۔

سنسکرت نے فعل کے طور مجہول کا نام "کرمن واچیہ" کے علاوہ "کرم پردھان" (कर्म प्रधान) بھی رکھا ہے، دونوں اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مفعول نے فقرے کے کل اجزا سے زیادہ اہمیت اختیار کر لی اور متکلم ہیئت فعل سے اس بات کی طرف بالخصوص توجہ دلانا چاہتا ہے۔

تصریف کے لئے محض لاحقات معروف نفسی سے کام لیا ہے مگر اس کی تہ میں کوئی خاص بات پنہاں نظر نہیں آتی۔ اگرچہ سنسکرت میں طور معروف کے لئے دو طرح کے لاحقے ہیں، ایک طرح کے لاحقے (आत्मने पद के प्रत्यय) لاحقات معروف نفسی) یہ ظاہر کرتے ہیں کہ صدور فعل سے خود فاعل مستفید ہوا ہے، اور دوسری طرح کے لاحقے (परस्मै पद के प्रत्यय = لاحقات معروف غیری) اس وقت کام آتے ہیں جبکہ صدور فعل سے فاعل نہیں بلکہ کوئی اور فائدہ اٹھائے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ طور معروف نفسی ہی قابل لحاظ ہے کیونکہ ایک تو سب فعل متعدی دونوں طرح کے لاحقوں کے معمول نہیں دوسرے لاحقات معروف نفسی جملہ مشتقات فعل میں کام آتے ہیں خواہ وہ براہ راست مادّوں سے بنائے گئے ہوں (सनि सृत क्रिया) خواہ ان میں کچھ اضافہ کر کے (निसृत क्रिया)۔ اس صورت میں طور مجہول کے لئے جو مادہ میں اضافہ کر کے بنایا جاتا ہے لاحقات طور نفسی کا لگانا ایک طبعی امر ہے۔ طور معروف غیری کو سنسکرت کی وسعت و دقت نظر پر محمول کرنا چاہیئے۔

سنسکرت کے قواعد نویسوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ طور مجہول مادہ سے براہ راست نہیں بنتا بلکہ اسمیں य بڑھانا پڑتا ہے اور وہ فعل مفرد نہیں فعل مرکب ہے لیکن مونیر ولیم صاحب اسپر یہ اور اضافہ کرتے ہیں کہ اس य کی اصل مادّہ या (جانا) معلوم ہوتا ہے۔ اسلئے فارسی اور سنسکرت کے طریق کار میں اگر کہیں مطابقت ہے تو وہ اتنی سی ہے کہ دونوں طور مجہول کو فعل مرکب ہی خیال کرتی ہیں۔ فارسی نے اپنی سہل انگاری کے باعث جہاں اور بہت سے فعل دو دو فعل ملا ملا کر بنائے وہاں اس بارہ میں بھی وہی روش اختیار کی چنانچہ اسم مفعول اور مصدر شدن کے مختلف صیغے حسب ضرورت ملا ملا کر طور مجہول بنایا۔ اور سنسکرت باریکیوں سے جن کا ذکر آچکا ہے چشم پوشی کی۔

فلسفۂ تاریخ

(از مسٹر سلیم حامد رضوی بھوپالی ایوننگ کرسچین کالج آلہ آباد)

بعض علماے یورپ کا خیال ہے کہ نیچر جو تبدیلیاں انسان میں، اور انسان جو تصرفات نیچر میں کرتا ہے اُن کے مجموعہ کا نام تاریخ ہے۔ اگر ہم اُن کے اس خیال کو اچھی طرح سمجھ لیں تو یقیناً ہم بے تکلف کہہ سکتے ہیں۔ کہ علوم انسانی کے مہتم بالشان شعبوں میں سے تاریخ ہی ایسا علم ہے جس نے حقائق و معلومات کا انکشاف کر کے مدنیت میں زبردست تبدیلیاں کر دی ہیں۔ تاریخ کی اہمیت و عظمت کا احساس وہ لوگ خوب کر سکتے ہیں جو "علوم جدیدہ" سے دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اگرچہ تاریخ سب علوم سے مؤخر ہے لیکن نتائج و ترتیب کے لحاظ سے اس کو دیگر علوم میں اولیت حاصل ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ تاریخ ہی ہماری زندگی کے بہت سے عقدوں کو حل کرتی اور ہمارے ہزاروں سوالات کا شافی جواب دیتی ہے۔ تاریخ اُن تمام باتوں کا حقیقی ماحصل ہے جو انسانی دل و دماغ میں پیدا ہوئیں، اور جو انسانی محنتوں کا نتیجہ ہیں۔

تاریخ سے نہ صرف انسان کے آغاز و آفرینش کا عقدہ حل ہوتا ہے بلکہ اُس کے انجام کا حال بھی معلوم کر لینا دشوار نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ انسان کی اُس عقل و فہم کا نتیجہ ہے جسے وہ ابتدائی حالت کو چھوڑ کر ترقی کے خاص درجہ پر پہونچکر حاصل کرتا ہے۔ اس عالم کے بسنے والے صفحۂ زمین پر جو اپنے نقش قدم چھوڑ گئے ہیں وہ مستقبل کی ذہنیتوں اور عقلوں کے لئے گویا تجربہ کا کام دیتے ہیں، اور اُن نقوش کو تاریخ سے موسوم کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے دنیا کے ابتدائی دَور میں تاریخ صرف چند حکایتوں اور قصوں کا مجموعہ تھی جو نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ واقعات میں تصنّع اور ناقابل یقین تذکرات کی آمیزش ہوگئی اور واقعات ہمارے سامنے بالکل مسخ شدہ حالت میں آئے۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ ہم دنیا کی ابتدائی تاریخ سے بالکل محروم ہوگئے۔ جس قدر ہم اس قدیم تاریخ کے متعلق واقفیت کا دعوی کرتے ہیں وہ سب کچھ نیم تاریخی مذہبی داستانوں سے حاصل کیا ہوا ذخیرہ ہے جس کو آریہ چینی اور یونانی ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ ایک محقق نے انھیں غیر مربوط واقعات سے نہایت ہی تنقید و تبصرہ کے ساتھ تاریخ مرتب کی۔

ایسا کرنا اُس کے لئے ضروری تھا۔ کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ انسان کی تمام ترقیاں تدریجاً ہوتی ہیں اور دنیا کا ہر موجودہ واقعہ گزشتہ واقعہ کا ایک نتیجہ ہے۔

غرض تاریخ اپنے اولین دَور میں اس لئے غیر مربوط حالت میں تھی کہ دنیا فنِ کتابت سے ناآشنا تھی گو خطوطِ حجری کے ارتسامات موجود تھے لیکن فنِ کتابت کی ترقی سے تاریخ اب اصلاح یافتہ صورت میں نظر آنے لگی ہے۔ قصص و حکایات کے بجائے واقعات کی تفصیل انسانی زندگی کے ہر ایک پہلو پر غور کر کے اور افعالِ انسانی کو دیکھکر گزشتہ اور آئندہ واقعات، اُن کے اسباب و نتائج، تہذیب و تمدن اور اُن کے معرکتہ الآرا انقلابات پر بحث کی جانے لگی جس نے سلاطین و مشاہیر کے ذاتی تذکروں اور اُن کی سوانح عمریوں کو تاریخی حدود سے خارج کر دیا۔

تاریخ کا موضوع کیا ہے؟ اس کا جواب ابن خلدون یہ دیتا ہے کہ تاریخ کا موضوع معاشرتی زندگی ہے یا دوسرے الفاظ میں جماعت کا مجموعی مادّی اور ذہنی تمدن دکھانا تاریخ کا کام ہے۔ یعنی لوگ کس طرح محنت کرتے اور روزی کماتے تھے۔ وہ کیوں آپس میں لڑتے اور الگ الگ سرداروں کے ماتحت بڑی بڑی جماعتوں میں مربوط ہوتے ہیں۔ اور بالآخر کیونکر حضری زندگی میں اُن کو اتنی فرصت مل جاتی ہے کہ اعلیٰ علوم و فنون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ کس طرح آغاز سے رفتہ رفتہ ایک لطیف تمدن بن جاتا ہے اور کس طرح معدوم و فنا ہو جاتا ہے؟ جبکہ تاریخ کا کام کسی قوم کی تہذیب و اخلاق سیاسیات و معاشرت اتحاد و باہمی صنعت و حرفت، تمدن و اقتصاد دکھانا ہے تو ایک محقق کے لئے یہی لازمی ہے کہ ان باتوں کو سمجھنے کے لئے وہ جغرافیہ داں ہو۔ علوم طبعیہ، اقتصادیات و سیاسیات میں کافی معلومات رکھتا ہو۔ قانون داں ہو، علم آثار قدیمہ، علم الالسنہ سے بھی واقف ہو تاکہ وہ انسان و نیچر کی باہم کشمکش کے راز کو سمجھکر دوسروں کو سمجھانے کی قابلیت پیدا کر سکے اور اُن واقعات کے اسباب و نتائج کو بیان کر سکے جن کے مجموعہ کو تاریخ کہتے ہیں۔ تاریخ کے دیکھنے سے ایسے تمام واقعات مسلسل اور مرتب صورت میں نظر کے سامنے آجاتے ہیں جن کے مطالعہ سے قوموں کے عروج و زوال کا حل معلوم ہو جائے۔ یعنی دنیا میں کسی قوم کے وجود کا آغاز کیونکر ہوا، اُس نے ترقی کے منازل کس طرح طے کئے، مدارج عروج سے گذر کر اُس کا زوال کیونکر ہوا۔ اگر نہیں تو وہ کون سے ذرائع اختیار کئے گئے جنھوں نے اس کو منازلِ فنا سے دور رکھا۔ زندگی کے ارتقا و انحطاط پذیر زمانوں میں اُس قوم کی معاشرت کیا تھی، اخلاق کیسا تھا، مذہب و سیاسیات کی کیا حالت تھی، اُن کے اشغال و اہتماکات زندگی کیا تھے، علوم و فنون میں کیا کیا کامیابیاں حاصل کیں اجتماعی زندگی میں اُن کے حقوق و فرائض کیا تھے؟ غرض ہر ایک جزو پر مفصل بحث و مذاکرہ تاریخ کا ضروری

عنصر ہوگا۔ ایک تاریخ لکھنے والے کا فرض صرف اس قدر ہے کہ وہ واقعات کو مسلسل حالت میں اُن کے اسباب وعلل کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔ لیکن ایک فلسفی مؤرخ اپنی تاریخ کی تیاری کے سلسلہ میں واقعات و اسباب کے بحرِ ذخار میں غوطہ لگا کر تاریخِ صحیح کے دُرِ آبدار سے دنیا کی نگاہوں کو دعوتِ تماشا دیتا ہے۔ اس قسم کی تاریخ کی بنیاد بحیثیت فن کے کس نے رکھی؟ اس کے متعلق یقینی طور پر فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ قدیم مصریوں کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے اس کی اہمیت کو سمجھا۔ اس کے ثبوت کے لئے علماء تاریخ نے متعدد دلائل پیش کئے ہیں، جو مصریوں کے چند آثار سے مستنبط ہیں۔

اس کے علاوہ معلوم ہوا ہے کہ سب سے پہلی کتاب جس میں واقعات ترتیب وار دکھائے گئے ہیں توراۃ ہے بعض بیان کرتے ہیں کہ سب سے پہلے کسی حد تک ایسی فلسفیانہ تاریخ سینٹ اگسٹائن ایک رومی پادری نے لکھی جس میں واقعات ۴۱۳ء سے ۴۲۶ء تک ملتے ہیں۔ پانچویں صدی میں اور بھی بہت سے علماء نے ایسی تاریخ لکھنے کی سعی کی، لیکن بحیثیت فن کے اصول و ضوابط کو مدنظر رکھکر ہیروڈوٹس ایک مشہور مؤرخ و سیاح نے جس کو ابتک دنیا "ابو التاریخ" کے لقب سے یاد کرتی ہے ایک مکمل تاریخ لکھی۔

اُسی زمانہ میں ٹھوقیدیدس و زینوفن وغیرہ بھی پیدا ہوئے ۴۰۰ء قبل مسیح میں ایک فارسی طبیب نے بھی اسی وضع کی ایران قدیم کی تاریخ مرتب کی جس کا نام تسیاس تھا۔ ان کے بعد جس قدر بھی مؤرخ پیدا ہوئے وہ اُنھی کے نقش قدم پر چلتے رہے۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں بھی ایسے مؤرخ پیدا ہوئے جنھوں نے اور زیادہ محققانہ طرز اختیار کیا۔ مثلاً ۱۷۲۵ء میں مان تسکیو، ۱۸۳۵ء میں شلیگل، ۱۸۳۷ء میں ہیگل، ۱۸۴۲ء میں کامٹی، اور ۱۸۵۷ء میں بکل وغیرہ پیدا ہوئے۔ عرب مورخین میں ابن خلکان، ابن اثیر، ابو ریحان البیرونی، علامہ یاقوت، مسعودی، ابن جریر طبری، ابو الفدا، مقریزی، اور ابن خلدون جیسے مؤرخ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

مغرب کو ناز ہے کہ اُس نے تاریخ نویسی کا جدید فلسفیانہ اصول ایجاد کیا ہے لیکن فلسفۂ تاریخ کا بانی علامہ ابن خلدون تھا۔ اس حقیقت کو مصنف مرجان فرنگ بھی تسلیم کرتے ہیں اور علامہ صدیو فرانسیسی نے بھی اپنی کتاب تمدن اسلام میں، اس کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔ عیسائیوں کی فاتحانہ شوکت کے آگے نہ صرف مسلمانوں کا مادی بلکہ اُن کا ذہنی تمدن بھی پسپا ہوتا جا رہا تھا، اُس وقت جبکہ اُن کا مغربی تمدن چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ کر زمانہ کے نشیب و فراز دیکھتا ہوا منزلِ فنا کی طرف جا رہا تھا اور قریب تھا کہ وہ بالکل معدوم ہو جاتا، اُس وقت اُس نے ایک ایسا شخص پیدا کیا جس کی بصیرت افروز قابلیت سے تمدن کی نشوونما کا نیا قانون مرتب ہوا اور اس طرح ایک نئے علم فلسفۂ تمدن یا فلسفۂ تاریخ کی بنیاد قائم ہوئی۔ یہ

عجیب و غریب شخص ابن خلدون تھا جس کی ولادت ۱۳۳۲ء میں اشبیلیہ کے رہنے والے ایک خاندان میں بمقام تونس ہوئی۔ علامہ دعوے کے ساتھ اٹھا تھا کہ وہ فلسفہ کی ایک نئی شاخ کی بنیاد ڈالے گا جو ارسطو کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی تھی۔ اُس نے اپنے اس جدید علم کے ذریعہ سے تاریخ کا ایک نیا راستہ تیار کیا کہ تمام تاریخی واقعات جس حد تک اپنے اسباب کی طرف منسوب کئے جاسکتے ہیں اور اصول و قوانین کے تحت میں لائے جاسکتے ہیں۔ اُن کو علم اور فلسفہ کا جُز کہلانے کا مستحق ٹھہرایا اس طرح تاریخ کا خیال بحیثیت علم کے پیدا ہو گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس فن کو تحسین تفاخر، نفع عام اور نصیحت و تلقین سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ علم زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے ماتحت ضرور ہے لیکن بجائے خود اس کا کام بجز واقعات کی تحقیق اور اُن میں علت و معلول کا تعلق تلاش کرنے کے اور کچھ نہیں۔ یہ کام نقادانہ حیثیت سے بالا تعصب کرنے کا ہے۔

جب مسلمانوں کا علمی خزانہ مغرب کے ہاتھوں میں پڑ گیا، اُسی وقت سے مسلمانوں کے ہاتھ خالی ہوگئے اور اب وہ مغرب کے محتاج ہیں۔ بقول ٹی۔ جی۔ دوبوئر "عالم اسلام میں جس طرح ابن خلدون کا کوئی پیش رو نہ تھا، اُسی طرح اُسے کوئی جانشین بھی نصیب نہ ہوا۔ تاہم اُس کی تصانیف کا اثر مشرق میں دیر پا ضرور تھا۔"

فی الحقیقت دنیا کی فلسفیانہ تاریخ لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے، نہ ہر شخص اس میدان کا مرد ہو سکتا ہے لیکن فنِ تاریخ کے مواد کے اس قدر افراط پر بھی خاص اس فن پر دنیا کی معلومات بہت کچھ ناقص ہے۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی مقتضی ہے کہ اس کی تحقیق بمقابلہ پہلے کے اب وسیع پیمانہ پر کی جائے تاکہ یہ فن بھی دوسرے فنون کی طرح اور زیادہ مکمل ہوتا جائے جس سے علوم میں ایک تناسب قائم ہو سکے۔ کیونکہ دنیا اپنی ترقی کے لئے پچھلے نقوش کی بہت کچھ محتاج ہے۔

پردیس میں

(چینی شاعر لی۔ تائی۔ پو)

میں پردیس میں تھا،
میرے خیمے کے سامنے چاند نے چمکتی ہوئی سفید چاندنی بچھا دی تھی
سمجھا کہ شاید صبح کا سفیدہ ہے جس کی چمک دیکھ رہا ہوں
غور سے دیکھا، نہیں یہ تو چاند ہے، چاند، میرا چاند۔ میں نے آنکھیں نیچی کر لیں۔
دُور سے کسی نے، میرے وطن نے، مجھ سے اشاروں میں کچھ کہہ دیا۔

(دین و دنیا)

خودنوشت حالات

(نواب حیدر یار جنگ بہادر مولوی علی حیدر صاحب نظم طباطبائی)

۱۵۔ صفر سنہ ۱۲۶۹ھ کو اکاسی برس کا میرا سن ہوا لکھنؤ میں پرانا حیدر گنج لکڑ منڈی جائے ولادت ہے۔

منشی مینڈولال زار میرے والد کے دوستوں میں میرے ہم محلہ تھے اُن سے فارسی پڑھی۔ ملا طاہر صرفی سے صرف و نحو عربی کی حاصل کی۔ جناب خاتمۃ الدین سے درس نظامی کی کتابیں پڑھیں۔ سنہ ۱۳۰۱ھ میں تشریح الافلاک پر میرا حاشیہ کلکتہ کے مطبع اُردو گائیڈ اخبار سے شائع ہوا جسے میں نے مسٹر کرانٹ وزیر تعلیمات کے نام سے معنون کیا تھا۔ اسی زمانہ میں مدرسۂ شاہ اودھ میں شاہزادوں کی تعلیم پر میرا تقرر ہوا۔ تعریب الاطفال میں نے انھیں طلبہ کے لئے تصنیف کی۔ اسے دیکھکر صدہا کتابیں اسی طرز کی لوگوں نے تصنیف کر کے شائع کرنا شروع کیں۔ کلکتہ سے میں نے دکن میں آکر اسی طرز کی دو کتابیں مبنیات و معربات لکھیں جنھیں لوگ کرامات سمجھتے ہیں۔

نظام کالج میں تقرر ہونے کے بعد مدراس یونیورسٹی کے بورڈ آف اسٹڈیز کا ایک رکن میں بھی مقرر ہوا اور میری ہی تحریک سے اردو دیوان مرزا نوشہ کا بی۔ اے کے نصاب میں شامل ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے سارے دیوان کی شرح لکھنا پڑی اس شرح کو دیکھ کر استاذ السلطان سناد العلما آقا سید علی شوستری نے کہا کہ اُردو کے دیوان کی شرح لکھنا میری رائے میں اُس کے لئے سُبکی کا باعث ہوا اسے چاہیئے تھا کہ عربی کے کسی دیوان کی شرح لکھتا۔

یہ قول مجھ تک پہنچا اور میں نے امرؤ القیس کے دیوان کی بھی شرح اُردو میں لکھ ڈالی۔ یہ عرب کا ملک الشعراء اسلام سے پہلے کا شاعر ہے۔ میں یہی سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں شرحیں لکھ کر میں نے اپنی زبان کو بڑی رونق دی۔

حیدرآباد کے مدرسہ دار العلوم میں عربی و فارسی پڑھنے والے طلبہ ہمیشہ سے پنجاب یونیورسٹی میں فاضل و عالم کے امتحانات دیا کرتے تھے۔ پنجاب سے مدرسہ میں سوالات آجایا کرتے تھے۔ لارڈ کرزن کے عہد فرمانروائی میں ملک ہند کی تعلیمات کا دورہ کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر ہوا اُس کا نتیجہ یہ تھا کہ پنجاب

یونیورسٹی سے حیدرآباد کا تعلق نہ رہا۔ یہاں یہ خبر جب پہنچی کہ امتحان دینے کا زمانہ بہت قریب تھا۔ طلبہ سال بھر کی محنت کا صلہ پانے کے مستحق ہو چکے تھے۔ میں نظام کالج میں تھا، مجھے دار العلوم کے مدرسہ سے بس اتنا ہی تعلق تھا کہ برسوں سے ہر سال وہاں کے اعلیٰ درجوں کا امتحان لینا میرے ہی ذمہ تھا۔ اس سال بھی میں امتحان لے چکا تھا اور اسی امتحان کے بموجب جو طلبہ پنجاب یونیورسٹی کے فاضل وعالم کے امتحان میں شریک ہونے والے تھے اُن کا انتخاب بھی ہو چکا تھا۔ مجھے ان طلبہ کی مایوسی پر نہایت افسوس ہوا۔ میں نے نظام کالج میں ڈاکٹر اگھورناتھ سے یہ ذکر کیا کہ ہم لوگ ان طلبہ کا امتحان یونیورسٹی سے بہتر لے سکتے ہیں اور خطابات بھی دے سکتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ڈاکٹر اگھورناتھ، ڈاکٹر نیستی کانتا، محمد عبد المنعم صاحب ایک اعلیٰ درجہ کے طالب العلم اس بات پر آمادہ ہو گئے۔ حیدرآباد کے مشاہیر علما کا ایک بورڈ مقرر کر کے امتحان کا اشتہار دے دیا۔ سوالات مرتب ہوئے اور ہم لوگوں کی نگرانی میں چھاپے گئے۔ غرضکہ پنجاب یونیورسٹی کے امتحان سے بڑھکر یہ امتحان ہوا اور ان طلبہ کو آج تک اوس امتحان پر فخر و ناز ہے۔

اس سے پیشتر مدراس یونیورسٹی میں فارسی وعربی کے امتحانات اور "دبیر" و "افضل العلما" کے خطابات وغیرہ نہ تھے یہ بھی میری کوشش سے جاری ہوئے ہیں۔

جاری تو ہو گئے لیکن کئی برس کے بعد رجسٹرار کا ایک مراسلہ میرے نام پر آیا کہ فلاں تاریخ سینیٹ ہوس میں مجلس شوریٰ میں آکر اس بات کا فیصلہ کر دینا چاہیئے کہ "چھ برس سے برابر فارسی وعربی کے امتحانات کا نصاب" دبیر" و "افضل العلما" کے طلبہ کے لئے یونیورسٹی کے کلنڈر میں شائع ہو رہا ہے لیکن آج تک کسی نے شریکِ امتحان ہونے کی درخواست نہیں دی۔

حیدرآباد میں عربی وفارسی کا جس قدر چرچا تھا اُس سے میں واقف تھا۔ درخواست نہ دینے کی وجہ بھی فوراً میں سمجھ گیا۔ وہ یہ کہ مدراس والوں نے عربی وفارسی کے طلبہ کے لئے "افضل العلما" اور "دبیر" وغیرہ کے خطابات تو تجویز کئے مگر شرط یہ لگا دی کہ انگریزی میں میٹرک پاس ہونا ہر طالب علم کے لئے ضروری ہے۔ اور یہ شرط پنجاب میں نہ تھی۔ میں نے مصمم ارادہ کیا کہ حقیقت امر کو مجلس کنگاش کے آگے عرض کر کے میٹرک کی شرط کو موقوف کرانا چاہیئے۔

مدراس یونیورسٹی کی مجلس نصاب کے صدر اس زمانہ میں سر عبد الرحیم صاحب تھے۔ مجلس شوریٰ ہونے سے دو دن پیشتر میں جناب ممدوح کی کوٹھی پر گیا۔ میں نے پوچھا کہ جناب نے کیا فیصلہ اس امر کا تجویز فرمایا ہے؟" انھوں نے فرمایا کہ عربی وفارسی کے امتحان میں جب کوئی آتا ہی نہیں تو سوا موقوف کر دینے کے اور کیا فیصلہ ہو سکتا ہے"۔ اب میں نے عرض کیا کہ حیدرآباد میں صدرا و شرح سلم حماسہ و معلقات و اسرار البلاغہ و درۂ نادرہ

دعرفی وظہوری واخلاق ناصری وجلالی وغیرہ کے درس جابجا ہو رہے ہیں، میٹرک تک انگریزی کی شرط انھیں امتحان میں آنے کو مانع ہے اور پنجاب یونیورسٹی میں یہ شرط نہ تھی ہر سال سیکڑوں طلبہ فاضل وعالم ومولوی ومنشی کے امتحانوں میں کامیاب ہوا کرتے تھے۔"

اسی طرح شفیق مکرم مولوی بذل اللہ خاں صاحب کے پاس بھی گیا، یہ مدراس کارپوریشن کے صدر مجلس نصاب کے رکن رکین تھے۔ کرم فرما نواب عبدالرحمٰن خاں صاحب شاطر وغیرہ سے بھی اس باب میں گفتگو کی۔ ان سب صاحبوں نے یہی فرمایا کہ "خوب ہوا آپ نے پہلے سے ذکر کردیا ورنہ عربی وفارسی کے امتحانات مدراس یونیورسٹی سے اُڑ گئے ہوتے۔" دو دن بعد سینیٹ ہوس میں ارکان مجلس نصاب جمع ہوئے مسئلہ پیش ہوا۔ میٹرک کی شرط بآسانی سے اُڑ گئی۔ اور میرے مجموعۂ اشعار کا پہلا حصہ "نظم طباطبائی" مدراس کے بی۔ اے الیف۔ اے کے کورس میں داخل ہوا

اعلیحضرت غفراں مکان کے جشن جوبلی کی تاریخ نواب فصاحت جنگ جلیل نے دو جلدوں میں لکھی تھی وہ تاریخ نواب سالار جنگ بہادر دام اقبالہ کی دیوانی کے زمانہ میں پیشگاہ خسروی سے اس فرمان کے ساتھ بھیجی گئی کہ علی حیدر طباطبائی کو یہ تاریخ دیدی جائے کہ بنظر اصلاح دیکھیں۔

اس تاریخ دکن کے متعلق میں نے بڑا کام یہ کیا کہ حیدرآباد افیرز کی سب جلدیں اول سے آخر تک پڑھیں اور مضامین ضروری کا اضافہ کیا۔ سنتا ہوں کہ یہ تاریخ شائع ہونے والی ہے۔ ایک بڑا کلمہ میں کہتا ہوں لیکن باللہ العظیم بالکل صحیح ہے۔ یعنی فارسی واُردو والے عرب کے عروض کو نہ سمجھے تھے اس فن کو اُلجھا کے رکھ دیا تھا یہی حال قافیہ کا بھی تھا میں نے تلخیص عروض وقافیہ لکھکر تمام گتھیوں کو سلجھا دیا اور حشو وزوائد کو چھانٹ دیا۔

۱۳۲۵ ہجری میں شاہزادگان والاجاہ دام اقبالہما کی تعلیم ادب پر میرا تقرر ہوا۔ اس خدمت گزاری کا شرف چار برس مجھکو حاصل رہا۔

۱۳۳۶ھ میں دارالترجمہ کی اصلاح زبان وطرز بیان کی خدمت بھی مجھ سے متعلق ہوئی تین سال یہاں رہکر کبرسن کے سبب سے وظیفہ ہوگیا۔ وظیفہ کے چند ماہ کے بعد اعلیٰحضرت خلد اللہ ملکہ نے ازسرنو دارالترجمہ میں میرا تقرر فرمایا چھ برس تک میں نے پھر ترجموں کی اصلاح کا بھی کام کیا اور تاریخ طبری کی ایک جلد کا ترجمہ بھی کیا۔ صلہ جس کا مجھکو تنخواہ کے علاوہ عنایت ہوا اور یہ جلد دارالطبع میں چھپ گئی۔

گو اب میں وظیفہ لیکر دارالترجمہ سے الگ ہوں مگر دارالترجمہ نے مجھے نہیں چھوڑا اصطلاحات علمی کی کمیٹیوں میں روزانہ مجھے جانا پڑتا ہے۔ سرکار فیس دیتی ہے اور مجھ سے کام لیتی ہے۔

قضیہ منچوریا

منچوریا | منچوریا کا ملک چین خاص، منگولیا، روس اور کوریا (جاپان) کے درمیان واقع ہے اور سیاسی حیثیت سے ہمیشہ چین کا صوبہ رہا ہے۔ اس کے لغوی معنی "سرزمین مانچو" (قوم مانچو کے ملک) کے ہیں۔ چین میں اس ملک کو "تین مشرقی صوبے" کہتے ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں (۱) ہیلنگ کیانگ (۲) کیرین، اور (۳) لیاؤننگ یا فنگٹین۔

منچوریا کا رقبہ اڑتیس لاکھ مربع میل یعنی جرمنی اور فرانس دونوں کے مجموعی رقبہ کے برابر ہے۔ اور آبادی تین کرور ہے جن میں دو کرور اسی لاکھ تو چینی اور مانچو ہیں (یہ دونوں قومیں باہم جذب ہو گئی ہیں) آٹھ لاکھ اہل کوریا (جاپانی رعایا) ہیں، ڈیڑھ لاکھ سفید روسی، دو لاکھ تیس ہزار جاپانی اور بقیہ منگول ہیں۔ ۱۹۱۱ء میں ملک کی آبادی صرف ایک کرور اسی لاکھ تھی لیکن گذشتہ بیس سال کے اندر چینی تارکانِ وطن کی کثرت آمد سے اسکی آبادی اس قدر بڑھ گئی ہے۔ چینی آبادی میں ہر سال تقریباً دس لاکھ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

چین کو منچوریا سے کم از کم چار اہم فائدے پہونچتے ہیں:۔

(۱) اضافہ آبادی کے لئے یہ ایک عمدہ میدان ہے، (۲) فصل کے موقعوں پر منچوریا میں چینی بیکاروں کو روزگار ملتا ہے (۳) چین کو منچوریا سے سامان خوراک و اجناس خام ملتے ہیں اور (۴) چین کیلئے منچوریا اولین خطِ استحکامات کے بمنزلہ ہے۔

منچوریا کا تمام کوہستانی علاقہ ہمالیہ کی طرح سرسبز ہے۔ جہاں اعلیٰ درجہ کی چوب عمارتی اور معدنیات خصوصاً کوئلہ پیدا ہوتا ہے، لوہا، سونا اور دیگر معدنیات بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ملک کی زمین اس قدر سرسبز ہے کہ ۱۹۲۷ء میں تقریباً ایک ارب تیس کرور پاؤنڈ کی زرعی پیداوار ہوئی تھی۔

سیاسی رقابتیں | جزائر برطانیہ کی طرح جاپان کی سلطنت بھی مجمع الجزائر سلطنت ہے، اس کا رقبہ محدود اور آبادی روز افزوں ہے۔ برطانیہ کی طرح جاپان بھی ایک تجارتی اور صنعتی ملک ہے۔ چنانچہ وہ مندرجہ ذیل باتوں کے لئے دیگر ممالک کا محتاج ہے:۔

(۱) آبادی کے لئے اجناس خوراک (۲) صنعت و حرفت کیلئے اجناس خام (۳) زائد آبادی کیلئے میدان استعمار

چونکہ جاپان امپیریلزم میں دول یورپ کا شاگرد ہے، اس لئے کچھ عرصہ سے اس نے حصول اغراض و مقاصد

کے لئے ہمسایہ کی کمزور سلطنتوں پر ہاتھ صاف شروع کردیا، اور پہلے ملک کوریا پر قبضہ کرکے اپنی ہوسِ استعمار پوری کی، اس کے بعد کوریا کے ہمسایہ ملک منچوریا پر دست درازی شروع کردی۔

پچھلی صدی میں ملک منچوریا مختلف سلطنتوں کی متضاد حکمت عملیوں کا جولانگاہ بنا رہا۔ اور چونکہ اس ملک کی صنعتی ترقی کے امکانات بہت وسیع ہیں اس لئے اس پر مختلف شہنشاہیت پرست سلطنتوں کا دانت رہنے لگا۔

۹۵-۱۸۹۴ء کی جنگ چین و جاپان میں جب چین کو شکست ہوئی تو معاہدہ شیمونوسکی مورخہ ۱۸۹۵ء کی رو سے چین کو مجبور ہوکر جزیرہ نمائے لیاؤتنگ کا پٹہ جاپان کو دینا پڑا۔ لیکن بعد میں روس جرمنی اور فرانس نے جاپان پر اس قدر سیاسی دباؤ ڈالا کہ بالآخر اسے چینی علاقہ واپس کرنا پڑا۔ روس نے تاوان جنگ ادا کرنے میں بھی چین کو اس قدر مدد دی کہ چین نے اپنی احسان مندی کے اظہار میں روس کو چیتا اور ولاڈیووسٹک کے درمیان سیدھی ریلوے لائن تعمیر کرنے کی اجازت دیدی جو منچوریا سے گذرتی ہے۔ روسی سرمایہ سے تعمیر شدہ مشرقی چینی ریلوے کے وجود میں آتے ہی روس کو اس رقبے میں اقتدار فرمانروائی حاصل ہوگیا۔ ۱۸۹۸ء میں چین نے پچیس ۲۵ سال کے لئے روس کو وہی علاقہ پٹہ پر دیدیا جو جاپان نے دباؤ میں آکر واپس کیا تھا اور چینی مشرقی ریلوے میں پورٹ آرتھر تک توسیع کی اجازت بھی دیدی۔ ۱۹۰۰ء میں بوکسروں کی بغاوت کے زمانہ میں روس نے اپنی رعایا کی حفاظت کے بہانہ سے منچوریا پر فوجی قبضہ کرلیا اور دول یورپ کے احتجاج کے باوجود اپنی فوجیں نہ ہٹائیں۔ روس کی اس جارحانہ کارروائی سے کوریا میں جاپان کے مفادات کو خطرہ محسوس ہونے لگا جس کی وجہ سے ۱۹۰۴ء میں جنگ روس و جاپان چھڑ گئی۔ چین اس جنگ میں غیر جانبدار رہا۔ ۱۹۰۵ء میں معاہدہ پورٹسمتھ کی رو سے روس نے مجبور ہوکر جنوبی منچوریا کے متعلق اپنے تمام سیاسی حقوق جاپان کے حق میں منتقل کردیے، انھیں میں جنوبی منچوریا میں ریلوے لائن چلانے کا بھی حق شامل تھا۔ اس طرح منچوریا کا ملک دو حلقہ ہائے اثر میں منقسم ہوگیا شمالی علاقہ روس کا اور جنوبی علاقہ جاپان کا تسلیم کیا گیا اور چین کو مجبوراً اس ذلت کو خاموشی سے برداشت کرنا پڑا۔ لیکن ۱۹۲۰ء کے انقلاب کے بعد جب دولت روسیہ اُن تمام حقوق سے دست بردار ہوگئی جو اسے شمالی منچوریا میں حاصل تھے تو چین نے ۱۹۲۲ء تک ازسرنو منچوریا کے روسی علاقہ پر تمام و کمال قبضہ کرلیا، اور معاہدہ چین و روس مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۲۴ء کی رو سے روس نے بھی منچوریا پر چین کا قبضہ تسلیم کرلیا جس کی بدولت چینی مشرقی ریلوے ایک خالص تجارتی ادارہ بنگیا۔

جاپان کی دراز دستیاں

لیکن جاپان نے چین پر اپنی دست درازیوں کا سلسلہ جاری رکھا تھا کہ جنگ عظیم

کے زمانہ میں جبکہ تمام دول عظام لڑائی میں مصروف تھے جاپان نے اپنے مشہور اکیس[۲۱] مطالبات چین کے سامنے پیش کر دیئے، اور چونکہ معاہدہ پورٹسمتھ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، چین کی منظوری کے بغیر ہوا تھا، اس لئے جاپان نے ۱۹۰۹ء میں چین پر دباؤ ڈال کر معاہدہ پیکن کیا، جس کی رو سے جزیرہ نمائے کوانٹنگ پر از روئے پٹہ جاپان کا قبضہ تسلیم کرلیا گیا اور چینی مشرقی ریلوے کا جنوبی حصہ بھی چانگچون تک جاپان کو مل گیا۔ علاوہ ازیں چین نے جاپان کو پندرہ سال تک اس بات کا بھی اجارہ دیدیا کہ وہ آنٹنگ اور مکڈن کے درمیان فوجی ریلوے لائن کو ترقی دے۔ جاپان نے ان بیش قیمت کوئلہ کی کانوں پر بھی قبضہ کرلیا جو فوشن اور نیتائی میں ہیں۔

الغرض منچوریا میں اس قدر وسیع حقوق حاصل کرنے کے بعد جاپان نے ۱۹۱۰ء میں ملک کوریا کا الحاق کرلیا، اور ۱۹۱۵ء میں جاپان نے چین سے اپنے اکیس[۲۱] مطالبات منوالئے۔ لیکن جنگ عظیم کے بعد ۲۲-۱۹۲۱ء میں امریکہ، برطانیہ، فرانس، اطالیہ، بلجیم، ہالینڈ، پرتگال وغیرہ نے ملکر جاپان پر دباؤ ڈالا اور بہت سے ٹھیکے جو چین سے جبراً حاصل کئے گئے تھے واپس کرادیئے، اور نو سلطنتوں کے درمیان جن میں مندرجہ بالا سلطنتوں کے علاوہ چین اور جاپان بھی داخل تھے ایک معاہدہ ہوا جس میں چین کے استحکام اور اس کے اقتدار فرمانروائی کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا۔ اس میں منچوریا بھی داخل تھا۔

لیکن چونکہ یہ محض کاغذی کارروائی تھی اور معاہدہ کی تعمیل کرانے کے لئے دول متحدہ کسی قسم کی عملی کارروائی کرنے کے لئے تیار نہ تھے، اس لئے جاپان رقبہ پٹہ داری پر بدستور حکومت کرتا رہا۔ جنوبی منچوریا ریلوے کی آڑ میں جاپان نے تمام ریلوے یحاتی رقبہ میں جس میں مکڈن اور چانگچون جیسے بڑے بڑے شہر اور وسیع رقبے بھی شامل تھے، اپنی حکومت قائم کرلی۔ ان علاقوں میں پولیس، ٹیکس، تعلیمات، امور رفاہ عام وغیرہ کے تمام کام جاپان کے زیر انتظام ہونے لگے۔ جاپان نے اپنی فوجیں بھی منچوریا کے مختلف حصص میں متسلط کردیں اور کوانٹنگ کے علاقۂ پٹہ داری میں اس کی باقاعدہ فوج رہنے لگی۔ ریلوے یحاتی رقبوں میں اس نے ریلوے گارڈ قائم کرلیا جو درحقیقت ایک باقاعدہ بری فوج ہے۔ علاوہ بریں تمام ملک میں جاپانی قنصلخانوں کی حفاظت کے بہانہ جاپانی پولیس تعینات کردی گئی ہے۔ غرض جاپان ملک منچوریا کو اپنا ایک مفتوحہ صوبہ سمجھنے لگا۔

بیداریٔ چین کے زمانہ میں جب چین کی کومنتانگ پارٹی (حزب الاحرار) وجود میں آئی اور اس نے "بازیافت حقوق" کے لئے جدوجہد کرنا شروع کردیا تو جاپان نے محسوس کیا کہ ملک منچوریا اس کے ہاتھ سے نکل جائیگا اس لئے وہ اپنی بری و بحری طاقت سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہوگیا۔ اور ۱۹۲۷ء میں بیرن تناکا

کی جاپانی گورنمنٹ نے صاف الفاظ میں اعلان کر دیا کہ وہ ہر طرح سے منچوریا میں امن وامان قائم رکھنے کا انتظام کریگی۔ اور اگر پیکن یا ٹین تسین کی سمت میں اس قسم کی کوئی بات ہوئی جس سے منچوریا کے امن و امان کو خطرہ کا اندیشہ ہوا تو جاپان انسدادی تدابیر اختیار کرنے پر مجبور ہوگا۔

خانہ جنگی کی حالت میں جب بعض شکست خوردہ چینی فوجیں منچوریا کی طرف پسپا ہونے لگیں تو جاپان نے صاف اعلان کر دیا کہ وہ کسی چینی فوج کو منچوریا میں آنے نہ دیگا۔ اس اعلان سے جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ ملک منچوریا جاپان کی ملکیت ہے معاملہ حد کو پہونچ گیا۔ اور جاپان چینیوں کی بیخکنی پر تُل گیا۔ ۱۸ و ۱۹ ستمبر ۱۹۳۱ء کی درمیانی رات کو ان جاپانی سپاہیوں نے جو جنوبی منچوریا ریلوے کے رقبہ میں تعینات تھے اچانک ان چینی سپاہیوں پر حملہ کر دیا جو بمقام مکڈن تعینات تھے، اور ہفتہ عشرہ کے اندر صوبجاتی فوجوں کے سوائے تمام چینی فوجوں کو چین کی دیوار اعظم کے جنوب میں نکال دیا۔ اور اس طرح جاپان تمام ملک پر قابض ہوگیا۔ تمام شہر مکڈن چینیوں سے خالی ہوگیا، اور جاپانی کرنل ڈوہی ہارا نے شہر کے جملہ انتظامات جاپانی حکام کے ہاتھ میں دیدیئے۔ اس کے بعد یعنی ۲۰ ستمبر ۱۹۳۱ء سے جنوری ۱۹۳۲ء تک جاپانیوں نے ملک کے مختلف صوبوں میں ایسی حکومتیں قائم کر دیا جو ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلیاں تھیں، اور بالآخر ۱۸ فروری ۱۹۳۲ء کو منچوریا اور جیہول کو ملاکر ایک خود ساختہ نوزائیدہ ریاست سلف گورنمنٹ بورڈ کے ماتحت رکھکر تمام ملک کی آزادی و خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد جاپان نے یہ چال چلی کہ چین کے معزول شہنشاہ ہنری پوائی کو جو اپنی معزولی کے زمانہ سے ابتک جاپان کی حفاظت میں تھا جدید خود مختار سلطنت کا نام نہاد بادشاہ بناکر ۹ مارچ کو اس کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا اور نام نہاد گورنمنٹ منچوریا نے جاپان سے ایک معاہدہ کرلیا جس کے بموجب دولت جاپان تمام منچوریا کی عملاً مالک ہوگئی۔ ملک میں برائے نام مانچو وزارت قائم ہے لیکن فی الحقیقت تمام بڑے بڑے عہدے اور نظم ونسق جاپانیوں کے ہاتھ میں ہے۔ جاپانیوں نے چین کی بڑی فوج کو بھی مار کر دیوار اعظم کے جنوب میں بھگا دیا، جس سے جنوبی اور شمالی صوبجات کی چینی فوجوں کا سلسلۂ تعلق منقطع ہوگیا اور اب ان فوجوں کے منتشر شدہ سپاہیوں کی تعداد کثیر جدید سلطنت کے مختلف مقامات میں جاپانیوں سے قزاقی جنگ (گوریلا وار) میں مصروف ہے۔ اور جاپان ان لوگوں کو قزاق بتاکر قتل کر رہا ہے۔

مجلس اقوام سے فریاد ماہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں بمقام جنیوا مجلس اقوام کی اسمبلی کا بیسواں سشن ہو رہا تھا کہ ۲۱ ستمبر کو اپنی گورنمنٹ کی ہدایت سے چینی نمایندہ نے زیر دفعہ ۱۱ میثاق مجلس اقوام سکرٹری جنرل سے درخواست کی کہ اس نزاع کی روک تھام کے لئے فوری تدابیر اختیار کی جائیں تاکہ اقوام کا امن وامان خطرہ میں نہ پڑ جائے۔"

مجلس اقوام کے لئے یہ معاملہ سخت نازک تھا کیونکہ چین وجاپان دونوں مجلس کے ممبر تھے اور دونوں میثاق

لیگ اور معاہدہ کیلوگ وبریاں پر دستخط کر چکے تھے، جاپان ایک درجہ اول کی طاقت تھی، مجلس اقوام کی ممبر تھی مگر وہی مجلس اقوام کے اصول کی جڑیں کاٹ رہی تھی۔ اس کے علاوہ جن طاقتوں کا مجلس اقوام کی کونسل پر اثر ہے وہ اپنے کسی نہ کسی مفاد کے سلسلہ میں جین کی رہین منت تھیں، اور چین کی تحریک بازیافت حقوق (Recovery of Rights) کا براہ راست اثر ان کے مفاد پر پڑتا تھا۔ فرانس کو اپنے مقبوضات ہند چینی کی فکر تھی اور وہ ہمیشہ جاپان کا لحاظ و پاس کیا کرتا تھا، اور تنازعہ چین و جاپان کے دوران میں بھی فرانس نے جاپان کو اسلحہ سے امداد دی تھی۔ دوسری طرف انگلستان اصول کی اس قدر پرواہ نہیں کرتا جس قدر کہ اپنے مطلب کی بات دیکھتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں عظیم طاقتوں کی سہل انکاری دیکھتے ہوئے ۳۰ ستمبر ۱۹۳۱ء کو کونسل نے ایک ریزولیوشن پاس کر کے فریقین کو اپنے دوستانہ تعلقات بحال کرنیکی ہدایت کی، اور جاپان کو حکم دیا کہ وہ اپنی سپاہ ریلوے رقبہ کے حدود سے ہٹالے۔ مگر اس کام کے لئے کوئی مدت معین نہ کی لیکن جاپان نے مجلس اقوام کی کچھ پرواہ نہ کی، اور ۱۳۔ اکتوبر تک جبکہ مجلس کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا اُس نے منچوریا میں چینی اقتدار حکومت کی تمام و کمال بیخکنی کر کے تحریک ہوم رول کو خوب تقویت دی۔

۱۰۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو جب لیگ کی کونسل کا اجلاس بمقام پیرس منعقد ہوا تو قضیۂ منچوریا کی تحقیقات کے لئے لارڈ لٹن کی سرکردگی میں ایک کمیشن مقرر کیا گیا جو پانچ ممبروں پر مشتمل تھا، لیکن جب تک یہ کمیشن موقع پر پہونچکر اپنا کام شروع کرے جاپان کی افتراق انگیزانہ تدابیر بار آور ہو چکی تھیں۔ چنانچہ ۱۰ فروری ۱۹۳۲ء کو منچوریا کے سلف گورنمنٹ بورڈ نے زیر سایہ جاپان منچوریا کی آزادی و خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد ۲۹۔ فروری ۱۹۳۲ء کو لٹن کمیشن ٹوکیو پہونچا لیکن اس سے پیشتر ہی شنگھائی میں جنگ شروع ہو گئی اور چین کی حکومت نانکن مجلس اقوام سے اپیل پر اپیل کرتی رہی لیکن اُسکی کوئی پرواہ نہ ہوئی۔

بہر حال لٹن کمیشن نے جس طرح بنا اپنا کام ختم کر کے اپنی رپورٹ پیش کر دی جس کا لب لباب یہ ہے:۔

(۱) چین کے زیر سیادت منچوریا میں ایک خود مختار حکومت قائم کی جائے۔

(۲) جاپانی فوجیں ملک سے ہٹالی جائیں۔

(۳) داخلی انتظامات کے لئے اسپشل پولیس رکھی جائے جو کسی غیر ملکی انسپکٹر جنرل کے ماتحت ہو۔

(۴) جاپان اور چین کے درمیان منچوریا اور جیہول کے متعلق تین معاہدات کئے جائیں جن میں جاپانی مفادات کی حفاظت، منچوریا کی حفاظت اور تجارت باہمی کے احترام کے بارہ میں شرائط ہوں۔

چونکہ یہ تمام تجاویز جاپان کے خلاف ہیں اس لئے اس نے ان کی کوئی پرواہ نہ کی اور مجلس اقوام

دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

اگر مجلس اقوام اس مصیبت کے وقت چین کی حمایت کرنا چاہتی ہے لیکن اپنا فیصلہ منظور کرانے کے لئے اس کے ہاتھ پاؤں وہی طاقتیں ہیں جو اس کی ممبر ہیں۔ مگر یہ سلطنتیں خود امپریلسٹ ہیں اس لئے جاپان پران کا زیادہ زور نہیں پڑتا ہے، اور لیگ آف نیشن کے پاس خود کوئی طاقت نہیں ہے جس کو وہ ایسی حالت میں جاپان کے خلاف استعمال کر سکے۔ جاپان کے جارحانہ طرزعمل کے سامنے عدالت العالیہ ہیگ بھی بے بس ہے لیکن رائے عامہ کا جہانتک تعلق ہے وہ چین کے ساتھ ہے۔ مجلس اقوام نے بھی اپنے گذشتہ اجلاس میں یہ فتوے دیدیا ہے کہ اس معاملہ میں جاپان ہی کی زیادتی ہے۔ حال میں ایک تہدیدی نوٹ بھی جاپان کو پیش کیا گیا ہے جس کا جواب جاپان نے ہنوز کچھ نہ دیا۔

نوٹ: یہ مضمون لکھنے کے بعد مشرق اقصیٰ کے واقعات یہانتک پہونچ گئے ہیں کہ قضیۂ منچوریا و جیہول کے متعلق مجلس اقوام نے ایک کمیٹی مقرر کی جسمیں انیس سلطنتوں کے نمایندے شامل ہیں چنانچہ اس کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوگئی ہے جسکا لب لباب یہ ہے:۔

(۱) منچوریا اور جیہول سلطنت چین کے اجزائے لاینفک ہیں جنپر چین کا اقتدار فرمانروائی ہے لہذا سلطنت مانچو کو علٰحدہ سلطنت کی حیثیت سے تسلیم نہ کرنا چاہیئے۔

(۲) منچوریا میں ایسا نظم ونسق قائم کردیا جائے کہ وہاں چین کا اقتدار فرمانروائی بحال رہے مگر ملک کو اندرونی طور پر وسیع خود مختاری حاصل ہوجائے۔

(۳) چونکہ زیادتی جاپان کی طرف سے ہوئی ہے اسلئے اس کو اپنی فوجیں ہٹالینا چاہیئے۔

(۴) چین و جاپان کے درمیان ایسے جدید معاہدات کئے جائیں جنکی رو سے جاپان اور دیگر سلطنتوں کے حقوق و مفادات کا احترام ہو۔

مگر جاپان اپنی ضد سے باز آنیکو تیار نہیں ہے، اس نے چینی کمانڈر متعینہ جیہول کو الٹی میٹم دیدیا ہے کہ وہ فوراً شہر خالی کردے ورنہ حملہ کردیا جائیگا۔ چینیوں نے اس دھمکی کی کوئی پرواہ نہیں کی اب جاپانی فوجیں جنکی تعداد ساٹھ ہزار ہے مع بکثرت ہوائی جہازوں اور مسلح کاروں کے ڈیڑھ لاکھ چینی سپاہ پر حملہ کرنیکو تیار ہے۔ دوطرفہ جنگی اسپتالیں تیار ہو رہی ہیں چین کے وزیراعظم نے اعلان کردیا ہے کہ وہ ہرگز جیہول سے دست بردار نہونگے خواہ دشمن اُنکے دارالحکومت نانکن پر قبضہ کرلے۔ ادھر حکومت جاپان نے اپنے نمایندہ متعینہ جنیوا کو ہدایت کردی ہے کہ اگر مجلس مذکور انیس سلطنتوں کی رپورٹ منظور کرے تو وہ مجلس اقوام سے علٰحدہ ہوجائے۔ الغرض اسوقت معاملہ سخت نازک صورت اختیار کرگیا ہے۔ آئندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

(ا۔ ز)

بھکاری

(از مسٹر محمد اسحاق ایم اے)

رات کی تاریکی بڑھتی جا رہی تھی، ایک بھکاری سردی سے بچنے اور رات بسر کرنے کے لئے گاؤں سے باہر راستہ کے کنارہ کوئی جگہ تلاش کر رہا تھا۔ اس کے پاس صرف ایک چھوٹی سی گٹھری تھی جس کو وہ اپنی لاٹھی کے سہارے کندھے پر لاد کر یہاں تک لایا تھا۔ اس نے گٹھری کو زمین پر رکھا اور اس پر سر رکھکر اپنے تھکن سے چور جسم کو فطرت کے سبز فرش پر دراز کر دیا۔ رات کی تاریکی میں ان گنت تارے آسمان میں جگمگا رہے تھے، وہ ان کے نظارہ میں محو ہو گیا۔ راستے کے دونوں طرف سنسان جنگل تھا، پرندے درختوں کی شاخوں پر میٹھی نیند سو رہے تھے، بھکاری بھی بے خبر سو رہا تھا۔

وہ باپ ماں کی صورت تک سے واقف نہ تھا، نہ معلوم اس کو کس نے پرورش کیا تھا لیکن بچپن ہی سے وہ پیٹ بھرنے کے لئے آوارہ گردی اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ دنیا اُس پر نامہربان تھی۔ زندگی میں وہ صرف دُکھ ہی سے واقف تھا۔ کتنی راتیں اُس نے چوپال میں گذاری تھیں۔ بھیک مانگنے کی ذلت موت سے بدتر تھی۔ اس نے بارہا سوتے وقت یہ خواہش کی کہ الٰہی میری یہ نیند ابدی نیند ہو۔ جو کوئی بھی دیکھتا وہی اُس سے نفرت کرتا اور شبہ کی نظر سے دیکھتا۔ ہر شخص اُس سے بچکر چلتا۔ لڑکے اُسے دیکھکر بھاگ جاتے۔ اس کے میلے کچیلے اور پھٹے کپڑے دیکھکر کتّے بھی اس کے پیچھے دوڑتے تھے۔ پھر بھی دنیا میں اُسے کسی سے عداوت نہ تھی۔ وہ دنیاوی آلام کا خوگر ہو گیا تھا اس لئے اس کی فطرت میں سکون کا مادہ پیدا ہو گیا تھا۔

وہ بے خبر سو رہا تھا کہ یکایک گھنٹی کی آواز اس کے کان میں آئی، اس نے سر اُٹھا کر دیکھا، ایک تیز روشنی اس کی طرف آ رہی تھی اس نے دیکھا کہ ایک گھوڑا بھاری گاڑی کو کھینچتا ہوا اس کی طرف آ رہا ہے۔ گنگناہٹ کی آواز میں گیت گاتا ہوا ایک شخص بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے گھوڑے کو چابک سے مارتے ہوئے کہا "اُٹھ۔۔۔۔ اُٹھ۔۔۔۔"

گھوڑا گاڑی کو کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کھینچتے کھینچتے وہ دو تین مرتبہ رُکا اور زمین پر گھٹنے ٹیک کر زور لگایا، پھر اُٹھا آخر اُس نے اس قدر زور لگایا کہ اس کا سارا جسم پسینہ میں تر ہو گیا اور وہ بے دم ہو کر ایک طرف کو جھک گیا اور گاڑی بھی رُک گئی۔

گاڑی بان نے پہیئے کو کندھے کا سہارا لگاتے ہوئے پھر زور سے ہانکا:

"چل......چل......آگے......آگے بڑھ......"

مگر گھوڑے کی جان توڑ کوشش سے بھی گاڑی نہ ہلی

"ہٹ!......ہٹ......آگے ہٹ!"

گھوڑا چاروں پاؤں پھیلا کر اور نتھنے پھلا کر جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ اپنے دونوں سموں سے وہ زمین پکڑے ہوئے تھا تاکہ بھاری بوجھ کی کوشش سے وہ پیچھے نہ ہٹ جائے

یکایک گاڑی بان کی نظر بھکاری پر پڑی اور اس نے چلّا کر کہا

"بھائی ذرا مدد کرو، جانور ہلنا ہی نہیں چاہتا، ذرا اُٹھ کر سہارا دینا۔"

بھکاری اُٹھ کھڑا ہوا اور گاڑی بان کے ساتھ گھوڑے کو ہانکنے لگا۔ مگر سب کوشش بیکار ہوئی۔

گھوڑے کی تکلیف دیکھ کر بھکاری نے کہا

"بیچارے کو ذرا دم لے لینے دو۔ بوجھ بھی بہت بھاری ہے۔"

"بالکل نہیں، یہ بڑا بدمعاش ہے۔ اگر آج گاڑی کو نہ کھینچا تو کل یہ پہاڑی راستہ پر بھی نہیں چڑھیگا۔ بھائی تم ذرا ایک پتھر لا کر پہیہ کے پیچھے روک لگا دو۔ پھر ہم دونوں ملکر اُسے چلا ہی لیں گے......"

بھکاری ایک پتھر اُٹھا لایا۔

گاڑی بان نے کہا "میں پہیہ پر ہوں، چابک وہاں ہے۔ چابک لیکر اُسے اچھی طرح مارو، کھال اُدھیڑ دو، تب یہ ٹھیک ہو گا۔"

چابک کی مار کھا کر گھوڑے نے پھر ایک مرتبہ جان توڑ کوشش کی۔ سموں کی رگڑ سے پتھر سے چنگاریاں اُٹھنے لگیں۔

"بہت اچھا! بہت خوب!"

گھوڑے نے جب ذرا بجلی کے ساتھ ایک زور کے جھٹکے سے گاڑی کھینچی تو گاڑی بان پہیے کے نیچے سے پتھر ہٹانے لگا مگر اس کا پیر پھسل گیا، اور اس کے ساتھ ہی گاڑی کے بوجھ نے گھوڑے کو پیچھے کھینچ لیا۔ ایک زور کی چیخ کے ساتھ گاڑی بان زمین پر گر پڑا۔ اس کی آنکھیں خوف زدہ ہو گئیں اور اسکی

کُہنی مٹی میں گڑ گئی۔ اس کے چہرے پر بھی شکن پڑ گئی۔ گاڑی بوجھ کے ساتھ کہیں اُس پر نہ آجائے اس خوف سے وہ پہیہ کو انتہائی زور کے ساتھ آگے کو ٹھیل رہا تھا۔

گاڑیبان نے چلاّ کر کہا:۔

"آگے ہانکو، آگے ہانکو، میں پس گیا۔"

بھکاری نے بغیر دیکھے اندازہ سے سمجھ لیا کہ کیا ہو گیا۔ اس نے چابک سے گھوڑے کی کھال اُدھیڑ دی۔ گھوڑا دوزانو ہو کر ایک طرف کو جھک گیا۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی بھی جھک گئی اور زمین پر گر پڑا۔ لالٹین بھی گر کر ٹوٹ گئی۔ اب تاریکی میں گاڑی بان کی آواز اور گھوڑے کے ہانپنے کی آواز کے سوائے اور کچھ سُنائی نہ دیتا تھا۔

"اُٹھ!...... اُٹھ!......"

بھکاری جب کسی طرح گھوڑے کو نہ اُٹھا سکا تو جلدی سے گاڑیبان کی مدد کو دوڑا۔ لیکن گاڑیبان اس وقت تک پہیہ میں پھنس گیا تھا۔

ایک غیر معمولی انسانی طاقت کی زور سے اس نے پہیہ کو اپنے بدن سے دو ایک انچ دُور ہٹا رکھا تھا۔ ایک مرتبہ کے پھسلنے سے ذرا سی بھی دیر ہو جاتی اور تھوڑی سی قوت کی بھی کمی ہوتی تو وہ بھاری گاڑی کے نیچے دب کر پس جاتا، وہ خود بھی یہ سمجھ رہا تھا۔ بھکاری کو آتے دیکھ کر اُس نے چلاّ کر کہا:۔

"ہاتھ نہ لگاؤ ہاتھ نہ لگاؤ......... دوڑ کر اس گانوں میں جاؤ......جلدی...... گھر میں ابا ہیں...... لوٹسا کے گھر......... داہنے ہاتھ کا پہلا گھر ... دس منٹ تک پہیہ کو روکے رہونگا۔ جلدی...... جلدی......"

بھکاری دم سادھ کر دوڑا اور سیدھا جا کر گانوں میں داخل ہو گیا۔ سب دروازے بند تھے۔ نہ کہیں روشنی نظر آتی تھی نہ کوئی آدمی دکھائی دیتا تھا۔ وہ حواس باختہ ہو رہا تھا۔ بھاری کے نیچے کس تکلیف سے وہ شخص گرتی ہوئی گاڑی کو اپنے بدن سے تھوڑی دُور روکے ہوئے تھا، اسی خیال میں وہ بیخود ہو رہا تھا۔ آخر وہ ٹھہرا۔ سامنے کا راستہ چورس تھا، دائیں طرف ایک گھر تھا، کھڑکی سے روشنی باہر آرہی ہے۔ اس نے سمجھا ضرور یہی گھر ہوگا، جلدی سے دروازے پر دستک دی۔

اندر سے کسی نے پوچھا:۔

"کون، جو لوا کیا تو پھر آگیا؟"

اُس کا دم پھول رہا تھا۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ صرف بار بار کھڑکی پر دستک دینے لگا۔

ایک شخص نے کھڑکی کھول کر سر باہر نکالا، اور کہا:۔

"جُولو! تو آگیا؟"

ذرا دم لیکر بھکاری نے کہا۔

"نہیں......... میں آیا ہوں۔"

اُس شخص نے بھکاری کو اپنی بات ختم نہ کرنے دی اور کہنے لگا:۔

"دوپہر رات گئے گانوں میں لوگوں کو مارنے آیا ہے۔ جا دُور ہو۔"

اس کے بعد اس نے کھڑکی بند کرلی، اور بڑبڑانے لگا۔

"سب نکمّے، کوڑھی، بھک منگے......"

اس بے رحمانہ برتاؤ سے بھکاری مبہوت ہو کر ٹھٹک گیا۔

"ان لوگوں نے کیا سمجھ رکھا ہے کیا جب میں آتا ہوں بھیک ہی مانگنے آتا ہوں؟ آخر میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟ شاید کچی نیند میں اُٹھانے سے اس قدر غصہ ہے، کاش وہ یہ جانتا؟"

ڈرتے ڈرتے پھر اُس نے دستک دی۔

اندر سے پھر وہی شخص چلّایا:۔

"اتبک نہیں گیا؟ کھڑا ہے؟ اچھا کھڑا رہ۔ اب کی بار تجھے مزہ چکھاؤنگا۔"

بھکاری نے ہمت کر کے کہا

"کھڑکی کھولو...."

"جا۔ جا۔ کہیں اور دیکھ...."

"کھڑکی کھولو......"

اس مرتبہ پھر کھڑکی کھلی، مگر اس قدر زور سے کہ بھکاری کو سر بچانے کے لئے پیچھے ہٹنا پڑا۔ کھلی ہوئی کھڑکی پر کھڑا ہوا وہ شخص غصّے سے کانپ رہا تھا۔ ہاتھ میں ایک بندوق تھی۔

"بدمعاش، سنتا نہیں، اگر تو یہاں سے جلد ہی دفع نہ ہوگیا تو جان کی خیر نہیں۔"

اندر سے کسی عورت کی سخت آواز کان میں آئی۔

"گولی مار دو، گاؤں کے لوگ دعا دیں گے۔ کوئی کام کاج نہیں، دنیا بھر کے نکمّے بھکاری۔ رات کو گھروں میں آکر چوری کرتے پھرتے ہیں۔"

اُس نے بھکاری کو بندوق کا نشانہ بنانا چاہا۔ مگر وہ بیچارہ خوف سے تاریکی میں پیچھے ہٹ گیا اور

تھوڑی دیر کے لئے گاڑیبان کو جو اس وقت جنگل میں موت کا انتظار کر رہا تھا بالکل بھول گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب گاڑیبان کی نازک حالت کا خیال آیا تو ایک بار پھر اس نے کھڑکی کھلوانے کا ارادہ کیا مگر سوچا کہ اگر پھر آواز دی تو اس مرتبہ ضرور بندوق کا نشانہ بنا دیا جاؤنگا، شور وغل مچانے سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوگا کیونکہ گاؤں کے لوگ میری بات سننے سے پہلے ہی مجھے مار ڈالیں گے۔

صرف ایک لمحے کے پس وپیش کے بعد وہ دوڑا، شاید اُن کی مدد کے بغیر وہ خود ہی تنہا گاڑیبان کو بچا سکے۔ وہ دیوانہ وار دوڑا، لیکن کسے معلوم تھا کہ اس وقت تک کیا گذر چکا ہے

اس عزم کے ساتھ ہی اس کے جسم میں جوانوں کی سی قوت آگئی تھی۔ گاڑی کے پاس پہونچکر اس نے آواز دی:۔

"ارے دوست!"

کوئی جواب نہ ملا، پھر آواز دی:"

"دوست!"

تاریکی اس قدر غالب آگئی تھی کہ گھوڑا تک نظر نہ آتا تھا، صرف اس کی آواز کانوں میں آتی تھی، بھکاری نے قریب جا کر دیکھا کہ گھوڑا ایک طرف جھک گیا ہے اور گاڑی بھی سامنے کو گری ہوئی کھڑی ہے

"دوست!..... دوست!....."

وہ جھک کر کچھ تلاش کرنے لگا، یکایک چاند نے ایک ابر کے ٹکڑے سے مُنہ نکالا۔ بھکاری نے اس کی روشنی میں دیکھا کہ گاڑیبان چت پڑا ہوا ہے اور اُس کی دونوں آنکھیں بند ہیں۔ منھ سے خون جاری ہے۔ گاڑی کا پہیہ جس طرح کیچڑ میں دب جاتا ہے اسی طرح اس کے سینے میں پیوست ہو گیا ہے۔

یہ حالت دیکھکر اس کو گاڑیبان کے ماں باپ پر غصہ آیا اور پھر اسی گھر کی طرف دیوانہ وار دوڑا۔ اب اُس کے دل میں بندوق کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہا، اُس نے بے خوف ہو کر کھڑکی پر دستک دی۔

"جو لو، کیا تو پھر آگیا!"

بھکاری نے کچھ جواب نہ دیا۔ کھڑکی سے منہ نکال کر جب دوبارہ اُس نے سوال کیا تو بولا:۔

"نہیں! تمہارا لڑکا راستے میں مرا پڑا ہے، جس خبر کو پہونچانے کیلئے میں پہلے آیا تھا اسی کے لئے اب پھر آیا ہوں۔"

گاڑیبان کے باپ ماں دونوں چیخ اُٹھے۔

"کیا کہتا، کیا کہتا ہے؟ اندر آ، اندر آ.......... جلدی.......... جلدی...."

لیکن بھکاری اپنے پھٹے پرانے کپڑوں میں سر چھپا کر چلدیا اور چلتے چلتے بولا:-

"مجھے اور کام کرنا ہے۔ اب شور وغل سے کیا فائدہ، تم نے بہت دیر کر دی، اگر پہلے ہی سے تھوڑا خیال کرتے تو اُس کی جان بچا لیتے۔ اب تو وہ گاڑی کو بوجھ سمیت اپنے سینے پر لئے بے فکر سو رہا ہے۔"

گاڑیبان کی ماں چلائی: "جاؤ پیارے دوڑو، فوراً جاؤ ......"

باپ نے فوراً چادر اوڑھ لی اور کہنے لگا:-

"کہاں چلا گیا؛ بھکاری تو کدھر غائب ہو گیا؟ آ- آ- تجھے خدا کی قسم بتا کیا ہوا؟"

مگر بھکاری اپنی لاٹھی کندھے پر رکھے تاریکی میں غائب ہو گیا۔

ان کے شور وغل سے پرندے جاگ اُٹھے، اور گاؤں کے کتے خوفزدہ ہو کر بھونکنے لگے لیکن بھکاری کا کہیں پتہ نہ تھا۔

(پلاٹ ماخوذ)

برسات اور گنگا کا کنارہ

از شریمتی شیو کماری دیوی

شام کا وقت ہے سخت گرمی پڑ رہی ہے جسکو دیکھو پسینے پسینے ہے، ہوا بند ہے، وہ اُمس ہے کہ دم گھٹا جاتا ہے۔ پنکھے جھلے جا رہے ہیں، ہر شخص کی زبان پر پانی پانی ہے۔ یہ لو! کالی کالی گھٹائیں پورب سے اُمڈیں بڑھیں، پھیلیں اور تمام آسمان پر چھا گئیں، دلوں میں طراوت آ گئی، چہروں پر خوشی نمودار ہے، معلوم ہوتا ہے کہ بے جان چیزوں میں بھی جان پڑ گئی تیز ہوا چلنے لگی، پتی پتی خوشی میں جھومنے لگی، درخت ہلنے لگے۔ ؎

خود بخود تازہ اُمنگیں جوش پر آنے لگیں　　دل کو گرمانے لگی ٹھنڈی ہوا برسات کی

پہلے ننھی ننھی بوندیں پڑیں، ہوا نے زور مارا تو بڑی بڑی بوندیں گرنے لگیں، اب موسلا دھار برس رہا ہے، ہوا بھی زور شور سے چل رہی ہے، دریا میں غضب کا تلاطم ہے، موجیں ہیں کہ بلیوں اُچھل رہی ہیں، پانی پر پانی مڑ رہا ہے بادل گرج رہے ہیں، بجلی چمک رہی ہے، وہ شور ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، جہاں تک دیکھو پانی ہی پانی نظر آتا ہے، ایک دھواں سا اُڑ رہا ہے سبز و پر دھند چھائی ہے کہیں کہیں بڑے بڑے درخت نظر آتے ہیں مگر کاجل کے سے دھبے۔ اس گہری دھند نے دریا سے آسمان تک ایک کر دیا ہے۔ دو کشتیاں دریا پر رواں ہیں جو کنارے کے قریب آ پہونچی ہیں، کچھ لوگ چھتریاں لگائے ہیں کسی نے اپنے سر پر ٹاٹ ہی ڈال رکھا ہے کسی نے سر پر پنکھا ہی رکھ لیا۔ کوئی ننگا ہی کھڑا ہے مگر سب تر بتر ہیں۔ دو تین ملاح ناؤ سے کود پڑے چپ چپ کرتے آہستہ آہستہ ناؤ کو کنارے کھینچے لئے جا رہے ہیں، اب ناویں رک گئیں، آوازیں بلند ہوئیں "گنگا میا کی جے" یہ لو سب پار اُتر گئے۔

تنقید کتب

گنجِ معانی

(منشی تلوک چند محروم بی۔ اے۔ کی اخلاقی، ادبی اور نیچرل نظموں کا مجموعہ)

منشی تلوک چند صاحب محروم سرزمین پنجاب کے مایۂ ناز شاعر ہیں، آپ ضلع میانوالی کے رہنے والے ہیں جہاں اُردو زبان کا بہت کم چرچا ہے۔ مگر بقول سر عبدالقادر اس جنگل نے وہ خودرو پھول پیدا کیا جس کی خوشبو دہلی اور لکھنؤ تک پھیلی۔ چنانچہ ابتک کلامِ محروم کے نام سے آپ کی دلکش نظموں کے دو مجموعے شائع ہوکر مقبولِ عام ہو چکے ہیں۔ اب آپ کی ۱۹۱ ادبی اخلاقی اور نیچرل نظموں کا مجموعہ گنجِ معانی کے نام سے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع ہوا ہے، اور آنریبل شیخ عبدالقادر صاحب جج ہائیکورٹ پنجاب نے اس کا دیباچہ تحریر فرمایا ہے جسمیں محروم کی شاعری پر لطیف بحث کی گئی ہے۔ واقعی بات یہ ہے کہ میانوالی میں پیدا ہوکر ایسی صاف اور سلیس زبان لکھنا جیسی صوبجات متحدہ کی ہوتی ہے عجائبات میں ہے اور اس بارے میں محروم صاحب کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔

اس دلچسپ مجموعے پر سرسری نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ محروم کی طبع رسا میں کس قدر تنوع، کس قدر بوقلمونی، کس قدر رعنائی اور کس قدر رنگینی ہے۔ اس مجموعے کو گیارہ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس کا ہر حصہ بجائے خود مکمل اور مستقل رسالہ ہے۔ اس کی اکثر نظمیں درسی کتب میں شامل ہونیکے قابل ہیں۔

مختلف نظموں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ محروم صاحب کو زبان و تخیل پر کس قدر زبردست قدرت حاصل ہے بقول میتھو آرنلڈ "شعر تنقید حیات کا دوسرا نام ہے"۔ اس اعتبار سے ہر چیز جسکا انسان کی زندگی سے تعلق ہے شعر کا موضوع بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ محروم کی ۱۹۱ نظموں سے بھی اس قول کی حقیقت ثابت ہوتی ہے۔ فلسفۂ اخلاق، جذبات کی تحلیل، تشریح، مذہب، روحانیات، خدا، غرض ہر چیز پر محروم صاحب نے قلم اُٹھایا ہے اور بحدِ کمال پہونچا دیا ہے۔ وہ اپنے موضوع کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے ہیں اور پھر اپنے کمالِ فن کی بدولت مختصر الفاظ میں اس حسن کو منکشف کر دیتے ہیں جو موضوع میں اس طرح پوشیدہ تھا جیسے سنگ میں شرار۔

اصل یہ ہے کہ کلام محروم کی ظاہری خوبیوں کو تو الفاظ میں دکھایا جا سکتا ہے لیکن اس کی وجدانی اور ذوقی کیفیتیں اور لطیف و نازک ادائیں الفاظ کی تشریح کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔ پھول کی بو، ساز کا نغمہ شراب کا نشہ لفظوں کی قید میں نہیں آسکتا ہے، اور اس کے لئے ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ جبتک "گنج معانی" کی سیر نہ کی جائے اس وقت تک احباب لطف سخن سے محروم رہیں گے۔

زمانہ کو شروع سے کلام محروم کی اشاعت کا موقع ملتا رہا ہے اس لئے ہم کو یہاں پر اس کے مفصل اقتباسات ہدیۂ ناظرین کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن آپ کے کلام معجز نظام کی بعض خصوصیات کا مختصر تذکرہ بے موقعہ نہ ہوگا۔

اکثر شعرا کے شاعرانہ محسوسات کا میلان ایک خاص مرکز پر ہوتا ہے۔ اُن کے قلب سے ایک خاص صدا نکلتی ہے، اُن کا ساز ہستی تمام ہم آہنگیوں کے ساتھ ایک خاص نغمہ بلند کرتا ہے، اُن کے قدم ایک خاص منزل مقصود کی طرف اُٹھتے ہیں، اُن کی روح کا ایک پیغام ہوتا ہے، چنانچہ محروم کی روح کا پیغام درد و غم ہے۔ اُن کی زندگی ایک داستان غم ہے۔ آپ کی رفیقۂ حیات شادی سے چند ہی سال بعد ایک ننھی سی بچی چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئیں۔ بچی کی بے بسی، اپنی خانہ ویرانی، اور اسی طرح کے صدمات پیہم نے محروم کو مجسم درد یا سوز و گداز کا پتلا بنا دیا ہے، جوانی کی امنگیں مٹ گئیں، ولولے جاتے رہے، دل کی بستی غموں نے اُجاڑ دی، "دنیا ہیچ است و کار دنیا ہمہ ہیچ" کی حقیقت نظر آنے لگی، ہجوم آلام سے پریشان ہو کر اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں اور وہ یہ آہ سرد کہنے لگتے ہیں:

کبھی ابر کرم کی نہ بوند گری، ہوئی آہ نہ شاخ امید ہری
ترے دل کی کلی نہ کھلی۔ ترے باغ میں باد صبا نہ چلی
نظر آئی نہ صبح وصال کبھی، شب غم نہ ٹلی نہ ٹلی نہ ٹلی
جسے ڈھونڈھ رہا تھا حرم میں کبھی کبھی دیر میں جسکی تلاش رہی
رگ جاں سے وہ تیرے قریب رہا — تری آنکھیں نہیں ہیں نظر ہی نہیں
نہ بہار نشاط دو روزہ پر مر، کہ ہے باغ جہاں میں خزاں کا گذر
یہ طلسم ہے سارا فریب نظر، نہ ہے غنچہ تر نہ شجر نہ ثمر
جو رکھے تو مآل جہاں کی خبر، تو اُٹھائے کبھی نہ ملال ضرر
رہا طالب عیش فنا تو اگر، تو حریم لقا کی امید نہ کر
وہ دام ہے جس سے گذر ہی نہیں — یہ وہ شام ہے جس کی سحر ہی نہیں

بہار ہو یا خزاں، گرمی ہو یا جاڑا، قدرت کے ہر منظر کو دیکھکر محروم کے دل کا کوئی نہ کوئی غم تازہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً فصل بہار کی نظم میں بھی حسنِ فطرت کی عقیدتمندانہ پرستش کے ساتھ محروم صاحب خندۂ صبح اور جلوۂ شام سے لطف اندوز ہو رہے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہے جاتے ہیں۔

آمدِ گل کا ہم کو کیا احساس　　دل ہے پہلو میں کب سے کشتۂ یاس

یہ جو نالے ہیں زینتِ قرطاس　　ہے فقط اپنی شاعری کا پاس

ورنہ ہم کو خزاں بہار ہے ایک

برگِ گل اور نوکِ خار ہے ایک

موسم سرما رخصت ہو چکا ہے اور بہار کی آمد آمد ہے، سرسوں پھول رہی ہے، طیور ترانہائے مسرت گا رہے ہیں، باغ و راغ، کوہ و دشت سب دلفریب مناظر پیش کر رہے ہیں۔ مگر محروم انھیں دیکھتے دیکھتے چلا اٹھتے ہیں

مگر آہ جس چمن کا میں ہوں عندلیبِ نالاں　　ہوئی مدتیں کہ اس میں نہ کبھی بہار آئی

جو گری فلک سے شبنم رہی تا سحر وہ گریاں　　جو صبا کہیں سے آئی تو لئے غبار آئی

شام کا وقت ہے، دریائے راوی میں ستاروں کے عکس نے سطح آب پر ایک اور جگمگاتا آسمان بنا دیا ہے مگر اس زاہد فریب سین میں بھی محروم کا دل ملول ہے۔ فرماتے ہیں:۔

عید بھی ہو مجھے محرم ہے　　میرا سینہ ہے خنجرِ غم ہے

خونفشاں کب سے چشمِ پرنم ہے　　دشتِ غربت ہے، شام ماتم ہے

شامِ غم ہے کنار راوی ہے

میں ہوں اور میری سینہ کاوی ہے

محروم کے لئے نگارخانۂ فطرت کا ہر نقش حسین ہے۔ جن چیزوں پر معمولی آدمی ایک سرسری نظر ڈالکر آگے بڑھ جاتا ہے اُن میں شاعر کو فطرت کے اسرار و محاسن نظر آتے ہیں اور اُسے قدرت کے سکوت و خامشی میں بھی وہی نغمے سنائی دیتے ہیں جن سے روح کی بالیدگی ہوتی ہے، اس کے لئے ستارے رقص کرتے ہیں، آسمان چراغ مہر و فا روشن کرتا ہے، بجلی کی تڑپ، بادل کی گرج، ہوا کے جھونکے سب اس کے محرم راز ہیں، انھیں مناظر و مظاہر کو عام آدمی روزانہ دیکھتا ہے اور بھول جاتا ہے لیکن شاعر کے لئے یہی معمولی واقعات داستانِ حسن اور افسانۂ عشق کا کام دیتے ہیں معمولی آدمی کے لئے دریائے گنگا ایک بڑا دریا ہے جو ایک وسیع خطۂ ملک کو سیراب کرتا ہے مگر محروم اس کو کس نظر سے دیکھتے ہیں ملاحظہ ہو

جوشِ زن رحمتِ یزداں ہوئی دریا ہو کر　　بہہ چلی عالمِ اجسام میں گنگا ہو کر



منشي تلوک چاند محروم

آئی ہے راہرو عالم بالا ہوکر
رہ گئے کچھ ترے قطرات ثریا ہوکر

عرش اور فرش ہوئے تجھ سے منور گنگا
مظہر نورِ ازل ہے تو سراسر گنگا

نور سیال ہے یا جلوۂ رقصاں ہے تو
حیرت افروز دل و دیدۂ حیراں ہے تو

کس دلآویزی و تیزی سے خراماں ہے تو
مجھ کو حیرت ہے، نمایاں ہے کہ پنہاں ہے تو

حسن بیتاب! نمائش سے پشیماں کیوں ہے؟
پردۂ رخ ترا جلوہ ہے، گریزاں کیوں ہے؟

محروم نے بہار کی تصویر جس دلفریبی و رنگینی کے ساتھ کھینچی ہے اُسکی ایک جھلک ملاحظہ ہو:۔

مسندِ شاہدِ بہار
تختۂ سبزہ زار ہے

شبنم ترے کشتِ زار
تختِ گہر نگار ہے

منظرِ جلوۂ طرب
ساحت روزگار ہے

روح نواز کس قدر
نغمۂ آبشار ہے

منظر صاف سطحِ آب
آئینۂ بہار ہے

دشت میں الغرض عیاں
قدرتِ کردگار ہے

شاخ بہ شاخ سو بہ سو
نغمہ سرا طیور ہیں

گرم ہے محفلِ نشاط
بادہ کشِ سرور ہیں

جھومتے ہیں شجر تمام
مست نشے میں چور ہیں

رقص شعاع مہر کے
جلوے قریب و دور ہیں

ذرے تمام خاک کے
روکشِ کوہِ طور ہیں

قدرتِ صانع ازل
سب یہ ترے ظہور ہیں

محروم کو دلی جذبات اور قلبی واردات کی تصویر کھینچنے میں جو کمال حاصل ہے اس کا ثبوت گنج معانی کی اکثر نظموں میں ملتا ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم یہاں ان کے اقتباسات نظر انداز کر رہے ہیں

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار

ناظرین اس بے نظیر مجموعے سے خود لطف اندوز ہوں۔

جہاں پھول ہوتے ہیں وہاں کچھ کانٹے بھی رہتے ہیں، اردو زبان پر محروم صاحب کو جو قدرت حاصل ہے

اس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، مگر بتقاضائے بشریت بعض مقامات میں نظر ثانی کی ضرورت باقی رہ گئی ہے مثلاً زمزمۂ توحید میں "جس نے تجھ میں سمائی بائی" فصیح نہیں ہے۔ اسی طرح کشف حقیقت میں "خیال دعا و دوانہ رہا" کے بجائے اگر "خیال دوا و دعا نہ رہا" ہوتا تو بہتر تھا۔ "فریاد یتیم" اور "کولھو کے بیل" میں الفاظ بیل اور کھیل مؤنث مستعمل ہوئے ہیں۔ اسی نظم میں رَہٹ، تیلی کے کولھو کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح بعض خفیف خفیف غلطیاں دو ایک مقامات میں اور رہ گئی ہیں۔ مگر بڑے سے بڑے استادوں کا کلام بھی اس قسم کی نکتہ چینی سے بالاتر نہیں۔ محروم جیسی صاف اور ستھری زبان میں اپنے شاعرانہ خیالات ادا کر لیتے ہیں وہ نہ صرف اُن کے لئے بلکہ تمام اہل پنجاب کے لئے باعث فخر و مباہات ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ کسی قدر دانِ فن یا کتب خانۂ اردو کو گنج معانی سے خالی نہ رہنا چاہیئے۔ اس کی لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت دیدہ زیب ہے۔ شروع میں مصنف کی عکسی تصویر بھی دی گئی ہے۔ یہ بیش بہا مجموعہ نفسٹ فل اسکیپ سائز کے ۲۰۴ صفحات پر ختم ہوا ہے۔ شائقین مسرز عطر چند کپور اینڈ سنز پبلشرز۔ انارکلی لاہور سے طلب فرمائیں۔ قیمت صرف ۱۲؍ ہے۔

"ریاست"

یہ حکیم افلاطون یونانی کی کتاب "اسٹیٹ" کا ترجمہ ہے جو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب پی ایچ۔ ڈی۔ پرنسپل جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے کیا ہے۔ حجم تقریباً ساڑھے چھ سو صفحات اور انگریزی وضع کی جلد پارچہ پشتہ و ٹائیٹل پر کتاب کا نام چھپا ہوا ہے اور پانچ روپیہ میں انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن سے مل سکتی ہے۔

مشہور و معروف انگریز ادیب و شاعر رڈیارڈ کپلنگ کا قول ہے کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور دونوں میں اتفاق و اتحاد ناممکن ہے۔" یہ قول صحیح ہو یا غلط مگر پورب ہو یا پچھم، اُتر ہو یا دکن سب ایک نقطے یا مرکز پر آ کر ضرور ایک ہو جاتے ہیں۔ وہ نقطہ "فلسفہ یا حکمت یونان" ہے۔ مشرق و مغرب دونوں کے صاحب فکر حکمائے یونان کے پرستار ہیں جن کا معلم اول حکیم افلاطون تھا۔ پھر جس کتاب کا مصنف دُنیا کا یہ حکیم اعظم ہو اُس کتاب کا کیا کہنا۔ خود فاضل مترجم نے اس کتاب کی تعریف میں لکھا ہے کہ "دنیا کے سب سے بڑے مصنف کی یہ سب سے اہم کتاب اور افلاطون کے شجر علم کا پختہ ثمر ہے۔" اس کا نام گو "ریاست یا تحقیق عدل" ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اسکا موضوع صرف سیاسیات یا قانون ہوگا اس کتاب میں انسان کی پوری زندگی پر نظر ڈالی گئی ہے جس میں انسان کے اخلاق کا حصہ زیادہ ہے۔ اس میں روح انسانی کے محاسن کی لطیف و عمیق تحقیق کی گئی ہے۔ سیاسیات کے حق میں یہ کتاب خضر طریقت

کا کام دیتی ہے۔ فلسفۂ تاریخ کی کلید ہے اور جماعات انسانی کے عروج و زوال کا مرقع۔ اس اہم کتاب کا ترجمہ بھی فاضل مترجم نے اس قدر قابلیت سے سلیس اور شستہ زبان میں کیا ہے کہ زبان سے بے اختیار واہ واہ نکلتی ہے۔ عبارت کے نمونہ کی گنجایش نہیں ورنہ تھوڑا سا اقتباس ضرور نذر ناظرین کیا جاتا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ کوئی کتب خانہ اور کوئی لکھا پڑھا ہاتھ اس کتاب سے خالی نہ رہیگا۔

مشاہیر ادب اُردو

مرتبۂ منشی مہیش پرشاد مولوی فاضل (آنرز ان عربک) لکچرار عربی و فارسی و اُردو ہندو یونیورسٹی بنارس

اس چھوٹی سی کتاب میں حضرت شمس الدین ولی دکنی سے لیکر سر محمد اقبال تک ایک سو مس[۱] ایسے مشاہیر ادب اردو کے مختصر حالات لکھے ہیں جو اردو نظم و نثر کے بہترین خادم تھے۔ حالات اگرچہ مختصر ہیں مگر سبق آموز اور طلبا کے لئے کافی ہیں۔ حالات کے علاوہ ان مشاہیر کی نظم یا نثر یا دونوں کے نمونے بھی دیلے گئے ہیں جس سے یہ کتاب اور بھی زیادہ مفید ہوگئی ہے۔ کیونکہ ان نمونوں ہی کے ذریعہ سے ایک محقق اگر چاہے تو ادب اردو کی تدریجی تاریخ لکھ سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کتاب بڑی جماعتوں کے طلبا کے لئے مفید ثابت ہوگی

اگرچہ فاضل مؤلف نے مشاہیر کے حالات میں حتی الامکان تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے لیکن ایک آدھ جگہ غلطیاں بھی رہ گئی ہیں مثلاً میر امن دہلوی کے حالات میں یہ واقعہ غلط درج ہوگیا ہے کہ باغ و بہار کا اصلی عنصر امیر خسرو دہلوی کا فارسی قصہ چہار درویش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امیر خسرو دہلوی نے کوئی قصہ چہار درویش نہیں لکھا بلکہ فارسی زبان میں یہ قصہ کسی اور صاحب کا لکھا ہوا پہلے سے موجود تھا۔ جیسے ممکن ہے امیر خسرو نے اپنے پیر کو سنا دیا ہو۔ یہ بات مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو اپنے مقدمۂ باغ و بہار میں بخوبی ثابت کر چکے ہیں

ہماری رائے میں فاضل مؤلف کو نظیر اکبر آبادی اور پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی کے حالات بھی اس مجموعے میں شامل کرنا چاہیئے تھا۔ زبان اُردو ان دونوں نامور شعرا کے احسانات سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتی ہے۔

کتاب کی لکھائی چھپائی صاف، کاغذ عمدہ اور حجم ۱۳۴ صفحات ہے قیمت ۸ ملنے کا پتہ اسٹینڈرڈ پریس الہ آباد

یادِ رفتگاں

جان گالزوردی مرحوم

زمانہ بابت اکتوبر ۱۹۳۲ء میں ہم نے نوبل پرائز کے سلسلے میں انگلستان کے نامور مصنف و ڈراما نویس جان گالزوردی کا مختصر تذکرہ کیا تھا۔ افسوس ۳۱۔جنوری گذشتہ کو یہ بیمثل ادیب و شاعر اس جہان فانی سے رہگرائے عالم جاودانی ہوگیا۔ پچھلا مہینہ انگریزی ادب کیلئے خاص طور پر منحوس ثابت ہوا کیونکہ گالزوردی کے علاوہ دو اور مشہور و معروف ادیب جارج مور اور جارج سینٹس بری کا بھی اسی ماہ میں انتقال ہوگیا۔ انگریزی زبان ان تینوں اصحاب کے احسانات سے ہمیشہ گرانبار رہیگی لیکن جان گالزوردی ایک فلسفی مصنف، ہمدرد انسان اور نکتہ دان علم کی حیثیت سے لافانی شہرت حاصل ہوگئی ہے اور ان کی تصانیف کے قدر دانوں کی تعداد روز افزوں ہوتی رہیگی۔ گالزوردی کی عمر ۶۶ سال کی تھی۔ آپ ۱۸۶۷ء میں بمقام کومب واقع ضلع سرے پیدا ہوئے تھے، ہیرو اور نیو کالج آکسفورڈ میں تعلیم پائی۔ ۱۸۹۰ء میں بیرسٹری کی سند حاصل کی لیکن وکالت کا پیشہ اختیار نہ کیا۔ طبیعت میں سیر و سیاحت کا بیحد شوق تھا۔ چنانچہ آپ نے ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ کناڈا۔ آسٹریلیا۔ جنوبی افریقہ مصر و روس میں نہایت وسیع سیاحت کی۔

سیر و سیاحت سے فارغ ہوکر گالزوردی نے صحیفہ نگاری اختیار کی، اسی سلسلے میں ۱۸۹۶ء میں افسانہ نگاری شروع کردی۔ لیکن ابتدا میں انکے ناولوں کی زیادہ قدر نہ ہوئی۔ ۱۹۰۶ء میں انکا ناول "صاحب جائداد آدمی" (مین آف پراپرٹی) شائع ہوا۔ یہ دراصل اس دلچسپ سلسلہ کی ابتدائی کڑی تھی جو دنیائے ادب میں" فورسائتھ ساگا" کے نام سے مشہور اور گالزوردی کا ایک کارنامہ اعظم ہے۔ اس سلسلہ میں ایک متمول خاندان کی کئی پشتوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ پورا سلسلہ چھ طولانی اور چار مختصر ناولوں پر مشتمل ہے اور اس کی تصنیف میں گالزوردی کی عمر عزیز کے بائیس برس صرف ہوئے۔ آخری حصہ زیادہ تر ۱۹۲۶ء میں اس وقت لکھا گیا تھا جب گالزوردی جنوبی افریقہ کی سیاحت کر رہے تھے۔ اس سلسلہ کا ہیرو سوامیس فورسائٹ دنیائے افسانہ میں ایک نہایت دلچسپ

اور مکمل کردار خیال کیا جاتا ہے۔

اسی اثنا میں گالزوردی دیگر ناول ڈرامے اور مضامین بھی لکھتے رہے جن میں زیادہ تر مظلوم انسانوں اور بے زبان جانوروں سے ہمدردی ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ دنیا کے نشیب و فراز پر غائر فلسفیانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔ گالزوردی کی تصانیف میں جذبات۔ خیالات۔ تاثرات اور محاکات سبھی کچھ موجود ہے۔ البتہ اگر کوئی چیز نہیں ہے تو شوخی جسکا ادب میں وہی درجہ ہے جو طعام میں نمک یا حسن وجمال میں ملاحت کا۔ گالزوردی کی کتاب "انصاف" (جسٹس Justice) اس قدر مؤثر اور دلکش پیرایہ میں تحریر ہوئی ہے کہ اس کے شائع ہوتے ہی ملک میں ہلچل پیدا ہوگئی اور اسکا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ انگلستان کے قیدخانوں کے انتظام و اہتمام میں معقول اصلاح کردی گئی۔

اس کے ڈرامے واقعات زندگی اور حقائق سے اس قدر مملو ہیں کہ ان کے دیکھنے یا مطالعہ کرنے سے جذبات فوراً متاثر ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ یہ ایک واقعہ ہے کہ ایک روز جرمنی کے شہر ہمبرگ میں جب گالزوردی کا جسٹس نامی ڈراما کھیلا جارہا تھا تو ناظرین کے قلوب پر اس ڈرامے کے واقعات کا اس قدر اثر ہوا کہ کئی خواتین پر غشی طاری ہوگئی۔ اس کا دوسرا ڈرامہ "اسٹرائف" (Strife) بھی نہایت زبردست ڈراما سمجھا جاتا ہے اس کے دیگر ڈرامے یہ ہیں:۔ چاندی کی ڈبیہ (سلور بکس Silve Box) "خوشی" (جوائے Joy) "جنگل" (فارسٹ Ferest) "مجمع (ماب Mob)" "ذرا سا عشق" (اے بٹ آف لو A bit of Love) "گرہست آدمی" (اے فیملی مین A Family man) "تماشا" (شو Show) "فرار" (اسکیپ Escape) وغیرہ

گالزوردی نے متعدد ناول لکھے ہیں جن کے نام ہم بخوف طوالت یہاں پر نظر انداز کرتے ہیں گالزوردی کے ناولوں کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ ان کی فکر رسا نے سطح قرطاس پر جتنے بھی کردار (کیرکٹر) پیدا کئے وہ ایسے نہیں جنھیں اپنے عشق و محبت یا فکرِ وصل کے سوائے دنیا و مافیہا سے کچھ تعلق نہ ہو ان کے ناولوں اور ڈراموں کے افراد سب کے سب دنیا میں رہنے اور چلنے پھرنے والے دنیا دار لوگ ہیں۔ دنیا سے تعلق رکھتے ہیں اور دنیوی زندگی بسر کرتے ہیں نہ وہ زاہد خشک ہیں نہ فرشتے۔ ان کرداروں کے نقل وحرکت اوضاع و اطوار نشست و برخاست اور جملہ معاملات سے ناظرین کو عہد حاضرہ کی تاریخ سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ ناول کیا ہیں عہد وکٹوریا و مابعد کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔

گالزوردی کی ہمیشہ یہ عادت تھی کہ وہ اپنی تصانیف کی خود زیادہ قدر نہ کرتے تھے جو چیز لکھی بے پروائی سے ڈال دی لیکن ان کی نیک نہاد بیوی اپنے نامدار شوہر کی ادبی قدر و منزلت سے بخوبی واقف تھیں۔ وہ ہمیشہ ہر چیز کو دیکھکر احتیاط سے ٹائپ کردیا کرتی تھیں۔ مسز گالزوردی میں بہترین

خوبی یہ بھی تھی کہ وہ بہترین نقاد فن تھیں۔ چنانچہ اُن کی تنقیدیں اور مشوروں نے اس نامور ادیب کی تصانیف کے ساتھ سونے میں سہاگہ کا کام کیا۔ اسی رفیقۂ حیات کی ترغیب تھی کہ گالزوردی نے اٹھائیس سال کی عمر میں سیف کے بجائے قلم کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا لیکن انھوں نے روپیہ کی خاطر کبھی کوئی کام نہیں کیا، ان کے پاس دوسرے ذرائع آمدنی بھی تھے اور اُن کی زندگی کا معیار نہایت بلند اور ان کے خیالات نہایت اعلیٰ تھے۔ انھوں نے کبھی دولت وثروت کا رعب نہیں مانا اور نہ کبھی شہرت اور دنیوی اعزازات کی کوئی پرواہ کی۔ ابھی چند ہی سال کی بات ہے کہ سلطنت برطانیہ کی طرف سے انھیں "سر" (نائٹ ہڈ) کا خطاب پیش کیا گیا تھا۔ مگر اس عافیت پسند اور مستغنی المزاج ادیب نے اس اعزاز کو قبول نہیں کیا، اس پر گورنمنٹ نے ۱۹۲۹ء میں انھیں "آرڈر آف میرٹ" کا تمغہ ونشان دیا۔

گالزوردی کی تصانیف کا ترجمہ بہت سی زبانوں میں ہو چکا ہے، اور ان کے ڈرامے مختلف مغربی ممالک میں کھیلے جا چکے ہیں۔ ۱۹۳۰ء میں اسکی مشہور عالم تصنیف "اسکیپ" (Escape) کا خود ان کی نگرانی میں متکلم فلم تیار کیا گیا۔ انگریز مصنفین کی صف اول کا یہ پہلا ڈراما تھا جو دنیائے فلم میں مقبول عام ہوا۔ اس کا مکالمہ خود گالزوردی نے لکھا تھا۔

گالزوردی کا دل حب وطن سے سرشار تھا۔ انگریزی ادیبوں میں ان کا شمار سر والٹر اسکاٹ وغیرہ معدودے چند محبان وطن میں ہوگا۔ لیکن ان کی حب الوطنی دوسرے ملکوں اور قوموں کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ انھوں نے اپنے حب وطن میں انسان دوستی اور انصاف پسندی کے اعلیٰ ترین معیار کو کبھی نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ پچھلے سال لندن اسپکٹیٹر کے کرسمس نمبر میں "ستارۂ وطن" کے نام سے گالزوردی کی جو نظم شائع ہوئی تھی اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔ ناظرین کرام لطف اندوز ہوں اور داد سخن دیں۔ ہمارے معزز دوست اور رفیق کار منشی محمد یعقوب خاں صاحب کلام بی۔ اے نے ناظرین زمانہ کی خاطر ان بے نظیر جذبات کا اردو ترجمہ بھی کر دیا ہے جو اصل اشعار کے بعد ہی ہدیۂ ناظرین ہے:-

In many countries I have stood,
Where miracles have thronged,
To God's imaginative mood,
And yet my heart has longed,
For English sound and scent and scene,

ough all my reason knows.
They'll never be, have never been,
Fit to compare with those.
Why this should be, I cannot tell,
Of man it seems decreed,
That he shall feel the moving spell,
Of his especial breed.

(ترجمہ)

پھر کے دنیا بھر میں دیکھے ہیں نئے امصار و دیار
جن میں تھی معجز نما، تخئیل ذاتِ کردگار

لیکن اے انگلینڈ، اے میرے وطن، اے میری جان
تیرے منظر، تیری نکہت، تیری آوازیں کہاں

ہاں جو سچ پوچھو تو ہے یہ فتوے عقل و گماں
ان کا ان سے کیا تقابل، یہ کہاں اور وہ کہاں

آخر اسکی وجہ کیا ہے اور یہ صورت ہے کیوں؟
یہ تخالف یہ کشش یہ اُنس یہ حالت ہے کیوں؟

وجہ کیا؟ یونہی مقدر ہے بشر کے واسطے
اس کا دل مضطر رہیگا اپنے گھر کے واسطے

ملک و ملت کی محبت کا ایک دریائے ناپیدا کنار گالزوردی نے کس قابلیت سے صرف چند اشعار کے کوزہ میں بند کر دیا ہے ان اشعار آبدار سے اس کے اعلیٰ تخئیل اور اسکی فلسفیانہ نکتہ دانی کا بھی پورا ثبوت ملتا ہے۔ بہر حال گالزوردی محض قافیہ پیما شاعر یا داستان گو ادیب نہ تھے بلکہ فطرت کے پیغامبر تھے۔ اور جو شئے وہ دنیا میں لیکر آئے تھے اس کا پیغام "حقیقت و صداقت" تھا۔ نثر ہو یا نظم گالزوردی نے اس پیغام کو دنیا کے کانوں تک پہونچانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ وہ خود اپنی قوم کی طرف سے جنگ کر چکے تھے لیکن وہ جنگ سے متنفر اور پورے صلح پسند واقع ہوئے تھے۔ گالزوردی کی زبان سادہ و سلیس اور خیالات اس قدر پاکیزہ و نفیس ہیں کہ زبان سے نکلتے ہی دل و دماغ سے اپیل کرتے ہیں۔ ایک

ماہر فن انگریزی نقاد نے گالزوردی کے متعلق حسب ذیل ریمارک کئے ہیں:۔

"انگلستان جدید کے ڈراما میں گالزوردی ایک ہستی اعظم ہے۔ اس کے ڈراموں کا لفظ لفظ جواہر پارہ اور ہر سطر سلک مروارید جس میں پند و نصائح اور اصلاح و درستی کے موتی چن چن کر پروئے گئے ہیں۔ یہ ڈرامے کھیل نہیں ہیں بلکہ شاندار حکمت و موعظت کے دفتر ہیں۔ اس کی تصانیف حقائق سے مملو اور ٹھوس واقعات پر مبنی ہیں۔ وہ ناظرین کے سامنے حقیقت پیش کرتا ہے۔ اور اُن کے قلوب کو متاثر کر کے ہیجان میں لے آتا ہے۔ وہ جو تصویر کھینچتا ہے اس کے خد و خال کی تفصیلات پر پوری نظر رکھتا ہے، وہ ایک زبردست آرٹسٹ ہے، وہ جذبات پیش کرتا ہے۔ مگر جذبات کی رَو میں خود نہیں بہہ جاتا۔ وہ ڈرامہ پیش کرتا ہے مگر خود اپنا تماشا نہیں دکھاتا۔ خدا کی مظلوم مخلوق کے لئے خواہ وہ انسان ہوں یا حیوان اس کی ہمدردیاں وقف ہیں۔ ظلم کاروں اور ستمگاروں کے حق میں اس کا قلم نیزہ ہے۔"

جان گالزوردی نے مرتے مرتے بھی دنیائے علم و ادب پر ایک احسان عظیم کیا، یعنی مرنے سے پہلے اس عالی ہمت اور اولو العزم ادیب نے یہ وصیت کر دی کہ اس کو نوبل پرائز میں جو رقم بطور انعام ملی ہے وہ ایک ٹرسٹ کے ذریعہ سے "پن کلب" کو دیدی جائے۔ مسٹر گالزوردی اس کلب کے صدر تھے یہ انشا پردازوں کی ایک عالمگیر انجمن ہے جس کے مرکز دنیا کے پچاس مقامات میں قائم ہیں۔ مسٹر موصوف نے یہ بھی شرط لگا دی ہے کہ اگر یہ کلب ٹوٹ جائے تو یہ رقم رائل لٹریری فنڈ کے حوالہ کر دی جائے۔ بہرحال

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

تصحیح

زمانہ جنوری ۱۹۳۳ء نمبر میں "مزار شعرا مرحوم" کے عنوان سے جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں مندرجہ ذیل غلطیاں رہ گئی ہیں۔ ناظرین کرام تصحیح فرمالیں:۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱	۳	بقیہ السیف	بقیہ السلف
۳	۱۱	درسیات پڑھیں	درسیات پڑھے
۹	۸	اور اونکا مذاق	اون کا مذاق
۱۲	۲۵	اگر زندگی ہے تو	اگر زندگی ہے تو آئندہ

(اڈیٹر)

مشاہیر عالم

شاہ کجکلاہ ایران رضا شاہ پہلوی

(از منشی محمد یعقوب خاں کلام بی۔اے)

اینگلو پرشین تیل کمپنی کے اجارہ کی تنسیخ کے متعلق ایران و برطانیہ کے درمیان جو تنازعہ چھڑ گیا ہے وہ اس امر کا متقاضی ہے کہ دو اہم شخصوں کے مختصر حالات ہدیۂ ناظرین زمانہ کئے جائیں۔ ان میں ایک تو اس کمپنی کا بانی ہے جس نے ایران میں شاہان قاچار سے مٹی کے تیل کا اجارہ حاصل کیا۔ اور دوسرا وہ جس نے اس اجارہ کو سیاسی یا اقتصادی لحاظ سے مضر سمجھ کر منسوخ کر دیا۔ پہلا شخص مسٹر ڈارسی ہے اور دوسرا شاہ کجکلاہ ایران رضا شاہ پہلوی کسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

خدا کی دین کا موسیٰ کا پوچھیئے احوال کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

یہ شعر جس قدر موجودہ شاہ ایران رضا شاہ پہلوی پر صادق آتا ہے کسی دوسرے پر نہیں آسکتا۔ قدرت کے کارخانے دیکھئے کہ دیہات کا رہنے والا محمد رضا نامی ایک نوعمر لڑکا فاقوں سے تنگ آکر دار السلطنت طہران میں آتا ہے اور یاوریٔ قسمت سے شاہی اصطبل میں سائیسی کی خدمت پر مامور ہو جاتا ہے۔ یا بقول بعض محلات شاہی کا دربان بن جاتا ہے، اس وقت وہ محمد رضا خاں کہلاتا ہے اور چند سال بعد جب وہ فوج شاہی میں ترقی کرتے کرتے اعلیٰ عہدہ پر پہونچ جاتا ہے اور فوج میں اپنی ہر دلعزیزی کے باعث تاج و تخت ایران کا مالک ہو جاتا ہے تو "شاہ کجکلاہ ایران ہز مجسٹی رضا شاہ پہلوی" کہلانے لگتا ہے۔

رضا شاہ نے گذشتہ چند سال کے اندر دولت ایران کے پیکر مردہ میں زندگی کی روح پھونک دی ہے۔ اور رستم و اسفندیار کی اس محبوب سرزمین کو جو شاہانِ قاچار کی عیش پرستیوں اور آرام طلبیوں کے باعث ٹرکی کی طرح "ایشیا کا مرد بیمار" بنگئی تھی اور جس کے ضعف و انحطاط سے فائدہ اٹھا کر روس و برطانیہ نے خفیہ معاہدہ کر کے حصے بخرے کر لئے تھے۔ اغیار و اجانب کے پنجۂ آہنی سے آزاد کر دیا اور ابھی جو کچھ اثر اغیار کا باقی ہے اس کی بھی بیخکنی پر آمادہ ہے۔

بلحاظ صورت و شکل ایران کا یہ "مرد فولاد بازو" کشیدہ قامت، موٹے مونچھوں والا اور خوبصورت سپاہیانہ

مونچھوں، مخمور آنکھوں اور سرخ و سفید رنگ کا مالک ہے۔ اس کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ خصائل کریمانہ اور مشاغل شریفانہ ہیں۔ فنون سپہگری اور جہاں بانی سے خاص دلچسپی رہتی ہے، اور سپہگری ہی وہ چیز ہے جس نے رضا شاہ کی بلند خیالی اور صحیح قوت فیصلہ کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالکر اس کو فرش خاک سے اٹھایا اور تخت طاؤس کے عرش پاک پر متمکن کر دیا ہے۔

رضا شاہ کی عمر تقریباً ستر ہ سال ہوگی کہ وہ دیہات سے آکر ایران کی کاسک فوج میں بھرتی ہوا اور یہیں سے اس کی تاریخی زندگی شروع ہوگئی۔ اس کے اصلی حالات کے بارہ میں مختلف بیانات ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ ایک کسان زادہ تھا، مگر بعض کا قول یہ ہے کہ وہ بڑے باپ کا بیٹا ہے اور اس کا باپ دو شاہان ایران کے دربار میں وزیر سوم رہچکا تھا۔ بہرحال اس ہونہار اور بلند اقبال سپاہی نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے لئے شاہراہ ترقی تعمیر کی۔ اس کی جنگی قابلیت اور سپہگری نے اسے چند ہی دنوں میں ایک با اختیار اور ذمہ دار افسر بنا دیا۔

جو سپہگرانہ خصوصیات انگلستان کے مشہور و معروف ڈیوک آف ولنگٹن میں تھیں وہی بلکہ اس سے بڑھ چڑھکر سرزمین ایران کے اس "مرد فولاد بازو" میں ہیں۔ وہ ترقی کرتے کرتے بہت جلد جنرل اور پھر فیلڈ مارشل ہوگیا۔ اسی زمانہ میں خوزستان کے عرب قبائل نے جنوبی ایران میں شورش برپا کی رضا خاں کو ان سرکشوں کی تادیب کے لئے بھیجا گیا جس نے جاتے ہی نہ صرف بغاوت کا خاتمہ کر دیا بلکہ شیخ محمرہ کو بھی پابزنجیر طہران لے آیا۔ جس وقت وہ قیاصرۂ روم کی طرح فاتحانہ جلوس کے ساتھ دارالسلطنت میں داخل ہوا تو وہ عالم دیکھنے کے قابل تھا۔ جن جن سڑکوں سے اس فاتح کا گذر ہوا اُن پر میلوں تک خوبصورت اور قیمتی فرش بچھا دیا گیا تھا۔ طہران نے اس خوشی میں کئی روز تک جشن فتح منایا۔ اب رضا خاں وزیر جنگ ہوگیا۔

۱۹۱۷ء میں رضا خاں نے ایران کے کاسک برگیڈ پر قبضہ کر لیا، اور برگیڈیر جنرل کو جو اس زمانہ کے شاہ قاچار کا عزیز تھا برخاست کر دیا۔ اس کے بعد اس نے ایرانی سپاہ کی تنظیم و ترتیب شروع کی جو نہایت پریشان اور بے سروسامان ہو رہی تھی۔ تین سال لگاتار محنت کرکے اس نے پانسو آدمیوں کا ایک دستہ بھرتی کیا جو اس پر ہر وقت جاں نثاری کے لئے آمادہ رہتے تھے۔ انھیں سرفروشوں اور جانبازوں کی مدد سے اس نے ایران کے فاتح اعظم نادر شاہ کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ نادر شاہ کی مشہور تلوار زیب کمر کی۔ تاج کیانی سر پر رکھا اور سرزمین کسریٰ کا شہنشاہ کہلاو بن گیا اور رضا شاہ پہلوی خطاب اختیار کیا۔

جس دن سے رضا شاہ پہلوی نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی ہے اُسی دن سے ایران

کے جسم مردہ میں نئی روح پھونک دی ہے۔ اس نے تمام محکموں کی از سر نو تنظیم کی، اور جس قدر خرابیاں حکومت میں نظر آئیں سب کو دُور کیا۔ تمام ملک میں شاہراہیں تعمیر کرادیں۔ پرانی عمارتوں کی مرمت کرائی، ایرانیوں کو قوم اور ایران کو صحیح معنوں میں "ایران" بنادیا۔

اس کی طرز معاشرت نہایت سپاہیانہ اور سادہ ہے، جب کبھی تفریح کو دل چاہتا ہے تو زیادہ سے زیادہ پیانو بجالیتا ہے، جو اس نے روس میں سیکھا تھا۔

اس اُولوالعزم پہلوی تاجدار کے کیا عزائم ہیں اور اس کو اپنے وطن عزیز سے کس قدر محبت ہے؟ اسکا اندازہ اس گفتگو سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جو انگلستان کی مشہور و معروف سیّاح اور جہانگرد مصنفہ مس روزیٹا فوربس نے سعد آباد کے قصر گرمائی میں شہریار ایران سے کی تھی، اور جو ولایت کے مشہور اخبار "ڈیلی میل" میں شائع ہوئی ہے۔ مس موصوفہ تحریر فرماتی ہیں کہ باریابی کے موقعہ پر شاہ ایران نے مجھ سے فرمایا:-

"میرے ملک کے لئے نہایت ضروری ہے کہ وہ غیر ملکی اعانت کے بغیر اپنا کام چلانے پر قدرت حاصل کرلے۔ اور میں اُمید کرتا ہوں کہ چند سال بعد ایران میں کسی غیر ملکی کو ملازم رکھنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ ۱۹۳۴ء تک باستثنائے چند ماہرین صنعت وحرفت و زراعت کے جن کا ہونا ضروری ہے ہم تمام یوروپینوں کی خدمات سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ یاد رہے کہ ہمیں کیانیوں اور اکاسرہ کی جانشینی کا فخر حاصل ہے اور زمانۂ قدیم سے ہم ان کی روایات عظمیٰ کے وارث چلے آ رہے ہیں جبکہ ایشیا دنیائے متمدن کا قائد اعظم تھا۔

اب اس کی سخت ضرورت ہے کہ قومی اسپرٹ اور جذبات وطنیت مؤثر طور پر جاری و ساری ہو جائیں۔ میرا ملک بہت کافی عرصہ تک اجنبیوں کی دستگیری کا محتاج رہ چکا ہے۔ میں ایرانیوں کو یہ سکھانا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی قدر و قیمت پہچان لیں تاکہ وہ ذہنی و عملی دونوں طرح پنجۂ اغیار سے آزاد ہو جائیں، ہر ملک کے وہ رستے۔ ہر ملک کی معاشرت جداگانہ ہوتی ہے، میں ہرگز نہیں چاہتا کہ ایران یورپ کی کورانہ اور مہمل تقلید کرے، کیونکہ ایران خود عظیم الشان روایات کا حامل ہے میں اہل ایران کو تا حد امکان "بہترین ایرانی" بنا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں، جو نہ خالص یوروپین ہوں نہ ایشیائی۔ ہر ملک کے لئے اپنا مخصوص جداگانہ سانچہ ہوتا ہے، اہل ملک کو اسی مخصوص قالب میں ڈھال کر ایسی ترقی دینے کی ضرورت ہوتی ہے جس سے ایسا شہری پیدا ہو جو کسی دوسرے کی نقل نہ ہو بلکہ خود ایک مستقل وجود رکھتا ہو، جسے خود پر اعتماد کامل اور اپنی قومیت پر جائز فخر حاصل ہو۔

"ایران اپنے گھر کا خود مختار مالک ہے، اُسے حق حاصل ہے کہ یہ اپنی دولت کو ترقی دے اور اپنی حفاظت خود اپنی قوت بازو سے کرے۔

"میرا اصلی حربہ فوج ہے، تعمیر مملکت کے لئے زمین اسی کی بدولت تیار ہوئی ہے۔ میں محض ایک سپاہی ہوں سیاست داں نہیں ہوں"

رضا شاہ پہلوی کی عمر اس وقت اگرچہ ساٹھ برس سے متجاوز ہے مگر بایںہمہ وہ ہر وقت تدبیر مملکت اور جہانبانی میں مصروف و منہمک رہتے ہیں۔ ان کی میز پر ایسے تاجروں کی عرضیوں کے علاوہ جو خام پیداوار کی درآمد سے قاصر ہوتے ہیں، زراعتی رپورٹوں، اعداد و شمار کے نقشوں، اجناس اور ملکی پیداوار کے نمونوں کے انبار، فوجی بھرتی کی تفصیلات، محکمہ جات جمرک (کسٹم)، ریلوے، مہاجرین، زائرین و تعمیرات شوارع وغیرہ کے متعلق رپورٹوں کے ڈھیر لگے رہتے ہیں۔

وہ عزم راسخ اور قلب مطمئن کے مالک ہیں، کیا مجال جو چہرہ پر کسی قسم کے اضطراب یا تفکر کی جھلک بھی نمودار ہو سکے۔ ان کے ہر انداز سے وقار و تمکنت برستی ہے۔ گفتگو میں آہستہ روی اور تبسم میں اس سے زیادہ نرم رفتاری پائی جاتی ہے۔ زبان سے الفاظ تلے ہوئے نکلتے ہیں، باتیں کھری کھری اور مختصر کرتے ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ وہ فطرتاً اپنے وطن سے عشق رکھتے ہیں۔ ان کو اگر کسی بات کا کبھی اندیشہ ہوتا ہے تو صرف اس کا کہ کہیں یورپ والے ایران کے ان بیش بہا قدرتی وسائل و ذرائع پر قبضہ نہ کرلیں جن کے ذریعہ سے وہ ایران کے پُرعظمت و شان دَور ماضی کا احیاء کرنا چاہتے ہیں۔

شہریار ایران کی اولوالعزمی کی یہ کیفیت ہے کہ وہ ایک ہی نسل کے عرصہ میں ایران کو اتنی ترقی دیدینا چاہتے ہیں جس کے لئے عموماً ایک صدی کی مدت درکار ہوتی ہے۔ حکومت ایران درحقیقت کوئی چیز نہیں، خود رضا شاہ کی ذات "حکومت ایران" ہے۔ وہ اپنے وزراء کے اختیارات و اعزاز کو اس تناسب کے ساتھ قائم رکھتے ہیں کہ کبھی کوئی وزیر اس قدر ذاتی اثر و اقتدار حاصل ہی نہیں کرسکتا جو ایک ترقی پذیر سلطنت کے لئے خطرناک ثابت ہو سکے۔

رضا شاہ نے عزم بالجزم کرلیا ہے کہ جنوبی ایران سے تمام برطانوی اثر قطعی زائل کردیا جائے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ ایران والے یورپینوں سے زیادہ ربط و ضبط رکھیں۔ چنانچہ حال ہی میں ایک جدید فرمان شاہی صادر ہوا جس میں ایران کے اعلیٰ حکام کا غیرملکی عورتوں سے شادی کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ یہ فرمان اس نظام عمل کا ایک لازمی جزو ہے جس کے ماتحت قومیت ایران کی تعمیر کی جارہی ہے۔

رضا شاہ کو ایرانی نوجوانوں کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کا بیحد خیال رہتا ہے۔ ایران ماضی میں متوسط درجہ کے خاندان کا نوجوان حرم کی چار دیواری کے اندر پرورش پاتا تھا۔ دس برس کے بعد کہیں مدرسہ کا منہ دیکھتا تھا اور رسمی نوشت وخواند کے بعد پندرہ سولہ برس کی عمر میں اس کی شادی کردی جاتی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ راحت پسند اور عیش طلب بن جاتا تھا۔ اس کے دل میں بجز اس کے اور کوئی تمنا نہیں ہوتی تھی کہ کسی سفارش یا خوشامد و رشوت سے کوئی سرکاری ملازمت حاصل کرلے۔ مگر اب ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اعلیٰ پیمانہ پر غیر ملکی درسگاہوں میں ہوتی ہے، جہاں انھیں صنعت و حرفت کی زندگی بسر کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ یہی نوجوان جب تکمیل تعلیم کے بعد اپنے وطن کو واپس آتا ہے تو اس کے دل میں تیل کے سلسلہ میں کام کرنے کی امنگ اور شاہ کی ذات پر یقین ہوتا ہے۔ اب ایران کا ہر تعلیم یافتہ نوجوان یہ محسوس کرتا ہے کہ ایران کو اس غیر محدود خداداد خزانہ کے استفادہ سے محروم کردیا گیا ہے جو کردستان کی سنگلاخ زمین میں مدفون ہے۔

شاہ کو تنظیم عسکری کا خاص شوق ہے۔ پہلے فوج پینتیس ۳۵ ہزار تھی مگر اب اس کی تعداد ساٹھ ہزار کردی گئی ہے۔ ایران کی موجودہ تاریخ میں یہ پہلا دور ہے کہ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسافروں کے جان ومال کو کوئی خطرہ نہیں۔ رضا شاہ ایران کی بحری اور فضائی قوت کو بھی نشوونما دے رہے ہیں۔ اگر یہ شہریار زندہ رہا تو دیکھئے ایران کو کس قدر چار چاند لگاتا ہے۔

اینگلو پرشین آئل کمپنی کا بانی

ولیم ناکس ڈی آرسی ٹیوٹن ایباٹ میں ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوا جہاں سے اس کا باپ اُسے سترہ برس کی عمر میں آسٹریلیا لے گیا۔ وہ راک ہیمٹن کوئینس لینڈ میں تھا کہ ایک کسان اُس کے پاس اپنے کھیت سے پتھر کے کچھ ٹکڑے لایا اور دریافت کیا کہ یہ کیا چیز ہے۔

ڈی آرسی نے فوراً جواب دیا کہ پتھر میں سونے کے ریزے موجود ہیں۔ اس انکشاف کا یہ نتیجہ نکلا کہ ڈی آرسی کو آسٹریلیا کی نہایت دولتمند مونٹ مارگن متکشف معدنیات کمپنی میں اس انکشاف و تحقیقات کے صلہ میں ایک حصہ مل گیا۔ اور ڈی آرسی کو اپنے اس حصہ سے دس لاکھ پونڈ یا ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ منافع حاصل ہوا اور وہ ایک دولتمند آدمی ہوگیا۔ اُس نے اپنا کام ترک کردیا۔ اور اپنی بیوی کے ساتھ تمام دنیا کی سیر وسیاحت شروع کی، آدمی اگرچہ متمول تھا لیکن اُس کے پاس کوئی کام یا مشغلہ نہ تھا۔ وہ کام جس سے اُس کی قسمت کا ستارہ چمکا اور کافی دولت حاصل ہوئی وہ ترک کرچکا تھا۔ اب بیکاری اُس

کے لئے عذاب جاں ثابت ہونے لگی اور اُس نے سوچا کہ پھر کوئی کام شروع کرے۔ اتفاقاً اُسی زمانہ میں اُس کی ایک نوجوان ایرانی سے ملاقات ہوئی جس نے ڈی آرسی سے برسبیل تذکرہ کہا کہ اُس کے وطن میں تیل کے ذخائر ہیں۔ یہ سنکر ڈی آرسی نے ایران جاکر تیل کے چشموں کے انکشاف کا تہیہ کرلیا۔

اس ابتدائی تحقیقات کا یہ نتیجہ نکلا کہ ۱۹۰۱ء میں ڈی آرسی نے شاہ ایران سے درخواست کی کہ اُسے اس علاقہ میں جہاں تیل کے ذخائر موجود ہیں تین سو میل تک زمین کھودنے اور تیل کے چشموں کے نکالنے کا ٹھیکہ مرحمت فرمایا جائے۔ الغرض اُسے ساٹھ برس کے لئے یہ ٹھیکہ حاصل ہوگیا۔

اب اُس نے مٹی کا تیل نکالنا یا دوسرے معنوں میں مٹی سے سونا نکالنا شروع کردیا۔ اُس نے میدان نفت میں ڈیرا ڈال دیا اور مسجد سلیمانیہ کے آثار قدیمہ میں جو بالکل ویران پڑا ہوا تھا تیل کے چشمے نکالنے شروع کئے۔ کوشش کے ابتدائی دَور میں اُسے دشواریوں اور مایوسیوں کا بھی سامنا ہوا خاصکر اس وجہ سے کہ تیل کے نقل وحمل کے لئے سوائے خچر اور اونٹ کے دوسرا کوئی ذریعہ بار برداری کا نہ تھا۔

اول دو تین سال میں اُس نے تین لاکھ پونڈ صرف کئے لیکن اتنی دولت صرف کرنے کا کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا۔ مایوس ہوکر وہ اپنی اس مہم کو ترک کرنے ہی والا تھا کہ لارڈ اسٹرتھ کونا برما آئل کمپنی کے افسر اعلیٰ اور دیگر لوگ اُس کی امداد کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کی امداد کے سہارے پر ڈی آرسی نے صبر و استقلال کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا یہاں تک کہ مئی ۱۹۰۸ء میں ایک دن ایسا آیا کہ بختیاری علاقہ کے ویرانہ میں تیل کا ایک بہت بڑا چشمہ برآمد ہوا، اب اُس کو محسوس ہوا کہ اُس کی قسمت دوسرا خوشگوار پلٹا لے رہی ہے۔

اِس چشمہ سے اس قدر نفع ہوا کہ اوسی سال اینگلو پرشین آئل کمپنی قائم ہوگئی جس کے صدر لارڈ اسٹرتھ کونا مقرر ہوئے اور مسٹر ڈی آرسی اس کمپنی کے ڈائرکٹر منتخب کئے گئے۔ اب چشمے پر چشمے مختلف مقامات پر نکلنا شروع ہوئے، اور ایک دس انچ کی پائپ لائن اس ویران حصہ ملک میں ایک سو تین میل تک قائم ہوگئی۔ سرجان کیڈمین تیل کے ایک بہت بڑے ماہر اس زرخیز مہم کو ترقی یافتہ حیثیت دینے کے لئے برلے امداد روانہ کئے گئے۔

۱۹۱۷ء میں اس کمپنی کا اصل بانی ڈی آرسی اپنے خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے بعد ہمیشہ کیلئے موت کی نیند سوگیا اور اُس کی موت کے ساتھ ہی ساتھ برطانوی گورنمنٹ نے اس کمپنی کے پچھتر لاکھ پونڈ کے حصے جو کمپنی کے نصف سرمایہ کے برابر تھے خرید لئے

عالمِ نسواں

ہندوستان کی عورتوں کو عنقریب ہی نئے آئین ملکی میں ووٹ کا حق ملنے والا ہے جس کے لئے بیگم شاہنواز صاحبہ مسلسل تین سال سے کوشش کر رہی ہیں۔ آپ واحد ہندوستانی خاتون ہیں جنھوں نے لندن کی تینوں گول میز کانفرنسوں میں شرکت فرمائی۔ اس مسئلہ میں اب صرف اس قدر طے ہونا باقی ہے کہ حق رائے دہی کے لئے عورتوں میں کیا خصوصیات ہونا چاہیئے۔ گول میز کانفرنس نے اتفاق رائے سے لوتھین کمیشن کی سفارشات منظور کر لی ہیں، یعنی اس بارے میں جو شرائط مردوں کے لئے مقرر ہوں وہی عورتوں پر عائد ہوں۔ اس تجویز پر اتفاق رائے نہیں ہو سکا کہ عورتوں میں تعلیم کا معیار کم رکھا جائے۔ اگر عورتوں کے لئے بھی اعلیٰ تعلیم کی شرط عاید کی گئی تو بہت ہی کم عورتوں کو حق رائے دہی حاصل ہو سکے گا۔ عام رائے یہ ہے کہ عورتوں کے لئے صرف خواندہ ہونا کافی ہونا چاہیئے۔ اس طرح گھروں کے اندر تعلیم حاصل کر لینے والی عورتیں بھی حق رائے دہی سے مستفیض ہو سکیں گی بیگم شاہنواز نے جو آل انڈیا ومنس کانفرنس کی ترجمان ہیں اصولاً تمام بالغہ عورتوں کے لئے حق رائے دہی ملنے کا مطالبہ کیا ہے اور وہ اس کے خلاف ہیں کہ عورتوں اور مردوں کے لئے مختلف شرائط ہوں بہر نوع اگر ملکیت کی شرط عورتوں کے لئے بھی رکھدی گئی تو ہندوستان بھر میں صرف پچیس لاکھ عورتوں کو رائے دینے کا حق حاصل ہو سکیگا۔ دیکھئے گورنمنٹ برطانیہ کا فیصلہ اس معاملہ میں کیا صادر ہوتا ہے۔

حال میں مسٹر ڈبلیو۔ جی۔ لیسی نے پٹنہ یونیورسٹی میں بہار واڑلیسہ کی مردم شماری کے بعض پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے چند ریمارک ایسے بھی کئے جو عالم نسواں سے تعلق رکھتے ہیں، آپ کی رائے ہے کہ ملک میں گذشتہ دس برس کے اندر عورتوں کی پوزیشن میں نمایاں تغیر ہو گیا ہے جس کی وجہ توسیع تعلیم نسواں، سیاسیات میں عورتوں کا مزید انہماک اور مغربی تہذیب کے اثرات ہیں۔ یورپ کی سیر و سیاحت کرنیوالوں کے علاوہ اب وہ لوگ بھی جو کبھی ہندوستان سے باہر نہیں نکلے یہی چاہتے ہیں کہ ان کی دلہنیں شائستہ اور تہذیب یافتہ ہوں اور وہ رکاوٹیں جو عورتوں کی راہ ترقی میں ابتک حائل تھیں رفع ہو جائیں۔ البتہ معدودے چند دقیانوسی خیال کے لوگ ابھی تک بدستور لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔

یہ خبر نہایت مسرت سے سنی جائیگی کہ انجمن نسواں لکھنؤ (لکھنؤ ویمنس ایسوسی ایشن) نے ہندوستانی خواتین کو انگریزی، ہندی، اردو، سوزن کاری، نقاشی وغیرہ سکھلانے کے کلاس کھول دیے ہیں جن میں یہ سب باتیں بلا فیس سکھائی جاتی ہیں اور ایسوسی ایشن مذکور نے پردہ کا بھی انتظام کیا ہے، اس مدرسہ میں ہر قوم ہر طبقہ اور ہر پوزیشن کی عورتیں داخل ہوسکتی ہیں اور غریبوں کو درسی کتب اور اسٹیشنری بھی مفت دی جائیگی، ہفتہ میں دو بار سوموار کو چار بجے سے چھ بجے شام تک بمقام پرتاب نواس شاہ نجف روڈ لکھنؤ میں اور جمعرات کو زنانہ پارک امین آباد لکھنؤ میں سبق دیے جاتے ہیں۔

ان کلاسوں میں مندرجہ ذیل خواتین نے درس دینے کی ذمہ داری اپنے ذمہ لی ہے:۔

لیڈی وزیر حسن۔ مسز ڈبلیو۔ ایچ۔ ولینس۔ مسز آلہی بخش۔ مسز بھارگو۔ مس پی۔ بھاٹیہ۔ مس سیتاوتی۔ مس ایس۔ مجید حسن۔ بیگم رضا۔ اور بیگم علی ظہیر۔

بمبئی کی دو خاتونوں (مس بیا بائی جوگ اور مس مینا بائی جوگ) کو سنگتراشی میں کمال حاصل کرنے کے صلہ میں بنگلور۔ ٹراونکور اور بمبئی کی نمائشوں سے طلائی تمغے اور سرٹیفکیٹ عطا کئے گئے ہیں۔

پچھلے ماہ مسراٹل چندر چٹرجی کی اہلیہ محترمہ نے بیرسٹری کا امتحان پاس کرکے وکالت کی سند حاصل کرلی ہے۔

مس سیتا دیوی داس بیرسٹرایٹ لا جو مسٹر داس ریٹائرڈ ہائیکورٹ جج مدراس کی دختر نیک اختر ہیں پریکٹس کرنے کے لئے کامبٹور بار میں شامل ہوگئی ہیں۔

صوبہ بنگال میں حال ہی میں سترہ خاتونیں آنریری مجسٹریٹ مقرر کی گئی ہیں۔

حال میں بمقام بنارس یو۔ پی۔ میشوری کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس کی صدارت کے لئے شریمتی کملادیوی ایڈیٹر وید وشارد اجمیری کا انتخاب ہوا تھا۔ اس صوبے میں غالباً یہ پہلی تمدنی کانفرنس ہوئی ہے جس میں ایک لیڈی نے صدارت کی۔

ایجاد و اختراع کے میدان میں بھی عورتیں مردوں سے پیچھے نہیں، چنانچہ پچھلے سال انگلستان میں عورتوں نے مندرجہ ذیل ایجادیں پیٹنٹ کرائیں

(۱) آلو آسانی سے چھیلنے کا آلہ (۲) موم بتی بنانے کی مشین (۳) ایسی کھڑاوں جو چلنے والے کے بوجھ سے خود بخود چلتی ہیں۔ (۴) شعلوں کے خطرناک صورت اختیار کرنیکی حالت میں گیس کا سلسلہ خود بخود کاٹ دینے والی مشین

معرکۂ حسن و عشق

(از خانصاحب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی، بی اے)

صبح طرب تھی آشکار، عہدِ فراق خواب تھا — طرّہ کشائے صد بہار، جلوۂ بے نقاب تھا
سنبل و گل چمن چمن، موج صبا شکن شکن — خون رگوں میں جوش زن مثل شراب ناب تھا
اوس میں ڈوبے پھول تھے، چھلکے ہوئے ایاغ میں — پھول جو تھا گلاب کا، شیشۂ پُر گلاب تھا
بادِ سحر کی مستیاں، غنچوں کی نرم سسکیاں — ایک سے ایک ملتفت، کہنے کو اجتناب تھا
خندۂ گل کی التجا، نالۂ عندلیب میں — نالۂ عندلیب کا خندۂ گل جواب تھا
پھوٹ رہی تھیں کونپلیں، جھوم رہی تھیں ڈالیاں — موج ہوا میں سربسر کیفِ مے شباب تھا
نشے میں ڈھونڈھنے لگا، ساز، مغنّیِ نمو — شاخ جو تھی وہ چنگ تھی، برگ جو تھا رباب تھا
ایک طرف تھی آبجو، کھولے ہوئے کنارِ شوق — خیرہ مثالِ چشمِ گل، دیدۂ ہر حباب تھا
ایک طرف تھیں چشمکیں ساقیِ شوخ و شنگ کی — جام کی گردشیں نہ تھیں، دور میں آفتاب تھا
حسنِ کرشمہ ساز ادھر، محوِ غرورِ دلبری — عشقِ خلش نواز ادھر، پیکرِ اضطراب تھا
آنکھیں جو چار ہوگئیں، جیسے قیامت آگئی — تیوری تھی چڑھی ہوئی، زلف کو پیچ و تاب تھا
عشق نے اک نگاہ میں بھر دیا جذب اس قدر — حسن ستیزہ خو معاً شرم سے آب آب تھا
ماتھے پہ کچھ عرق بھی تھا، کانپ رہے تھے ہونٹ بھی — باطنی اضطراب کا، چہرہ کھلی کتاب تھا
نظروں میں منتیں بھی تھیں اور ملامتیں بھی تھیں — وعدۂ مہر تھا کبھی، اور کبھی عتاب تھا
نام کو تھا بس امتیاز، حسن میں اور عشق میں — ناز تھا سربسر نیاز، پردہ فقط حجاب تھا
معرکہ ختم یوں ہوا، فتح شکست ہوگئی — عشقِ نبرد آزما اپنے پہ فتحیاب تھا
نظریں جو انکے رُخ پہ تھیں سوئے زمیں وہ جھک گئیں — آنکھوں میں تھے سرشکِ خوں سینے میں دل کباب تھا
پھر تھی وہی فتادگی، پھر وہی درد و خستگی — دل کہ تھا جلوہ گاہِ دوست، غمکدۂ خراب تھا
پھر وہی آہ آہ تھی، پھر وہی دورِ ابتلا — پھر وہی سوزِ ہجر تھا، پھر وہی التہاب تھا
جوشِ جنوں میں یا کبھی لب پہ یہ مصرعِ اثر — "صبحِ بہار وہم تھی، عہدِ نشاط خواب تھا"

کلامِ نظم

(از حیدر یار جنگ صاحب نظم طباطبائی)

مُسکرانے سے چھلکتے ہوئے پیمانوں کے — بزم میں کھلنے لگے پھول بھی گلدانوں کے
گرد میں قافلۂ نکہت گل کی سمجھا — دیکھکر رنگ پریدہ کو گلستانوں کے
آتش افروز ہوئی برق صدائے مطرب — نغمۂ نے نہیں شعلے ہیں نیستانوں کے
لذت نغمہ سے ہوتی نہیں زحمت محسوس — ناقہ چلتا ہے ترنم پہ حدی خوانوں کے
اوج پر اپنے بہت ہفت فلک میں نازاں — مَیں سمجھتا ہوں بگولے ہیں بیابانوں کے
آزمانے کو جو ابنائے زمانہ کے اُٹھا — دیو بھی مجھکو ملے بھیس میں انسانوں کے
لے چل اے جذبۂ دل آنکھ بچا کر مجکو — پہرے بیٹھے ہوئے رہ جائیں نگہبانوں کے
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اربابِ کمال — حوصلے اور بڑھے جاتے ہیں نادانوں کے
خوانِ نعمت پہ ہجوم اہل ہوس کا ہے عبث — منّ وسلویٰ نہیں حصہ میں مگس رانوں کے
اُسکی محفل میں خبر کچھ دلِ مضطر کی نہیں — لوٹتے ساتھ ابھی دیکھا تھا پروانوں کے
مجکو حیرت ہے کہ رخسار تو لو دیتے ہیں — اور مرجھاتے نہیں پھول ترے کانوں کے
کتنے معمورۂ عالم تھے کہ اب ان کی جگہ — خاک ہی خاک ہے دامن میں بیابانوں کے
ڈال دی نالۂ پُر درد نے اُس میں بھی کمند — کنگرے عرش سے اونچے تھے جن ایوانوں کے
جلد اے بادِ مراد آ کہ ہے کشتی اپنی — منہ میں گرداب کے آغوش میں طوفانوں کے
چاہئیں عرش کے مضمون غزل میں اے نظم — ساتھ ہی اس کے مضامین پرستانوں کے

جلوۂ کن فیکوں ہے ترے فرمانے سے — کیا کمی ہوگی تمنا مری بر لانے سے
اُس طرف عرش کے ہے منزلِ مقصود اپنی — رہ گیا میں کششِ ارض کے آجانے سے
آکے تو بیٹھ یہاں کام نہیں ناصح کا — میں سمجھ جاؤنگا سب کچھ ترے سمجھانے سے

آنکھ تھی محوِ تماشا کہ گری اِک بجلی
برق پیدا یہ ہوئی دل کے تڑپ جانے سے

زیست کا لطف گیا ساتھ دلِ زندہ کے
جل گیا نخل بھی اِک پھول کے کُمھلانے سے

چشمِ بینا کو نظر آتے ہیں اسرارِ نہاں
پردۂ ابر میں بجلی کے چمک جانے سے

سرکشی نفس کی ہے، باعثِ بیتابیِ دل
لہر پیدا یہ ہوئی سانپ کے بل کھانے سے

تو نے دوزخ میں گرایا مجھے اے نفسِ زبوں
شعلے اُٹھنے لگے آخر ترے بھڑکانے سے

داد لیتا ہوں میں اے نظم نوا سنجی کی
ابر کے جھومنے سے۔ بحر کے لہرانے سے

کلامِ محروم

(از منشی تلوک چند محروم بی اے)

سُرورِ عاشقی بعدِ فنا بھی مونسِ جاں ہے
کہ صحرا کے بگولوں میں غبارِ قیس رقصاں ہے

یہ حیرت خانۂ دنیا طلسمِ حسنِ پنہاں ہے
وہی کچھ مطمئن اس میں نظر آیا جو حیراں ہے

چراغِ زندگی روشن سرِ راہِ بیاباں ہے
ہوائے دہر کا ہر ایک جھونکا دشمنِ جاں ہے

چمن اندر چمن حسنِ جہاں افروز ہے تیرا
مگر وائے! مری منزل بیاباں در بیاباں ہے

مری افتادگی پر رحم کر اے حسنِ بے پروا
عروج آموز ذرّے کو شعاعِ مہرِ تاباں ہے!

رُباعیات

انجامِ حیات اب نظر آتا ہے
معلوم نہیں بُرا ہے یا اچھا ہے
کی عمر تمام شاعری میں ہم نے
باتوں باتوں میں یہ سفر کاٹا ہے

شوقِ رسوا، نہ ہے جوانی باقی
کم تر ہے نشاطِ زندگانی باقی
یہ قصہ بھی اب تمام ہونیکو ہے
تھوڑی سی ہے اور عمرِ فانی باقی

لطفِ سخن

حال میں حیدرآباد دکن میں ایک عظیم الشان مشاعرہ عالیجناب مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر صدر اعظم ریاست کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں نامور مقامی شعرا موجود تھے۔ دل بنا۔ قابل بنا۔ طرح تھی۔ مگر محمل، قابل ساحل یہ تین قافیئے خاص طور پر معرکۃ الآرا رہے۔ چنانچہ ہمارے ایک مہربان نے ناظرین زمانہ کی ضیافت طبع کے لئے اس مشاعرہ کا انتخاب ارسال فرمایا ہے جو درج ذیل ہے۔

(عالی جناب مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاد)

مختلف جلووں کا مرکز عشق میں یہ دل بنا ۔۔۔ یہ کبھی مجنوں کبھی لیلےٰ، کبھی محمل بنا
کس قدر ذوقِ فنا ہے مد و جزر عشق میں ۔۔۔ جب بڑھا دریا بنا جب گھٹ گیا ساحل بنا
پوچھتے کیا ہو حقیقت مجھ سے دردِ عشق کی ۔۔۔ میرا ہی دل تھا جو اس کے رہنے کے قابل بنا

(نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز)

ناخدا کی کیا ضرورت جب محافظ ہے خدا ۔۔۔ جس جگہ ڈوبی مری کشتی وہیں ساحل بنا
دیکھنی ہو گر لیاقت مانی و بہزاد کی ۔۔۔ پہلے اپنے آپ کو تصویر کے قابل بنا
کچھ ہجوم یاس اپنا مانعِ دیدار تھا ۔۔۔ کچھ غبارِ راہ اُڑکر پردۂ محمل بنا

(نواب اصغر یار جنگ بہادر اصغر)

خون کی ندی بہی دل سے تو دریا دل بنا ۔۔۔ سرلبِ زخم جگر اپنا لبِ ساحل بنا
یہ تکلف ہے کسی پردہ نشیں کے واسطے ۔۔۔ اپنا اِک اِک پردۂ دل پردۂ محمل بنا

(جناب آزاد انصاری)

جب اُبھارا ہے تو لے اپنے قرب کی حد تک اُبھار ۔۔۔ جب بنایا ہے تو اپنے لطف کے قابل بنا

(نواب اکرم الدین خاں بہادر اکرام)

کثرتِ اشکِ ندامت سے بھی ہے تر دامنی ۔۔۔ میرے آنسو پونچھنے سے دامنِ ساحل بنا

(جناب امید شاد نظامی)

ہوتے ہوتے ہوگئی لفظ و معانی کی تمیز
میں کہیں قطرہ کہیں دریا، کہیں ساحل بنا

(جناب آلم حیدرآبادی)

سیر گر عمرِ رواں کی دیکھنی منظور ہے
جا کسی دریا پہ گھر اپنا لبِ ساحل بنا

ایک مدت کی ریاضت، سالہا کی بندگی
جب کہیں بندہ ترے الطاف کے قابل بنا

(جناب اجلال حیدرآبادی)

ڈوبنے والا تھا میں، دریا چڑھا میرے لئے
جس کی ہمت پست تھی اس کے لئے ساحل بنا

(سید امین الحسن صاحب بسمل)

اعترافِ جرم میں پنہاں ہیں خاطرداریاں
میں کہاں قابل ہوا، یہ کہئے میں قابل بنا

(جناب باغ صاحب)

چاہیئے کچھ تو پتہ اے بحرِ الفت کے غریق
نام کا اپنے نشاں مٹکر سرِ ساحل بنا

عصمتِ لیلےٰ کی خاکِ قیس بھی ہے پاسباں
جو غبار اُٹھتا گیا وہ پردۂ محمل بنا

(جناب باقی ایم ۔ اے ۔ (عثمانیہ)

خود نکل آئے گا دریا سے کنارِ عافیت
اپنی ہر موج نظر کو تشنۂ ساحل بنا

چشمِ مجنوں درحقیقت جب ہوئی لیلےٰ پرست
ذرہ ذرہ خاک کا اک پردۂ محمل بنا

(جناب شہرت صاحب)

بیخودیِ عشق میں صحرائے حسرت دل بنا
مدعا مجنوں بنا، لیلےٰ بنا، محمل بنا

(جناب فرحت دہلوی)

وائے ناکامی کہ لیلیٰ پہلے ہی محمل میں تھی
گردِ رہ سے گردِ مجنوں اور اک محمل بنا

بے وفائی اس کی ہے یک بحرِ ناپیدا کنار
تو وفا سے دوسرا دریائے بے ساحل بنا

(جناب فدائی صاحب حیدرآبادی)

ٹھوکریں کھا کھا کے سر سے خودسری جاتی رہی
اب کہیں دل آستانِ یار کے قابل بنا

(جناب تمجید حیدرآبادی)

قیس کو کچھ بھی نظر آیا نہ لیلےٰ کے سوا
یعنی ہر ذرہ نگاہِ شوق میں محمل بنا

بحرِ الفت میں چلی بادِ مخالف اس طرح
بادبانِ کشتیِ دل ٹوٹ کر ساحل بنا

(نواب نجیب الدین خاں بہادر نجیب)

مانتا ہوں تجھ کو اللہ نے بنایا ہے حسیں جیسی صورت ہے تری سیرت بھی اس قابل بنا

(نواب تراب یار جنگ بہادر سعید)

لاکھ ہو افسردگی، ہے رقصِ بسمل بھی ضرور دل کو پہلو میں نگاہِ ناز کے قابل بنا

نوائے راز

(از جناب ابوالفاضل راز چاندپوری)

حدِّ امکاں تک تو بیشک کام ہے تدبیر کا
اس سے آگے جو مقدر ہو مری تقدیر کا

اُف یہ نازِ بے نیازی حسنِ عالمگیر کا
واہ کیا کہنا جنابِ عشق کی تقدیر کا

الاماں یہ جوش، لے آہِ رسا بس رحم کر
معترف ہوں روزِ اول سے تری تاثیر کا

کہہ چکا ہوں سختیٔ منزل کی کچھ پروا نہیں
راہبر! تجھکو تو گویا خبط ہے تقریر کا

کون ہے یہ سر بسجدہ آستانِ غیر پر
غالباً کوئی مسافر منزلِ تدبیر کا

تیرے صدقے تیرے قرباں ساقیٔ میکش نواز
دیکھ تو کیا وقت ہے، یہ وقت ہے تاخیر کا؟

بندۂ تسلیم ہوں، جائے ادب ہے، کیا کہوں
جائزہ لیتے ہیں اب وہ دفترِ تقصیر کا

راز یہ دشتِ جبل پور اور میں، اب کیا کہوں
اِک کرشمہ ہے نگاہِ شاہدِ تقدیر کا

(از پروفیسر ڈپٹی لال صاحب نجم ایم اے)

خلق جلوہ سے شادکام ہوئی
یار کی بزم بزمِ عام ہوئی

منتظر ہوں کہ کب وہ آتے ہیں
دن ہوا ختم اور شام ہوئی

صبح سے اہتمامِ آمد ہے
شام بھی نذرِ انتظام ہوئی

روز امیدِ وصل میں رہنا
عمر یونہی غرض تمام ہوئی

علمی خبریں اور نوٹ

آجکل ترکوں کو ترکی زبان سکھائی جا رہی ہے، چنانچہ حال ہی میں مصطفےٰ کمال پاشا نے یہ فرمان جاری کیا ہے کہ ترکی زبان میں جو غیر ترکی الفاظ شامل ہو گئے ہیں اُن کو خارج کر کے اُن کے بجائے ٹھیٹ ترکی الفاظ استعمال کئے جائیں، لیکن چونکہ ترکی زبان میں فارسی اور عربی الفاظ بکثرت شامل ہو گئے ہیں اس لئے اب ان کے بجائے پُرانے اور متروک ترکی الفاظ ڈھونڈھ ڈھونڈھکر رکھے جا رہے ہیں۔ ہندوستان میں بعض حامیان اُردو اس کے برعکس اُردو زبان میں عربی فارسی کے ادق الفاظ اور نامانوس ترکیبیں داخل کر رہے ہیں جس سے اُردو زبان کی ہر دلعزیزی میں فرق آ رہا ہے ۔

انگلستان کے نامور مصنف جان گالزوردی اپنے نوبل پرائز کی رقم کو جسکی تعداد نو ہزار چھ سو پاؤنڈ ہے بذریعہ وصیت ایک ادبی انجمن کو دے گئے ہیں جسکے صدر خود گالزوردی تھے اور جسکی دُنیا میں پچاس شاخیں موجود ہیں۔ اس انجمن کے بند ہو جانے پر یہ رقم رائل لٹریری فنڈ کو دیدی جائیگی۔ گالزوردی کا ۳۱ جنوری گذشتہ کو انتقال ہو گیا ہے اور زمانہ میں کسی دوسری جگہ ان کے متعلق ایک ایڈیٹوریل مضمون بھی زیب رسالہ ہے۔

اعلیٰحضرت نظام دکن نے مولوی ارشد تھانوی صاحب وکیل بھوپال کی علمی و ادبی خدمات کی قدر دانی میں دو سو روپیہ کا عطیہ دیا ہے۔

آجکل تمام دنیا کے ملک اپنی اپنی ملکی زبانوں کو ترقی دینے کی فکر میں منہمک ہیں، چنانچہ پچھلے دنوں شاہ عراق نے بھی ایک فرمان کے ذریعہ اپنے ملک کے سرکاری محکموں کو ہدایت کی ہے کہ وہ آئیندہ سے دفاتر میں صرف عربی زبان استعمال کریں اور انگریزی کو بالکل ترک کر دیں۔

برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی کی سالانہ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے سال عام کساد بازاری کے باوجود اس سوسائٹی نے ہندوستان میں سال گذشتہ کی بہ نسبت ایک لاکھ زیادہ بائبلیں فروخت و تقسیم کیں۔

معلوم ہوا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو صاحب آجکل جیل میں تمام دنیا کی تاریخ لکھنے میں مصروف ہیں

مغربی ممالک کے اخبارات کی ترقی کی داستان ہندوستانیوں کیلئے خاص طور پر سبق آموز ہے۔ مثلاً ماہ دسمبر ۱۹۳۲ء میں انگلستان کے مشہور اخبار ڈیلی میل کی سترہ لاکھ پنتیس ہزار چھ سو باون اور اخبار ڈیلی ایکسپریس کی سولہ لاکھ ۴ ہزار ایکسو چھپن کاپیاں فروخت ہوئیں۔ انگلستان کے بعض ہفتہ وار اخبارات ایسے ہیں جنکی اشاعت دس لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔ مثلاً نیوز آف دی ورلڈ کی اشاعت تیس لاکھ کے قریب بتلائی جاتی ہے۔ اسپر ہفتہ وار اسقدر کاغذ خرچ ہوتا ہے کہ اگر اسکے کاغذ کے تختے زمین پر بچھا دیئے جائیں تو آٹھ ہزار پانچسو میل طولانی سڑک تیار ہو جائے۔ ان اعداد و شمار کے لحاظ سے ہندوستانی زبانوں کے اخبارات کی حالت بہت کچھ اصلاح و توجہ کی محتاج ہے۔ مگر جبتک عوام ملک تعلیم یافتہ و خوشحال نہ ہونگے اُسوقت تک ملکی پریس کی یہی حالت رہیگی۔

افسوس کہ اُردو کے مشہور نثار و شاعر حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی کا پچھلے ماہ بمقام دہلی انتقال ہو گیا۔ آپ دو سال سے فالج میں مبتلا تھے اور نقل و حرکت سے عاری ہو گئے تھے۔ مگر کہتے ہیں کہ زندہ دلی اور دہلی کی آن آخر تک باقی رہی۔ انکے مضامین رسالہ مخزن لاہور اور بعض دیگر رسالوں میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ آپکی تحریروں میں دہلی کی صاف و شستہ روزمرہ کی شان پائی جاتی تھی اور طرز بیان صاف و سلیس تھا جیل خانہ دہلی کے سامنے نئے قبرستان میں آپ مدفون ہوئے۔ آپکی وفات سے اُردو کا ایک دیرینہ خادم اُٹھ گیا۔

پنڈت مہابیر پرشاد صاحب دویدی سابق ایڈیٹر سرسوتی الہ آباد اپنی بیش بہا زندگی کے پچیس سال نہایت اعتبار و بے لوثی سے ہندی کی خدمت میں بسر کر چکے ہیں۔ آپنے جدید ہندی لٹریچر کی تعمیر میں نہایت گرانقدر اور قابل یادگار خدمات انجام دی ہیں مگر مسلسل جانفشانی و دماغ سوزی سے خستہ ہوکر اب آپ گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔ آئندہ مئی میں آپکی سترھویں سالگرہ ہونیوالی ہے چنانچہ اسکے اعزاز میں ناگری پرچارنی سبھا بنارس کیطرف سے ایک شاندار یادگاری کتاب شائع کیجائیگی جو اعلیٰ درجہ کی ادبی خوبیوں کا خزانہ ہوگی۔ اس موقع پر ہندی کی ایک ادبی نمائش منعقد کرنیکی بھی کوشش ہو رہی ہے۔

زمبک Zam-Buk

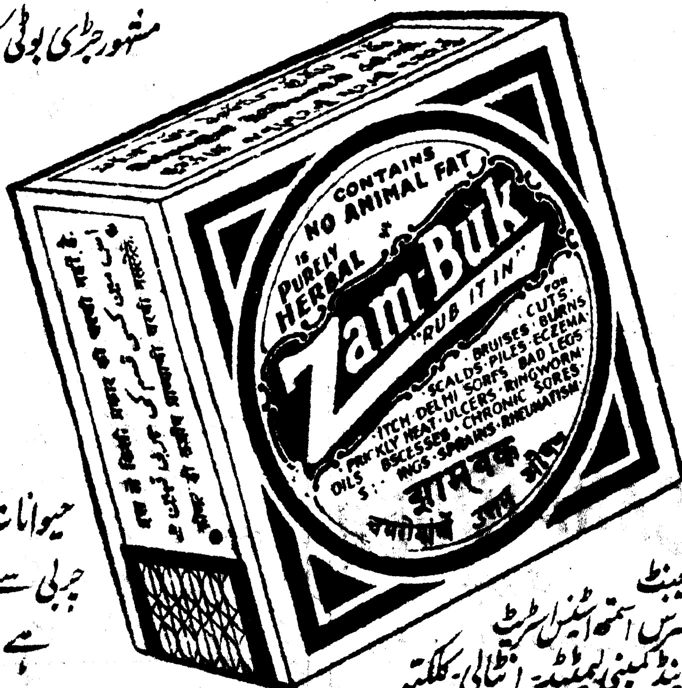
زمبک نئی تندرست کھال پیدا کرتا ہے

اپنی بیش قیمت جڑی بوٹیوں کے اجزا اور اعلیٰ صفائی کی وجہ سے زمبک باریک سوراخوں میں آسانی سے جذب ہو جاتا ہے۔ یہ درد و سوزش کو دفع کر دیتا ہے اور مرض کو جڑ سے نیز جلد کی سطح پر اچھا کر دیتا ہے زمبک مرض کے جراثیم کو نیست و نابود کر دیتا ہے اور زہریلا مادہ باہر نکال کر نئی کھال پیدا کرتا ہے۔

اکزیما۔ پھوڑے۔ کھجلی۔ زہریلے زخم۔ چاقو سے کٹنے۔ چوٹ آگ سے جلنے۔ ڈنبل۔ کیڑے مکوڑوں کا کاٹنا۔ پاؤں کے زخم۔ بواسیر وغیرہ کے لئے زمبک بہت ضروری ہے۔

تمام انگریزی دوا فروش زمبک فروخت کرتے ہیں۔

قیمت فی ڈبیہ ایک روپیہ۔ بڑی ڈبیہ دو روپیہ چار آنہ۔ ۴؍





باپکو پوری تندرستی حاصل ہوگئی

ایک سناٹوجن استعمال کرنیوالے شخص کا شکرگذار بیٹا لکھتا ہے کہ:-

"یہ بالکل سچ ہے کہ سناٹوجن کے تین ہفتہ کے استعمال سے میرے باپ کو پوری صحت اور طاقت حاصل ہوگئی۔ سناٹوجن کے استعمال سے پہلے میرا باپ قریب المرگ معلوم ہوتا تھا لیکن اب وہ پورے طور پر تندرست اور طاقتور ہوگئے ہیں میں سناٹوجن کا شکرگذار ہوں۔"

سناٹوجن نے دوسروں کو جو فائدہ پہونچایا ہے وہ آپکو بھی پہنچ سکتا ہے تھوڑی سی مدت میں آپکی کمزوری پر غالب آئیگا اور آپ اپنے آپ کو طاقتور اور تندرست محسوس کرنے لگیں گے کیونکہ اسمیں بالکل وہی اجزا ہیں یعنی فاسفورس اور البومن جو خون رگوں اور جسم میں طاقت پیدا کرتے ہیں پس آپ کیوں کمزور اور نحیف رہیں جبکہ آپ کو معلوم ہے کہ سناٹوجن آپ کو اپنی زندگی سے پورے طور پر لطف اندوز ہونیکی طاقت بخشے گا۔

SANATOGEN

اصلی مقوی غذا

تمام انگریزی دوا فروشوں اور بازاروں میں ملتی ہے

(سناٹوجن ہاتھ سے نہیں چھوئی جاتی)



THE WOMAN'S TONIC

الٹراس کارڈی آل یعنی اکسیر نسواں

ڈاکٹر اسکو جسمانی صحت کیلئے بہترین دوا قرار دیتے ہیں

ہر گھر میں اسکا رہنا نہایت ضروری ہے

ماں بہن اور بیٹی کے واسطے بہترین دوائی

Rio Chimecal Co;

79. BARROW STREET

NEW YORK (U.S.A.)

ہندو شعرا

خواجہ عشرت لکھنوی کی جدید تالیف چار سو پچاس گزشتہ و موجودہ ہندو شعرا کے حالات مؤثر و دلکش قابل دید چیدہ اشعار — ۴ر

تذکرہ آب بقا گذشتہ و موجودہ شعرا کے حالات — عار

شاعری کا مکمل سٹ چار جلدوں میں — عار

لغات اردو مکمل سٹ — ۴

حال اردو۔ ہندی اور اردو کی حقیقت الفاظ کا فرق — ۶ر

اصلاح زبان اردو۔ متروکات کی تشریح — ۶ر

ترجمان پارسی۔ اردو سے فارسی بنانیکی آسان ترکیب — ۶ر

زباندانی۔ اردو کے مستند قواعد — ۶ر

اصول اردو۔ صرف و نحو کے مختصر قواعد — ۶ر

المشتہر

مینیجر عشرت بکڈپو۔ احاطہ خانساماں لکھنؤ



سانس کے ذریعہ فائدہ پہونچانے والی

پیپس کی ٹکیوں سے

سانس لینے والی نلیوں کی شدید بیماریاں

مکمل طور پر اچھی ہو جاتی ہیں

برانکائیٹز کا مرض سینہ کو اس قدر کمزور کر دیتا ہے کہ بیمار ہر وقت سانس لینے کی تکلیف اور سخت کھانسی کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور بیماری کے ہر نئے دورہ کے ساتھ سانس کا لینا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

پیپس سانس لینے والی نلیوں اور پھیپھڑوں کا سب سے سیدھا اور مکمل علاج ہے جب آپ سانس کے ساتھ فائدہ پہونچانے والی ان ٹکیوں کو استعمال کرتے ہیں تو حلق اور سانس لینے والی نلیوں کی سوزش اور آماس بہت جلد رفع ہو جاتی ہے اور کھانسی بالکل اچھی ہو جاتی ہے پیپس سے سینہ کو آرام پہونچتا ہے اور حلق کے اندر تمام نازک جھلیوں کی تکلیف دور ہو جاتی ہے۔ گلے میں پھنسنے والا بلغم بھی اکھڑ جاتا ہے اور تنفس کی تمام تکلیف بالکل رفع ہو جاتی ہے۔

پیپس گلے۔ سینہ اور پھیپھڑوں کو طاقت پہونچاتی ہے اور کھانسی۔ زکام۔ گلے کی سوزش لارنگیٹز کنٹھ مالا۔ دمہ اور نزلہ وغیرہ کے لئے بہت مفید ہے۔

سب انگریزی دوا فروش پیپس ایک روپیہ فی شیشی کے حساب سے فروخت کرتے ہیں۔

ایجنٹ:۔ مسرز اسمتھ اسٹینس اسٹریٹ اینڈ کمپنی لیمٹڈ۔ اٹالی۔ کلکتہ

پیپس کی ہر ٹکیہ پر نقرئی ورق چڑھا ہوتا ہے

پیپس Peps

ملاحظہ

سیرت محمد علی

مکتبۂ جامعہ نے نہایت ہی اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اس میں مولانا مرحوم کی زندگی کے حالات تمام و کمال لکھے گئے ہیں۔ طباعت و کتابت نہایت عمدہ۔ تقریباً ۶۰۰ صفحات مع متعدد تصاویر

قیمت تین روپیے

ترکی جمہوریہ

یعنی ترکی کی نشأۃ ثانیہ کا تجزیہ۔ ترکوں پر مغربیت کا اثر کیونکر ہوا۔ ترکی کا اولین زمانہ، جنگ عظیم میں شرکت، خلافت اور سلطانیت کا تجزیہ۔ اور جمہوریت کا قیام۔ سیاست۔ یہ تمام باتیں تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں پڑھیں۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ

دیوان غالب (جرمن)

تمام کتابوں میں سب سے زیادہ خوبصورت کتاب

اور قیمت میں انتہائی تخفیف

یعنی

قسم اول للعہ کے بجائے ۱۲؍ قسم دوم ۱۲ کے بجائے عا؍

نفسیات شباب

۱۲؍

تلاش حق (۲ حصے)

عا؍

کیمیاگر

مختصر افسانوں کا یہ ایک اچھا مجموعہ ہے۔ پڑھنے والے کو ان افسانوں میں اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نظر آئے گا۔ اپنے اخلاقی اور ادبی محاسن کی بنا پر اردو میں یہ ایک نئی چیز ہے۔

قیمت ایک روپیہ

صید زبوں

ایک اچھا ڈرامہ ہے جس میں عورتوں کی نزاکت دکھائی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ "خلع" ایک اہم مسئلہ ہے اور موجودہ زمانے میں بھی اس قانون کا باقاعدہ اجرا ہونا چاہیے۔

قیمت ۱۰؍

مکتبہ جامعہ۔ قرول باغ۔ دہلی

زمانہ

مرتبہ: دیا نراین نگم بی۔ اے

نمبر ۳	مارچ سنہ ۱۹۳۳ء	جلد ۶۰

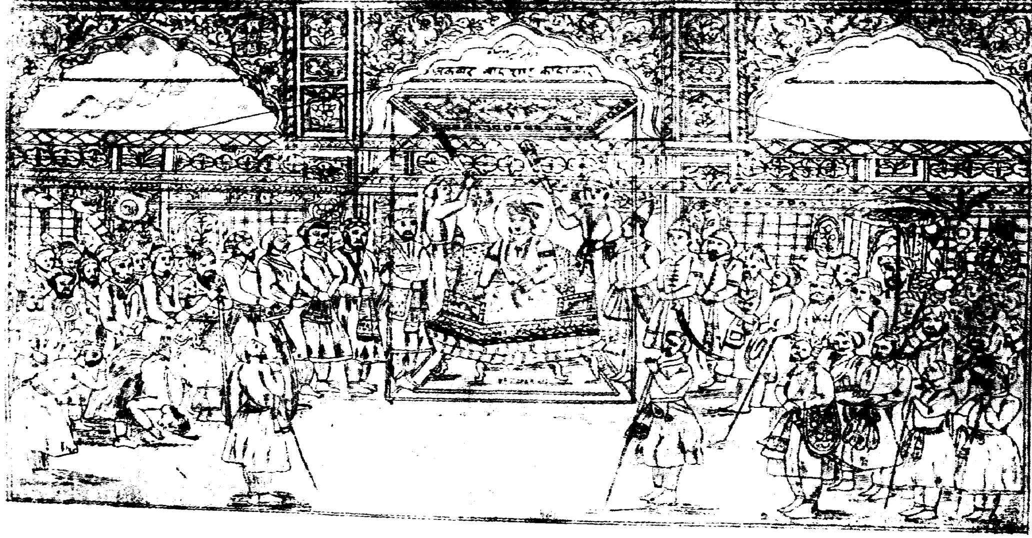
فہرست مضامین

تصویر: اکبر اعظم کا دربار

قیمت فی پرچہ ۸؍

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

نعیب لال ایجنٹ



اکبر اعظم کا دربار

زمانہ

جلد ۶ | مارچ سنہ ۱۹۳۳ء | نمبر ۳

مرزا رسوا مرحوم

(از مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی)

مرزا صاحب کی شاعری

مرزا صاحب کو شاعری کا شوق بچپنے سے تھا، مثنوی امید و بیم میں کہتے ہیں ؎

چار دن سے نہیں یہ شوقِ سخن — بچپنے سے ہے مجھے ذوقِ سخن
قدردانوں میں ہے عزت میری — نکتہ سنجوں میں ہے شہرت میری
مجھکو پہچانتے ہیں اہلِ ہنر — جوہری جانتے ہیں قدرِ گہر
لوگ آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں مجھے — آرزوؤں سے بلاتے ہیں مجھے
رونقِ بزمِ سخن ہے مجھ سے — زینتِ صحنِ چمن ہے مجھ سے

ابتدائے عمر میں ایک بزرگ مرزا دبیر صاحب مرحوم کی خدمت میں لے گئے، اُنھوں نے بلحاظ مناسبت عمر مرزا محمد جعفر صاحب اوج سے تعارف کرادیا صرف دو تین غزلیں دکھائیں اسکے بعد مشورہ رہا۔ مرزا کی زبان موجودہ شعرا میں لکھنؤ کی ٹکسالی زبان تھی جس قدر محاورات پر اُن کو عبور تھا ایسی کوئی ہستی آج شعرا میں نظر نہیں آتی، اسکا سبب اُنکے فطری ذوق کے علاوہ اُنکی ہمہ دانی اور مختلف صحبتیں تھیں۔ ایک طرف اہلِ علم کے ساتھ علمی معاشرت، دوسری طرف لکھنؤ کے مختلف طبقات سے تعلقات، مرزا اصنافِ سخن پر قدرت رکھتے تھے، قصائد بھی کہے، مثنویاں بھی کہیں، غزل بھی کہی، نظم و نثر دونوں پر ایکطرح قادر تھے

مگر نظم سے زیادہ نثر لکھی اور ایسی لکھی کہ آج اُن کی کتابیں زبان اُردو کا بہترین سرمایہ ہیں۔

مرزا کا کلام اگر جمع کیا جاتا تو ایک ضخیم کلیات ہوتا مگر آپکی بے اعتنائی اور بے پروائی کا یہ عالم تھا کہ غزل کہی اور پھینک دی یا کسی نے مانگی تو وہی مسودہ اوسکو دیدیا۔ کلام جو کسی نے لیکر چھاپ دیا وہ تو چھپ گیا ورنہ خود اونھوں نے نہ کبھی چھپوایا نہ جمع کیا۔ خدا بخشے حکیم علی محسن خاں آبر مرحوم کو جن کی سعی و کوشش سے آج مرزا کی چند غزلیں بھی دستیاب ہوسکیں۔ آبر مرحوم جس زمانے میں معیار نکالتے تھے تو مرزا صاحب کی خدمت میں برابر جایا کرتے تھے اور معیار کی ہر طرح میں اون سے کسی نہ کسی طرح غزل کہلوانے کی کوشش کرتے چنانچہ اس مضمون میں اکثر غزلیں معیار کے مختلف نمبروں سے لیگئی ہیں۔

غزلیات کے علاوہ "مراسلہ مرزا" کے عنوان سے ایک مستقل مضمون فلسفہ شعر کے متعلق معیار میں شائع ہوا کرتا تھا۔ مرزا صاحب کی بے پروائی کا عالم دیکھکر مرزا اوج صاحب مرحوم نے آپ کا کلام جمع کرنا شروع کیا۔ مسودات مرزا صاحب سے لے لیتے تھے اور اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے مگر افسوس بقول اُن کے صاحبزادے مرزا محمد طاہر صاحب رفیع کے وہ سب ذخیرہ ضائع ہوگیا۔

شاعری مرزا صاحب کا خاص مشغلہ نہ تھا بلکہ تفنن طبع اور مشاغل تفریح میں داخل تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ:۔

شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

میرے نزدیک لکھنؤ میں اونکی ذات بحیثیت ایک مجدد فن کی تھی اُنکی شاعری کا آغاز اُس وقت ہوا جب لکھنؤ میں ناسخ و آتش کے ترانے گونج رہے تھے اور محفلوں پر وہی رنگ چھایا ہوا تھا اس وقت سب سے پہلے جس شخص نے ترمیم کی وہ مرزا کی ذات تھی اور یہ سہرا اونھیں کے سر رہا۔ اونکی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے اس رنگ کو اختیار کیا، مگر غالب کے رنگ میں جس قدر کامیابی مرزا کو حاصل ہوئی کسی ایک کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ مرزا نے زبان میں تقلید نہیں کی بلکہ خیالات و طرز ادا میں غالب کا تتبع کیا دوسروں نے فقط زبان اور فارسی ترکیبوں میں تقلید کی۔ مرزا نے ابتدا میں مدتوں غالب کا کلام سامنے رکھکر فکر سخن کی جس طرح کوئی خوشنویس استاد کی وصلی رکھکر مشق کرتا ہے۔

مرزا زبان کی خرابیاں دیکھکر بہت متاثر ہوتے تھے، ایک زمانہ میں الواعظ مدرسۃ الواعظین کا رسالہ میری ادارت میں نکلتا تھا اوسکو برابر دیکھا کرتے تھے کسی صاحب کے مضمون میں لوٹ کر بمعنی پلٹکر لکھا ہوا تھا اُن کے دماغ میں محفوظ رہا، لکھنؤ آئے تو مجھ سے ملتے ہی شکایت کی۔

"کیوں صاحب جو رسالہ آپکی ادارت میں نکلتا ہو اوسمیں لوٹ کر لکھا جائے

شعر میں بھی سب سے پہلے زبان کو دیکھتے تھے اوسکے بعد خیالات۔ اُن کے شعر میں کبھی اغلاق لفظی و معنوی ہوا ہی نہیں، مضامین بلند ہوتے تھے مگر نہایت صاف اور شستہ زبان میں ادا کرتے تھے۔ آخر عمر میں بجد صاف کہنے لگے تھے، ایک دن زمانہ حال کی ایک غزل سُنائی مَیں نے کہا مرزا صاحب کہاں وہ کلام کہاں یہ، کہنے لگے:۔

"بھائی اب یاروں نے بہت بلند پروازیاں شروع کر دی ہیں شعر کے معنی بھی مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں مذاق بگڑ چلا میرا مسلک عام روش سے جدا ہے، اب مجھے یہی رنگ پسند ہے"

اکثر متروکات کے سختی سے پابند تھے۔ ایک دن میں نے ایک غزل سنائی جسکا مطلع تھا:۔

کوئی مریضِ غم کا دم واپسیں نہیں ۔ اک جان ہے سو[1] وہ بھی کہیں ہے کہیں نہیں

کہنے لگے سو کیوں کہا، دیر تک اس لفظ پر گفتگو رہی مگر ایک نہ سنی،

مرزا ندرتِ تخئیل اور بلند پروازی سے خوش ہوتے تھے مگر جہاں مسلّم اصول اساتذہ کے خلاف یا زبان و محاورات میں کوئی تغیر دیکھتے تھے تو غصہ آجاتا تھا، اونکو شاعری میں موجودہ دور کی بے راہ روی سے سخت نفرت تھی۔ آجکل انگریزی کے تتبع میں بعض لوگ جو ترکیبیں تراشا کرتے ہیں اونکو بیحد ناپسند تھیں۔ زمانہ کے ساتھ جو تغیرات پابندی اصولِ فن کے ساتھ ہوتے ہیں اوسکا اعتراف کرتے تھے مگر ایجاد بندہ سے سخت متنفر تھے۔ اس مقام پر اونکی ایک تحریر کا مختصر حصہ نقل کرتا ہوں جو میرے دیوان پر لکھی تھی، اس سے مقصود خودستائی نہیں بلکہ اونکے خیالات کا اظہار ہے۔

"زمانہ جو رنگ بدل رہا ہے اور ہمیشہ بدلتا رہیگا اس سے شاعری مستثنیٰ نہیں رہ سکتی۔ جناب عزیز نے شاعری کی اوس حالت کو واضح کر دیا جو زمانے کا اقتضا تھا جس طرح صاف آئینہ پر ہر چیز کا عکس خوب دکھائی دیتا ہے اسی طرح طبع سلیم ترقی کو من وعن ظاہر کر دیتی ہے۔ آپ نے رنگ بدلنے کا خود قصد نہیں کیا اور خوب کیا جن لوگوں نے یہ وطیرہ اختیار کیا اور اپنے نزدیک جدت پسندی کو دُور تک کشاں کشاں لے گئے، اونھوں نے شاعری کو ایجاد بندہ بناکے ایسی شے پیدا کر دی جسکو نہ مشرقی کہہ سکتے ہیں نہ مغربی۔ الخ"

ہر زہ مشتاب و دو جادہ شناساں بردار ۔ ایکہ در راہ سخن چوں تو ہزار آمد ورفت

جادہ شناسوں کے راستے پر چلنا ہی اس عہد میں دشوار ہو گیا ہے۔ ان باتوں سے مرزا بہت

---

[1] مرزا صاحب کو خیال نہیں رہا مثنوی نو بہار میں اس لفظ کو خود بھی نظم کیا ہے۔

بیکسی تھی ادھر میں تھا کوئی پہلو میں نہ تھا ۔ میرا دل تھا میرے پہلو میں سو قابو میں نہ تھا

متاثر ہوتے تھے۔

مرزا صاحب کے کلام کے خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) کوثر سے دھوئی ہوئی زبان شستہ، صاف، سلیس

(۲) انداز میں بانکپن

(۳) فصحا کے محاورے

(۴) خیالات بلند فلسفیانہ مگر اوسی حد تک جہانتک غزل متحمل ہو سکے۔

(۵) عاشقانہ رنگ غالب مگر ہر تخئیل ابتذال سے پاک وصاف۔

زبان کے اس قدر دلدادہ تھے کہ جس شعر میں کوئی محاورہ کی خوبی ہوتی تھی اوسکو پڑھتے وقت خود بھی محظوظ ہوتے تھے۔ پڑھنے کا انداز بالکل سادہ تھا نہ لحن نہ ترنم جس طرح باتیں کرتے ہیں مگر اکثر زبان کے ٹکڑوں کو خاص طور پر ادا کرتے تھے۔

مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے تھے مگر جب کبھی اصرار ہوتا تھا تو ضرور جاتے تھے۔ غزلگوئی میں اپنا زیادہ وقت صرف نہیں کرتے تھے۔ مشاعرہ کے دو ایک گھنٹہ پیشتر غزل کہنا شروع کرتے تھے وقت تک کافی تعداد اشعار کی ہو جاتی تھی۔

ایک زمانے میں بالالتزام میرے مکان پر ماہوار مشاعرہ ہوا کرتا تھا مرزا اکثر اون صحبتوں میں شریک ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایک مشاعرہ میر تقی میر کی فاتحہ سد سالہ کے نام سے ہوا تھا جسمیں میر صاحب نے میر کی شاعری پر ایک پر مغز تقریر کی تھی اور ذیل کی غزل طرح میں پڑھی تھی جسکے اکثر شعر لکھنؤ میں زبان زد ہو گئے ہیں، اس طرح میں میر و غالب کی معرکہ آرا غزلیں ہیں۔

(۱)

حسن شاہد ہے مری رنگینیِ تحریر کا اک ادائے شوخ ہے جو رنگ ہے تصویر کا

فطرت انسان کی کمزوری دکھلاتے ہیں:۔

ضعف میں شکوہ عبث ہے گردش تقدیر کا بن پڑا دہ ہم سے کب جو کام تھا تدبیر کا

شعر کا انداز دیکھئے:۔

دیکھ میرا حال، اگر تو جھوٹ سمجھے عشق کو سن مری فریاد، اگر قائل نہ ہو تاثیر کا

شعر نہیں ایک عبرت کا دفتر ہے۔

یاد کر لینا کہ اکثر بستیاں ویراں ہوئیں اس خرابے میں خیال آئے اگر تعمیر کا

شعر کی گہرائی دیکھیے:۔

تھم گئے آنسو نمایش جب ہوئی مدِنظر رُک گیا نالہ جو اندیشہ کیا تاثیر کا

زبان اور انداز بیان دیکھیے، اس رنگ کے شعر مرزا کی خاص پسند کے تھے، مشاعروں میں اونھوں نے ایک خاص انداز سے اسکو پڑھا ہے۔

الحذر یہ کام دنیا میں تمہیں سے ہو سکا چاہنے والے پر اپنے کھینچنا شمشیر کا

عاشقانہ شعر ہے مگر وہی ندرت بیان اور خوبیِ زبان کا پہلو لئے ہوئے۔

طبعِ نازک پر گراں ہے کیوں سراسر چھوڑنا ہم نہ کہتے تھے نہ چھیڑو تذکرہ تقدیر کا

یہ شعر بیت الغزل ہے اسکا زور دیکھیے۔

وضع کے پابند ہم دیوانگی جدت پسند پھر گلایا جائے لوہا قیس کی زنجیر کا

عزمِ مشاعرہ ملحوظ رکھتے ہوئے مقطع کہا ہے:۔

اس غزلگوئی میں وہ تاثیر ہے مرزا کہ آج سو برس کے بعد عالم نوحہ خواں ہے میر کا

مرزا کی شاعری کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف اپنے جذبات وخیالات نظم کرتے تھے جو ایک فطری شاعر میں ہونا چاہیئے، غالب کی زمینوں میں اونھوں نے خوب خوب گل کھلائے ہیں، افسوس کہ وہ سب کلام دستیاب نہیں ہوسکا مگر جس قدر ملا ہے وہ ملاحظہ ہو۔

(۳)

جسے ہو حسن ظن تم سے کسی سے بدگماں کیوں ہو تمہارے عہد میں بدنام دورِ آسماں کیوں ہو

کسی پر جان جاتی ہو تو ضبطِ شوق مشکل ہے نہ ہو قابو اگر دل پر تو کہنے میں زباں کیوں ہو

اس شعر میں جو ٹکڑے ہیں یہ مرزا صاحب کی خاص پسند کے ہیں۔

جو دل مطلوب ہے اچھا یہ تمہید وفا کیسی ستم مقصود ہے بہتر، فریب امتحاں کیوں ہو

مری بےتابیوں کا حال غیروں سے نہ کہنا تھا تم ایسے ہو تو پھر کوئی کسی کا رازداں کیوں ہو

دل آزاری کو جس کی دلربائی ہم سمجھتے ہوں توقع اوس سے کیسی، پھر وہ ہم پر مہرباں کیوں ہو

یہ دونوں شعر دیکھیے:۔

حقیقت میں مخاطب ہو تمہیں شکر و شکایت کے تمہیں تم جسکے ہو وہ شکوہ سنج آسماں کیوں ہو

فرشتو! جب کسی سے ہو وقوع سعیِ لاحاصل مرے اعمال میں لکھ دو وہ محنت رائگاں کیوں ہو

کہیں گے حالِ دل مرزا کبھی رمز و کنایت میں ملالِ خاطرِ احباب اندازِ بیاں کیوں ہو

مرزا غالب کی مشہور غزل پر مرزا کی طبع آزمائی دیکھیے :-

(۲)

راحتیں طولِ مرض کی صرفِ درماں ہوگئیں ۔۔۔ زندگی جن مشکلوں سے تھی وہ آساں ہوگئیں

صورتیں امید کی خوابِ پریشاں ہوگئیں ۔۔۔ سامنے آنکھوں کے آئیں اور پنہاں ہوگئیں

اون سے کیا لطفِ تعلق اون سے کیا دلبستگی ۔۔۔ غیر کے ماتم میں جو زلفیں پریشاں ہوگئیں

ناخنِ وحشت نے سینے پر جو کیں گلکاریاں ۔۔۔ فصلِ گل میں زینتِ چاکِ گریباں ہوگئیں

سیکڑوں رخنے کیے پیدا درو دیوار میں ۔۔۔ شوق کی نظریں رقیبِ چشمِ درباں ہوگئیں

بے مروت سی جو قبریں کوہِ وحشت میں تھیں ۔۔۔ وہ بھی آخر صرفِ استحکامِ زنداں ہوگئیں

کھل گئے چینِ جبیں سے اونکی بدخوئی کے بھید ۔۔۔ جن اداؤں کو چھپاتے تھے نمایاں ہوگئیں

دل میں اب کیا رہ گیا ہے ناامیدی کے سوا ۔۔۔ آرزوئیں خون ہوکر نذرِ مژگاں ہوگئیں

مقطع ملاحظہ ہو :-

چند باتیں وہ جو ہم رندوں میں تھیں ضرب المثل ۔۔۔ اب سنا مرزا کہ وردِ اہلِ عرفاں ہوگئیں

(۳)

نگاہِ مہر ہے عالم کے اجزائے پریشاں پر ۔۔۔ ہر اک ذرے کا حق ثابت ہے خورشیدِ درخشاں پر

فنا کے بعد بھی چھوٹا نہیں قیدِ تعلق سے ۔۔۔ مری تصویر کھچوائی گئی دیوارِ زنداں پر

بہل ہی جائیگا دل شہر کی گلیوں میں اے ناصح ۔۔۔ نہیں آوارگی موقوف کچھ سیرِ بیاباں پر

کبھی تو اس طرف بھی کوئی بھولے سے نکل آئے ۔۔۔ کہاں تک بیکسی رویا کرے گورِ غریباں پر

دکھاتے جوشِ وحشت کے مزے تجھکو بھی اے ناصح ۔۔۔ مگر کیا کیجیے قابو نہیں تیرے گریباں پر

مجھے ذوقِ جنوں نے دیکے رخصت ذوقِ خواری کی ۔۔۔ کیے ہیں بارہا احسان اطفالِ دبستاں پر

سمجھتے کافرانِ عشق کی دشواریاں یہ بھی ۔۔۔ اگر طاعت بتوں کی فرض ہوتی اہلِ ایماں پر

کہیں اب کچھ ہم ایسے شعر مرزا جن میں جدت ہو ۔۔۔ کہاں تک حاشیے لکھا کریں غالب کے دیواں پر

غالب کی مشہور غزل "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا" اس پر مرزا کی لاجواب غزل ہے مگر پتہ نہیں میں نے خود اُن کے زبان سے سُنی تھی ایک شعر یاد رہ گیا۔

عشق اور عشق سے منظور کہ ہو چارۂ کار ۔۔۔ درد کا بھی کہیں ممکن ہے دوا ہو جانا

چھوٹی بحروں میں مرزا کی روانی طبیعت کا اندازہ کیجیے۔

ابر جب جھوم جھوم کر آئے دل جو اُمڈے ہوئے تھے بھر آئے
دل میں طوفاں اُٹھاتے تھے نالے لب تک آئے تو بے اثر آئے

ذیل کے شعر میں کوٹھے کا استعمال اور مصرع کی بلندی دیکھیئے۔

کہیئے کیا آسمان سے ٹھہری آپ کوٹھے سے کیوں اُتر آئے

یہ شعر بھی داد طلب ہے۔

جس کو برسوں ہنسی نہ آتی ہو اوس کو ناصح کی بات پر آئے

چند شعر ایک طرح میں اور سنیئے:۔

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی اُسی کافر کی ادا یاد آئی
تم جدائی میں بہت یاد آئے موت تم سے بھی سوا یاد آئی
لذتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی
چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

ردیف وہی قافیہ و بحر مختلف۔

روشِ وحش وطیر یاد آئی دشت وحشت کی سیر یاد آئی
زاہد و آج ہم کو پھر وہ شے جس سے ہے تم کو بیر یاد آئی
دیکھکر مشہدِ ادا ان کو لالہ و گل کی سیر یاد آئی

اب چند غزلیں سُن لیجئے اس لئے نقل کئے دیتا ہوں کہ اُردو کے یہ جواہر پارے محفوظ رہیں اب نہ مرزا ہونگے نہ یہ نغمے آپ سُنیں گے۔ ممکن ہے کہ اس دَور کے جدت پسند شعرا پسند نہ کریں کیونکہ ان اشعار میں وہی پُرانے محاورے ہیں اور پُرانی زبان، نہ ترکیبوں میں ندرت نہ الفاظ میں جدت نہ تخیل میں اتنی پرواز جس کی تلاش میں طائرِ عقل بھی گُم ہو جائے۔

لڑکے جاتے ہو تو اک تیغ لگاتے جاؤ ہاتھ اُٹھاتے ہو تو یوں ہاتھ اُٹھاتے جاؤ
حالِ دل سچ بھی کہوں میں تو مجھے جھٹلا دو بھید کھلتے ہوں تو کچھ بات بناتے جاؤ
وعدۂ شام کرو صبح کو جاتے ہو اگر کوئی بے وقت جو سوتے تو جگاتے جاؤ
کہیں بدنام نہ ہو جاؤ، پشیماں کیوں ہو ہاتھ ملتے ہو تو مہندی بھی لگاتے جاؤ
یوں چلو راہِ وفا میں کہ نہ پائے کوئی جو نشاں راہ میں ہیں اُنکو مٹاتے جاؤ
میر کا نام تو روشن ہے مگر اے مرزا اِک چراغ اور سرِ راہ جلاتے جاؤ

چارہ گر مشورۂ ترکِ وفا دیتے ہیں　زہر دیتے ہیں یہ ظالم کہ دوا دیتے ہیں
مجھکو یہ خوف کہ تم بھی کہیں اُنمیں سے نہو　چاہنے والوں کو جو لوگ دعا دیتے ہیں
کان تک اُسکے نہ پہونچے تو نہ پہونچے فریاد　سننے والوں کا کلیجا تو ہلا دیتے ہیں
الحذر شیخ بُرے ہوتے ہیں پینے والے　اچھے اچھوں کو یہ دھوکے سے پلا دیتے ہیں
تنگیِ عیش میں ممکن نہیں ترکِ لذت　سوکھے ٹکڑے بھی تو فاقوں میں مزا دیتے ہیں
یادِ ایامِ جوانی ہے بہت درد انگیز　وہی اچھے جو یہ افسانے بھلا دیتے ہیں
جب غزل کوئی نئی کہتے ہیں مرزا صاحب　کسی حیلے سے اونھیں جا کے سنا دیتے ہیں

بُرے یا بھلے ہوں لہو رونیوالے　یہی لوگ ہیں سرخرو ہونے والے
تہِ چرخ برپا ہوئے حشر کیا کیا　مزاروں میں سویا کیئے سونیوالے
زہے خوش نصیبی شہیدانِ غم کی　مزاروں سے ہنستے اُٹھے رونیوالے
شبِ وعدہ جاگیں گے ہم بھی سحر تک　ذرا سُن رکھو شام سے سونیوالے
کہانتک تو برسے گا اے ابر کھل جا　ابھی دیر تک روئیں گے رونے والے

تمھیں کیا کام میرے امتحاں سے　نپٹ لینے دو مجھکو آسماں سے
تمنا ہے کہ اے ذوقِ اسیری　قفس میں اُڑ کے پہنچوں آشیاں سے
نگاہیں میری نظروں کی طرف ہیں　کسی نے کہہ دیا کچھ پاسباں سے
کہیں گے اضطرابِ شوق کا حال　سُنیں گے آج کچھ اُن کی زباں سے
اِسی پر منحصر تھی زندگی کیا　گھٹا جاتا ہے دم ضبطِ فغاں سے
مرے دل میں ترا کیا کام اے شوق　نکل کمبخت اس اجڑے مکاں سے
کہاں مرزا کہاں اے آسماں تو　یہ کس بل اس ضعیف و ناتواں سے

بن جائے جو بگڑ کے وہ تقدیر چاہیئے　خانہ خرابیوں میں بھی تاثیر چاہیئے
میں مرگِ ناگہاں کا طلبگار ہجر میں　اور اقتضائے شوق کہ تاخیر چاہیئے
ممکن تو ہے کہ ضعف میں آنکھیں کھلی رہیں　پیشِ نگاہ آپ کی تصویر چاہیئے

خانہ خرابیوں کی تلافی ضرور ہے زنداں بقدرِ وسعتِ تعمیر چاہیئے

شکووں کا بھی انداز نہ ہو حسنِ طلب کا ہاں اے دلِ بیتاب رہے پاسِ ادب کا

عاقل کبھی اندیشۂ فردا نہیں کرتے موقوف ہے اُس وقت پہ جو کام ہے جب کا

گو اُن سے اشاروں ہی میں ہوتی رہیں باتیں محفل میں یہ مضمون ہے سمجھا ہوا سب کا

اربابِ تمنا وجد میں ہیں گرم ہے محفل ہے شمع کا ڈھلتا ہوا جوبن بھی غضب کا

کہتے تو ہیں احباب کہ ہم بھی کبھی خوش تھے کچھ یاد نہیں اب کہ یہ مذکور ہے کب کا

مرزا کبھی کچھ اپنی زباں سے نہ کہے گا ہر چند کہ حسرت زدہ ہے بوسۂ لب کا

جو حیاتِ چند روزہ کا ہم اعتبار کرتے ہمیں اور کام کیا تھا ترا انتظار کرتے

شبِ ہجر کی سیاہی نے چھپا دیے ستارے کچھ انھیں سے دن بہلتا جو انھیں شمار کرتے

وہ کلام حسبِ مرزا کو بجائے خود ہے نازش کسی نکتہ چیں کی باتوں پہ اُسے نثار کرتے

سُن اے شوقِ شہادت یہ نشانِ کوئے قاتل ہے در و دیوار پر نقش و نگارِ خونِ بسمل ہے

غلط ہے آدمی کو ہو اگر دعوائے ہشیاری قیودِ وضع سے دیوانہ پابندِ سلاسل ہے

خوشا تقدیر اون کی مر گئے جو راہ میں تیری خوشا حال اُن شہیدوں کا وفا خود جنکی قائل ہے

ضعیف العقل ہے انساں کہ ہے جویائے آزادی یہ حسرت ہی حقیقت میں دلیلِ ضعفِ کامل ہے

نہیں مطبوع اون کو اختلاطِ شمع و پروانہ یہ گستاخی سرِ محفل خلافِ دابِ محفل ہے

میری معجز بیانی مجھ سے عاجز ہو کے کہتی ہے بیاں ہونا تیری دشواریوں کا سخت مشکل ہے

نہ رکھ مرزا کو اے شوقِ زیارت دور مشہد سے اُسی در پر اُسے پہونچا دے یہ جس در کا سائل ہے

ہم اگر شیخ و برہمن سے اٹک جائیں گے کفر و ایماں کے دوراہے پہ بھٹک جائیں گے

ساقیا دور ہمارا ہے ہمیں کو دینا ابھی اتنی نہیں پی ہے کہ بہک جائیں گے

خلد و کوثر سے نکل چلنے دے اے راہنما آگے بڑھ کر کہیں ٹھہریں گے جو تھک جائیں گے

جوہروں کو مرے کھلنے دو سیہ بختی میں شبِ تاریک میں تارے سے چمک جائیں گے

گفتگو پر ہیں اظہارِ تمنا موقوف
مرے چپ بیٹھنے پر بھی وہ کھٹک جائیں گے

ہم جو دیں اگلے معمّا میں کو طراوت مرزا
پھر یہ کمہلائے ہوئے پھول مہک جائیں گے

فکرِ نام و ننگ میں کیا کوئی دیوانہ رہے
جب نہوں میں خلق میں کیوں میرا افسانہ رہے

وضعِ رندانہ ہو لیکن ٹھیک ہوں ترے اصول
ہے وہی فرزانہ جو ظاہر میں دیوانہ رہے

ہمکو اے مرزا نہیں دنیا و مافیہا سے کام
ہم جہاں کے پینے والے ہیں وہ میخانہ رہے

اب یہ صورت ہے کہ ہیں سر تا قدم تصویرِ غم
اِک وہ عالم تھا کہ تھے ہم منکرِ تاثیرِ غم

خاک میں سب حسرتیں تیری ملا دوں تو سہی
اے دلِ ناشاد میں دوں گا تجھے تعزیرِ غم

میرے رونے پر وہ ہنستے ہیں زہے رونا مرا
میری غمگینی سے وہ خوش ہیں خوشا تقدیرِ غم

بسکہ اندازِ بیاں دشوار و معنی خیز ہے
ساکت و صامت ہے وہ جس نے سُنی تقریرِ غم

اس طرح گذرے خوش و ناخوش یہ دو دن زیست کے
منہ پہ آثارِ تبسم دل میں زخمِ تیرِ غم

جنبشِ ابرو سے تمکو سہل انکارِ وفا
اوس سے پوچھو جس کے دل پر چل گئی شمشیرِ غم

ماتمِ اہلِ وفا میں صرفِ آرائش ہیں وہ
یہ توقع کس کو تھی مرزا یہ ہے توقیرِ غم

سامنے اس کے تڑپنے کی جو حسرت دل میں ہے
اِک رمق جاں تنو بہانے سے دلِ بسمل میں ہے

ہجر میں جینا اگر مشکل ہے اچھا یوں سہی
جان دیدیجئے یہ آسانی تو اس مشکل میں ہے

بے حجابی آپ کی بے امتیازی غیر کی
مجھ سے سنیئے جو تکلف آپ کی محفل میں ہے

دشت نجد و ساربان و ناقہ و بانگِ جرس
ہیں یہ سب سامان تو لیلیٰ پردۂ محمل میں ہے

اوس سے اب قطعِ نظر کرنے لگے اہلِ کمال
وہ جو نکتہ امتیازِ ناقص و کامل میں ہے

گوشۂ مرقد ہے مرزا تیرہ و تاریک و تنگ
یہ تو سب کچھ ہے مگر آرام اسی منزل میں ہے

جب ہم نہ تھے تو لوز کا تیرے ظہور تھا
پھر ہم سے یہ حجاب تجھے کیا ضرور تھا

آخر ہجومِ یاس میں کھویا گیا غریب
اب تک تو میرے پاس دلِ ناصبور تھا

برباد کر کے مجھکو نہ ہوں منفعل حضور
میں آپ معترف ہوں کہ میرا قصور تھا

ٹکرا کے سر کو ہم پسِ دیوار مر گئے　　　وہ کہتے ہیں دماغ میں اُس کے فتور تھا
نازک ہوا اس قدر کہ نہ اُٹھا کسی پہ ہاتھ　　　تلوار باندھنا تمہیں پھر کیا ضرور تھا
رکھ لی میرے خدا نے گناہوں کی میرے شرم　　　زاہد کو اپنے زہد پہ کتنا غرور تھا
دل دیکھیے ان بتوں سے اُمیدِ وصال واہ　　　مرزا یہ کیا سمجھ تھی یہ کیسا شعور تھا

اون کے اخلاص کی یہ حد ہے کہ خود ہم نہ رہے　　　روح و قالب میں ضدیں پڑ گئیں باہم نہ رہے
اضطرابِ دلِ شوریدہ سے کہتا ہے یہ ضبط　　　سلسلۂ شوق کا تجھ سے کہیں برہم نہ رہے
کاش بیکار ہوں اسبابِ ستم میرے بعد　　　تیغ و خنجر میں ترے آب نہ ہو دم نہ رہے
حشر برپا ہو اگر حضرتِ زاہد پی لیں　　　یہ سماں خاک میں مل جائے یہ عالم نہ رہے
وہ جواں ہو کے خدا جانے کریں گے کیا قہر　　　کم سنی میں فلکِ پیر سے جو کم نہ رہے
اُٹھے جاتے ہیں مری جان کو رو کر احباب　　　دو گھڑی آپ شریکِ صفِ ماتم نہ رہے
بسکہ آمادۂ عبرت ہے نگاہِ انساں　　　نورِ بینش ہو فنا چشم اگر نم نہ رہے

رکھتے ہیں حسنِ ظن یہ بتوں کی وفا سے ہم　　　جیسے کہ مانگتے ہیں دعائیں خدا سے ہم
لے ذوقِ بادہ توبہ کو اذنِ شکست دے　　　بے چین ہیں تغیرِ آب و ہوا سے ہم
وہ تو یہ جانتا ہے کہ ہم کب کے مر چکے　　　جیتے رہے فراق میں اوس کی بلا سے ہم
ہر چند قولِ ناصحِ مشفق غلط نہیں　　　کچھ ہو مگر ملیں گے اُسی بیوفا سے ہم

شروعِ موسمِ گل میں اسیرِ دام ہونا تھا　　　ہمارے شوقِ بیجد کا یہی انجام ہونا تھا
پیامِ موت کیوں آیا ابھی سے مرنے والوں کو　　　کوئی دن اور اون سے نامہ و پیغام ہونا تھا
جگہ دی تھی اسی سے سر پہ دستارِ فضیلت کو　　　اسے اک روز رہنِ بادۂ گلفام ہونا تھا

کیا کہوں تجھ سے محبت وہ بلا ہے ہمدم　　　ہم کو عبرت نہ ہوئی غیر کے مر جانے سے
دیکھ اسطرح بھی دل لیتے ہیں ملنے والے　　　شمع کا بس نہ چلا بزم میں پروانے سے
جیتے جی اُسکے نہ کہتے مگر اب کہتے ہیں　　　لذتِ غم نہ رہی غیر کے مر جانے سے

غیروں کو ہے ستم کے تقاضے کا حوصلہ — چھوڑینگے یہ نہ عشق کو رسوا کیئے بغیر
زاہد سے گفتگو ہو کہ ناصح سے بحث ہو — بنتی نہیں ہے ذکر کسی کا کیئے بغیر
ہر چند اسمیں آپ ہی بدنام کیوں نہ ہوں — باز آئیں گے نہ وہ برا چرچا کیئے بغیر
رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم — چھوڑوں گا اب نہ میں تمھیں رسوا کیئے بغیر

آج اِس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے — دیکھیئے دیکھیئے اِک آن میں کیا ہوتا ہے
نالہ رُکتا ہے تو سرگرم جفا ہوتا ہے — درد تھمتا ہے تو بیدرد خفا ہوتا ہے
عشق میں حسرتِ دل کا تو نکلنا کیسا — دم نکلنے ہی میں کمبخت مزا ہوتا ہے
تا لبِ گور پہونچ جاتے ہیں مرنیوالے — وہ بھی اُسوقت کہ جب شوق رسا ہوتا ہے
آہ میں کچھ بھی اثر ہو تو شرر بار کہوں — ورنہ شعلہ بھی حقیقت میں ہوا ہوتا ہے
کس قدر معتقدِ حسنِ مکافات ہوں میں — دل میں خوش ہوتا ہوں جب رنج سوا ہوتا ہے
شوقِ اظہار اگر ہے تو مرے دل کو نہ توڑ — اِسی آئینہ میں تو جلوہ نما ہوتا ہے

امراؤ جان کا تخلص ادا تھا۔ اس ناول میں اکثر غزلیں اُسکے نام سے کہی ہیں۔ ایک غزل ملاحظہ ہو۔

شبِ فرقت بسر نہیں ہوتی — نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی
شورِ فریاد تا فلک پہونچا — مگر اوسکو خبر نہیں ہوتی
جان دینا کسی پہ لازم تھا — زندگی یوں بسر نہیں ہوتی
اب کس امید پر نظر میری — شکوہ سنجِ اثر نہیں ہوتی
غلط انداز ہی سہی وہ نظر — کیوں مرے حال پر نہیں ہوتی
اے ادا ہم کبھی نہ مانیں گے — دل کو دل کی خبر نہیں ہوتی

اپنے صورت گر سے پوچھوں میں اگر مقدور ہو — کیا بنایا تھا مجھے تُو نے ستانے کے لئے
ہجر کی شب کے بنانے میں بھی تھی اِک مصلحت — طول آخر چاہیئے تھا کچھ زمانے کے لئے

اب سُنا ہے کہ جفا سے بھی پشیماں ہیں وہ — اور پھر آہ کی تاثیر سے کیا ہوتا ہے
گوشِ مشتاقِ سخن، دل متمنیِ وصال — تو ہی کہدے تری تصویر سے کیا ہوتا ہے

مرقع لیلیٰ و مجنوں میں ایک غزل مادہ پرستوں کی تردید میں کہی ہے:۔

کھول تو آنکھ ذرا دیکھ تماشا کیا ہے
وہم ہے یا کہ حقیقت ہے یہ دنیا کیا ہے

تو یہ کہتا ہے ہیولیٰ کے یہ سب دھوکے ہیں
پھر ہیولیٰ بھی تو دھوکا ہی یہ دھوکا کیا ہے

پھر کہا تو نے کہ دیکھا نہیں خالق کو کبھی
اِک ذرا غور تو کر جی میں یہ کہتا کیا ہے

تو نے دیکھا ہے ازجی و ہیولے کو کبھی
پھر جو قائل ہے تو اسکا تجھے سودا کیا ہے

بے بنائے تو کسی کے نہیں بنتا کچھ بھی
تجربہ ہمکو بتا دے کہ بتاتا کیا ہے

مان لے تو کہ نہیں کوئی بنانے والا
پھر قیاس اپنا ذرا دیکھ تو بنتا کیا ہے

اُسکا ہونا نہیں واجب تو نہیں کچھ ممکن
پھر اگر کچھ بھی نہیں ہے تو یہ جھگڑا کیا ہے

خواجہ وزیر کی مشہور غزل

"چلا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہوکر"

پر مرزا صاحب کا دو غزلہ سُن لیجئے اور اس باب کو ختم کیجئے، یہ دونوں غزلیں طولانی تھیں میں نے اشعار انتخاب کر لئے ہیں۔ طرح کا فیض تھا کہ مرزا صاحب اوسی رنگ کی طرف جھک گئے اون کے مذاق سے الگ جو شعر تھے وہ زیادہ تر خارج کر دیے ہیں۔

ادائے شرم پر نازاں ہو نظروں سے نہاں ہوکر
ستم کرتے ہو در پردہ شریکِ آسماں ہوکر

رگ و پے میں سمایا عشق ربطِ جسم و جاں ہوکر
رہی یہ آگ میرے تن میں مغزِ استخواں ہوکر

ہوئی ترکِ وفا لیکن یہ ہے پاسِ وفا ابتک
فلک کا شکوہ کرتا ہوں کسی سے بدگماں ہوکر

زلیخا کاش تیرا جذبۂ دل بے اثر ہوتا
نہ بکتے حضرتِ یوسف اسیرِ کارواں ہوکر

نہ پوچھو حسرتِ سختی کشانِ عشق و رسوائی
درِ بُت خانہ پر رہتے ہیں سنگِ آستاں ہوکر

محیطِ آسماں نے ہم کو آخر گھیر کر مارا
لگائے ہر طرف سے تیر ظالم نے کماں ہوکر

ادائے شرم کے سر خون ہوتا ہے ہزاروں کا
ستم کرتے ہیں تیر اُن کی نگاہوں کے کماں ہوکر

غزل اس رنگ میں اک اور بھی کہنی پڑی مرزا
نہیں رکتی طبیعت اہلِ معنی کی رواں ہوکر

مقامِ عشق پر فائز ہوئے ہم بے نشاں ہوکر
کسی پردہ نشیں کے گھر میں ہو بے الامکاں ہوکر

لگائے تیر دل پر تیرے ابروئے کماں ہوکر
کلیجے پر پڑیں نیچی نگاہیں برچھیاں ہوکر

خموشی کی ادائیں حسن صورت سے یہ کہتی ہیں
ہے تصویر کے پردے میں اِک شوخی نہاں ہوکر

گر وہ بے حجابانہ نکل آتا تو کیا ہوتا
کیا ہنگامہ برپا جس نے پردے میں نہاں ہوکر

ہم اوس منزل میں پہونچے لیکے اِک دل مثل آئینہ
کدورت رہ گئی پیچھے غبارِ کارواں ہوکر

غم جاوید یعنی دردِ فرقت میرا حصہ ہے
عدو نے بات ہی کھوئی شریک امتحاں ہوکر

حیا کی شوخیوں سے اُٹھتے اُٹھتے جھک گئی نظریں
میری قسمت سے اُن کے تیر بھی آئے کماں ہوکر

ترے ہر لفظ پر شوخی سے اُس نے نکتہ چینی کی
غزل کیسی کہی تھی تو نے مرزا نکتہ داں ہوکر

قصائد

مرزا صاحب نے اس صنفِ سخن میں بھی کمال دکھایا ہے خوب خوب قصیدے کہے ہیں

نے اون کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک مجموعۂ قصائد اون کے پاس دیکھا تھا، مدت کے بعد ایک دن پوچھا کہ وہ

مجموعہ کہاں ہے۔ مرزا نے کہا پتہ نہیں کوئی صاحب لیگئے ہونگے۔ لکھنؤ میں انجمن امامیہ کے نام سے ایک

جماعت عرصہ تک قائم رہی جسکے مقاصد میں یہ بھی تھا کہ آئمہ کی ولادت کی تاریخوں میں نواب اکرام اللہ خاں

مرحوم کے امام باڑہ میں قصیدہ خوانی کی صحبتیں منعقد ہوا کرتی تھیں جس میں بیشتر اساتذۂ سخن شریک ہوتے

تھے اوس کے پہلے دور میں مرزا صاحب نے بھی اکثر صحبتوں میں اراکین انجمن کے اصرار سے قصائد پڑھے

ہیں اور داد سخن لی ہے۔

مدت ہوئی کہ جام جم ایک رسالہ غالباً نواب مرزا مہج کی ادارت میں نکلتا تھا اُس کے اکثر نمبروں میں

مرزا صاحب کا کلام ہوتا تھا باوجود کوشش کے وہ رسائل دستیاب نہیں ہوئے تین چار ورق پھٹے ہوئے ایک

دوست سے مل گئے جسمیں مرزا صاحب کے دو قصیدوں کی تشبیبیں تھیں وہ یہاں نقل کرتا ہوں۔

در فخر خود و مرثیہ بعض احباب و موعظت

لکھ مری مدح و ثنا اے قلم زود رقم
کہ نہیں مجھ سا زمانے میں کوئی معجز دم

تا کہ ہوں طبع خدا داد کے پیدا جوہر
کیف و کم سے مرے آگاہ ہوں اہلِ عالم

کون ہوں میں مجھے کیا سمجھے ہیں یہ مردہ پرست
ملکِ انشا میں مسلم ہے مجھے سندِ جم

میں ہوں وہ نقطہ کہ ہے منشاء دورِ پرکار
میں ہوں وہ خط کہ جو ہی محور آرامش ورم

درو دیوار شکستہ کے مٹے نقش و نگار
مجھ سے پیدا ہوئے آثار رضا و دید عجم

کون ہوں میں وہ گل سر سبد گلشن دہر
جس سے تشکیل قوت ہوئی خود قوت شم

فائدہ ہرزہ سرائی سے نہیں اے مرزا
یاد احباب سے محفل میں بپا ہے ماتم

خونچکاں صفحۂ قرطاس ہوا سرتاسر
بسکہ شدت سی لہو روئی ہے چشم پرنم

دل پہ اک داغ محبت ہے نشانِ روشن
بھول جاؤں تمہیں کس طرح سے اے اہل کرم

اے فلک تجکو میری ہمتِ عالی کی قسم
تجھ سے رتبے میں سوا ہیں کہ نہیں اہلِ ہمم

کس نظر سے تو ہوا دشمنِ اربابِ کمال
کیا تری شان بڑھیگی جو یہ ہو جائینگے کم

اس سے کیا نفع کہ ہنستوں کو رلاتا ہے تو
اس سے کیا نفع کہ ہر گھر میں بپا ہے ماتم

ہائے کیا لوگ تھے جن سے ہوئی دنیا خالی
جنکے ماتم میں سیہ خانہ ہے سارا عالم

اسکا کیا غم کہ چلے جاتے ہیں جانیوالے
ہاں یہ حسرت ہے کہ افسوس سے جاتے ہیں ہم

قبل احباب کے اے کاش ہمیں موت آتی
کون روئیگا ہمیں جب نہ رہیں گے ہمدم

قدرداں جب نہ رہے ہیچ ہے اپنا جینا
کیا سمجھتا ہے ہمیں کوئی کہ کیا چیز ہیں ہم

بے حقیقت ہے یہ نیرنگِ جہانِ فانی
اعتباری ہیں یہ مفہوم وجود اور عدم

بند کر آنکھ اگر ذوقِ تماشا ہے تجھے
غور سے دیکھ کہ اک دم میں نہ شادی ہے نہ غم

دیکھ تو اب نہ ستارے ہیں نہ اُن کی وہ جھلک
دیکھ تو اب نہ فلک ہے نہ فلک کا وہ خم

نیّرین اب کہیں طالع ہیں نہ وہ انکا نور
ظلمتِ بخت ہے اصغر ہے نہ اب وہ اعظم

نہ عناصر نہ موالیدِ ثلاثہ کا ظہور
جنس عالی ہے نہ سافل ہے نہ وہ کیف و کم

نہ زمیں ہے نہ بیابان نہ وہ دشت و جبل
نہ مکیں ہیں نہ مکاں ہیں نہ حشم ہیں نہ خدم

نہ وہ سبزے کی طراوت نہ وہ موجِ صرصر
نہ گلوں کی وہ نزاکت نہ وہ لطفِ شبنم

نہ وہ نرگس کہ جسے کہتے تھے چشمِ محبوب
نہ وہ سنبل کہ جسے کہتے تھے زلفِ پُرخم

نہ وہ بادل کا گرجنا نہ وہ بجلی کی چمک
نہ وہ پانی کا برسنا نہ ہوا ہے پُرنم

نہ وہ دریا کا تلاطم نہ حبابوں کی نمود
عالمِ آب ہے نایاب نہ قطرہ ہے نہ یم

نہ وہ بلبل کے ترانے نہ وہ صوتِ قمری
نہ وہ موسیقیِ گلشن ہے نہ وہ زیر نہ بم

سبز شاخوں کی نہ وہ باغ میں موزوں حرکت
آس وہ موج ہوا کی ہے نہ وہ تال نہ سم

از زمیں تا بفلک ہو گئی ہر شے پابند
از ثریٰ تا بہ ثریّا ہوئی ہر چیز عدم

ماسوا اللہ ہر اک چیز ہے فانی غافل
ایک باقی ہے فقط ذاتِ خدائے عالم

ذات واجب کے سوا جس سے ہے منسوب وجود
نسبتِ خاص سے ہے عام یہ اطلاقِ اعم

یہ بھی اک صفتِ اضافی ہے کہ ہم ہیں موجود
مرتفع ہو یہ اضافت تو پھر تم ہو نہ ہم

جوہر اپنا کہ ہے معروضِ تنافی الجہتین
ہے وہ اک ہستیِ موہوم میانِ دو عدم

زہر ہے زہر سمجھتے ہیں جسے ہم تریاق
لذتِ عیش کہ وہ ہے متغیر بہ الم

اپنی دولت پہ عبث غرہ ہے تجھکو منعم
تو سمجھتا ہی نہیں جوہرِ اربابِ ہمم

متاثر نہ ہو لذاتِ جہاں سے ہرگز
فی الحقیقت ہی یہ لذت اثرِ نقشِ درم

جو کہ ہے خارج قسمت نہ ملے گا ہرگز
سود در سود اَمل ہے عملِ جذرِ اصم

دیکھ عامل نہ خطائیں کا ہو تو زنہار
منع ہیں بُخل و ریا دونوں بنصِ محکم

نفع منظور ہو تو بانٹ دے تو راس المال
جو کہ تقسیم سے حاصل ہو وہ ہے اصل رقم

جمع و تفریق میں اموال کی کیا ہی مصروف
صفر ہے صفر بیک ضربِ قضائے مبرم

طرح کر مس کو مساکین پہ اے اہلِ ہوس
دیکھنا ہو جو تجھے جلوۂ اکسیرِ کرم

دیکھ مالوف نہ ہو موسقیٔ عیش سے تو
ہی یہ وہ راگ کہ جس راگ میں ہی تال نہ سم

چند روزہ ہی حیات اسمیں نہ کر فکرِ کمال
پانچ دمیں تو کبھی صاف نہو گی سرگم

تجھ سے ممکن ہو تو ہو موجبِ تالیفِ قلوب
سانس اُکھڑ جائیگی دم بھر میں غنیمت ہی یہ دم

تان کیا لیتا ہی ناداں یہ ہے اصلِ اصول
فرصتِ عمر کے آگے ہے بہت بعد نغم

تجھ میں جوہر نہیں تو ہیچ ہے عالی نسبی
تجکو کیا نفع اگر شاہ ہوں تیرے اَب و اُم

نوعِ انساں میں ہے ہر فرد پیمبر زادہ
سب کی ماں حضرتِ حوا ہیں پدر ہیں آدم

جاہ و ثروت سے جو حاصل ہو تو یہ حاصل ہو
تیرے تابوت کے ہمراہ چلیں طبل و علم

وضعِ دنیا سے اسے بھی تو سمجھ مستبعد
کوئی عہد اس زنِ قحبہ کا نہیں مستحکم

جاہ و ثروت کو زمانے میں نہیں استقلال
چادرِ گور بھی آخر نہ ہوئی مسندِ جم

دور کر کعبۂ دل سے ہوسِ مال و منال
اختراعات سے ہیں وہم کے تیرے یہ صنم

کس لئے تجکو بنایا تھا کیا کیا تو نے
دیکھ تو نفس پہ کیا کیا نہ کئے تو نے ستم

درسِ توحید سے پیدا ہو اگر ذوق صحیح
چاشنی موت کی ہو تیرے لیئے طعم نعم

غور کر غور کہ دنیا ہے طلسمِ باطل
قصرِ ہستی کی بنا سخت ہے نامستحکم

برزخ و حشر کا ساماں مہیا کر تو
فکر کر فکر کہ ہیں پیش مہماتِ اہم

عشق پیدا ہوا گر دلمیں تو حاصل ہو کمال
عشق وہ عشق کہ جس عشق میں لذت ہی الم

موت اس راہ میں سرمایۂ خوابِ آرام
خواب وہ خواب کہ جس خواب کی تعبیر ارم

شکایت زمانہ و حالِ خود

کوئی فلک سے یہ پوچھے کہ او ستم ایجاد — ہم ایسے خاک نشینوں کو کیوں کیا برباد
ہمیں بنا کے بگاڑا تو کیا ملا تجھ کو — مگر اسی پہ ہے موقوف طرح کون و فساد؟
بُرے ہیں ہم مگر ایسے بُرے بھی کم ہوں گے — کسی زمانے کے اچھے ہمیں کریں گے یاد
وہ ہم خرابِ خرابات ہی سہی لیکن — ہمارے دم سے ہے آباد یہ خراب آباد
جو دیکھنا ہو تو اہلِ جہاں ہمیں دیکھو — کہ ہیں زمین کے پردے پہ ہم سے آدم زاد
ہماری حالتِ افسردگی ہے قابلِ دید — مثالِ غنچۂ تصویر ہے دلِ ناشاد
بگاڑ پر بھی کروروں بناؤ پیدا ہیں — مٹے ہوئے ہیں مگر پھر بھی ہم ہیں نقشِ مراد
جو ہمکو جانو تو جانو مشیئتِ تقدیر — جو ہم کو سمجھو تو سمجھو حقیقتِ ایجاد
نہ ہوگا ہم سا بھی دنیا میں کوئی بے پروا — کہ باوجودِ علائق ہیں بندۂ آزاد
دل آئینہ ہے بظاہر ہیں گو غبار آلود — کہیں جہاں میں نہ دیکھو گے ہم سے پاک نہاد
جنوں کا جوش ہے کہتا ہوں کیا خدا جانے — کوئی یہ فخر کا موقع ہے اے دلِ ناشاد
پیامِ مرگ سناتی ہے دل کی مایوسی — نویدِ امن ہے اے آرزو مبارک باد
اسیرِ غم ہوں رہائی محال ہے میری — اجل بھی آئے تو پوری نہ ہو مری میعاد
ہجومِ یاس میں شیون سے جی بہلتا تھا — مگر وہ دل نہ رہا اب نہ طاقتِ فریاد
کبھی کبھی یہ اسیری میں یاد آتا ہے — کسی زمانے میں رکھتے تھے اِک دلِ آزاد
جنوں میں اپنی خودی سے بھی ہم ہوئے باہر — وہاں ہیں اب کہ جہاں آدمی نہ آدم زاد
سوائے یاس کوئی میرے آس پاس نہیں — سناؤں کس کو کہ سنتا نہیں کوئی فریاد
وہ آہ سینۂ سوزاں میں ہے اگر نکلے — ابھی خراب ہو بنیادِ چرخِ کج بنیاد
دلِ نشاط پریشاں کریں مرے نالے — دماغِ عیش معطّل کرے مری فریاد
میں کیا کروں مری کوشش میں کچھ اثر ہی نہیں — بگڑ کے مجھ سے مقدر ہے مائلِ بیداد
فلک ہے میری امیدوں کے قتل پر مامور — کہ جیسے شرع میں ہو کافروں پہ حکمِ جہاد
اسیرِ یاس کے ہاتھوں میں یوں ہے حسرتِ دل — اجل گرفتہ کو لے جائے جس طرح جلّاد
ہر ایک دور سے مقصود ہے مری گردش — مرے مٹانے کو پھرتا ہے چرخِ کج بنیاد
جو کچھ بھی ملنے کی امید بخت سے ہوتی — تو مانگتا نفسِ چند مہلتِ فریاد

جہاں ایک طرف اہل جہاں بھی دشمن ہیں — بلا نصیب ہوں لیکن ہیں سیکڑوں حساد

اثر یہ کرتی ہے نیکی مری بدی ہو کر — کہ جس کا دوست بنوں میں اسے ہو مجھ سے عناد

جہاں عدو ہے مرا دوستی کے پردے میں — وہ کیا کرے کہ طبیعت میں مرتکز ہے فساد

جنوں سہی مگر اتنا تو ہوش ہے مجھکو — لگا رہا ہے رگ جاں پہ نیشتر فصاد

گھرا ہوا ہوں بلاؤں میں چار سمت سے میں — مگر یہ کہتی ہے ہمت کہ ہر چہ بادا باد

اگر ہے ہمت عالی تو قصد محکم رکھ — کہ جیسے کوہ پہ قائم ہو قلعۂ فولاد

جہاں قضا و طبیعی ہو میل کیا ہوگا — ملے مگر نہ ملے خاک و آب و آتش و باد

ہو اعتدال مزاج بشر میں کیا ممکن — کہ اصل مبدء فطرت سے جمع ہیں اضداد

وہی ہیں ہم کہ بنائے گئے ہیں مٹنے کو — وہی ہیں ہم کہ ودیعت ہے ہم میں طرح فساد

وجود اور عدم، دونوں ساتھ ہیں اپنے — یہ چند روزہ ہے اور وہ ہے تا بہ یوم تناد

بگاڑ کر ہمیں اک دن بنائیں گے پھر بھی — یقین جان کہ مہمل نہیں ہے لفظ معاد

سمجھ لے تو کہ یہ اک دن ضرور ہونا ہے — یقین جان کہ باطل ہے مذہب سمراد

اٹھیں گے خواب گران عدم سے محشر میں — وہ دن ہے اپنے لئے یا کہ ہے شب میلاد

اٹھے گی حسرت مردہ بھی اپنے ساتھ ہی ساتھ — کہ جس طرح سے کسی شخص کا کوئی ہمزاد

اس آسمان کے اس دن اڑائیں گے پرزے — دل ستم زدہ آخر ملے گی تیری داد

وہی ہم اور وہی وضع جوشش گریہ — وہی ہم اور وہی طرح شورش فریاد

اٹھیں گے خاک سے ہم اس کی جستجو کرتے — یہ مشت خاک ہوئی جس کی راہ میں برباد

عمر اور جسم

علمائے حیوانات و نباتات کی تحقیق ہے کہ جانور اور نباتات کا جتنا بڑا جسم ہوگا اس کی اتنی ہی عمر زیادہ ہوگی۔ مثلاً ہاتھی کی عمر تمام جانوروں سے زیادہ ہے اور اپنی جسامت کے لحاظ سے بھی وہ سب سے بڑا ہے مچھلیوں میں بھی اس کا تجربہ کیا گیا ہے اور بڑی مچھلیوں کی عمر زیادہ پائی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نوع انسان کی حیات بھی اسی اصول کے ماتحت پائی جاتی ہے۔

نستعلیق ٹائپ

(از مسٹر سلیم جعفر)

گزشتہ صدی میں بارہا کوششیں کی گئیں کہ نسخ کے ٹائپ کی طرح نستعلیق کا ٹائپ بھی ڈھال لیا جائے۔ ان کوششوں کی غرض وغایت کبھی اشاعت مذہب کا سامان بہم پہنچانا تھا تو کبھی تجارتی مفاد۔ لیکن ان سے کبھی ایسا نتیجہ مرتب نہ ہوا جسے سعیِ مشکور سے تعبیر کیا جا سکے۔ اس صدی کے جتنے ٹائپ ہیں وہ اپنے طرز کے لحاظ سے نستعلیق کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ درحقیقت نستعلیق کے اوصاف ان میں نام کو نہیں پائے جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ملک میں رائج نہ ہو سکے اور لیٹر پریس کی سہولتیں لیتھو کی خوبیوں نیز دقتوں پر غالب نہ آسکیں۔ میدان ہمیشہ لیتھو ہی کے ہاتھ رہا۔

موجودہ صدی کی کشاکش نے مسئلہ اشاعت اردو کو اہمیت بخش دی حکمائے ملت نے لیتھو کی دقتوں کو سنگِ راہ ترقی تصور کیا۔ اور مفکرین اس کے حل کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کے نزدیک اس کا ایک ہی حل قرار پایا اور وہ یہ کہ لیتھو ترک کر کے طباعت کا کام ٹائپ سے لیا جائے۔ اب یہ سوال خود بخود پیدا ہو گیا کہ نسخ کا ٹائپ کام میں لانا چاہیئے یا نستعلیق کا۔ خطِ نسخ گوناگوں خوبیوں سے معمور ہے لیکن اس کے خلاف دو باتیں ہیں۔ ایک تو عرصہ سے ملک نستعلیق سے مانوس ہے اور اس کے نزدیک عربی رسم الخط عربی ہی کے لئے موزوں ومناسب ہے۔ اردو اور فارسی کی میراث میں نستعلیق آیا ہے، یہ دونوں زبانیں اگر نسخ میں چھاپی جائیں تو اس کے نزدیک ایک حسینہ کو ایسے زیور ولباس میں آراستہ کرنا ہے جو اس کا حسن خاک میں ملا دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسے نسخ پڑھنے کی عادت نہیں اس لئے اس کی طرف مائل نہ ہوگا اس صورت میں کوششوں کا مرکزِ ثقل نستعلیق رہ گیا اور اب جولانیِ طبع کا یہی میدان ہے۔

پچھلے تین قرنوں میں تین کوششیں بہت زور وشور سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئیں جن کی تقسیم حسبِ ذیل ہے:۔

(۱) حیدرآبادی (جو مسٹر رفیق بیگ، مولوی سید عبدالکریم حسینی اور عثمانیہ ٹائپ فاؤنڈری کی مسلسل

و منفقہ کوششوں کا نتیجہ ہیں)

(۲) قریشی (جس کے موجد مسٹر ایس۔ ایچ۔ قریشی ہیں)

(۳) صدیقی (جس کے مخترع ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی ہیں)

ان کے نمونے حسب ذیل ہیں:۔

(۱) حیدر آبادی:۔

(ا) مسٹر رفیق بیگ کا ٹائپ،

یہ محض احکام قضا شیم خداوندی کی قوت ارادی کی اثرات تھے

(ب) سید عبدالکریم صاحب کا ٹائپ:۔

یہ محض احکام قضا شیم خداوندی کی قوت ارادی کے اثرات تھے

(ج) عثمانیہ ٹائپ فاؤنڈری کا ٹائپ:۔

یہ محض احکام قضا سیم خداوندی کی قوت ارادی کے اثرات تھے

(۲) قریشی۔

پنیمٹ　　کینتی　　سبکتگین

(۳) صدیقی

(ا)　پبلک　ٹھیک　ملک　ابتک

پبلک　ٹھیک　ملک　ابتک

(ب) کھینچکر　چنچولی　مجمع　مجھے　پنجشنبہ

کھینچکر　چنچولی　مجمع　مجھے　پنجشنبہ

پہنچی　حجج

پہنچی　حجج

نسخ کے ٹائپ کے عدم ترویج کا باعث عادت جمہور ہے اور نستعلیق کے جو ٹائپ ایجاد ہوئے وہ خوبصورت نہ تھے

اس لئے رائج نہ ہوسکے۔ لیکن محض بدصورتی ہی مانع رواج نہ ہوئی تجارتی پہلو بھی ان کی ترویج کا معاون نہ تھا۔ لیتھو کا چھپا ہوا مالی نقطۂ نظر سے بھی قابل لحاظ ہے۔ جگہ کم گھیرتا ہے اسلئے کاغذ اور چھپائی پر لاگت کم آتی ہے اسپر خوبصورتی مستزاد۔ پھر ٹائپ کیونکر لیتھو کے مقابلہ میں ٹھہر سکتا تھا۔

ہمارے نزدیک مذکورہ تینوں ٹائپوں کی نسبت کامیاب یا کامل ہونے کا فتویٰ دینے سے پہلے یہ دیکھ لینا نہایت ضروری ہے کہ وہ (۱) خوبصورت ہیں یا نہیں (۲) خوبصورت ہیں تو لیتھو کی اور ان کی طباعت میں بہ لحاظ مصارف کیا تناسب ہے۔

مذکورہ بالا تینوں ٹائپوں پر تین پہلوؤں سے نظر ڈالئے پہلے یہ دیکھئے کہ اجزائے الفاظ بحیثیت انفرادی اچھے معلوم ہوتے ہیں یا نہیں۔ اس نقطۂ نظر سے خاصے ہیں لیکن تینوں میں کوئی اہم فرق نہیں۔ مسٹر قریشی کا ٹائپ نسبتاً اچھا ہے۔ مفردات کی خوبصورتی خطاط اور سانچہ بنانے والے کی مرہون منت ہے جیسے یہ دونوں ہوں گے خط بھی ویسا ہی ہوگا۔ مفردات دونوں کے کمالوں کا آئینہ ہیں۔ ممکن ہے کہ سانچہ بنانے والے کا عیب خطاط کا کمال خاک میں ملادے لیکن وہ اپنے فن میں کامل ہے تو خطاط کا عیب بہت ہی نمایاں ہو جائیگا۔ اس لئے مفردات کی خوبصورتی کا تعلق موجد سے نہیں بلکہ خطاط اور سانچہ بنانیوالے سے ہے۔

مفردات جب لفظوں میں ترکیب پاکر ایک تصویر آنکھوں کے سامنے لاتے ہیں تو وہ دل میں سما جاتی ہے یا نہیں؟ یہ دوسرا پہلو ہے جس سے اِن ٹائپوں پر نظر ڈالنی چاہئیے۔ الفاظ بحیثیت انفرادی بھی وحشت انگیز نہیں، اور ان کی خوبصورتی میں وہی مدارج تفاوت ہیں جو مفردات میں پائے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تینوں میں سے کوئی ناکامیاب ہے۔ اب سے خوبصورتی یا بدصورتی کا بار دوش مخترع یا موجد پر ہے۔

لیکن عام طور سے یہ دونوں باتیں معیار خوبصورتی نہیں مانی جاتیں۔ الفاظ اور مفردات کی خوبصورتی کا بہت کم لحاظ کیا جاتا ہے، اگر یہی ہوتا تو ادنیٰ درجہ کے کاپی نویسوں کو اپنا پیٹ پالنا دشوار ہو جاتا۔ اور اعلیٰ درجہ کے کاتب اس قدر اجرت لیتے کہ ہمارے بہت سے اخبار و رسالے نکل ہی نہ سکتے یا نکلتے تو ان کا چندہ اتنا ہوتا کہ چند صاحب ذوق ہی ان کے خریدار ہوتے۔ ہاتھ کا لکھا اچھا ہو یا برا اس میں لفظوں کے پاس پاس ہونے سے ایک حُسن ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور اُسے دیکھکر دل نہیں گھبراتا۔ حیدرآبادی کے لفظوں میں اتنا فصل ہے کہ ان کی ساری خوبصورتی پر پانی پھر گیا، اور صفحہ پر نظر پڑتے ہی معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ بلکہ اکثر اجزائے الفاظ بھی سطح کاغذ پر بکھرے پڑے ہیں۔ اس کمی کو اجزائے الفاظ اور الفاظ دونوں کی خوبصورتی پورا نہیں کرسکتی بعض موقع پر تو ایسا لمبے ڈھنگا فصل واقع ہوتا ہے کہ پناہ بخدا۔ لفظ ایک ہی ہے لیکن دو لفظ معلوم ہوتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

دو رو دہان تنگ تو ، عارض عنبریں خطت

قریشی صاحب کے ٹائپ کا جو نمونہ پیش نظر ہے اس کی ایک سطر بھی وہ پیٹنٹ کرلینے سے پہلے پبلک کے سامنے لانا خلاف مصلحت تصور فرماتے ہیں اور اسکی نسبت رائے دینا قبل از وقت ہے۔ اپنے نزدیک وہ اپنی ایجاد کو بہمہ وجوہ مکمل سمجھتے ہیں اور کسی کو حق نہیں کہ اس دعوے کی تردید کرے۔ کبھی نہ کبھی وہ پبلک سے ضرور روشناس ہوگا۔ اس وقت رائج ہوگیا تو کامل اور پبلک نے اسے قبول نہ کیا تو ناقص ہے اور یہی فیصلہ ناطق اور اٹل ہوگا۔

صدیقی صاحب کا ایجاد مولوی عبداللہ صاحب رضوی ہیڈ مولوی نارمل اسکول آگرہ کے "مطابع کے لئے حروف جدیدہ" سے برائے نام بہتر ہے۔ رضوی صاحب کا پمفلٹ اس وقت سامنے نہیں ہے جہاں تک حافظہ کام کرتا ہے ان کے حروف اس قسم کے تھے اور ان پر اعراب بھی تھے۔ ا۔ ب۔ ج۔ د بوقت ترکیب یہ حرف صورت نہیں بدلتے۔ مثلاً لفظ "بند" ان کے ایجاد یا اختراع کے مطابق اس طرح چھاپا جائیگا۔ ب ن د۔ جو کچھ "قریشی" کے لئے کہا گیا ہے۔ ذرا سے ردوبدل کے ساتھ "صدیقی" پر بھی صادق آتا ہے۔

الفاظ اور اجزائے الفاظ کے درمیان فاصلہ نے صرف حسن خطاطی کو برباد و تباہ نہیں کردیا بلکہ ٹائپ کی ترویج عام میں بھی بہت مانع ہوا۔ ناشر کتاب کی نظر اس امر پر فطرتاً رہتی ہے کہ خوبی نفس مضمون کے ساتھ ساتھ اس کی قیمت بھی ایسی ہونی چاہیئے کہ معمولی درجے کا آدمی بھی اسے خرید لے۔ وہ اس کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ قیمت کی زیادتی شوق کا گلا گھونٹ دے اور اشاعت ایک خاص طبقہ اور حیثیت والے تک محدود رہے۔

ٹائپ گردش قلم کا ہم عناں نہیں ہوسکتا۔ قلم اجزائے الفاظ حتیٰ کہ الفاظ کے درمیان بھی بے وجہ فاصلہ نہیں چھوڑتا اور ضرورت ہو یا کاتب کے شعور حسن کا تقاضا تو وہ حرف پر حرف اور لفظ پر لفظ رکھدیتا ہے ٹائپ کو یہ بات کہاں نصیب۔ اس لئے ٹائپ سے چھاپی ہوئی کتاب زیادہ کاغذ چاہتی ہے، پریس مین کو زیادہ چھپائی کرنی پڑتی ہے اور اس سے کتاب کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ مگر یہی دو باتیں قیمت کو نہیں بڑھاتیں۔ لیٹر پریس کا مالک ڈسٹری بیوٹر (وہ شخص جو کسی چیز کے چھپ جانے کے بعد ٹائپوں کو اپنے اپنے خانوں میں رکھتا ہے) کی اجرت کو بھی نظرانداز نہیں کرسکتا۔ جہاں تک میرا علم ہے ٹائپ کا ایک صفحہ ہاتھ سے لکھا جائے تو ایک صفحہ سے کم جگہ لیتا ہے۔ اس لئے کاتب کی اجرت اس سے یقیناً کم ہوگی جو کمپوزیٹر اور ڈسٹری بیوٹر کو دینی پڑتی ہے۔ اسی حساب سے کاغذ اور چھپائی کے دام بھی کم ہونگے۔ قریشی صاحب

کا دعوی ہے کہ اُن کا ٹائپ ہاتھ کی لکھائی سے کم جگہ گھیرتا ہے۔ ممکن ہے کہ صحیح ہو مگر جب تک وہ دو چار سطریں بھی دکھانے سے دریغ فرماتے رہیں گے اس کی صحت میں شک وشبہ کی گنجایش باقی رہیگی۔

ٹائپ میں اجزائے الفاظ یا الفاظ میں فاصلہ کا ہونا ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹائپ میں اجزائے لفظ کے بعض حصوں کے لئے اِدھر اُدھر کچھ جگہ چھوڑنی پڑتی ہے۔ اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے الفاظ "عارض عنبریں" پر غور کیجئے۔ عارض تین سیسے کے ٹکڑوں پر ڈھلا ہوا ہے، جو بالترتیب عا۔ ر۔ ض۔ ہیں۔ عنبریں کے پانچ ٹکڑے یہ ہیں۔ ع۔ ند۔ بر۔ یہ۔ ں۔ ان میں پہلے تین کے ملنے سے جو شکل بنتی ہے (عنبر) وہ کم سے کم جگہ لیتی ہے۔ اس کا اندازہ اس طرح کیجئے کہ ایک عمودی خط ع۔ اور دوسرا ر۔ کے آخری سرے سے ملا ہوا کھینچئے۔ لیکن اس جزو لفظ اور دوسرے (یں) کے درمیان کے فاصلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ر کے بائیں جانب حاشیہ چھوڑا گیا ہے اور شاید ری کے تفعلوں کے لیئے بھی ایک ٹائپ ہے۔ اس فصل کا ہونا اس کی خوبصورتی کو ستیاناس کر رہا ہے اور بظاہر اس سے ایک حد تک مفر بھی نہیں۔ ہاں اگر ریں ایک ہی ٹکڑے پر ڈھالا جاتا تو ممکن تھا کہ فصل کچھ کم ہو جاتا۔

ٹائپ میں جو حاشیہ حرفوں کے اردگرد ضرورتاً چھوڑنا پڑتا ہے وہ تو پڑتا ہی ہے لیکن چند حرفوں کی ساخت بھی ایسی ہے جو مد فصل ہوتی ہے۔ ان میں سے سب سے زیادہ نمایاں ک اور گ ہیں حیدرآبادی کے کسی چھپے ہوئے صفحہ پر نظر ڈالیئے تو معلوم ہوگا کہ دو سطروں کے درمیان کہیں نہ کہیں اونٹ کی طرح گردن اُٹھائے کھڑے ہیں۔ اگر ان کی وضع میں قطع وبرید کر دی جائے تو ممکن ہے کہ صفحے میں زیادہ سطریں آسکیں۔ صدیقی صاحب کو اس کا خیال آیا اور ممدوح نے اُن کی گردنوں کو مروڑ کر منہ گدی کی طرف کر دیا اور مرکز کو بجائے مرتفع رہنے دینے کے مستوی کر دیا۔ یہ اصول عام کے خلاف ہے لیکن ایجاد بُرا نہیں۔ مسٹر رفیق بیگ کو بھی یہ بات کھٹکی تھی اور موصوف نے صرف مرکز کی دم کتر دینے پر قناعت کی۔ اگر قدامت پرستی سے دامن نہیں چھوڑایا جا سکتا تو یہ بہتر ہوگا کہ عربی کی تقلید کی جائے اور یہ حرف اس طرح لکھے جائیں۔ ك۔ ڭ۔ قریشی صاحب کے ٹائپ میں اس وقت کو محسوس نہیں کیا گیا اس لئے جو کچھ حیدرآبادی کے بارہ میں کہا گیا ہے، وہی اس پر صادق آتا ہے۔

حرفوں کا جوڑنا بھی قیمت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جس ٹائپ میں حرفوں کی تعداد کم ہوگی وہی جوڑنے میں کم محنت اور وقت لے گا۔ حیدرآبادی چھ سو ٹکڑوں پر مشتمل ہے لیکن بقول مسٹر قریشی یہ تعداد ان کے حرفوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ یہ بات ہے تو قریشی صاحب کے ٹائپ میں دو اسباب

فوقیت مجتمع ہیں، اور اسے حیدر آبادی کے مقابلہ میں ترویج کا زیادہ موقع ہے۔ صدیقی صاحب کا ٹائپ کل ۲۲۳ ٹکڑوں کا ہے، اس کو "قریشی" سے بھی زیادہ موقع تھا لیکن وہ اس قدر ندرت وایجاد کا مظہر ہے کہ شاید پبلک اسے اس قدر آسانی سے بھی قبول نہ کرے جس قدر آسانی سے وہ نسخ کو قبول کرلے گی۔

سطور بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ غرض نہیں کہ نستعلیق کے ٹائپ کے ایجاد کی کوشش ہی بے سود ہے اور یہ بیل کبھی پروان نہ چڑھے گی بلکہ دکھانا یہ مقصود ہے کہ اس سے پہلے کہ پبلک لیتھو چھوڑکر ٹائپ کی طرف مائل ہو ترقی کے کتنے مدارج طے کرنے باقی ہیں۔

۱۹۳۲ء میں دُمدار ستارے

دیگر نقطہائے نظر سے ۱۹۳۲ء کی نسبت خواہ کچھ بھی کہا جائے لیکن ایک بات میں اس برس نے سالہائے گذشتہ کو مات کردیا۔ اور وہ یہ ہے کہ جتنے دُمدار ستارے ۱۹۳۲ء میں آسمان پر نمودار ہوئے اُتنے کبھی نہ ہوئے تھے۔ یعنی مشاہدہ کاروں نے سال گذشتہ میں آسمان پر چھ دُمدار ستارے ایسے دیکھے جو بالکل نئے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام "فائیز کامٹ" ہے اس ستارہ کو سب سے پہلے ماہ نومبر ۱۸۴۳ء میں موسیو فائیز نے پیرس کی رصدگاہ سے دیکھا تھا۔ اسکی گردش باقاعدہ ہے اور یہ اس وقت سے ابتک نو مرتبہ نظر آچکا ہے۔

دوسرا دمدار ستارہ بوریلی صاحب کا ستارہ تھا۔ اس دُمدار ستارہ کو سب سے پہلے ۱۹۱۲ء میں بوریلی صاحب نے مارسیلز میں دیکھا تھا اور یہ پانچ ماہ تک نمودار رہا تھا تیسرا دُمدار ستارہ کاف صاحب والا اور چوتھا گریگ مینا کا تھا۔ کاف صاحب نے ایسا ہی ایک ستارہ ۱۹۰۵ء میں اور دوسرا ۱۹۰۶ء میں دیکھا تھا۔ بقیہ دو ستارے ۱۹۳۲ء میں دو انگریزوں، ایک اسپینی اور دو امریکنوں نے دیکھے۔ انکے نام ہاوٹن۔ گڈلیس۔ گاردرنیا۔ بنومین پیلیٹر۔ اور چپل ہیں اور یہ دونوں دمدار ستارے کیپ آف گڈ ہوپ، ملبورن، میڈرڈ، لاویل رصدگاہ واقع ریاست آریزونہ، دلفوش واقع ریاست اوہیو، اور ہارورڈ یونیورسٹی میں دیکھے گئے۔ الجزائر کا ایک ماہر فلکیات مسٹر اشمڈ بھی دعویدار ہے کہ اس نے ساتواں دمدار ستارہ دریافت کیا لیکن اس کی دیگر مشاہدات سے تصدیق نہیں ہوئی۔

نظام تجارت، شرح محصولات میں سخت تغیر و تبدل پیدا ہو جائیگا۔ اس کی بدولت مختلف ممالک میں اقتصادی طور پر جتھا بندیاں ہونگی۔

ہندوستان کی لیجسلیٹیو اسمبلی نے بھی اس معاہدہ کو تین سال کے لئے منظور کیا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ ناقدانہ نظر ڈالی جائے۔

بین الاقوامی

اقتصادی حیثیت سے سلطنت برطانیہ دنیا کا ایک جزو غالب ہے، اس لئے اس کی تجارتی پالیسی کے اساسی تغیرات کا دنیا کی تجارت پر ہمیشہ زبردست اثر پڑتا ہے، اس وقت کیا بلحاظ مقدار اور کیا بلحاظ قیمت دنیا کی تجارت میں زبردست کمی آگئی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس حالت کی اصلاح و درستی میں معاہدہ اوٹاوہ سے کہاں تک مدد ملے گی؟ اضافہ محصولات درآمد اور ترجیحی پالیسی کے ذریعے یہ ممکن ہے کہ سلطنت برطانیہ کے ماتحت ممالک کی تجارت میں کسی قدر ترقی ہو جائے، لیکن عالمگیر تجارت پر اس کا اثر معکوس ہوگا، مثلاً اگر سلطنت برطانیہ کے مختلف حصص دیگر ممالک کا مال خریدنا ترک کردیں گے تو وہ بھی اسی تناسب سے سلطنت برطانیہ کا مال کم خریدیں گے، اور اس طرح جو منافع سلطنت کے اندر ہوگا اس سے زیادہ خسارہ سلطنت سے باہر ہو جائیگا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ معاہدۂ اوٹاوہ سے دنیا کی تجارت میں کوئی ترقی نہیں ہوسکتی، بلکہ اس کے برعکس اس کی وجہ سے دنیا کی اقتصادی ترقی میں رکاوٹیں پیدا ہو جائینگی۔ دنیا کی موجودہ کساد بازاری کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ مختلف ممالک نے اپنے یہاں چنگی کی بلند دیواریں کھڑی کرکے بین الاقوامی مصنوعات کی راہ میں سد سکندری تعمیر کردی ہے۔ اوٹاوہ کانفرنس نے ان دیواروں کو اور زیادہ بلند کرکے سر بفلک کردیا ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے محصولات میں جو اضافہ ہوا ہے اس سے دنیا بھر کے محصولات بڑھ گئے ہیں۔ دیگر ممالک اس سے متاثر ہوکر انتقامی تدابیر اختیار کریں گے اور اضافہ چنگی کے علاوہ بھی مال کی درآمد و برآمد میں بیسیوں طریقہ سے رکاوٹیں پیدا کیجا سکتی ہیں۔

حامیان معاہدہ اوٹاوہ نے یہ بھی نظر انداز کردیا ہے کہ فی زمانہ دنیا میں مال کی برآمد (Supply) تو بہت ہے مگر مانگ (Demand) یا ڈیمانڈ اردو میں "نکاسی" کم ہے جس کا سبب برآمد مال میں مختلف ممالک کا تباہ کن مقابلہ ہے۔ سلطنت برطانیہ کی امپیریل ترجیح کے ذریعے ممکن ہے کہ ممالک غیر کے مال کی برطانوی منڈیوں میں کھپت نہ ہو اور اس کے بجائے سلطنت کے مال کی گنجائش نکل آئے لیکن جب ممالک غیر کے ہاتھوں سے سلطنت برطانیہ کی منڈیاں نکل جائیں گی تو وہ بھی دنیا کی دوسری منڈیوں پر اپنی توجہ زیادہ سرگرمی سے مبذول کریں گے اور ان میں حتی المقدور سلطنت برطانیہ کے مال کی کھپت کی گنجائش باقی نہ رکھیں گے۔ مثال کے لئے گیہوں کو لے سکتے ہیں جو ارجنٹائن (جنوبی امریکہ) اور ہندوستان

میں زیادہ پیدا ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ ترجیحی ٹیکسوں کی بدولت برطانوی منڈیوں میں ارجنٹائن کی السی نہ جانے پائے اور وہاں صرف ہندوستان ہی کی السی فروخت ہوسکے لیکن اس کے عوض ارجنٹائن بھی دیگر ممالک غیر میں اپنی السی زیادہ سرگرمی کے ساتھ فروخت کرنے کی کوشش کریگا جس کی وجہ سے ہندوستان کی السی کو ہر لحاظ سے نقصان پہونچے گا۔ اس کے علاوہ امریکہ اور مغربی یورپ میں ارجنٹائن کا مال کفایت سے جا سکے گا۔ اس طرح جو فائدہ ہندوستان کو ترجیح سے پہونچنا ممکن ہے وہ نہ صرف برابر ہوجائیگا بلکہ شاید الٹا خسارہ رہے۔

معاہدہ اوٹاوہ کی ترجیحی پالیسی کے باعث جب سلطنت برطانیہ کی منڈیاں مصنوعات و پیداوار ممالک غیر سے خالی ہوجائیں گی تو ہندوستان جیسے ممالک کو جس کی برآورد (Produce) کا دو تہائی حصہ ممالک غیر میں فروخت ہوتا ہے سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا۔ یا تو ممالک غیر سے اس کی تجارت گھٹ جائیگی یا اس کی قیمت گرجائے گی۔

غرض نئی جنگی کی وجہ سے ہمارے تجارتی نظام میں فرق آجائیگا، اور ہم حسب ضرورت دیگر ممالک سے خاطرخواہ تجارتی معاہدات بھی نہ کرسکیں گے۔ یعنی اگر کوئی غیر ملک ہمارے ساتھ ترجیحی برتاؤ بھی کرنے کے لئے تیار ہو تو ہم اس کو معاہدۂ اوٹاوہ کی خلاف ورزی کئے بغیر قبول نہیں کرسکتے۔ بالفاظ دیگر خرید و فروخت کی جو آزادی ہم کو معاہدہ سے قبل حاصل تھی وہ اس کے بعد باقی نہیں رہی چنانچہ اب ہم جاپان، امریکہ، بلجیم، جرمنی وغیرہ سے کوئی جدید تجارتی معاہدہ نہیں کرسکتے۔

ہندوستان کی تجارت کے اعداد و شمار سے معلوم ہوگا کہ ہماری تجارت برطانیہ اور اس کے ماتحت ممالک کے ساتھ گھٹتی اور ممالک غیر سے بڑھتی جاتی ہے۔ نقشہ ذیل سے اس قول کی صداقت بخوبی ذہن نشین ہوجائے گی۔

قیمت مال تجارت (برآمد) بحساب کرور روپیہ

نام ملک	اوسط قبل از جنگ	اوسط بعد از جنگ	سنہ ۲۹-۱۹۲۸ء	سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء	سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء	سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء
سلطنت متحدہ برطانیہ	۵۶٫۳	۷۳٫۰۴	۷۲٫۴	۶۹٫۶	۵۴٫۲	۴۵٫۳
سلطنت برطانیہ	۹۲٫۱	۱۲۵٫۱	۱۱۹٫۹	۱۱۴٫۶	۸۹٫۵	۷۱٫۵
ممالک غیر	۱۳۲٫۰	۱۷۶٫۹	۲۱۸٫۰	۲۰۳٫۳	۱۳۶٫۲	۸۹٫۱
میزان کل	۲۲۴٫۱	۳۰۲٫۰	۳۳۷٫۹	۳۱۷٫۹	۲۲۵٫۷	۱۶۰٫۵

قیمت مال تجارت (درآمد) بحساب کرور روپیہ

نام ملک	اوسط قبل از جنگ	اوسط بعد از جنگ	سنہ ۲۹-۱۹۲۸ء	سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء	سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء	سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء
سلطنت متحدہ	۹۱،۶	۱۴۶،۴	۱۱۳،۲	۱۰۳،۱	۶۱،۳	۴۴،۸
سلطنت برطانیہ	۱۰۱،۵	۱۶۵،۵	۱۳۶،۶	۱۲۴،۵	۷۶،۰	۶۵،۷
ممالک غیر	۴۴،۳	۸۸،۵	۱۱۶،۷	۱۱۶،۳	۸۸،۸	۶۹،۷
میزان کل	۱۲۵،۸	۲۵۴،۰	۲۵۳،۳	۲۴۰،۸	۱۶۴،۸	۱۲۶،۴

ہندوستان کی تجارت کے فیصدی حصہ وار

(برآمد)

نام ملک	اوسط قبل از جنگ	اوسط بعد از جنگ	سنہ ۲۹-۱۹۲۸ء	سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء	سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء	سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء
سلطنت متحدہ	۲۵،۱	۲۴،۲	۲۱،۴	۲۱،۸	۲۴،۰	۲۸،۲
سلطنت برطانیہ	۴۱،۱	۴۱،۴	۳۵،۵	۳۶،۰	۳۹،۶	۴۴،۵
ممالک غیر	۵۸،۹	۵۸،۶	۶۴،۵	۶۴،۰	۶۰،۴	۵۵،۵
میزان کل	۱۰۰،۰	۱۰۰،۰	۱۰۰،۰	۱۰۰،۰	۱۰۰،۰	۱۰۰،۰

(درآمد)

نام ملک	اوسط قبل از جنگ	اوسط بعد از جنگ	سنہ ۲۹-۱۹۲۸ء	سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء	سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء	سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء
سلطنت متحدہ	۶۲،۸	۵۷،۶	۴۴،۷	۴۲،۸	۳۷،۲	۳۵،۵
سلطنت برطانیہ	۶۹،۷	۶۵،۲	۵۴،۱	۵۱،۷	۴۶،۱	۴۴،۸
ممالک غیر	۳۰،۳	۳۴،۸	۴۵،۹	۴۸،۳	۵۳،۹	۵۵،۲
میزان کل	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰

ان نقشہ جات سے ناظرین زمانہ پر بخوبی روشن ہوگیا ہوگا کہ ہندوستان کی تجارت درآمد و برآمد دونوں سلطنت متحدہ و سلطنت برطانیہ کی بہ نسبت ممالک غیر سے روز افزوں ترقی کر رہی ہے اور جنگ کے بعد سلطنت متحدہ سے ہندوستان کی تجارت برآمد روز افزوں کم ہو رہی ہے۔ حتیٰ کہ سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء میں سلطنت متحدہ میں ہندوستان کا مال صرف ۲۴ فیصدی فروخت ہوا اور ۶۰،۴ فیصدی ہندوستانی مال کی کھپت ممالک غیر میں ہوئی اور اس کی بیشی کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے لئے برطانوی منڈیوں کے مقابلے میں غیر ممالک کی منڈیاں زیادہ قابل قدر ہیں۔ معاہدہ اوٹاوہ کی رو سے چنگی کی جو جدید شرح عاید کیجائیگی اس کے معنی یہی ہونگے کہ ہم ان ممالک کے خلاف کام کر رہے ہیں جو ہم سے نہ صرف زیادہ مال خریدتے ہیں بلکہ جن کی درآمد ہمارے ملک میں ہمیشہ ہماری برآمد سے کم رہی ہے

بالفاظ دیگر ہم ایک ایسے ملک کی رعایت کرکے جس نے سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء میں ہندوستان سے اتنا مال نہیں خریدا جتنا کہ اس کے ہاتھ فروخت کیا ہم اُن خریداروں کے خلاف قدم اٹھائیں گے جو ہمارا مال زیادہ مقدار میں خریدتے اور اپنا مال کم مقدار میں فروخت کرتے ہیں

مختلف ممالک سے ہندوستان کی تجارت کی کیفیت یہ ہے

نام ملک	درآمد		برآمد		نفع ونقصان	
	سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء	سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء	سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء	سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء	سنہ ۳۱-۱۹۳۰ء	سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء
سلطنت متحدہ	۶۱٫۲۹	۴۴٫۸۱	۵۴٫۲۳	۴۵٫۳۳	−۶٫۰۶	+۰٫۵۰
جرمنی	۱۲٫۳۸	۱۰٫۲۰	۱۴٫۲۳	۱۰٫۰۹	+۱٫۸۵	−٫۱۱
جاپان	۱۴٫۵۱	۱۳٫۳۴	۲۳٫۸۷	۱۴٫۰۳	+۹٫۳۶	+٫۶۹
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۱۵٫۱۲	۱۲٫۸۴	۲۱٫۱۴	۱۴٫۲۹	+۶٫۰۱	+۱٫۴۵
اطالیہ	۴٫۵۱	۳٫۵۹	۷٫۹۳	۵٫۵۰	+۳٫۴۲	+۱٫۹۱
بلجیم	۴٫۶۷	۳٫۰۲	۷٫۵۷	۴٫۴۷	+۲٫۹۰	+۱٫۴۵
فرانس	۲٫۸۹	۲٫۱۷	۱۱٫۱۷	۷٫۶۲	+۸٫۲۸	+۵٫۵۵

اس نقشہ سے بھی صاف ظاہر ہے کہ جملہ ممالک میں صرف سلطنت متحدہ ہی ایسا ملک ہے جس نے ہندوستان کا مال توکم خریدا لیکن اپنا مال اس کے ہاتھوں زیادہ فروخت کیا۔ صرف سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء میں یہ پہلا موقعہ پیش آیا۔ کہ اس نے ہندوستان سے زیادہ مال خریدا۔ اور یہ محض تحریک بائیکاٹ کا نتیجہ تھا اور اگر بائیکاٹ نہ رہے تو حالت پھر دگرگوں ہوجائے۔ سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء میں بھی فرانس، بلجیم، اطالیہ، اور جاپان نے ہندوستان کا زیادہ مال خریدا۔ لہٰذا جو لوگ ہم سے زیادہ مال خریدتے ہیں اُن کے سامنے محصولات امتیازی کی سد سکندری کھڑی کرنا کسی طرح دانشمندی نہیں ہوسکتا۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہی ہوگا کہ ہندوستان کے ہاتھ سے تمام غیر ملکی منڈیاں نکل جائیں گی کیونکہ جب ہم تجارتی امتیازات میں چینکر باہر والوں کا مال کم خریدیں گے تو وہ بھی ہمارے مال کو ٹھکرادیں گے۔ بہرحال ہم کو خوف ہے کہ محصولات میں جدید تغیرات ہماری تجارت کا گلا گھونٹ دیں گے

اس مسئلہ پر ایک اور نقطہ خیال سے بھی نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ گیہوں ہندوستان کے علاوہ آسٹریلیا کناڈا۔ اور روس سے بھی برآمد ہوتا ہے۔ پس اگر برطانیہ ہم سے گیہوں خریدے گا تو عام بازاری نرخ پر خریدیگا

جس سے ہمیں کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا۔ چائے ہندوستان، لنکا اور جاوا کے علاوہ اور کسی ملک میں کثرت سے پیدا نہیں ہوتی ہے۔ ہندوستان میں اس کی پیداوار تیسرے درجہ پر ہے اور لنکا میں اول درجہ پر۔ اگر امتیازی ٹیرف کی مدد سے جاوا کی چائے برطانوی منڈیوں میں نہ آنے پائی تو اس سے ہندوستان کو نہیں بلکہ لنکا کو اصلی فائدہ ہوگا۔ سن۔ لاکھ اور ہڑ۔ بہیڑہ۔ آنولہ وغیرہ ہندوستان کے سوائے کہیں پیدا نہیں ہوتے۔ لہٰذا تمام ممالک غیر کو یہ چیزیں مجبوراً ہمیں سے خریدنا پڑیں گی۔ اب فقط روئی کا قصہ باقی رہ جاتا ہے انگلستان گراں نرخ پر روئی نہیں خرید سکتا۔ کیونکہ ایسی صورت میں وہ دوسروں کے مقابلہ میں سستا کپڑا نہیں تیار کرا سکتا۔ اور جب انگلستان اپنا کپڑا ہندوستان میں فروخت کریگا تو اُسے ہماری روئی بھی چنگی بڑھائے بغیر خریدنا پڑے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ معاہدہ اوٹاوہ کے ذریعہ سے ہندوستان کی تجارت برطانیہ اور سلطنت برطانیہ تک محدود ہو جائے گی اور تمام گاہک ٹوٹ جانے پر ہندوستانی تجارت صرف برطانیہ کے رحم و کرم کی محتاج ہو جائے گی جو ہمارے لئے کسی طرح مفید نہ ہوگا۔

زندگی کی خام خیالیاں

۱۔ صحیح اور غلط کا معیار خود قائم کر کے دوسروں سے توقع رکھنا کہ وہ اس پر عمل کریں۔

۲۔ دنیا میں کسی امر پر اتفاق رائے کی امید رکھنا۔

۳۔ نوجوانوں سے تجربہ کاری کی توقع رکھنا۔

۴۔ ہر شخص پر حکومت کرنیکا خیال باطل رکھنا

۵۔ دوسروں کے جذبات کا اندازہ اپنے نقطۂ نظر سے کرنا۔

۶۔ خود کو نیک اور غلطیوں سے معصوم سمجھنا۔

۷۔ ذاتی مصارف میں تخفیف پیدا نہ کرنا۔

۸۔ جس غلطی کی تلافی نہ ہو سکے اس پر بک جھک کرنا۔

۹۔ جو کام خود سے نہ ہو سکے اُسے ناممکن خیال کر لینا۔

۱۰۔ جو بات سمجھ میں نہ آئے اسے بعید از عقل قرار دینا۔

ضعیف الاعتقادی

(از شریمتی شوکماری دیوی)

وہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کے باعث لوگوں کو اکثر خطرناک واقعات پیش آجایا کرتے ہیں جو واقعہ میں بیان کرنے والی ہوں میرا چشم دید ہے۔

مَیں کانپور میں مقیم تھی، میری ایک پڑوسن بہوت پریتوں میں، جادو ٹونے میں، اچھے بُرے شگون میں بہت اعتقاد رکھتی تھیں۔ اور اکثر جوتشیوں، پنڈتوں وغیرہ کو اپنے شوہر اور بچوں کے زائچے دکھا کر آئندہ کے نیک و بد حالات دریافت کیا کرتی تھیں۔ اگر کسی کی گرہ خراب ہوتی تو اس کی تدابیر معلوم کر کے اُس پر عمل بھی کرتی تھیں، اُن کے بچوں میں بھی قدرتی طور سے یہی خیالات سرایت کر گئے تھے امسال ایک پنڈت جی نے جو پڑوسن کا زائچہ دیکھا تو فرمانے لگے: تمہاری گرہ اب کی بہت کڑی ہیں، پنتیسویں ۳۵ سال میں الپ (یعنی خطرۂ مرگ) ہے اور سانپ کے ڈس لینے کا اندیشہ ہے۔ اب پڑوسن بیچاری ہر وقت فکر میں مبتلا رہتیں اور اکثر کہا کرتیں کہ ہمارا تو اب کی ایشور ہی مالک ہے۔

سوء اتفاق سے ایک روز ایک کالا سانپ بھی اُن کے گھر میں نکلا اور ایک کوٹھری میں گھس کر کہیں غائب ہوگیا، پھر کیا تھا؟ گویا فرشتۂ موت نے اُن کے گھر میں ڈیرا ڈال دیا۔

ایک روز رات کے وقت ہم لوگ کھانے پینے سے فارغ ہو کر اپنے اپنے بستروں پر پڑے تھے کہ دفعتًا پاس کے گھر سے رونے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم لوگ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے اور پڑوسن کے گھر پہونچ گئے۔ وہاں دیکھا کہ پڑوسن ایک چارپائی پر بیہوش پڑی ہیں، شوہر پریشان سرہانے بیٹھے ہیں، لڑکے لڑکیاں چیخ چیخ کر رو رہے ہیں "ہائے میری میّا کو کیا ہوا، ہائے میری میّا کو ہائے میری میّا کو کیا ہوا، ہائے میری میّا کو سانپ ڈس گیا"

محلہ والے: "ارے کیا ہوا کیا ہوا؟ کوئی بات تو بتاؤ"

پڑوسن کے شوہر: کیا بتائیں ابھی زینہ پر آرہی تھیں کہ ایک دم سانپ سانپ کر کے چلائیں۔

اور گر کر بیہوش ہوگئیں۔ سانپ تو کہیں تھا نہیں، ایک بڑا سا ڈنڈا بیشک پاؤں میں لپٹا ہوا تھا۔"

ایک محلہ والا" ارے پنکھا جھلو، ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دو۔"

دوسرا" ڈاکٹر صاحب کو بلاؤ۔ ترّو بابو کو بلالو۔"

تیسرا (بڑی لڑکی سے جس کی گود میں ایک بچہ بھی تھا) "بیٹی چپ رہو رونے کی کیا بات ہے، بیہوشی ہے سو ابھی دور ہوئی جاتی ہے، رونے چلانے سے تو بیمار اور گھبرا جائیگا۔"

اسی طرح سب محلہ والوں نے لڑکے لڑکیوں کو سمجھایا مگر کسی نے رونا چلانا بند نہیں کیا۔ ذرا دیر میں ترّو بابو آئے۔ شور کم ہوا، دوا دی گئی، پنکھا جھلا گیا، پانی کے چھینٹے دیئے گئے۔ مریضہ نے آنکھیں کھولیں اور کچھ کہنا چاہا۔ اتنے میں ایک محلہ والے نے پوچھا "کیا حال ہے؟"

مریضہ:۔ ارے للّا میں زینہ پر آرہی تھی کہ ایک سانپ اوپر سے گرا اور میرے پاؤں میں لپٹ گیا۔ میں گھبرا کر بھاگی اور گر پڑی۔"

شوہر:۔ سانپ واپ کہاں تھا ایک ڈنڈا تھا بڑا سا۔"

مگر مریضہ نے کچھ نہ سنا وہ پھر بیہوش ہوگئی۔ تھوڑی دیر میں ان کو پھر ہوش آیا اور طبیعت ٹھیک ہوگئی۔ آخر سب محلہ والے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

صبح کو پڑوسن نے میری ماں سے کہا "بی بی، اب میں جینے کی نہیں، رات میں نے سپنا دیکھا ہے کہ سامنے والے کمرے میں دو آدمی کھڑے ہیں، لال کپڑے پہنے ہیں جم دوت کے سے سینگ ہیں، مجھے بلا رہے ہیں، باہر ایک پالکی کھڑی ہے۔ یہ سپنا دیکھکر مجھے بڑا ڈر لگا اور میں نے اماں (اپنی ساس) سے کہا کہ کمرے کے کواڑ بند کردو۔"

اماں:۔ ہاں کہا تو تھا۔"

صبح کو پھر مریضہ کو دورہ ہوا۔ ایک دوسرے انگریزی ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔ مگر ان کے علاج سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر مریضہ کو زنانہ شفاخانہ بھیج دیا گیا، وہاں وہ پانچ سات روز رہیں اور صحتیاب ہو کر اپنے گھر واپس آگئیں۔

ظاہر ہے کہ بی ہمسائی کو یہ ساری پریشانی اور تکلیف اپنے وہم کی بدولت اٹھانا پڑی۔ میں جوتش یا علم نجوم کو برا نہیں کہتی ہوں۔ لیکن اس کے نتائج پر بھروسہ کرنا خلاف عقل ہی نہیں بلکہ اکثر صورتوں میں جیسا کہ متذکرہ بالا واقعہ سے ثابت ہے بہت ضرر رساں ہے۔ علم نجوم کی صحت کا سارا دار و مدار ستاروں کی گردش پر ہے، اور زمین والوں کے لئے آسمان کی باتیں دریافت کرنا ممکن نہیں

تومحال ضرور ہے۔ ایسی صورت میں نجومیوں کا معتقد ہونا یا اُن کی پیشین گوئیوں پر اعتقاد رکھنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر یہ مانا جاتا ہے کہ قسمت کا لکھا پیش آتا ہے اور ہونی اَمِٹ ہے تو بھی مستقبل کے حالات جاننے کی فکر کرنا کوئی دانشمندی نہیں کیونکہ اگر کوئی خوشی ہونی والی ہے تو پیشتر ہی اُسے جان لینے سے کچھ فائدہ نہیں بلکہ اُس کا لطف مٹ جاتا ہے، اور اگر رنج نصیب میں ہے تو قبل از مرگ واویلا سے کیا حاصل ؎

اصلاح کی مجال نہیں ہے تو کیا ضرور
بے ربطیِ نوشتۂ تقدیر دیکھنا

تقدیرِ آدم

(چینی شاعر کانگ ۔فوسے)

(۱۵۵ تا ۴۷۸ ق۔م۔)

خزاں کی خنکی کے بعد موسم گرما کی حدت آتی ہے،

برف سے ڈھکے ہوئے میدانوں پر بہار کے پھول سج جاتے ہیں۔

سورج جب صبح سو کر اُٹھتا ہے تو سُرخ رو۔

جب شام کو سونے جاتا ہے تو سُرخ رو۔

چھوٹے چھوٹے چشمے سمندر سے جا ملتے ہیں۔

زمانہ ہر گھڑی اپنی تجدید میں مصروف ہے۔

ہر روز نئی دھوپ نکلتی ہے، ہر آن دریا کا پانی بدلتا ہے۔

مگر آدمی! اسے بس ایک مرتبہ زندگی عطا ہوتی ہے۔

یہ مڑکر دیکھتا ہے، نہ لوٹ کر آتا ہے۔

اس کی ہستی ایک حباب ہے۔ ٹوٹا اور ختم ہوگیا۔

اس کی زندگانی کا ماحصل؟ لاچار و بے بس مٹی کا ایک چھوٹا سا ڈھیر جس پر گھاس اُگتی ہے۔

(دین دنیا)

تنقید کتب

سب رس

(از جناب سید احمد اللہ قادری، ایم۔ آر۔ اے۔ ایس (لندن)

نثر اُردو کی سب سے پہلی کتاب ابتک فضلی کی کربل کتھا سمجھی جاتی تھی، لیکن تحقیقات سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ فضلی سے مدت پہلے نثر اُردو کے بڑے بڑے مصنف گزرے ہیں اور اُنھوں نے بہت سی قابل قدر کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں حسن و دل کا فسانہ (جو سب رس کے نام سے مشہور ہے) عین القضاۃ کی تمہیدات کا ترجمہ میراں یعقوب کی شمایل الاتقیا ممتاز حیثیت رکھتی ہیں، اور یہ سب کتابیں دکن میں لکھی گئی ہیں۔

سب رس کا مصنف ملا وجہی گولکنڈہ کا مشہور شاعر اور زبردست مصنف ہے، اسکی عمر کا بہترین زمانہ سلطان محمد قطب شاہ اور عبد اللہ قطب شاہ کے دربار میں گزرا ہے اور اس نے فارسی کے علاوہ دکنی نظم و نثر میں تین کتابیں لکھی ہیں:۔

(۱) مثنوی قطب مشتری (۲) تاج الحقایق (۳) سب رس۔

مثنوی قطب مشتری ۱۶۰۹ء میں لکھی گئی ہے، اس میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے حسن و عشق کی داستان ہے۔

تاج الحقایق اخلاق و تصوف کا رسالہ ہے اور مثنوی قطب مشتری کے بعد تصنیف ہوا ہے سب رس ۱۶۳۵ء کی تصنیف ہے اور وجہی کی اخیر کتاب ہونے کے لحاظ سے اسکے بہترین شاہکاروں میں شمار ہوتی ہے اور ادبی حیثیت سے اسے حیات دوام حاصل ہے۔

سب رس کا قصہ بڑا عجیب و غریب قصہ ہے۔ اس کا انداز بیان بھی سب سے نرالا اور الگ ہی ہے، عشق و محبت کی عجیب کشمکش ہے اور حق تو یہ ہے کہ وجہی نے قصہ نگاری میں اپنا پورا زور اور کمال دکھایا ہے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سب رس کس کتاب کو پیش نظر رکھکر لکھی گئی، کیونکہ اسکا ماخذ وجہی نے کہیں بھی نہیں بتایا ہے، اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ وجہی کی دماغی کاوش کا رہین منت ہے۔ لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ بے مثل داستان یحیٰی ابن سیبک فتاحی نیشاپور کے دماغ کی اپج ہے، یہ بزرگ شاہرخ مرزا کے عہد میں گزرے ہیں، انکا انتقال ۸۵۲ھ میں ہوا۔

فتاحی کی مثنوی دستور عشاق بہت مشہور مثنوی ہے جس کے پانچہزار اشعار ہیں، اسکا خلاصہ خود فتاحی نے بعد میں شبستان خیال اور حسن ودل کے دو علیحدہ علیحدہ ناموں سے کیا تھا۔

حسن ودل مسجع ومقفیٰ نثر میں ہے یہ مشرق سے زیادہ مغرب میں مقبول ہوئی اور یورپ میں اسکے تین ایڈیشن ترجموں کے ساتھ چھپے، سب رس کا ماخذ بھی یہی ہے۔

حسن ودل چونکہ دستور عشاق کا خلاصہ ہے اسلیے یہ دستور عشاق کی طرح واضح نہیں ہے۔

ہندوستان کے شعرا میں داؤد ایلچی نے اس فسانے کو ۱۰۶۵ھ میں فارسی میں نظم کیا۔ یہ نظم بمبئی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

خواجہ محمد بیدل نے جو عہد عالمگیر کے مشاہیر میں گزرے ہیں ۱۰۹۵ھ میں انھوں نے اسے فارسی نثر میں لکھا ہے۔

ترکی زبان کے شہرہ آفاق شاعر لامعی نے بھی اسے اپنی زبان میں تحریر کیا، اسکے سوا اور تین ترکی شعرانے (جنکے نام آہی۔ والی۔ صدقی ہیں) اسے نظم و نثر میں لکھا۔ ان میں سے لامعی اور آہی کی تصنیفات نثر میں ہیں اور باقی دو کی نظم میں۔ اہل دکن نے بھی اس قصہ کو فراموش نہیں کیا بلکہ ان تمام سے زیادہ اسکی قدر افزائی کی، چنانچہ دکن کے ایک شاعر شاہ حسین ذوقی نامی نے اس قصہ کو ۱۱۱۹ھ میں نظم کیا ہے اور اسکی کتاب کا نام "وصال العاشقین" ہے۔

دوسرے بزرگ مجرمی ہیں جنھوں نے اسکو مثنوی گلشن حسن ودل کے نام سے ۱۱۶۰ھ میں منظوم کیا۔

مختصر یہ کہ ان تمام مصنفین نے مولانا فتاحی سے سب کچھ اخذ کیا ہے اور انھیں سے خوشہ چینی کی۔ وجہی نے قصہ کو بامزہ اور پر لطف بنانے کے لئے ایک خاص خوبی یہ پیدا کی ہے کہ افراد اور مقامات کے نام بڑے ہی دلکش انتخاب کئے ہیں۔

سب رس اب سے کچھ سال پہلے بڑی نایاب سمجھی جاتی تھی اور اسکی حقیقت سے بہت کم اصحاب واقف تھے ابتدا میں مولوی عبدالحق صاحب نے جو ہندوستان کے مشہور مقدمہ نویس ہیں اس پر ایک ناقدانہ مضمون لکھکر رسالہ اردو میں طبع کرایا اور جب انھیں اسکے متعدد نسخے ملے تو ان کی مدد سے ایک

صحیح نسخہ تیار کیا اور اسے اپنے ایک مبسوط و محققانہ مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی اُردو کی جانب سے شائع کرایا۔ اصل کتاب کے تین سو صفحے ہیں، آخر میں سولہ صفحہ کا فرہنگ بھی شامل ہے جسمیں قدیم اور متروک الفاظ کے معنی بتلائے گئے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کو اس انداز میں ایڈٹ فرمایا ہے جس طرح کہ مستشرقین یورپ اہل مشرق کی کتابیں ایڈٹ کیا کرتے ہیں۔ باوجود اس قدر ضخامت اور خوبیوں کے کتاب کی قیمت نہایت ہی کم مقرر کی ہے (مجلد چار روپیہ بے جلد تین روپیہ آٹھ آنہ) اور ہر صاحب ذوق اسے خرید کر مستفید ہو سکتا ہے۔

ہم انجمن ترقی اُردو (اورنگ آباد) اور اسکے معزز معتمد کی خدمت میں مبارکباد عرض کرتے ہیں کہ انھوں نے سبرس جیسی بے مثل کتاب کو انجمن کے لئے انتخاب کیا حقیقت میں ایسی کتابوں کی اشاعت کی ہماری زبان کو شدید ضرورت ہے تاکہ زبان اُردو کے ادب سے واقفیت حاصل ہو اور علم اللسان کے دقیقے ان سے بآسانی حل ہوں۔ اور یہ ایسی بے لوث خدمات ہیں کہ ان کا اعتراف کرنا ہم ایسے شیدستوں سے ناممکن ہے۔

دیگر مطبوعات

فل لوٹ

مصنفہ جناب مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔اے۔ایل ایل۔بی وکیل جودھپور۔ کتابت و طباعت نفیس تقطیع ۲۰×۳۰ ضخامت ۱۷۶ صفحات قیمت عہ ملنے کا پتہ: دفتر کتابت عظیم بیگ چغتائی جودھپور۔

یہ ناول نما کتاب تین حصوں اور تیئیس ۲۳ ابواب پر مشتمل ہے، جس میں ایک بے اصول اور دل پھینک کا قصۂ عشق و محبت درج ہے جو ملازم ہو کر ایک قصبہ میں جاتا ہے، وہاں شفاخانہ کی ایک ڈاکٹرنی مس سنگھ سے شناسائی اور پھر عشق پیدا ہو جاتا ہے۔ ہیرو رخصت لیکر گھر جاتا ہے اور وہیں بیٹھے بیٹھے بذریعہ خط و کتابت دونوں کی شادی طے ہو جاتی ہے۔ اسی دوران میں ایک دوسری لڑکی ہیرو کے سر منڈھ دی جاتی ہے اور آپ باوجود مس سنگھ کے عاشق اور اسکے منگیتر ہونیکے اس لڑکی سے شادی کر لیتے ہیں۔ مس سنگھ کو جب یہ حال معلوم ہوتا ہے تو وہ اپنی جان دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔

قصہ کی تحریر کسی قدر مزاحیانہ شوخی لیے ہوئے ہے۔ طرز ادا وہی ہے جو چغتائی صاحب کی ہمیشہ ہوتی ہے اس ناول میں کوئی ترقی نہیں کی گئی ہے۔ بعض بعض جگہ قابل داد نادر ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں لیکن اکثر جگہ زبان کے نقائص رہ گئے ہیں ذیل میں　　دونوں کے نمونے نذر ناظرین ہیں۔

"کسی نالائق نے ایک گاڑی عورتیں اس طرف بھی اتار دی تھیں"۔ اس میں "ایک گاڑی عورتیں" حسین جملہ ہے۔

"بڑی بی اپنے ہونٹوں سے مختلف سائز کے جلدی جلدی صفر بناتی تھی" یہ پوپلے منھ کی حرکت سے "صفر بنانا" بہت خوب ہے۔

"بسا اوقات بے بس ہو کر یہی جی چاہتا کہ اپنی گھڑی میں زیادہ بجالوں"۔ اس میں جذبات نفرت وبیقراری کی دلآویز تصویر ہے۔

"اس کی خوبصورت پلکوں میں موتی لٹک رہے تھے اور ہر قطرہ میں مجھے دجلہ دکھائی دیا"۔ قطرہ میں دجلہ قابل تعریف ہے۔

چغتائی صاحب زبان لکھنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں لیکن زبان انھیں نہ کبھی آئی تھی نہ آئے گی۔ اب چند نمونے آپ کی ولندیزی اُردو کے بھی ملاحظہ ہوں :۔

صفحہ ۲۴ سطر ۹ پر "کون نہ علاج کرانے لگ جائیگا۔ صفحہ ۳۲ سطر ۲ میں مس سنگھ کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ "وہ میری پہلی لڑکی دوست تھی" غالباً یہ "She was my first girl friend" کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ صفحہ ۳۰ سطر ۳ میں "میں نے شیر کے گولی دی ہے اور وہ زخمی ہو کر دھاڑا ہے"۔ مگر گولی ماری جاتی ہے یا گولی رسید کی جاتی ہے، گولی دینا کوئی محاورہ نہیں ہے۔ صفحہ ۳۶ پر یہ فقرہ کہ "گھٹنے کے یہ زخم دراصل ایک کٹکھنے کتے نے مجھے دوڑا کر بدحواس کر دینے کے بعد گرا گرا کر پہونچائے تھے"۔ کس قدر الجھا ہوا ہے۔

اسی طرح صفحہ ۱۴۱ سطر ۱۲ پر "ٹھونکنے کے لئے" لکھا گیا ہے مگر غلیلیں ہانکی جاتی ہیں، نہیں ماری جاتی ہیں لیکن "ٹھونکی" نہیں جاتی۔ اسیطرح اور بھی بعض مقامات میں نظرثانی کی ضرورت ہے جو امید ہے دوسرے ایڈیشن میں ہو جائیگی۔

شریر لڑکا

یہ چھوٹا سا ڈراما ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر فلسفہ و تعلیمات جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا لکھا ہوا ہے اسکی کتابت وطباعت نفیس ہے چھوٹی تقطیع پر ٹائپ میں انگریزی وضع کے ٹائیٹل کے ساتھ طبع ہوا ہے۔ اس ڈرامے میں پانچ دلچسپ اور سبق آموز سین ہیں۔ اسکی زبان نہایت پاکیزہ اور سلیس، خیالات شریفانہ اور پلاٹ سبق آموز ہے۔ بغرض ہر حیثیت سے ڈراما اس قابل ہے کہ قوم کا ہر بچہ اسکا مطالعہ کرے۔ ہم فاضل مصنف کی اس ادبی خدمت کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ شائقین جامعہ ملیہ دہلی سے طلب فرمائیں۔

مثنوی مقام محمود

مصنفہ آغا محمد صدیق حسن صاحب ضیا راولپنڈی۔ یہ رسالہ ہے تو چھوٹا سا مگر شروع سے آخر تک جواہر پاروں سے بھرا ہوا ہے۔ تخلیق آدم اور بعثت و معراج محمد عربی صلعم کے مضمون کو نہایت لطیف اور دلآویز پیرایہ میں نظم کیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ نمونہ کے طور پر ہم چند اشعار ذیل میں درج کرتے ہیں جو ظہور نبوی پر ہیں:-

یکایک مبدّل ہوا سب نظام کیا ناز سے زندگی نے خرام
یکایک نگاہوں سے اٹھا حجاب نئے رنگ میں آئی کہنہ شراب
یکایک برسنے لگا ابر نور کیا ساقیِ زندگی نے ظہور
لئے بزم ہر دو جہاں کی کلید زمیں کی کلید، آسماں کی کلید
نگاہوں میں جادو کا ساماں لئے تنفس سے دنیا کو زندہ کئے
پیام اخوت سناتا ہوا سمندر سے کف کو ملاتا ہوا
کہ و مہ کے دل کو سنبھالے ہوئے گل و خار پر سایہ ڈالے ہوئے
رموزِ تمدن سکھاتا ہوا ہر اک اجڑے گھر کو بساتا ہوا
مئے بیخودی یوں پلاتا ہوا کہ دم میں خدا سے ملاتا ہوا
جفاؤں کو برباد کرتا ہوا غلاموں کو آزاد کرتا ہوا
رموز کفالت سمجھتا ہوا ہر اک دل کی حالت سمجھتا ہوا
پیام محبت سناتا ہوا ہوا جلوہ گر مسکراتا ہوا

کتاب کے شروع میں پانچ صفحات کا ایک "تعارف" بھی مولوی عبدالعزیز خاں صاحب صدر بزم ادب راولپنڈی کا لکھا ہوا ہے۔ اس مختصر تحریر میں دو لفظوں کے استعمال پر بعض شناسان ادب کو اعتراض ہو سکتا ہے۔ پہلے ہی صفحہ کی آخری دو سطروں میں تحریر ہے "گذشتہ دو سالوں میں مجھے بزم ادب کے اکثر مظاہروں میں شمولیت کا فخر حاصل ہوا" اس عبارت کا مفہوم صرف "دو سال" سے پورا ہو سکتا تھا۔ دوسرے "شمولیت" کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ یہاں شرکت چاہیئے۔ مثلاً کاغذ شامل مسل ہو سکتا ہے مگر شریک مسل نہیں ہو سکتا۔ اس طرح "شریک" اور "شامل" کے استعمال میں فرق ہے۔ بہر حال کتاب بہت اچھی ہے۔ رموز شناسانِ تصوف بہرہ اندوز ہوں۔ اس کا حجم چھوٹی تقطیع کے چالیس صفحات لکھائی اور کاغذ عمدہ لیکن چھپائی خراب۔ قیمت درج نہیں، غالباً انجمن خدام اسلام راولپنڈی سے مفت مل سکتی ہے۔

تاجِ آفرینش

مترجمہ جناب عبد الحمید صاحب نعمانی کاغذ عمدہ لکھائی چھپائی غنیمت تقطیع ۲۲×۱۸ صفحات علاوہ ٹائیٹل ۱۰۶ شروع میں مصنفہ کی عکسی تصویر قیمت دس آنہ ملنے کا پتہ اجمل کمپنی پوسٹ بکس بلڈنگ بمبئی ۵

اصل کتاب عربی زبان میں تھی جس میں مصر کی ایک مشہور اہل قلم خاتون ملک خانم عرف "باحثۃ البادیۃ" (صحرا میں بیٹھکر بحث کرنے والی) کے بیش بہا مقالات ہدیۂ ناظرین کئے گئے ہیں۔ تمام مضامین عالم نسواں سے تعلق رکھتے ہیں اور اصلاحی ہیں۔ لائق مصنفہ نے زن وشوہر کے تعلقات پر قابل قدر ہدایات لکھی ہیں جن کا مطالعہ اہل ہند کے لیے بھی مفید ہوگا۔ فاضل مترجم نے اس کتاب کا ترجمہ کرکے ہندوستانیوں پر احسان کیا ہے۔ شروع میں "باحثۃ البادیۃ" کی مختصر سوانحعمری بھی ہے۔

رامائن مسدس

جناب منشی راجی مل صاحب سنبھلی المتخلص بہ رام کی تصنیف لطیف ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ اور دیدہ زیب۔ جلد نفیس و مطلّا جس پر کتاب کا نام طلائی حروف میں درج ہے، موقع بموقع پنج رنگی سہ رنگی اور بلاک کی متعدد تصویریں بھی دیگئی ہیں جن کی وجہ سے کتاب کی خوبیاں دوبالا ہوگئی ہیں انہیں ایک مطلّا ومذہب پنج رنگی تصویر "شری رام پنچائتن" کی خاص طور پر خوبصورت وگرانبہا ہے

رامائن کے عقیدتمندوں کے لئے یہ نسخہ ذریعہ معفرت ہے۔ نازک خیال شاعر کے جودت طبع نے اکثر مقامات پر اپنے جوہر دکھلائے ہیں۔ (۱) دھنش یگیہ (۲) رانی کیکئی اور منتھرا کا مکالمہ (۳) بن باس کا بروان (۴) بھرت جی کی کوشلیاجی سے گفتگو (۵) چترکوٹ کے واقعات (۶) رامچندر جی کا بھرت سے مباحثہ (۷) انسویاجی کا اُپدیش وغیرہ وغیرہ کا بیان خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ بڑی تقطیع کے تین سو صفحات پر یہ رامائن ختم ہوئی ہے۔ قیمت مجلد سے، شائقین زمانہ بک ڈپو کانپور سے طلب فرمائیں۔

آئینۂ دہلی جناب سید ابن الحسن فکر ایم۔ اے کی زیر ادارت دہلی سے ایک ماہواری رسالہ اڑھائی جزپر شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ تقطیع بڑی ہے۔ طباعت وکتابت اور کاغذ سب عمدہ خصوصاً رنگین ٹائیٹل پیج نظر فریب ہے۔ قیمت سالانہ ایکروپیہ آٹھ آنہ ششماہی بارہ آنے فی پرچہ دو آنہ ۲/

اس رسالہ کی ترتیب ونوعیت مضامین دونوں قابل تعریف ہیں اور امید ہے کہ اگر پبلک نے قدر کی تو یہ رسالہ ادبیات اُردو کی معقول خدمات انجام دیگا۔ فروری ۱۹۳۳ء نمبر میں بعض تاریخی اور علمی مضامین گرانقدر شائع ہوئے ہیں۔

یادِ رفتگان

(۱) پنڈت پدم سنگھ شرما مرحوم

از منشی اقبال ورما سحرؔ ہتگامی

پارسال جب پنڈت پدم سنگھ شرما ہندوستانی اکیڈمی میں ۷ مارچ کو اپنی معرکۃ الآرا تقریر "ہندی اُردو اور ہندوستانی" کو ختم کرکے الہ آباد سے روانہ ہوئے تھے تو کسے معلوم تھا کہ فرشتۂ اجل انھیں کشاں کشاں اسی گانوں کو لئے جا رہا ہے جہاں وہ سنہ ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے تھے اور جہاں پہونچنے کے بعد پندرہ بیس دن کے اندر ہی اُنکی وفات ہو جائیگی ؛ تقریر کا موضوع اُردو اور ہندی زبانوں سے ایک مشترکہ ہندوستانی زبان کا عالمِ وجود میں لانا تھا وہ اکیڈمی ہی کے فرمایش پر تیار کیگئی تھی، وہی مرحوم کی آخری ادبی یادگار ہے جس کے لئے انھیں اکیڈمی سے ایک ہزار روپیہ حق المحنت عطا ہوا تھا۔ اس معاملہ میں ارکان اکیڈمی کی نظرِ انتخاب کا قائل ہونا پڑتا ہے، اس تقریر کیلئے پنڈت جی سے موزوں تر شخص کا ملنا واقعی دشوار تھا۔

مرحوم کا وطن موضع نائک نگلا، چاند پور، ضلع بجنور تھا۔ اس وقت وہاں پلیگ پھیلا ہوا تھا۔ اور باشندگانِ موضع اپنے گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر جان بچانے کی فکر کر رہے تھے، مرحوم کو بھی گانوں چھوڑ کر چلے جانے کا مشورہ دیا گیا۔ مگر وہ نوشتہ تقدیر کے معترف اور عوام کی خدمت کے دلدادہ تھے۔ گانوں والوں کو مصیبت میں چھوڑ کر باہر کیسے جاتے۔ انھیں ویدک طریقۂ علاج میں خاص مہارت تھی۔ اس وقت انھوں نے غریبوں کی دوا علاج کرنا ہی اپنا فرض خیال کیا اور گھر ہی پر مقیم رہے۔ آخر وبا کے زور سے وہ خود بھی محفوظ نہ رہ سکے، اور دس گیارہ روز بیمار رہکر، ۷ اپریل سنہ ۳۲ء کو جان بحق تسلیم ہوئے، علم و ادب کے سچے خادم تھے، مرتے مرتے اپنی جان عزیز کو قومی خدمت پر قربان کر دیا۔ ہندوستان اور خصوصاً ہمارے صوبہ کی ادبی انجمن میں ایک ممتاز جگہ ہمیشہ کے لئے خالی ہوگئی۔

پنڈت جی آریہ سماجی تھے، انھوں نے سب سے پہلے آریہ سماج کے اپدیشک کا کام کیا تھا۔ اوّل اوّل مضمون نگاری کے سلسلہ میں انھوں نے گورو کل کانگڑی کے ہفتہ وار اخبار ستیہ وادی ہی میں مضامین بھی لکھے تھے، جس کے وہ سنہ ۱۹۰۴ء میں اڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ پھر سنہ ۱۹۰۸ء میں وہ ویدک پریس اجمیر کے پرادپکاری نامی اخبار کے اڈیٹر ہوئے تھے، اور سنہ ۱۹۰۹ء لغایت سنہ ۱۹۱۷ء انھوں نے مہا ودیالیہ جوالا پور کے بھارت ودے اخبار کی

اڈیٹری کے فرائض انجام دیے تھے، آخرالذکر موقع پر وہ مہاودیالیہ کے سکرٹری اور پروفیسر بھی تھے، یہ سب ہوتے ہوئے بھی وہ کبھی فرقہ وارانہ خدمات سے متاثر نہیں ہوئے۔

درحقیقت پنڈت جی فطرتاً ایک ادبی شخص واقع ہوئے تھے اور ان میں وہی فراغ دلی تھی جسے خالص ادبی زندگی کا جزو لاینفک سمجھنا چاہیے، وسیع مطالعہ نے ان کے خیالات کو اور بھی وسیع بنا دیا تھا، وہ صرف سنسکرت، ہندی، اور برج بھاشا ہی کے عالم نہ تھے، بلکہ فارسی اور اُردو زبانوں پر بھی انھیں پورا قابو تھا، وہ ہر زبان کی کتب کی خریداری میں سینکڑوں روپیہ خرچ کرتے تھے، ان کے کتبخانہ میں ہزارہا کتابیں ہیں مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ انھیں اسکی دُھن میں کھانے پینے، بیماری صحت، رات دن، کسی بات کا خیال نہ ہوتا تھا، پھر انکا مطالعہ بھی کوئی رواروی کا پڑھنا نہ تھا، بلکہ وہ ہر کتاب کو غائر نظر سے دیکھتے ہوئے نشان لگاتے جاتے اور حاشیہ پر نوٹ بھی لکھتے جاتے تھے، وہ جو کچھ پڑھتے تھے محض پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ کچھ سیکھنے کے لئے، بسترِ مرگ پر پڑے رہنے کی حالت میں بھی انکا یہ شوق کم نہ ہوا تھا۔ پڑھنے کی سکت باقی نہ رہنے پر وہ دوسروں سے پڑھوا کر سننے کے برابر متقاضی رہے۔

گیتا اور رامائن کے ساتھ ہی انھیں حافظ، خیام، سعدی، وغیرہ شہرہ آفاق فارسی شعرا سے بھی گہری عقیدت تھی، اُردو میں آزاد، حالی، اور اکبر کے بہت بڑے معتقد تھے، خصوصاً اکبر کے کلام سے تو ان کو ایک طرح کا عشق تھا۔ شرما جی خود بھی بہت زندہ دل، شوخ طبع اور ظرافت پسند واقع ہوئے تھے، بہرحال ان کی یہ عقیدت اکبر کی زندگی ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ اب بھی جب کبھی وہ الہ آباد جاتے تو اکثر انکے مزار پر جاکر پھول چڑھاتے، اکبر مرحوم بھی ان کے بڑے مداح تھے؛ کہا کرتے تھے کہ اگر میری فطرت کو کسی نے سمجھا ہے تو پنڈت جی نے۔

انھیں ہر زبان کے ہزاروں اشعار یاد تھے جنھیں وہ اکثر مزہ لے لیکر پڑھا کرتے اور رقت سے آبدیدہ ہوجاتے، تحریر و تقریر میں بھی بکثرت استعمال کرتے تھے، خصوصاً اُردو اشعار کی تو بھرمار ہی رہتی تھی ان کے خطوط بھی بہت دلچسپ ہوا کرتے تھے، رواں، چُست، فقرات اور برجستہ اشعار سے مملو، جذبات سے معمور اور ہندوستانی زبان کا رنگ لئے ہوئے اکثر شاعرانہ مسائل کو بھی بڑی خوبی سے حل کیا کرتے تھے، جو ان کے علم عروض سے واقفیت کا ایک بیّن ثبوت تھا۔ وہ مضمون لکھنے میں بڑے کاہل تھے مگر خط لکھنے میں وہ سہل انگاری کو ذرا بھی دخل نہ دیتے۔ اور اپنا بہت سا وقت اسی کام کی نذر کرتے تھے، ڈاک کی راہ دیکھنا بھی ان کا ایک دلچسپ مشغلہ تھا۔

ہندی مشاعروں میں تو وہ دباؤ میں پڑ کر ہی جاتے، مگر اُردو مشاعروں کی شرکت اور صدارت سے بھی

شوق سے کرتے، کہا کرتے کہ اُردو اور ہندی مشاعروں میں دن رات کا فرق ہے، وہ خود دونوں کے قدرداں تھے۔ اور چاہتے تھے کہ ہندی شعرا زیادہ لگن سے کام کرتے ہوئے ہندی مشاعروں کو بھی کامیاب بنائیں۔

ان کا اخلاق بہت قابل ستایش تھا۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتے وہاں کے مشہور خادمان ادب سے ضرور ملتے پیش قدمی کے لحاظ سے انھیں چھوٹائی بڑائی کا بھی مطلق خیال نہ ہوتا تھا نومشق اصحاب کی وہ کھلے دل سے حوصلہ افزائی کرتے تھے، اور جب انھیں کسی کی لکھی ہوئی کوئی چیز پسند آجاتی تھی تو فوراً بذریعہ تحریر اپنی خوشنودی کا اظہار کرتے تھے، اس کے برخلاف وہ ناپسندیدگی کی حالت میں عموماً قلم نہ اٹھاتے لیکن جب اٹھاتے تو کھری کھری کہہ ڈالنے میں انھیں ذرا بھی تامل نہ ہوتا تھا۔

بے لوث تنقید نگاری ان کا خاص وصف تھا۔ وہ کسی کی رورعایت کرنا نہ جانتے تھے، انکی شہرت کی ابتدا اسی فن کی بدولت ہوئی تھی۔ پنڈت جوالا پرشاد مصر مرادآبادی مرحوم نے "بہاری ست سئی" کی شرح لکھی تھی، آپ نے اس کی تنقید میں ایک سلسلہ مضامین سرسوتی میں چھپانا شروع کیا تھا، جو بعد کو "ست سئی سنگھار" کے نام سے کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔ اس میں پنڈت جی نے مصر جی کی بُری طرح خبر لی تھی، آجکل کوئی اس طرز تحریر کو پسند کرے یا نہ کرے، مگر وہ اپنی صاف گوئی سے مجبور تھے، ساتھ ہی وہ اپنے لئے بھی کھری کھوٹی کہے جانے پر برا نہ مانتے تھے، دل میں کدورت رکھنا وہ کسی حالت میں بھی روا نہ رکھتے تھے،

استغنا اور وضعداری کا یہ حال تھا کہ آپ جب مہاودیالیہ جوالاپور میں کام کرتے تھے اس وقت بابو شیام سندر داس نے ناگری پرچارنی سبھا بنارس کی طرف سے ایک سو روپیہ مشاہرہ پر بلایا تھا مگر آپ نہ گئے، اسیطرح مالوی جی نے بھی ہندو یونیورسٹی کی پروفیسری کے لئے طلب کیا تھا جہاں معقول ترقی کی امید تھی مگر پنڈت جی کو روپیہ کی طمع نہ تھی، مہاودیالیہ میں انکی تنخواہ پچاس روپیہ سے زیادہ نہ تھی، مگر وہ وہاں کیلئے اپنی خدمات کو زیادہ مفید و کارآمد سمجھتے تھے، گھر کے امیر نہ تھے مگر دل کے کہیں زیادہ امیر تھے، طلبا کو ہمیشہ بڑے شوق سے پڑھاتے اور کسی قسم کا معاوضہ لینا گوارا نہ کرتے تھے، بلکہ بسا اوقات وہ ان کی روپیہ پیسہ سے مدد بھی کرتے تھے،

جہاں پنڈت جی ہوتے ہر وقت ایک مجلس سی لگی رہتی، آنے جانے والوں کا سلسلہ برابر قائم رہتا پنڈت جی ہر ایک کے ساتھ خلق وانکسار سے پیش آتے، وہ چائے پینے کے بہت عادی تھے جسے انھوں نے مطالعہ کیلئے زیادہ سے زیادہ دیر تک جاگتے رہنے کی غرض سے پینا شروع کیا تھا، مگر وہ تنہا پیتے تھے

اور نہ پہلے بلکہ اہالیان " مجلس کو اصرار کے ساتھ پلاکر پھر خود پیتے تھے، مہمانوں کی تواتنی آؤ بھگت کرتے کہ ان کا پنڈت جی سے جلد نجات پا جانا مشکل تھا۔

پنڈت جی کی یادگار تصنیف انکی لکھی ہوئی "بہاری ست سئی" کی شرح ہے جسمیں ست سئی کے تقریباً سوا سو دوہوں کی تفسیر کیگئی ہے، کتاب کا نصف حصہ دیباچہ کی نذر ہوا ہے، جسمیں انھوں نے دوہوں کا سنسکرت ہندی اُردو اشعار سے موازنہ کرتے ہوئے دوہوں کی فضیلت دکھلائی ہے، یہ کتاب نہایت دلکش پیرایہ میں لکھی گئی ہے، اور پنڈت جی کے علمی تبحر کا پتہ دیتی ہے افسوس کہ بار بار ارادہ کرتے ہوئے بھی وہ اسے مکمل نہ کرسکے حالانکہ انکو اس نامکمل شرح پر ۱۹۲۳ء میں ہندی ساہتیہ سمیلن کیطرف سے بارہ سو روپیہ کا منگلا پرشاد انعام ملا تھا ازاں بعد ۱۹۲۸ء میں وہ سمیلن مذکور کے صدر منتخب ہوئے تھے، اجلاس مظفر پور میں ہوا تھا۔ اس کے آٹھ برس پہلے وہ سمیلن کے صوبجاتی اجلاس کے صدر رہ چکے تھے جو مرادآباد میں منعقد ہوا تھا، انکی آخری مطبوعہ تصنیف پدم پراگ ہے جو انکے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے اسکے دیباچہ میں آپ اپنے مضامین سے خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اسوقت دل ٹھکانے نہیں ہے، دل کے ٹکڑے۔ جگر کے پارے جدا ہو رہے ہیں!.... جو مدت سے چھپے ہوئے تھے وہ چھپکر باہر نکل رہے ہیں!.... کیا پڑی تھی جو یوں اُجالے میں ظاہر ہو کر نکل پڑے!.... میرے تھے، میرے پاس پڑے رہتے.... بڑی آرزوں سے بڑی منتوں سے بلایا تھا نہ جانے تمہارے دھیان میں کتنی راتوں کو دن اور کتنے دنوں کو رات کر کے تمہارے درشن نصیب ہوئے تھے،.... پوری نگرانی اور خبرداری سے پال پوس کر بڑا کیا تھا اب جدا ہو رہے ہو اتنے دنوں کا ساتھ چھوڑ رہے ہو، کس دل سے کہوں اور کیسے کہوں کہ جاؤ؟"

پنڈت جی کو نام و نمود سے بہت نفرت تھی جسکو انھوں نے سطور بالا میں عجیب شاعرانہ کنایہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔
وہ عموماً ہندی ہی میں لکھا کرتے تھے اسکا سبب انکا دیرینہ معمول ہی تھا نہ کہ ہندی اردو کے تعلق سے کسی قسم کا امتیازی خیال، سچ پوچھئے تو انکی تحریریں اُردو ہی کا رنگ زیادہ نظر آتا ہے، بہرحال ان خصوصیات کے لحاظ سے ہم پنڈت جی کے طرز تحریر کو ہندوستانی ہی کہنا قرین انصاف سمجھتے ہیں۔

پنڈت جی کے مزاج میں کافی قدامت پسندی بھی تھی، اکثر گنگا اشنان کرتے متبرک مقامات میں پاکیزگی و عقیدت کیساتھ ہی جانا مناسب سمجھتے تھے اپنے گرو کی خدمت میں جاتے تو انکے قدموں پر سر رکھکر سجدہ کرتے اور کچھ نہ کچھ بھینٹ بھی دیتے، بزرگوں کی واجبی تعظیم اور ادبی مشاہیر کا کما حقہٗ احترام کرتے، یہی وجہ تھی کہ وہ آریہ سماجی ہوتے ہوئے بھی گوروکلوں کے جدید فضا سے بیزار رہتے اور ان کے مجمعوں سے حتی الامکان دور رہنا چاہتے تھے۔

بچپن میں انکی صحت نہایت عمدہ تھی مگر کثرت مطالعہ اور چائے کے بیجا استعمال نے ان کی صحت میں گھن لگا دیا تھا۔ وہ لکھتے کم تھے مگر جب کبھی لکھتے تو رات کے سناٹے میں۔ اس مصروفیت میں وہ اکثر راتیں آنکھوں میں کاٹ دیتے۔ اِنھیں دیرینہ بے اعتدالیوں کے اثر سے وہ اسطرف اکثر بیمار رہا کرتے تھے، اور افسوس یہ بے لوث خادم ادب صرف پچپن سال کی عمر میں پیوند خاک ہو گیا۔ ے

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

پیدائش ۱۸۷۵ء

(۲) آروگیہ سوامی مودلیار مرحوم

وفات ۱۹۳۳ء

افسوس کہ ۲۳ر جنوری ۱۹۳۳ء کو گورنمنٹ مدراس کے سابق وزیر دیوان بہادر آر۔این آروگیہ سوامی مودلیار کا ۵۸ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ آپ عیسائیوں کے رومن کیتھولک فرقہ کے ایک معزز ممبر اور صوبۂ مدراس کے محکمہ انجنیری کے ایک ممتاز رکن تھے۔ اپنے محکمہ میں آپ کو تمام صوبہ کے اندر قابل فخر شہرت وعزت حاصل تھی۔ چنانچہ سپرنٹنڈنگ انجنیر کے مرتبہ تک پہونچنے کے بعد آپ ۱۹۲۵ء میں اس سے کنارہ کش ہوگئے تھے سرکاری ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوکر آپ خدمت قوم و وطن پر کمربستہ ہوئے اور سیاسی خدمت کی بدولت آپکو قوم اور فرقہ میں اسقدر زبردست اثر حاصل ہوگیا کہ آپ مسٹر رتھنا سوامی سابق پریسیڈنٹ مدراس کونسل جیسے ممتاز فذی اثر لیڈر کے مقابلہ کامیاب ہوکر مدراس کونسل میں داخل ہوگئے ۱۹۲۶ء کے انتخابات کونسل میں جب "جسٹس پارٹی" کو شکست ہوئی۔ اور سوراجیوں نے وزارت قبول کرنیسے انکار کردیا تو انڈیپنڈنٹ پارٹی کو جس سے مرحوم کا تعلق تھا کارگذاری دکھانیکا موقع مل گیا۔ چنانچہ ڈاکٹر سوبرایان وزیر اعظم مقرر ہوئے اور انھوں نے آروگیہ سوامی مودلیار کو قلمدان وزارت سپرد کرکے اپنا رفیق کار بنالیا چونکہ مسٹر آروگیہ سوامی کو پبلک ورکس سے قدرتی لگاؤ تھا اور وہ اسمیں کارہائے نمایاں انجام دے چکے تھے، اسلئے انھیں نشو ونما و ترقی امور عامہ کے محکمے سپرد کئے گئے جس سے انکے تمام احباب جو ان محکموں سے تعلق رکھتے تھے پھولے نہ سمائے، مرحوم نے اپنی دیانتداری، آزادی پسندی اور قوم پرورانہ خیالات کے باعث بہت جلد ایک ممتاز درجہ حاصل کرلیا

ایک سال بعد جب سائمن کمیشن ہندوستان میں آیا اور ملک کیطرف سے اسکا بائیکاٹ کیا گیا۔ تو دونوں مودلیار وزیر چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں پھنس گئے۔ یعنی آئینی مسائل کے متعلق ایکطرف تو وزیر اعظم مدراس سے اور دوسری طرف خود گورنر صوبہ سے آپ کا اختلاف رائے ہوگیا جسکی وجہ سے آپنے اپنے رفیق کار مسٹر رنگ ناتھ مودلیار کے ساتھ جرأت اور حوصلہ مندی سے کام لیا اور دونوں اصحاب مارچ ۱۹۲۸ء میں اپنے عہدوں سے مستعفی ہوگئے، اس جرأت و حوصلہ مندی سے ہر دو وزراء یعنی آروگیہ سوامی اور رنگ ناتھ مودلیار کی عزت و وقعت پبلک کی نظر میں بیحد بڑھ گئی، اس واقعہ کے بعد سے مرحوم تادم مرگ نیشنلزم کے پرستار رہے اور ترقی پذیر اصلاحات کیلئے کام کرتے رہے، انکی بقیہ عمر انسداد شراب نوشی، سودیشی پروپیگنڈا، مخلوط انتخابات اور دیگر سرگرمیوں میں گذری آپنے کسی سے دب کر کوئی بات نہیں کی جب کبھی آپ کونسل میں تقریر کرتے تھے تو ہمیشہ متانت شان اور بیخوفی سے اپنے دلی مطالب کو بیان کردیا کرتے تھے، آپ ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کے آرزومند رہتے تھے، چنانچہ گذشتہ اتحاد کانفرنس الہ آباد میں آپنے شرکت فرمائی تھی، رائے کے معاملہ میں آپ کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوئے، افسوس آپکی عمر عزیز نے وفا نہ کی۔ اور آپکی وفات سے صوبہ مدراس کا ایک مشہور اور آزمودہ کار محب وطن، عیسائی فرقہ کا ایک معزز و متدین رکن اور ملک کا ایک سیاسی اور بے لوث بہی خواہ اٹھ گیا۔

عالمِ نسواں

امسال ۲۲ لغایت ۲۴- فروری ۱۹۳۳ء آل انڈیا مسلم ومنس کانفرنس کا اجلاس آگرہ میں منعقد ہوا۔ اسکے ساتھ صنعت وحرفت کی ایک نمائش بھی کیگئی تھی جسکا سلسلہ ۳- مارچ تک جاری رہا۔ بیرونجات سے تقریباً پانسو۵۰۰ خواتین ڈیلیگیٹ آئی تھیں۔ بہت سی ہندو لیڈیاں بھی شریک تھیں جلسہ کی کارروائی بیگم رحمٰن کی صدارت میں شروع ہوئی جو آگرہ کے سول سرجن لفٹننٹ کرنل رحمٰن کی اہلیہ محترمہ ہیں۔ برجیس دُلھن سکریٹری نے سالانہ رپورٹ پڑھکر سنائی جسمیں انجمن مذکور کی شاخ آگرہ کی مفصل کارگذاری بیان کی گئی تھی۔ بیگم رحمٰن صاحبہ نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ ہندوستان کی عورتوں کو اپنے وطن کا مستقبل تعمیر کرنے میں بہت کچھ حصہ لینا ہے اسلیئے اب لمبی چوڑی تقریروں کا زمانہ نہیں رہا بلکہ عمل کا وقت آگیا ہے۔ تعلیم نسواں کے متعلق آپ نے فرمایا کہ اگرچہ اس سمت بہت کچھ ہو چکا ہے لیکن ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ جبتک ہندوستان کی عورتیں تعلیم یافتہ نہونگی وہ دیگر اقوام کی عورتوں کے برابر نہیں ہو سکتیں۔

ہندوستان کی بیواؤں کی حالت خاص طور پر قابل رحم ہے اور اُنکی تعداد بھی بہت زیادہ ہے چنانچہ پچھلی مردم شماری کی رو سے اس وقت ملک میں ایک کروڑ ۶۷ لاکھ ۹۷ ہزار ۴۰۸ بیوہ عورتیں ہیں جنکی تفصیل صوبہ وار حسب ذیل ہے:-

پنجاب، دہلی اور صوبہ سرحدی	۸۰۷۱۰۷	راجپوتانہ	۳۵۴۲۰۵
صوبجات متحدہ	۳۳۷۱۹۸۴	احاطہ بمبئی	۱۹۵۸۴۱۹
بہار واڑیسہ	۳۰۴۳۸۹۰	صوبجات متوسط	۱۰۸۵۹۹۰
بنگال وآسام	۲۸۱۷۳۷۴	احاطہ مدراس	۳۹۴۳۹۷۱

جس ملک میں اتنی عورتیں رنڈاپے کے دُکھ جھیل رہی ہوں وہ ملک کیونکر ترقی کر سکتا ہے؟

مسز کملا بائی سیٹھی ایم۔ اے رائل جیاگرفیکل سوسائٹی کی ممبر منتخب ہوئی ہیں۔ آپ پہلی ہندوستانی خاتون ہیں جن کو یہ اعزاز نصیب ہوا ہے۔

ہزہائینس بیگم صاحبہ رامپور نے رفاہِ عام کی خاطر قابل قدر ایثار سے کام لیکر اپنے محل کے مصارف میں ساڑھے چار لاکھ روپیہ سالانہ کی تخفیف منظور فرمائی ہے۔ آپ اس رقم کو ریاست میں توسیع تعلیم پر صرف کرنا چاہتی ہیں۔ آپ کو شعر و سخن سے بھی ذوق ہے۔ چنانچہ ہزہائینس نواب صاحب بہادر کی جشن سالگرہ کے موقع پر جو مہتم بالشان مشاعرہ ہوا اس کے لئے آپ نے ایک خاص غزل ارشاد فرمائی۔

چند روز ہوئے میر بلدیۂ بغداد نے ایک کمیٹی کی مدد سے ماڈ ہوٹل میں ایک بزم رقص و سرود کا انتظام کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ اس کی آمدنی سے انجمن ہلال احمر کی امداد و اعانت کی جائے۔ اس جلسہ میں تقریباً تین سو معززین نے شرکت کی جنمیں بہت سی عراقی خواتین بھی تھیں۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جدید عراق بھی قدامت پرستی کی زنجیریں توڑ کر مغربیت کا رنگ قبول کر رہا ہے۔ دس برس قبل اس قسم کی بزم رقص و سرود کا انتظام محالات سے تھا۔ یقیناً آیندہ دس سال کے اندر اس قسم کی صحبتیں معمول میں شمار ہونے لگیں گی۔

ہندوستان کے طبقۂ نسواں میں بھی اپنے حقوق کا احساس پیدا ہو رہا ہے اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے کیا جا سکتا ہے جو ڈسٹرکٹ بورڈ اوناؤ کی لیڈی ممبر ساجدہ بیگم صاحبہ کی تقریر سے درج کیا جاتا ہے آپ کو گورنمنٹ صوبہ نے حال ہی میں اوناؤ ضلع بورڈ کا ممبر نامزد کیا ہے اور آپ نے اس کے پہلے ہی جلسہ میں جو اظہار خیالات کیا اس میں بجاطور پر آپ نے مردوں پر عورتوں کے حقوق غصب کر لینے کا الزام عاید کیا ہے آپ نے فرمایا کہ "اب ہماری حیثیت ایک "لونڈی" کی نہیں ہے، ہمارے حقوق مردوں کے برابر ہیں۔ عام مردوں کا خیال ہے کہ عورت کا کام صرف شوہر کی وفاداری ہے اور اس کو دنیا کے معاملات سے بیخبر رہنا چاہیئے گر جبتک عورت کو باعتبار قابلیت مرد کی سطح پر نہ لایا جائیگا وہ ضروری اوصاف سے متصف نہ ہو سکیگی"۔

فرانس کے ایک زنانہ اخبار نے اپنے ناظرین سے یہ سوال کیا تھا کہ "کیا محبوبیت کے لئے عورت کا حسین و جمیل ہونا لازمی ہے؟" اس کے جواب وزرا حکومت، ممبران پارلیمنٹ، وکلا، فسانہ نگاروں، مصوروں، پوشاک سازوں اور ہزارہا دیگر حضرات نے دیئے جو نفی و اثبات دونوں میں تھے۔ سب جوابوں کا اوسط نکالا گیا تو معلوم ہوا کہ عورت کیلئے پانچ خصوصیات لازمی ہیں:۔ (۱) حسن و جمال (۲) ناز و ادا (۳) بذلہ سنجی (۴) ذکاوت (۵) فراخدلی۔

سرگزشتِ دل

(از خانصاحب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی بی۔ اے ڈپٹی کلکٹر)

ارمان ہیں تیرے دلِ ناشاد نرالے — ایسا ہو کہ وہ شوخ تجھے پاس بلالے

مجھ سے نہ برا ہوگا کوئی اب جو کہا کچھ — کیا خوب عجب تونے تو اطوار نکالے

بس ہوش میں آ، دیکھ نتیجہ نہیں اچھا — نادان سنبھل، جان کے پڑ جائینگے لالے

سمجھایا بہت حیف مری بات نہ مانی — ہنگامہ بپا کرنے لگے ہجر میں نالے

وہ گریۂ جانسوز، کہ ہر اشک تھا چھالا — وہ آہ شرر ریز کہ جل اُٹھتے تھے چھالے

اس طرح تڑپتا تھا، لہو روتی تھیں آنکھیں — آنکھیں تھیں کہ لبریز لہو سے تھے پیالے

القصہ وہ عالم تھا کہ پھٹتا تھا کلیجا — دشمن پہ بھی اللہ بُرا وقت نہ ڈالے

ناچار لئے دل کو گیا تا درِ جاناں — آواز دی، اک عاجز و بیکس کی دُعا لے

دھوکے میں گدا کے وہ ہوا لطف پہ مائل — کی عرض یہ میں نے کہ مری جان بچالے

دل ہے مرے پہلو میں وہ سیماب کا ٹکڑا — تھمتا ہے جو تھامے، نہ سنبھلتا ہے سنبھالے

مشہور جہاں میں ہے تری شیریں سخنی ہے — اس غمزدہ کو باتوں ہی باتوں میں لُبھالے

یا چشمِ فسوں ساز سے کر چشم نمائی — یا زلف کو لہرا کے پہ بیدار بنالے

یا اور جو تدبیر مناسب ہو وہ کرنا — دل تیرے سپرد اور خدا کے تو حوالے

فرمایا کہ منظور ہے خاطر تری مجھکو — پر خستۂ و دل ریش ہے دم ایک ذرا لے

اتنے ہی میں تلنے لگیں پلکوں کی سنانیں — اور ابروؤں نے کھینچے تن تن کے سنبھالے

نرغے میں کرشموں نے دلِ زار کو گھیرا — اور ٹوٹ پڑے ساتھ ہی غمزوں کے رسالے

تھے وار پہ وار اور جراحت پہ جراحت — اللہ نہ ڈالے کسی بے درد کے پلے

جس عہد کا یہ ذکر ہے اب اُس کی نشانی

کچھ داغ ہیں، کچھ زخم ہیں، یہ نم ہیں، وہ آلے

کلام آرزو

(از جناب سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی)

ذیل میں حضرت آرزو لکھنوی کی دو غزلیں ہدیۂ ناظرین ہیں۔ ایک غزل حضرت موصوف کے خاص انداز بیان خالص اردو میں ہے دوسری غیر مقید اردو میں ہے ناظرین دونوں کا لطف اٹھائیں اور حضرت آرزو کے کمالِ فن کی داد دیں۔ (ایڈیٹر)

(خالص اردو)

الگ رہی جیتے جی سدا جو وہ رو رہے تھے لپٹ لپٹ کے
گھڑی گھڑی پھرتی پتلیوں نے سماں دکھایا پلٹ پلٹ کے

جو آنسو آنکھوں میں آچکے ہیں کہاں وہ جائینگے اب پلٹ کے
یہ چڑھتے پانی کے ہیں تھپیڑے پڑینگے منہ پر الٹ الٹ کے

کٹا رچھون لیے کھڑی تھی کرید کرنے کو میرے جی کی
لہو تھا جتنا بھی پل بھر میں سب اک جگہ آگیا سمٹ کے

نہ اسکو پوچھو کہ کس لیئے تھا یہ رو کے ہنسنا یہ ہنس کے رونا
اک ان کہی دکھ بھری کہانی دکھادی تمکو الٹ پلٹ کے

تھمے جو آنسو رکی نہ ہچکی بندھی ہوئی آس اور لوٹی
مہین سا سانس کا یہ ڈورا اور اسپہ ایسے کرارے جھٹکے

یہ ایک ہم ہیں کہ جیسے چھوٹے لگی ہے چپ دھیان میں تمہارے
وہ ایک تم ہو کہ جس نے ابتک نہ بات پوچھی کبھی پلٹ کے

ہے جی تو بیکل کہاں کا سونا پڑا ہے سمٹا ہوا بچھونا
جو ساتھ لیکر تمھیں نہ آئے وہ نیند آنکھوں میں کیوں نہ کھٹکے

بھنور سے نکلی جو ناؤ بچکر تو پار اترنے میں کھائی ٹھوکر
بڑھا کے رکھا تھا پاؤں جسپر وہی کگار اگرا ہے پھٹ کے

جو مار رکھا ہے جی کو تم نے نہ آرزو اب تمہیں ہے دینا
ہوئی جو مٹھی ذرا بھی ڈھیلی یہ سانپ کاٹیگا پھر پلٹ کے

غزل غیر مقید (اردو)

دیا وہ درد کہ جسمیں سکونِ جاں دیکھا	تری نظر ہی کو دل کا مزاجداں دیکھا
خود اضطراب کو وجہ سکونِ جاں دیکھا	اجل کو زیست کا اپنی مزاجداں دیکھا
ہزار اُلٹے حجاباتِ حُسن کے دفتر	پھر ایک نہ ایک ورقِ سادہ درمیاں دیکھا
عدو نہ تھی مگر اندھی صرور تھی بجلی	کہ دیکھے پھول نہ غنچے نہ آشیاں دیکھا
ہوا سمیٹے رہی مشتِ خاک وحشی کی	ہمیشہ ایک بگولا رواں دواں دیکھا
وہ تلخ زہر تھے جو نعمتوں کے بھیس میں تھے	نشاطِ حرص کو خود کر کے رائگاں دیکھا
غضب تھا خاتمہ سوزِ عشق کا منظر	بھڑکتے شعلہ کو بنتے ہوئے دھواں دیکھا
تھے اختیار بھی دے کر وہ جبر پر مجبور	اسیر کر دیا جس کو رواں دواں دیکھا
کہاں ہے منہ پہ وہ خودداریوں کی اب رونق	اِن آنسوؤں کا مٹایا ہوا نشاں دیکھا
جتا نہ مفت کا احسان دیکھ برقِ جمال	جھپکتے آنکھ تو دیکھی تجھے کہاں دیکھا
ممدّدِ واسطہ ہے جذبِ عشق کی تکمیل	وہ پہلے کشتہ ہوا جس کو درمیاں دیکھا
سکونِ دل اسی تصدیقِ اضطراب میں ہے	نہ آنکھ کھول مگر کہہ تو دے کہ ہاں دیکھا
سزا بنی ہوسِ ناروا کی دیدِ جمال	نظر نے اپنے ہی جلنے کا کچھ دھواں دیکھا
فقط تھی عجزِ طلب حسنِ بے نقاب کی آڑ	جہاں نگاہ نہ پہونچی تجھے وہاں دیکھا

سرِ نیاز اب اے آرزو ہے قابلِ ناز
کہ جس جگہ پہ جھکا اُس کا آستاں دیکھا

ماہتاب

(از منشی گرسرن لال صاحب ادیب لکھنوی، بی۔اے)

ماہتابِ پُرضیا کیا خوب سیارا ہے تو — عین ظلمت میں ہماری آنکھ کا تارا ہے تو
کیا تعجب ہے جو اہلِ خاک کو پیارا ہے تو — جانتے ہیں سب ہمارا ہی جگر پارا ہے تو

ماہِ نو سے رفتہ رفتہ ماہِ کامل بن گیا
پارۂ دل تھا مگر اب سر بسر دل بن گیا

رونقِ بزمِ فلک ہی تجھ سے اے شب زندہ دار — وسطِ گردوں میں ترا جلوہ ہے با عزّ و وقار
تیرے ہر جانب ستارے ہیں قطار اندر قطار — جھلملاتے ہیں کہ ہیں تیری ضیا سے شرمسار

ہے رخِ پُرنور کے چاروں طرف ہالہ ترا
کیوں نہ عظمت کا مُقر ہو دیکھنے والا ترا

منحصر ہے تجھ پہ اکثر بزمِ ہستی کا نظام — تو وزیرِ شاہِ خاور ہے نہیں اسمیں کلام
اِک اشارے کا نتیجہ ہے ترے ماہِ صیام — رونمائی تیری ہی عید الفطر کا ہے پیام

خود شرابِ نور کا لبریز پیمانہ ہے تو
بادہ نوشوں کو کلیدِ بابِ میخانہ ہے تو

ہے مسلّم بزمِ ہستی میں ترا عزّ و وقار — دیدنی بیشک ہے تیری بامِ گردوں پر بہار
حُسن کی تشبیہ تک لیتے ہیں تجھ سے مستعار — ہاں مگر یہ کیا ہے کیوں ہے تیرا سینہ داغدار

یاس کیوں ہے تجھ پہ طاری دل ترا کیوں سرد ہے
اس قدر خاموش کیوں ہے رنگِ رخ کیوں زرد ہے

دوریِ منزل کا شاید ہے ترے دل میں ملال — آگیا ہے یا تجھے اپنی حقیقت کا خیال
کر دیا ہے گردشِ گردوں نے تجھکو پائمال — ہوگئی ہے تجھ کو دامنگیر یا فکرِ مآل

کیا سمجھتا ہے کہ تیرا رازداں کوئی نہیں
"ہم نفس کوئی نہیں اور مہرباں کوئی نہیں"

میں سمجھتا ہوں جو کچھ اے ماہ تیرے دل میں ہے — دل کہیں ہے اور تیرا گرچہ تو محفل میں ہے
گردشِ پیہم سے تیری جاں بڑی مشکل میں ہے — تیرہ بختی آہ مضمر تیرے آب و گل میں ہے

غم نہ ہو کیونکر کہ تو اپنے وطن سے دور ہے
رکن تھا جس کا کبھی اُس انجمن سے دور ہے

اب فقط تو میہماں ہے رات بھر کا ماہتاب — چند ساعت میں چڑھیگا تجھ پہ رنگِ انقلاب
چرخ پر ہوگی رواں جب موجِ نورِ آفتاب — اس طرح مٹ جائیگا تو جیسے پانی کا حباب

صبح کو معدوم تو اے سیمتن ہو جائے گا
آہ دامانِ سحر تیرا کفن ہو جائے گا

رباعی

معذور ہوں ابتذال ہستی یہ ہے — مجبور ہوں، آدمی کی پستی یہ ہے
جو ذرہ ہے، مظہرِ حقیقت یہ ہے — محدود نظر ہو، بت پرستی یہ ہے

(چودہری جگت موہن لال) (دکارماں)

رموز و نکات

(از حضرت ابوالفاضل راز چاندپوری)

بے کیف ہے کچھ آج طبیعت ساقی! بے رنگ ہے رنگِ بزمِ غربت ساقی
اِک جامِ نشاط خیز، تیرے قرباں دینی ہے دادِ حُسنِ فطرت ساقی

یہ عزمِ سفر، پیامِ راحت ہو جائے فکرِ منزل سے مجھکو فرصت ہو جائے
اے رہبرِ خوش خرام تیرے قرباں طے شام سے پہلے دشتِ غربت ہو جائے

کیا فکر، اگر ہے راہِ مقصد دشوار کیا غم ہے، اگر نہیں ہے کوئی غمخوار
یہ ہمتِ سربلند و عزمِ راسخ کافی ہے دلیلِ کامیابی، ہشیار

یہ لطف و کرم، یہ رہنمائی تیری ہمّت افزا ہے خوشنوائی تیری
بیشک ہے یقینِ کامیابی مجھکو واللہ، یہ رمز آشنائی تیری!

یہ جامِ شرابِ ناب، کیا کہنا ہے یہ ماہ، یہ آفتاب، کیا کہنا ہے
اے ساقیِ ذی وقار و عالی ہمت میں اور ہوں کامیاب، کیا کہنا ہے

نوائے محوی

از مولوی محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنوی (اُردو لکچرار مدراس یونیورسٹی)

ہو نہ کمی خدا کرے ہمتِ غم نواز میں
ہے کچھ اسی سے روح سی شیوۂ ضبطِ راز میں

کچھ نہ سمجھ سکا کوئی اُن کی حریمِ ناز میں
کہہ گیا اپنا دردِ دل کوئی نوائے ساز میں

قوتِ جذبِ دل سہی حُسنِ کرشمہ ساز میں
کیف کہاں سے لائیے زندگیِ مجاز میں

جان دی اور اُف نہ کی کوششِ ضبطِ راز میں
ایک یہی تو بات تھی عاشقِ پاک باز میں

ہو گئے کتنے دل تباہ مٹ گئے کتنے بے گناہ
حُسن کی ترک تاز میں یعنی فریبِ ناز میں

خاک میں مل گئیں مگر اب بھی ہیں کتنی صورتیں
اے دلِ عبرت آشنا دیدۂ امتیاز میں

تیری نہیں نے توڑ دی ہمتِ زندگی مری
جوششِ وفا کہاں رہا جانِ الم نواز میں

بھر دی ہیں کتنی بجلیاں سوزِ غمِ فراق نے
نالۂ غم طراز میں، آہِ جگر گداز میں

تیرا تبسمِ خفیف، ہو کہ نگاہِ عشوہ ریز
پھونک دی ہے کسی نے روح پھر دلِ غم نواز میں

مجھکو دیا جنونِ عشق، تجھ کو فسونِ دلبری
کس کو مجالِ دخل ہے حکمتِ کارساز میں

دردو اثر کی بجلیاں، سوزِ جگر کی گرمیاں
بھر دی ہیں کس نے خامۂ محویِ غم طراز میں

علمی نوٹ اور خبریں

پچھلے ماہ لکھنؤ یونیورسٹی کے توسیع علوم کے سلسلے میں مدراس کے نامور ادیب و مصنف مسٹر کے ایس۔ ونکٹ رمنی صاحب نے دو قابل ذکر لکچر دیئے جن کے عنوان "جمہوریت اور علم ادب" اور "علم ادب اور زمانۂ حال" تھے۔ ان لکچروں کے دوران میں فاضل ادیب نے فرمایا کہ جمہوریت کا علم ادب سے خاص تعلق ہے، کیونکہ جب جمہوریت کا دور دورہ ہوتا ہے تو انسان آزادی کی دھن میں اجتہاد پسند ہو جاتا ہے اور وہ اپنی عقل پر زور دیکر ہر چیز پر اعتراضات کرنے لگتا ہے اور بات بات پر سوالات کرتا ہے جیسے کوئی سائنس کا محقق۔ ادنیٰ سے ادنیٰ واقعہ کے لئے بھی اسباب و علل کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتا ہے۔ اسی طرح زمانۂ جمہوریت کے معمولی افراد بھی ہر بات کی وجہ دریافت کرتے اور ہر وجہ کی غایت کو جاننا چاہتے ہیں۔ ایسی صورت میں ادب کی پوری ترقی نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے لئے اعلیٰ درجہ کے ذہنی تاثرات کی ضرورت ہوتی ہے جن کے بغیر علم ادب اپنے اعلیٰ درجات تک پہونچ ہی نہیں سکتا ہے چنانچہ جمہوریت کی زندگی میں خواص کے بجائے عوام سے واسطہ رہتا ہے اور قابل مصنف یا نکتہ داں شاعر کے بجائے اخبار نویس پیدا ہونے لگتے ہیں جو علم و فضل پہلے کتابیں لکھنے کی تحریک کرتا تھا۔ وہی جمہوریت کے زیر سایہ لوگوں کو اپنی عقل اور ذہن پر زور دیکر ملکی معاملات پر غور کرنے، حکومت اور پبلک کی غلطیوں پر نگاہ رکھنے اور ہر طبقے کے قصوروار کو اس طرح ٹوکنے پر مائل و متوجہ کرتا ہے جیسے کوئی پہرہ دار سنتری ہر آنے جانے والے اجنبی کو روکتا ٹوکتا رہتا ہے بقول سعدی

سگ و دربان چو یافتند غریب   ایں گریباں گرفت و آں دامن

لیکن جب جمہوریت ابتدائی مراحل طے کر چکتی ہے اور اپنے اعلیٰ نصب العین کی طرف پہونچنے کی کوشش کرتی ہے اور اس کا مقولہ "عوام الناس کی خدمت اور اہل ملک سے محبت" ہو جاتا ہے تو پھر علم ادب کی ترقی کی باری آتی ہے۔ جیسے خزاں کے بعد موسم بہار میں جب درخت نئے پتوں سے لد جاتے ہیں تو پھولوں کے نکلنے اور پھلوں کے لگنے کے دن آتے ہیں۔

دوسرے لکچر کا مضمون "علم ادب اور زمانۂ حال" پہلے دن کے لکچر سے زیادہ عام فہم تھا۔ چنانچہ اس کے

دوران میں فاضل لکچرار نے فرمایا کہ ہندوستان میں علم ادب کے جو بڑے بڑے ماہر آجکل موجود ہیں اُس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ زمانہ علم ادب کی ترقی کا زمانہ ہے۔ مثال کے لئے آپ نے ملک کی بڑی بڑی ہستیوں کا شمار کرایا جیسے مہاتما گاندھی۔ ڈاکٹر ٹیگور۔ مسز سروجنی نیڈو۔ سر محمد اقبال سر سی۔ وی۔ رمن۔ سر ایس۔ رادھا کرشن۔ سر جگدیش چندر بوس۔ اور سر پی۔ سی۔ رائے جنھوں نے ہمارے ملک ہندوستان کو دنیا کی نگاہ میں بہت اونچا اُٹھا دیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہمیں ملک کی اس موجودہ ترقی کو مفت رائیگاں نہ کرنا چاہیئے بلکہ ایسی کوشش کرنا چاہیئے اور وہ تدابیر اختیار کرنا چاہیئے جن سے یہ ترقی مستقل اور دیرپا ہو۔

آپ نے اس سلسلے میں کئی علمی تجاویز بھی پیش کیں جنھیں ہم درج ذیل کرتے ہیں

(۱) ہندوستان کی بڑی بڑی زبانوں میں اعلیٰ تصانیف کے لئے سالانہ انعامات مقرر کئے جائیں۔ اور جس طرح نوبل انعام دیا جاتا ہے اسی طرح ایک بڑا انعام بھی مقرر کیا جائے جو کم از کم دس ہزار کا ہو۔

(۲) تمام ملک کے مصنفوں کی ایک انجمن قائم کی جائے

(۳) ہر سال کسی خاص مقام پر جو سالانہ تبدیل ہوتا رہے مصنفین جمع ہو کر تبادلہ خیالات کیا کریں۔

(۴) تمام ہندوستان کے لئے ایک عظیم الشان دار الاشاعت قائم کیا جائے جس کی شاخیں مختلف زبانوں کے لحاظ سے مختلف مقامات میں کھولی جائیں۔

ہم کو امید ہے کہ ہمارے ملک کے ارباب حل و عقد ان تجاویز کی طرف مناسب توجہ دیں گے۔

لالہ سری رام صاحب دہلوی مرحوم نے خمخانۂ جاوید کے نام سے اُردو شاعروں کا جو نا تمام مگر ضخیم تذکرہ مرتب کیا تھا اسکی پانچویں جلد اُردو کے مشہور محقق و مصنف پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی کے زیر نگرانی مرتب ہو کر اشاعت کے لئے مطبع بھیجدی گئی ہے۔ لالہ صاحب مرحوم اپنا کتب خانہ اور خمخانۂ جاوید کی جلدیں ہندو یونیورسٹی کے نام وقف کر گئے ہیں چنانچہ خمخانہ کی کل جلدیں اب یونیورسٹی ہی سے ملسکتی ہیں

بنارس یونیورسٹی کے مولوی فاضل پروفیسر مہیش پرشاد صاحب رقعات غالب کا ایک خاص و مکمل ایڈیشن مرتب کر رہے ہیں جس میں آپ نے تمام خطوط کو سلسلہ وار ضروری حواشی اور تشریحی نوٹوں کے ساتھ جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس وقت دنیا میں دو ہزار سات سو پچاس زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یوروپین زبانوں میں انگریزی زبان کے بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ یعنی اسّی کروڑ بتلائی جاتی ہے۔ فرانسیسی بولنے والے چار کروڑ دس لاکھ جرمن بولنے والے چھ کروڑ ۹ لاکھ۔ اطالوی بولنے والے تین کروڑ ہسپانوی زبان بولنے والے چار کروڑ دس لاکھ۔ روسی بولنے والے چھ کرور سات لاکھ اور پرتگالی بولنے والے ایک کرور تین لاکھ بتلائے جاتے ہیں۔

دنیا کے ہر ترقی کرنے والے ملک میں اس وقت اپنی اپنی ملکی زبان کو فروغ دینے کا خیال عام ہو رہا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں شاہ عراق نے ایک فرمان جاری کیا ہے جس کی رو سے حکومت عراق کے دفاتر میں صرف عربی زبان استعمال کی جائیگی اور انگریزی کو بالکل ترک کر دیا جائیگا۔

لالہ سری رام مرحوم اپنا بیش بہا کتب خانہ بنارس یونیورسٹی کو وقف کر گئے ہیں۔ اس میں فارسی کے ۶۶۳ قلمی نسخے اور ۴۰۰۴ مطبوعہ کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ عہد مغلیہ کے مصوری کی بہت سے بیش قیمت نمونے بھی اس مجموعے میں شامل ہیں جن میں سے بعض کا شمار نایاب نوادرات میں ہے۔

ہندو یونیورسٹی بنارس ہندی بھاشا کی توسیع و ترقی میں خاص خدمات انجام دے رہی ہے۔ چنانچہ پچھلے سال انٹرمیڈیٹ کلاس کی چند درسی کتابوں کے علاوہ یونیورسٹی نے مندرجہ ذیل کتابیں بھی شائع کیں

(۱) سادھارن رسائن (مبادیات کیمیا) حصہ اول و دوم۔ مصنفہ پروفیسر پی۔ ایس۔ ورما۔

(۲) سواستیہ رکھین (حفظان صحت) از ڈاکٹر ایم۔ ایس۔ ورما۔

(۳) بھارتیہ لوک نیتی اور سبھیتا (تہذیب و تمدن ہند) از پروفیسر ایس۔ وی پونبکار

(۴) بھارت کا اتھاس، ہندو کال (تاریخ ہندوستان۔ ہندوؤں کا عروج) از پنڈت گنگا پرشاد مہتا۔

ابتک افغانستان کے سرکاری دفاتر اور عدالتوں کی زبان فارسی چلی آتی تھی، لیکن اب وہاں کی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ فارسی کے بجائے پشتو زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت دی جائے۔ چنانچہ آیندہ سال سے سرکاری مدارس میں ہر طالب علم کے لئے پشتو زبان ایک لازمی مضمون ہوگا، تاکہ کچھ عرصہ کے بعد دفاتر میں فارسی کی جگہ پشتو لے سکے۔ پشتو زبان کی ترقی کے لئے ایک انجمن بھی قائم کی گئی ہے جو

عنقریب ہی ایک پشتو رسالہ جاری کرے گی،

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ مہاتما گاندھی کبھی کبھی اُردو میں بھی خط لکھتے ہیں۔ چنانچہ جنوری گذشتہ میں اُنھوں نے ڈاکٹر عالم صاحب کی بیگم صاحبہ کو ایک خط لکھا تھا جو معصر سرفراز لکھنؤ کی عنایت سے ناظرین زمانہ کے تفنن طبع کے لئے لفظ بہ لفظ درج ذیل کرتے ہیں:۔

"پیاری بہن! تمہارا خط مجھے ملا ہے، سمجھ میں نہیں آتا میرے خط تم کو کیوں نہیں ملتے، لاہور کا بھی نہ ملا اور کلکتہ کا بھی، میں نے دونوں میں پتہ ٹھیک جو تم نے بتلایا تھا وہی دیا تھا، اب دیکھیں اسکا کیا حال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو آرام ہو رہا ہے یہ جانکر بہوت خشی ہوئی ہے۔ خدا ان کو بالکل تندرست کرے، ملک کے لئے انکا بہت کام ہے، مجھے سب حال دیتی رہو۔ پہلے ڈاکٹر صاحب لکھ بھی سکتے ہیں تمہارا خط میرے لئے اُردو کا سبق ہوتا ہے "البینا" اور زہرہ تو دے رہی ہیں۔ ہم سب مجے (مزے) میں ہیں اب ہم جا ہیں آشرم کے چھگن لال جوشی کو مدد کے لئے سرکار نے بھیج دئیے ہیں۔ آجکل ہری جنوں کے کام میں بہت وقت دینا پڑتا ہے۔ باپو کو دعا۔"

معلوم ہوا ہے کہ اسی طرح کے وہ خط ڈاکٹر عالم کو بھی موصول ہوئے ہیں۔

شہنشاہ اکبر کے دربار کا جو تاریخی مرقع اس نمبر کے ساتھ ہدیۂ ناظرین ہے اس کی اصل ہمارے مرحوم دوست اور راجپوتانہ کے مشہور مورخ منشی دیبی پرشاد صاحب جودھپوری سے دستیاب ہوئی تھی منشی صاحب زمانہ کے مضمون نگاروں میں بھی تھے اور ان کے کئی دلچسپ مضامین اور نادر تاریخی تصاویر زمانہ کی پرانی جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ منشی صاحب نے اُردو میں کئی اہم تاریخی تصانیف بھی اپنی یادگار چھوڑی ہیں اور اُردو کے ہندو شاعروں کا ایک تذکرہ آثار الشعرائے ہنود کے نام سے لکھا تھا جو مطبع رضوی دہلی میں تمبر ۱۸۸۵ء میں طبع ہوا تھا۔

ایک اہم سوال؟

کیا آپ نے رسالہ زمانہ کی توسیع اشاعت کی طرف توجہ فرمائی ہے؟

اگر نہیں تو

اس ضروری مسئلہ پر کبتک متوجہ ہونے کا خیال ہے؟

پھنسیوں والے مجروح یا بیمار جلد کو جادو کی طرح شفا ہوتی ہے



زمبک دنیا کا سب سے بڑا شفا بخش مرہم ہے

دنیائے سائنس میں کوئی معلوم شئے اسقدر حیرت انگیز شفا بخش طاقتوں کی حامل نہیں ہے جیسی کہ زمبک، جڑی بوٹیوں کا یہ عجیب مرہم درد و خارش کا جادو کی طرح خاتمہ کر دیتا ہے۔ یہ ورم کو بہت جلد تحلیل کر دیتا ہے، اور خون میں سمیت پیدا کرنیوالے جراثیم کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔

زمبک اس قدر پاک صاف اور لطیف چیز ہے کہ وہ لگاتے ہی جسم میں جذب ہو جاتا ہے اور اسطرح براہ راست بیماری کی جڑ پر اثر کرتا ہے، زمبک تمام مادہ فاسدہ کو خارج کر کے نئی اور مضبوط جلد پیدا کر دیتا ہے

اکزیما، ناسور، زہرباد، کھڑی ٹانگوں، خارش، پھنسیوں، پھوڑوں، جلے کٹے زخموں، چھلنے اور آنتوں کے خوفناک لوا سیر کیلئے زمبک ایک مجرب چیز ہے،

تمام دوافروش زمبک کا ایک روپیہ دو آنہ فی ڈبیہ فروخت کرتے ہیں،

ایجنٹس: میسرز اسمتھ اسٹینس اسٹریٹ اینڈ کو لمیٹڈ انٹالی کلکتہ

حیوانی چربی سے پاک

Zam Buk زمبک

ہاف ٹون عکسی تصاویر جنکو عام مقبولیت حاصل ہے

تصاویر رنگین

مسیح ابن مریم ۲ر
نغمۂ محبت ۲ر
موسم سرما ۲ر
باد بہاری ۲ر
انتظار ہدایت ۲ر
نواب راحت ۲ر
گل پنج روزہ ۲ر
رفیق طفلی ۲ر
شکنتلا اور دشینت ۲ر
شعل ہدایت ۲ر
تار شکستہ ۲ر
صبح نوروزی ۲ر
روح اور گناہ ۲ر
عکس رخ یار ۲ر
نورجہاں کی حسن تدبیر ۲ر
سیٹھ جمنالال بجاج ۲ر
ڈاکٹر مختار احمد انصاری ۲ر
سردار ولبھ بھائی پٹیل ۲ر
شہنشاہ جہانگیر چوگاں کھیل رہے ہیں ۲ر
پیام محبت ۲ر

فن تصویر کے نمونے

کثرت میں وحدت ۲ر
وقت نزع ۲ر
رام بن باس ۲ر
کرشن و جسودھاجی ۲ر
نظر بد کا اُتار ۲ر

راجہ اج کا ملاپ ۲ر
بھکارنی ۲ر
گنگا اور بھیشم ۲ر
سمندر ساشن ۲ر
امید وفاداری ۲ر
مہاراجہ پرتھی راج ۲ر
شیواجی اور رام داس ۲ر
جنگ یورپ کا ایک معرکہ ۲ر
ایک قدیم مشرقی مدبر ۲ر
مصطفے کمال پاشا کی ترکی کونسل ۲ر
غسل کی تیاری ۲ر
ستیہ وان اور ساوتری ۲ر
راجہ کمایڈ کے بیٹے کا قتل ۲ر
باسدیو اور دیوکی نند ۲ر
گوتم بدھ ۱ر
زوجہ پلیس متعلق سکھ تعداد ۱ر
کالی داس ۱ر
اکبر اعظم ۲ر
راجہ مان سنگھ ۲ر
اکبر اور چیتے کا شکار ۲ر
دربار شاہجہاں ۲ر
عہد مغلیہ میں شاہی سواری کا جلوس ۲ر
محاصرہ چتوڑ ۲ر
پیدائش شاہزادہ سلیم ہر
دربار جہانگیر میں سفیر فارس ۲ر
شکوہ کا سر اورنگزیب کے سامنے ۲ر

میرن حسب ایما میر جعفر ۲ر
ٹیپو سلطان ۲ر
دربار مادھو راؤ پیشوا ۲ر
دربار شاہ عباس ۲ر

موسمی تصاویر

ماہ چیت ۲ر
ماہ بیساکھ ۲ر
ماہ جیٹھ ۲ر
ماہ اساڑھ ۲ر
ماہ ساون ۲ر
ماہ بھادوں ۲ر
ماہ ماگھ ۲ر
ماہ پھاگن ۲ر

مشہور انشاپردازان اردو

مولانا شبلیؒ ۱ر
شمس العلماء ذکاء اللہ ۱ر
شمس العلماء ڈاکٹر سید علی ۱ر
میر تعشق لکھنوی ۱ر
حضرت انیس مرحوم ۱ر
حضرت سرور ۲ر
مولوی عزیز مرزا ۲ر
بابو بالمکند گپتا ۲ر
ایڈیٹر بھارت متر ۲ر
مشاعرہ کیننگ کالج ۱۹۱۱ء ۲ر
منشی احمد علی شوق ۱ر
مرزا سلطان احمد ۱ر
مرزا محمد رفیع سودا ۲ر
مرزا انشاء اللہ خاں ۱ر

مولنا عبدالرزاق البرامکہ ۲ر
مولنا آزاد دہلوی ۲ر
مسٹر رام بابو سکسینہ ۲ر
منشی نوبت رائے نظر ۲ر
جناب چکبست ۲ر
حضرت صفی ۲ر
ڈاکٹر اقبال ۲ر
مولنا حسن نظامی ۲ر
منشی بشن نراین بھارگو ۱ر

لیڈران ہند و ناموران ملک

راجہ رام موہن رائے ۲ر
مسٹر دادا بھائی نوروجی ۲ر
سر سالار جنگ ۲ر
ڈاکٹر نذیر احمد خاں ۱ر
ارکین دیانند کالج ۱ر
مسٹر تلک ۲ر
جسٹس محمود ۲ر
بابو سریندر ناتھ بنرجی ۱ر
مسٹر کالی چرن بنرجی ۱ر
سر رام کرشن بھنڈارکر ۱ر
بابو گنگا پرشاد ورما ۲ر
سوامی دیوکانند ۲ر
مسٹر رس بہاری ۲ر
نواب محسن الملک ۲ر
ڈاکٹر نیلش چندر بنرجی ۱ر
پنڈت بشمبر ناتھ ۱ر
بابو پرتاب چندر بنرجی ۲ر
جسٹس لال چند ایم اے ۲ر

انریبل مسٹر گوکھلے ۲ر
انجمن خادمان ہند ۲ر
مسٹر داس مرحوم ۲ر
مہاتما گاندھی ۲ر
پنڈت مدن موہن مالوی ۲ر
کرنل بھولا ناتھ ۲ر
پنڈت موہن لال نہرو ۲ر
لالہ لاجپت رائے ۲ر
ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو ۲ر
سر ابراہیم رحمت اللہ ۲ر
راجہ صاحب محمود آباد ۲ر
لارڈ سنہا دو قسم ۲ر
سر آغا خاں ۲ر
مولانا محمد علی ۲ر
مسٹر سچدانند سنہا ۲ر
مسٹر سروجنی نائیڈو ۲ر
مسٹر وی پی مادھو راؤ ۱ر
میاں سر محمد شفیع ۲ر
مہاتما تلسی رام ۲ر
سوامی شردھانند ۲ر
سر بیندر ناتھ ٹیگور ۲ر
بابو بھگوان داس ۱ر
نواب سید حسن بلگرامی ۱ر
سید امیر علی ۱ر
نواب سید محمد ۱ر
سور داس ۱ر
راز و نیاز ہر

پیپس Peps

کھانسی۔ زکام۔ نزلہ۔ گلے کے زخم اور سوزش کو

سائنس کیساتھ فائدہ پہونچانیوالی عجیب و غریب ٹکیاں

ہندوستان کی آب و ہوا میں پھیپھڑوں، سینے کی بیماری اور گلے کو اچھا کرنے کے لئے "پیپس" کی بے نظیر اور حیرت انگیز دوا خاص طور پر تیار کی گئی ہے،

جونہی "پیپس" کی ٹکیہ منہ میں گھلتی ہی اس سے طاقتور شفا بخش ابخرے اٹھتے ہیں اور سانس کیساتھ سیدھے پھیپھڑوں میں پہونچتے ہیں۔ گلے کی نسوں اور سانس لینے کی نازک نلیوں کیواسطے بہت زود اثر تسکین دہ اور شفا بخش دوا ہے۔

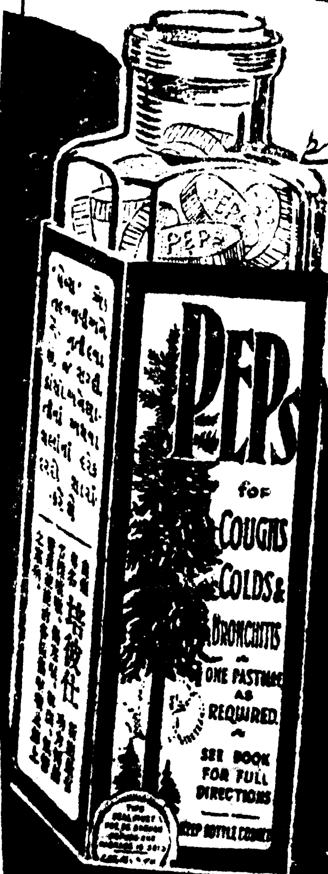
"پیپس" کی ٹکیاں گلے میں پھنسنے والا بلغم نکالتی اور ہوائی نلیوں کو صاف کرتی ہیں۔ ان سے تکلیف دہ کھانسی بھی رفع ہو جاتی ہے۔

یہ آپ کو کھانسی کھانسی۔ ٹھنڈ۔ گلے کے زخم۔ ورم۔ دمہ اور دوسری سینہ اور پھیپھڑوں کی بیماری سے محفوظ رکھے گی۔

پیپس کی ہر ایک ٹکیہ پر نقرئی غلاف چڑھا ہوا ہے

تمام دوا فروش ایک روپیہ فی شیشی میں "پیپس" فروخت کرتے ہیں۔

ایجنٹ: میسرز اسمتھ اسٹینسٹریٹ اینڈ کو لمیٹیڈ۔ نمبر ۲ کلکتہ



خمخانہ جاوید

یعنی

تذکرہ ہزار داستان

(مصنفہ)

جناب لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے مرحوم دہلوی

کسی تعارف کا محتاج نہیں، اب صرف دو حصوں کی کچھ جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔

جلد منگائیے ورنہ آئندہ کسی قیمت پر ملنا اگر محال نہیں تو دقت طلب ضرور ہوگا۔

قیمت جلد سوم
للعہ

قیمت جلد چہارم
للعہ

نوٹ۔ لالہ صاحب موصوف نے اپنی کتب کا گراں بہا سرمایہ ہندو یونیورسٹی کو عطا کیا ہے لہذا منگانے کا پتہ یہ ہے۔

لائبریرین ہندو یونیورسٹی بنارس

پنڈت سری لبھ پرنٹر سپیر دال پریس کانپور — دیا نرائن نگم ایڈیٹر و پبلشر

جملہ حقوق محفوظ ہیں — رجسٹرڈ نمبر ۴۱

زمانہ

مرتبہ: دیانرائن نگم بی اے

جلد ۶۰	اپریل ۱۹۳۳ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

تصاویر: ہز ہائنس شری یت یم سنگھ شرما۔

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت فی پرچہ ۸ آنہ — قیمت سالانہ مع محصول ڈاک

قیمت سالانہ ممالک غیر سے للعہ شلنگ ... ہندوستان کے لئے ششماہی تین روپیہ



هرایدولف هتلر چانسلر جرمني

سلطوند

مجلّہ مکتبہ



پنڈت پدم سنگھ شرما مرحوم

مدرضلیہ

زمانہ

جلد ۶۰ — اپریل ۱۹۳۳ء — نمبر ۴

نورس

(از حضرت کلیم اعظم گڈھی)

شعر کیا ہے؟ بقول لارڈ میکالے یہ ایک قسم کی نقالی ہے جو اکثر اعتبارات سے مصوری، بت تراشی اور ناٹک سے متشابہ ہے مگر یہ سب اظہار بطون میں عاجز ہیں۔ ایک اور محقق کا قول ہے کہ جو خیال ایک غیر معمولی اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعہ سے اس لئے ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اُسکو سنکر متاثر ہو وہ شعر ہے خواہ وہ نظم ہو یا نثر۔ ہندی محققین کا قول ہے کہ رعایاتِ لفظی اور محاسنِ معنوی کا نام شعر ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ کبھی چیزوں میں قیود کے لگنے سے ایک دلفریبی آجاتی ہے، جیسے پانی کو صدف کی قید موتی، خون کو ناف آہو کی قید مشک بنا دیتی ہے اسی طرح الفاظ، وزن اور بحور کی قید میں آکر ایک دلفریب شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اور جب اس میں تاثیر کی روح دوڑ جاتی ہے تو شعر بن جاتا ہے۔

ہندی اُردو میں ہر قسم کی کیفیات کے اظہار بذریعہ اشعار ہوتے ہیں۔ بعض بعض ایسے لطیف جذبات کا اظہار اشعار کے ذریعہ ہو جاتا ہے جس کی تشریح کے لئے لغت میں کافی الفاظ نہیں ملتے۔ اس سلسلے میں ہندی کے ساتھ اُردو کی مثالیں بھی پیش کی جائیں گی تاکہ موازنہ میں آسانی ہو۔

شعر کی تعریف میں تمام ہندی محققین اس رائے میں متفق ہیں کہ ایسے کلام جن میں رَس (التذاذ) ہو۔ شعر ہیں۔

تاثرات سے جو التذاذی کیفیت پیدا ہوتی ہے اُس کو رَس کہتے ہیں، یا یوں سمجھیے کہ جذبات مستقل

کی مشتل صورت کا نام رس ہے۔ رس کا کالبد جذبات اور تاثرات کے خمیر سے طیار ہوا ہے۔ جذبات کو ہندی میں भाव کہتے ہیں اور یہ ودیعت خدا ہے جو سب میں موجود ہے مگر اپنے گرد و پیش کے حالات سے کسی میں کم کسی میں زیادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ علم و عمل کے درمیان کی کڑی ہے۔ لوگ مرثیہ سنکر رونے لگتے ہیں۔ اس رونے کے فعل اور مرثیہ کے سمجھنے کی درمیانی حالت کا نام جذبہ ہے۔

تاثرات सचारी भाव (سنچاری بھاؤ) جذبات پر ٹھیس لگنے سے جو خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ تاثر ہے اور یہ اپنے ماحول کا محتاج ہے۔ بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ علم ہی جذبات ہیں مگر ان دونوں میں فرق ہے۔ علم روحانیت سے بری اور جذبات اکثر روحانیت سے مملو ہوتے ہیں علم میں خود غرضی کم ہوتی ہے اور جمہوری کی طرف جھکتا ہے۔ جذبات خودی کی طرف مائل ہیں۔ جہاں علم روحانیت سے تعلق رکھتا ہے وہیں جذبات میں تبدیل ہونے لگتا ہے۔ جہاں علم ہتھیار ڈال دیتا ہے اور تدبیر بیکار ثابت ہوتی ہے وہاں جذبات سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک شخص کا رجز سنکر لڑائی میں جان دینے کے لئے تیار ہو جانا اسکا بین ثبوت ہے کہ اگر علم اور جذبات ایک ہی چیز ہیں تو ایک پھول کو دیکھکر ایک منطقی اور ایک شاعر کا خیال یکساں ہو جانا چاہئیے۔

رس - جذبات مستقل स्याइ भाव (استھائی بھاؤ) محرک جذبات विमाव (وی بھاؤ) صورت انفعالی (अनुभाव) (انو بھاؤ) جذبات اضافی सचारी भाव (سنچاری بھاؤ) سے مرکب ہے۔

جذباتِ مستقل۔ وہ جذبات ہیں جن میں ایسی پختگی آگئی ہو کہ ہر حالت میں یکساں قائم رہیں اور دوسرے جذبات اپنے میں جذب کرلیں۔

محرک جذبات۔ وہ اسباب ہیں جو جذبات مستقل کو حرکت میں لائیں۔

صورتِ انفعالی۔ وہ نتیجہ ہیں جو جذبات کے برانگیختہ ہونے سے پیدا ہوتا ہے مثلاً خوف و دہشت ایک جذبہ مستقل ہے اسکا محرک قبرستان، سنسان میدان وغیرہ۔ اس کی صورتِ انفعالی جسم کا کانپ جانا، رونگٹے کھڑے ہو جانا وغیرہ۔

جذبات اضافی۔ وہ جذبات ہیں جو مستقل جذبات کے ساتھ ساتھ لگے رہتے ہیں اور دریا کی موج کی طرح ابھرتے اور مٹتے رہتے ہیں مثلاً تغزل میں رنج و افسوس۔ شب ہجر کی مصیبت، وصل کی خوشی رونا۔ ہنسنا وغیرہ۔ جذباتِ مستقل کی چھوٹی چھوٹی نو قسمیں ہیں جن میں ہر ایک سے ایک ایک التذاذی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

جذبات مستقل	کیفیت التذاذی	جذبات مستقل	کیفیت التذاذی
خواہش وصل رتی रती	تغزّل شرنگار رس श्रृंगार रस	غم و اندوہ شوک शोक	مرثیہ کرونا رس करुणा रस
خوشی ہاس हास	مطائبہ ہاسیہ हास्य	غصہ کرودھ क्रोध	رجز رودرس रोद रस
ہمت اُتساہ उतसाह	شجاعت بیررس बीररस	خوف بھے भय	خوف بھیانک رس भयानकरस
کراہت گلانی गलानी	نفرت وی بھتس वीभतस	تعجب آشچریہ आश्चर्य	استعجاب اوبھت अदभुत
معرفت نروید निर्वेद	معرفت شانت رس शान्त रस	[illegible]	

تغزّل (شرنگار رس - श्रृंगार रस)

تغزل کا جذبہ مستقل خواہش وصال ہے۔ اسکی تعریف ان لفظوں سے ہوسکتی ہے کہ جس کیفیت سے طبیعت میں محبوب کے وصل سے التذاذی کیفیت پیدا ہو اور جدائی میں محبوب کے حسن وجمال کی یاد سے رنج وتکلیف کا احساس اور اس کے ملنے کی سعی کرتے ہوئے آنے والے آرام کے خیال سے لطف حاصل ہو، شرنگار رس ہے۔ اسکی دو قسمیں ہیں وصال اور فراق۔

محرکات جذبہ وصال۔ یار موافق۔ چھٹکی ہوئی چاندنی۔ طمانیت بخش تنہائی۔ نسیم کے خوشگوار جھونکے وغیرہ۔

صورت انفعالی۔ حیرت۔ لرزش۔ پسینہ آجانا۔ روئیں کھڑے ہوجانا۔ گلا بیٹھنا۔ چہرہ فق ہونا۔ آنسو نکل آنا۔ محویت۔ اضطراری کیفیت۔ ملاعبت۔ غمزہ۔ سیہ مستی وغیرہ۔

جذبات اضافی۔ رقابت۔ نفرت۔ استقلال۔ یاد محبوب۔ تعجب۔ تکلیف۔ خوشی۔ خوف۔ مستی۔ شرم وغیرہ۔

نمونہ کیف وصال

सावनी तीज सोहावनी को सजि सूहें दुकूल सबै सुख साधा
त्यों पदमाकर देव बनै न बनै कहते अनुराग अगाधा
प्रेम के हेम हिंडोरन में सरसै बरसै रस संग अगाधा

राधा के हिय झूलत सांवरो सांवरो के हिय झूलत राधा

ساونی تیج سُہاونی کو سج سوہیں دوکول سبے سکھ سادھا
تیوں پدماکر دیوبنے نہ بنے کہتے اُنراگ اگادھا
پریم کے ہیم ہنڈورن میں سرسے برسے رس سنگ اگادھا
رادھاکے ہیہ جھولت سانورو سانورو کے ہیہ جھولت رادھا

پدماکر دیو رادھا کی حالت بیان کرتے ہیں کہ ساون کا مہینہ ہے، ہرطرف بدلی چھائی ہوئی ہے۔ رادھا ساونی کی خوبصورت تیج عیش اور خوشی میں پہنکر نہایت حسین ہوگئی ہے۔ محبت کے سنہرے جھولے میں محبت کے پینگ بڑھ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رادھا کرشن جی کے دل میں جھول رہی ہیں اور کرشن جی رادھا کے دل میں ؎

خدا رکھے محبت کو کئے آباد دونوں گھر
میں اُن کے دلمیں رہتا ہوں وہ میرے دلمیں رہتے ہیں (داغ)

اس موقع کے بہاری اور متی رام کے ایک ایک دوہے ملاحظہ فرمائیے ؎

डीटि बरत बांधी अटन चढ़ि धावत न डेरात
ویٹھ برت باندھی اٹن چڑھی دھاوت نہ ڈرات
इते उतै मन दुहुन को नट लौं आवत जात
اِتے اوتے من دُوہُن کو نٹ لوں آوت جات
(بہاری)

دونوں کی مشتعل نگاہیں کوٹھوں سے بندھی ہوئی ہیں اور اس پر دونوں کے دل نٹ کی طرح ادھر اُدھر بیخوف آتے جاتے ہیں ؎

ذوق :- آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا ٭ کہیں جائے نہ یہ اس جنگ وجدل میں مارا
داغ :- رکھنا وہ روک روک کے لڑتی نگاہ کا ٭ رہنا وہ تھام تھام کے دل محو دید کا

पितम को मन भावती मिलति बांह दै कंठ
پیتم کو من بھاوتی ملت بانھ دے کنٹھ
बांह छुटै न कंट ते नाहिं छुटै ना कंद
بانھ چھٹے نا کنٹھ سے ناہیں چھٹے نا کنٹھ
(متی رام)

عورت عالم خیال میں اپنے شوہر کے گلے میں ہاتھ حمائل کر دیتی ہے اور اس طرح لپٹاتی ہے کہ خود

اس کا ہاتھ اپنی گردن میں لپٹ جاتا ہے اور نہ گردن سے ہاتھ چھوٹتا ہے نہ ہاتھ سے گردن ~ آتش

گستاخ ہاتھ گردنِ دلبر میں ختم ہوا حدِ ادب سے شوق کا باہر قدم ہوا

حیرت

देखा देखी भई छुटि तब ते सकुच गई मिटी कुल कानि कैसी घूंघट को करिबो

دیکھا دیکھی بھئی چھٹی تب تے سکچ گئی مٹی کل کانی کیسی گھونگھٹ کو کریبو

लगी टक टकी उर उठी धक धकी, गति जकी मत छकी ऐसो नेह को उघारबो

لگی ٹکٹکی اُور اوٹھی دھک دھکی گت جکی مت چھکی ایسو نیہہ کو اوگھاربو

चित्र कैसे लिखे दोऊ ठाढे "कासी राम" नाहीं प्रवाह लोग लाख करो लरिबो

چتر کے سے لکھے دوؤ ٹھاڑھے کاسی رام ناہیں پرواہ لاگے لاکھ کرو لریبو۔

बंसी को बजैबो नट नागर बिसर गयो नागर बिसरि गयो गगरी को भरिबो

بنسی کو بجیبو نٹ ناگر بسر گیو ناگر بسر گیو گاگری کو بھریبو۔

رادھا اور کرشن جی کی آنکھیں یکبارگی چار ہوئیں، رادھا گھونگھٹ کا کرنا اور خاندانی شرم وحیا سب بھول گئیں ٹکٹکی بندھ گئی دل میں دھڑکن پیدا ہوئی اور ششدر ہو گئیں۔ رادھا اور کرشن جی دونوں تصویر کی طرح خاموش کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ اور محویت میں رادھا گھڑا بھرنا اور کرشن جی بنسی بجانا بھول گئے۔ ~

آنکھ کے ملتے ہی باہم چھا گئیں حیرانیاں آئینہ کی شکل یاں عالم وہاں تصویر کا (داغ)

سوز فراق

बिरह की ज्वाल सों बीजुरी जराय डारौं । — برہ کی جوالن سوں بیجوری جرائے ڈاروں

नासा से उड़ाऊं बैरी बेदरद बादरन ॥ — سوانس سے اوڑاؤں بیری بیدرد بادرن

فراق کی سوزش سے بجلی کو جلا ڈالوں اور اپنی آہ گرم سے بادلوں کو اڑا دوں ~

پڑا فلک کو کسی دل جلے سے کام نہیں

جلا کے خاک نہ کردوں تو داغ نام نہیں (داغ)

اسی طرح فراق۔ اشکباری۔ یاد محبوب وغیرہ کی مثالیں سمجھئے۔

(۳) مطایبہ (हास्य रस ہاسیہ رس)

تغزل میں تبادلہ دھیرے دھیرے ہوتا ہے مگر مطایبہ میں یک بیک پیدا ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ختم بھی ہو جاتا ہے۔ یہ ایک برقی لہر ہے جو یک بیک جسم میں دوڑ جاتی ہے۔ مثلاً ہم کسی کو برسات میں پھسلکر گرتے دیکھتے ہیں تو یک بیک ہنس دیتے ہیں۔ کسی شخص کو عجیب وغریب سوانگ میں جو اسکی فطرت سے

الگ ہو دیکھتے ہیں تو ہنسنے لگتے ہیں۔

ہنسی کیا ہے؟ یہ ایک الگ سوال ہے، اس سے ہمیں یہاں بحث نہیں۔ یہ کیوں آتی ہے؟ اس کے متعلق راقم الحروف کا خیال ہے کہ خلاف فطرت ہونے کے ساتھ ساتھ اگر غلطی اور سہو بھی شامل ہو تو ایسی باتیں ہنسی پیدا کرتی ہیں۔ برگسن کا خیال ہے کہ جب انسان بے اختیاری میں مشین کی طرح کام کرنے لگتا ہے تو اُسی وقت وہ ہنسی کا سبب بن جاتا ہے۔ جیسے کوئی چلتے چلتے گر پڑے اور گیند کی طرح تھوڑی دور تک لڑھکتا چلا جائے۔ تو یہ غیر اختیاری حالت دیکھنے والوں کے لئے ہنسی کا سبب ہو جاتا ہے۔

اسی طرح جملے جب اپنے اصلی معنی سے الگ معنی پیدا کرتے ہیں یا وہ ایسی تشبیہ و استعارے سے مملو ہوتے ہیں جو اس کے لئے زیبا نہیں تو وہ مطائبات کے سبب بن جاتے ہیں۔ اُردو میں صنعت حسن التعلیل و اکبر مرحوم کا ظرافت آمیز کلام اس کے بہترین نمونے ہیں۔ سنسکرت کا ایک اشلوک سنیئے۔

कमल कमला रोते हर: हिमालये। क्षीरा बद्धौ च हरि शेते मन्ये मुत्कुरा शंकया

مطلب یہ ہو کہ لکشمی جی کمل پر سوتی ہیں شیوجی ہمالیہ پر اور شیوجی چھیر ساگر میں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دُنیا میں کھٹمل کے ڈر سے انھیں سونے کی ہمت نہیں۔

مطائبات (ہاسیہ رس) کا جذبہ مستقل (ہاسیہ हास्य) ہنسی ہے۔

محرک جذبات۔ ہنسانیوالی چیزیں۔ ہنسی کو مشتعل کرنیوالی صورت۔ لباس۔ وضع قطع۔ زبان وغیرہ

جذبات اضافی۔ ہنسی، چہرے پر خوشی کے آثار، تعجب، مسکرانا۔ بشاشت وغیرہ۔

صورت انفعالی۔ سستی، خون میں تیزی سے روانی۔ بشاشت وغیرہ۔

ہنسی کی قسمیں (۱) تبسم زیر لب (۲) تبسم (۳) خندہ (۴) خندۂ دنداں نما۔

आइ है एक महाबन तेतिय गावत मानो गिरा पगु धारी

آئی ہے ایک مہابن تے تیہ گاوت مانو گرا پگ دھاری

सुंदरता जनु काम की कामिनी कोल कह्यो बृषभानु दुलारी

سندرتا جنو کام کی کامنی بول کہیو برشبھان دولاری

गोपि के ल्याइ गोपालहिं वै अकुलाइ मिली उटि सादर भारी

گوپی کے لیائی گوپالہیں وے اکولائی ملی اوٹھی سادر بھاری۔

केशव भेटत ही भरि अंक हंसी सब कीक दै गोप कुमारी

کیشو بھینٹ ہی بھرانک ہنسی سب کیک دے گوپ کماری

کیشوداس کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ گوپیاں کرشن جی کو زنانہ لباس پہنا کر رادھا کے پاس لائیں اور اس کو بلا کر کہا کہ بندرابن سے ایک عورت آئی ہے جو زبردست گانے والی اور نہایت حسین ہے چل کر دیکھو۔ وہ آکر اس مصنوعی عورت کو نہ پہچان سکی۔ اور عزت کے ساتھ گلے لگایا اس پر تمام گوپیاں قہقہہ مار کر ہنسنے لگیں۔

مطائبات اکبر

مس کو دیکھا عاشقِ زلفِ چلیپا ہوگیا — مست تھا دل بھول کر وھسکی کا پیپا ہوگیا

غضب ہے یہ منسٹری بڑے ہوگئے — میں لیٹا تو اُٹھ کر کھڑے ہوگئے

سینہ پہ بتوں کے دسترس مشکل ہے — پوائنٹ یہ نازک ہے اسے چُھو نہ کرو

(۳) مرثیہ (करुणा रस کرونڑا رس)

کسی اپنے عزیز یا محبوب کے فوت ہونے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اُسی کا نام करुणा (کرونڑا) صدمہ اور اُسی کے اظہار کا طریقہ مرثیہ ہے۔ عربی۔ فارسی اور اُردو شاعری کی ابتدا مرثیہ سے ہوئی اس کا سبب یہ ہے کہ صدمات کا اثر زبردست اور دیرپا ہوتا ہے اور طبیعت کو نہایت سرعت سے مشتعل کر دیتے ہیں جس سے نہایت لطیف لطیف جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

مرثیہ کا جذبۂ مستقل (शोक) صدمہ ہے اور اس کا محرک صدمات پیدا کرانے والے اسباب مثلاً محبوب کی جدائی، اسکا مرنا، اسکی لاش، تجہیز و تکفین، اس کی چیزوں کا دیکھنا، اس کی تعریف و توصیف سننا وغیرہ۔ اس کے جذبات اضافی دنیا اور علائق دنیا سے بیزاری۔ محبت۔ چکر کھا کر گر پڑنا، رنج و غم اور مرض ہیں۔ اس کی صورتِ انفعالی قسمت کی شکایت، زمین پر تڑپنا، رونا، لمبی لمبی سانسیں لینا، نالہ، فریاد وغیرہ۔

مثال

رام چلے بن پران نہ جاہیں	राम चले बन प्रान न जाहीं
کیہی سکھ لاگی رہت تن ماہیں	केहि सुख लागी रहत तन माहीं
رام رام سیہ رام پکاری	राम राम सिय राम पुकारी
پریو دھرنی تل بیاکل بھاری	परेउ धरनि तल ब्याकुल भारी

رام چندر جی کے بن جانے کے وقت دسرتھ جی اس طرح نالہ و فریاد کرتے ہیں۔ آہ رام چندر جی بن کو

جا رہے ہیں اور ہماری جان نہیں نکلتی، اب نہیں معلوم یہ کس آرام کے خیال سے جسم میں مقیم ہے دسرتھ جی رام اور سیتا کو یاد کرتے کرتے بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔ انیس

مرتا ہے باپ اے علی اکبر ابھی نہ جا دل مانتا نہیں میرے دلبر ابھی نہ جا
اے لال سوئے نیزہ و خنجر ابھی نہ جا ہے ہے نہ جا شبیہ پیمبر ابھی نہ جا
مضطر ہوں چین آئے۔ یہ آتا نہیں مجھے
رونے میں منہ تیرا نظر آتا نہیں مجھے

(۴) رجز (रौद्र रस رودر رس)

رجز کا جذبہ مستقل عصہ क्रोध (کرودھ) ہے۔ کوئی بات اپنی مرضی یا خواہش کے خلاف ہونے سے غصہ پیدا ہوتا ہے، غصہ اور رنج دونوں میں اپنی خواہش کے خلاف کام ہوتا ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ صدمات کے فاعل اپنے اختیار سے باہر اور غصہ کے فاعل زیادہ تر جسمیات سے تعلق رکھنے والے اسباب ہوتے ہیں جن سے بچا جا سکتا ہے۔ صدمات میں ناامیدی رہتی ہے مگر غصہ میں نہیں۔ صدمات میں عاجزی اور گڑگڑانے کا جزو اعظم ہے اور غصہ میں غرور کا۔

جذبہ مستقل غصہ۔ **محرک جذبہ**، اپنی مرضی یا خواہش کے خلاف کام۔ **صورت انفعالی** افسوس رنج۔ **جذبات اضافی** دانت نکالنا، باچھیں چر جانا، آنکھیں سرخ ہونا، منہ میں کف آنا وغیرہ۔

مثال

بالک بول بدھوں نہیں توہیں	बालक बोलि बधौं नहिं तो हीं ।
کیول منی جڑ جانس موہیں	केवल मुनि जड़ जानस मोहीं ॥
بال برہمچاری اتی کوہی	बाल ब्रह्मचारी अती कोही ।
وشو ودت چھتری کل دروہی	विश्व विदित क्षत्री कुल द्रोही ॥
بھج بل بھومی بھوپ بن کینھی	भुज बल भूमि भूप बिन कीन्ही
بپل بار مہی دیون دینھی	बिपुल बार महि देवन दीन्ही ॥
سہس باہو بھج چھیدن ہارا	सहस बाहु भुज छेदन हारा ।
پرسو بلوک مہیپ کمارا	परशु बिलोक महीप कुमारा ॥

پرسرام جی لچھمن جی پر بگڑ کر کہتے ہیں کہ اے بیوقوف تو نے شاید مجھے صرف درویش ہی خیال کر رکھا ہے یاد رکھ میں تجھے لڑکا سمجھ کر طرح دے رہا ہوں، تو شاید نہیں جانتا کہ میں لڑکپن سے برہمچاری ہوں اور

بہت زیادہ غصہ کرنے والا بھی ہوں۔ دنیا پر یہ روشن ہے کہ میں چھتریوں کے خاندان کا دشمن ہوں، میں نے اپنے بازو کی طاقت سے زمین کو بے بادشاہ کا کر دیا اور کئی مرتبہ اس زمین کو فتح کر کے برہمنوں کو بخش دیا، میں سہس باہو کے بازو کو زخمی کرنے والا ہوں تو میرے تبر سے کو دیکھ اور خوف کر۔ ع

بخشا ہے مجکو حق نے شہ لافتیٰ کا زور　　اس دستِ مرتعش میں ہے دستِ خدا کا زور

ہے انگلیوں کے بند میں خیبر کشا کا زور　　پانی ہے میرے زور کے آگے ہوا کا زور

الٹوں فلک کو یوں جو ہو قصد انقلاب کا

جس طرح ٹوٹ جاتا ہے ساغر حباب کا　　(انیسؔ)

لچھمن جی رام چندر جی سے ایک موقع پر کہتے ہیں۔

जो राउर अनुशासन पाऊं ।　　جو راؤر انوشاسن پاؤں

कन्दुक इवि ब्रह्मांड उठाऊं ॥　　کنڈک ایو برہمانڈ اُٹھاؤں

काचे घट सम डारों तोरी ।　　کاچے گھٹ سم ڈاروں توری

सकूं मेरु मूलक इवि तोरी ॥　　سکوں میرو مولک ایو توری

اگر میں آپ کا حکم پاؤں تو زمین کو گیند کی طرح اٹھاؤں اور کچے گھڑے کی طرح اس کو توڑ دوں اور میرو پہاڑ کو مولی کی طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔ ع انیسؔ

دنیا ہو اک طرف تو لڑائی کو سر کروں　　آئے غضب خدا کا اُدھر رُخ جدھر کروں

لے جبرئیل کا رِ قضا و قدر کروں　　انگلی کے اِک اشارے میں شق القمر کروں

طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی

رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

(۵) شجاعت (बीर रस بیر رس)

ویر رس (شجاعت) کا جذبہ مستقل جوش کے ساتھ ہمت ہے۔ بادی النظر میں رودر رس (زجر) اور ویر رس (شجاعت) میں فرق نہیں دکھائی دیتا۔ مگر غور کرنے پر دونوں میں زبردست فرق نظر آنے لگتے ہیں۔

(۱) غصہ ہمیشہ اپنے سے کمزور پر آتا ہے اور اس میں رواداری کا اثر نہیں، مگر ویر رس (شجاعت) میں کمزور اور قوی کا خیال نہیں رہتا اور اس میں رواداری کا جزو غالب رہتا ہے۔

(۲) غصہ میں اپنی طاقت کی لن ترانی زیادہ رہتی ہے مگر ویر رس (شجاعت) میں استقلال کا جزو غالب رہتا ہے۔

(۳) غصہ کے دربار میں دشمن جس حال میں ہو اس کا ستانا، مارنا جائز ہے، مگر ویر رس (شجاعت)

کے دربار میں ؎ مرتے کو مارنا بیدردی سے ہے بہت دُور جوانمردی سے

محرک جذبہ اپنی جائز مرضی کے خلاف کام۔ دشمن کا ناحق ستانا وغیرہ صورت انفعالی خوشی، خرمی وغیرہ جذبات اضافی استقلال، محبت، غصہ، روئیں کھڑے ہونا وغیرہ۔

مثال

छूटत कमान और तीर गोली बानन के, मुसकिल होत मुरचानहू के ओट में।

چھوٹت کمان اور تیر گولی بانن کے مشکل ہوت مورچان ہو کے اوٹ میں

ताही समय सिवराज हुकुम कै हल्ला कियो दावा बांधि पर हला वीर भटजोट में॥

تاہی سمے سیوراج حکم کے ہلا کیو داوا باندھی پر ہلا بیر بھٹ جوٹ میں

भूषन भनत तेरी किम्मौत कहां लौं कहौं हिम्मत इहां लगि है जाकी भट झोट में।

بھوشن بھنت تیری کِمت کہاں لوں کہوں ہمت یہاں لگی ہے جا کی بھٹ جھوٹ میں

ताव दै दै मोछन कगूरन पै पांव दै दै अरि मुख घाव दै दै कूद परे कोट में॥

تاؤ دے دے موچھن کگورن پے پاؤں دے دے اری مکھ گھاؤ دے دے کود پرے کوٹ میں

ایسے وقت میں جبکہ مورچوں کی بناہ میں بھی رہنا دشوار ہوتا ہو اور کمان سے تیر اور بندوق سے گولیاں برس رہی ہوں سیواجی نے قلعہ پر ہلے کا حکم دیا اور بہادر لوگ موچھوں پر تاؤ دے دیکر مخالف کو زخمی کرتے ہوئے کنگوروں پر پاؤں رکھکر قلعہ میں کود پڑے۔ بھوشن کوی کہتے ہیں کہ تیری قدر و قیمت اور ہمت بیان سے باہر ہے۔

انیس صاحب نے حضرت قاسم کی شجاعت کی تصویر یوں پیش کی ہے:-

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزے کو دی نکال چمکی انی تو برق پکاری کہ الاماں
ایک بند باندھکر جو فرس سے کہا کہ ہاں ڈانڈ آئی ڈانڈ پر تو سناں سے لڑی سناں
بل کیا کرے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
غل تھا کہ اژدہے سے وہ انعی لپٹ گیا

جھنجھلا کے چوب نیزہ کو لایا وہ فرق پر قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ پہ ماری بچا کے سر
دو انگلیوں میں نیزۂ دشمن کو تھام کر جھٹکا دیا کہ جُھک گئی گھوڑے کی بھی کمر
نیزہ بھی ایکبے ٹوٹ گیا نابکار کا دو انگلیوں سے کام کیا ذوالفقار کا

سنبھلا وہ بے شعور یہ جھٹکا اُٹھا کے جب قبضہ میں لی کمان کیانی بصد غضب
چلّہ میں تیر جوڑ چکا جب وہ بے ادب تیوری چڑھائی قاسم نوشاہ نے بھی تب
تیر نگاہ سے وہ خطا کار ڈر گیا
کانپے یہ دونوں ہاتھ کہ چلّہ اُتر گیا

(۶) خوف (भयानक रस بھیانک رس)

خوف (بھیانک رس) کا جذبہ مستقل دہشت ہے۔ اس میں انسان کو ایسی غیر معمولی چیز سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے جس میں اپنے سے زیادہ طاقت ہو، اور جس سے مقابلہ میں جان جانے کا خطرہ ہو۔ یا ایسے ہولناک منظر کا سامنے آجانا جس کے دیکھنے کی تاب نہ ہو۔

محرک جذبہ، دہشت پیدا کرانے والی چیزیں۔ **صورت انفعالی** کانپ جانا، آنکھ جھپکنا، قدم اکھڑنا چہرہ فق ہونا وغیرہ **جذبات اضافی** عاجزی، افسوس، رنج، الحاح، وزاری وغیرہ

مثال

पौन पूत आगि को लगाय भगवन्त कवि लगत न घाव काहु तुपकत न तीर को।
پون پوت آگ کو لگائے بھگونت کوی لگت نہ گھاؤ کاہو تپکت تیر کو

रातो भयो आसमान, तातो भयो भासमान, कारो पीरो नीर भयो नीरधि के तीरको
راتو بھیو آسمان تاتو بھیو بھاسمان کارو پیرو نیر بھیو نیرودھ کے تیر کو

लंका लगी बरन, जरन रनिवास लाग्यो, व्याकुल होय असुर धरे नरन धीर को ॥
لنکا لگی برن جرن رنواس لاگیو بیاکل ہوے آسُر دھرے نہ رن دھیر کو

सुरन को जाप कैधों सिता को सराप है कि रावन की पाप कै प्रताप रघुबीर को
سرن کو جاپ کیدھوں سیتا کو سراپ ہے کہ راون کو پاپ کے پرتاپ رگھبیر کو

بھگونت کوی کہتے ہیں کہ ہنومان جی نے لنکا میں آگ لگائی اور اس سے وہاں کے لوگ اس طرح متاثر ہوئے کہ بندوق اور تیر کے زخم سے بھی اتنا متاثر نہ ہوتے۔ آگ کے شعلوں سے آسمان سرخ ہوگیا اور لنکا کے اطراف وجوانب میں گرمی پھیل گئی، سمندر کا کنارا آگ اور راکھ سے کالا پیلا اور نیلا ہوگیا۔ لنکا مشتعل ہوگئی اور تمام محلات شاہی جلنے لگے، راکچھس پریشان ہوگئے۔ یہ آگ یا تو دیوتاؤں کی بددعا کا نتیجہ ہے یا سیتاجی کی بددعا ہے یا راون کے گناہوں کا نتیجہ یا رام چندر جی کے اقبال کا اثر ہے

میر انیس صاحب فوج کی ابتری اور میدان جنگ کا خوفناک منظر اسطرح پیش کرتے ہیں ۔

ملتا نہ تھا صفوں میں علم کا نشاں کہیں چلّے کہیں تھے شست کہیں تھی کماں کہیں
نیزے کہیں تھے ڈانڈ کہیں تھی سناں کہیں جمدھر کہیں کمند کہیں برچھیاں کہیں
اِک اک سیاہ رو کا جگر داغ داغ تھا
جنگل تمام ڈھالوں کے پھولوں کا باغ تھا

وہ گھاٹ بار بار اور وہ اُس کی چمک دمک کانپی کبھی زمیں کبھی تھرا گئے فلک
شعلہ میں یہ چمک تھی نہ بجلی میں یہ لپک ہر ضرب میں سما سے تلاطم تھا تا سمک
کونین میں حواس بجا تھے نہ ایک کے
گاوِ زمیں سمٹتی تھی گھٹنوں کو ٹیک کے

ڈر ڈر کے پچھلے پاؤں سیاہ لعیں ہٹی یہ صف سوئے یسار وہ سوئے یمیں ہٹی
سہمے جبال، نہر کہیں سے کہیں ہٹی دہشت سے آسماں ہوا اونچا، زمیں ہٹی
بھاگڑ پڑی کہ ایک سے ایک آگے بڑھ گیا
دریا لہو کا کشتیٔ گردوں پہ چڑھ گیا

(۷) نفرت (विभतस)

نفرت کا جذبہ مستقل کراہت اور گھن ہے۔ اس کے طریقۂ اظہار کا نام ہجو ہے۔ بھیانک رس اور نفرت میں فرق یہ ہے کہ بھیانک رس میں نقصان پہنچنے کا خوف لگا رہتا ہے اور نفرت میں یہ بات نہیں ہوتی۔ بھیانک رس میں خوف کی وجہ سے علٰحدگی اختیار کی جاتی ہے اور نفرت میں اس کی کراہت علٰحدگی پہ مجبور کرتی ہے۔ محرک جذبہ، بدبو، مکروہ صورت وغیرہ۔ صورت انفعالی طبیعت کا بدکیف ہو جانا جذبات اضافی، ناک، منہ سکوڑنا، منہ پھیر لینا، لوٹ آنا وغیرہ۔

مثال

अनंवारी लै उड़त गिध पिशाच कर महि धावेहि ।
انتواری لے اُڑت گدھ پشاچ کر گہی دھاوہیں۔

संग्राम पुर बासी मनहु बहु बाल गुड्डि उड़ावही ॥
سنگرام پُر باسی منہو بہو بال گوڈی اوڑاوہیں

گدھ انتڑیوں کو لیکر اوپر اوڑتے ہیں اور بھوت (پشاچ) اس کو ہاتھ میں پکڑ کر دوڑتے ہیں اسکو دیکھکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لڑکے پتنگ اُڑا رہے ہیں۔

तिमिर लंग लई मोल चली बब्बर के हलके

تمر لنگ لئی مول چلی ببر کے حلقے

रही हुमायुं साथ गई अकबर के दल के

رہی ہمایوں ساتھ گئی اکبر کے دل کے

जहांगीर जस लियो पीठ को भार छोड़ायो

جہانگیر جس لیو پیٹھ کو بھار چھڑایو

शाहजहां कर न्याय ताही को मांड़ चटायो

شاہجہاں کر نیاو تاہی کو مانڈ چٹایو

बलहरित भई पौरुश थक्यो भागी फिरत बन सियार डर

بل ہرت بھئی پورش تھکیو بھاگی پھرت بن سیار ڈر

औरंगजेब करनो सोई लै दीन्ही कवि गंग घर

اورنگ زیب کرنی سوئی لے دینھی کوی گنگ گھر

کوی گنگ ہاتھی کی ہجو میں کہتے ہیں کہ اس کو تیمور لنگ نے مول لیا تھا اور بابر کے ساتھ برابر رہا بابر کے مرنے کے بعد ہمایوں اور اکبر کے ساتھ رہا، جہانگیر کے وقت میں ضعیف ہوگیا تو اس نے اپنی سواری سے آزاد کردیا، شاہجہاں نے اس کو تبرک سمجھکر عزت کی اور آش چٹا چٹا کر پرورش کی جب بہت ضعیف ہوگیا تو گیدڑوں کے ڈر سے ادھر ادھر بھاگتا پھرتا تھا اسی کو اورنگ زیب نے کوی گنگ کو انعام میں دیا۔

سودا کی ہجو ملاحظہ ہو:۔

اِک دن گیا تھا انکے یہ گھوڑا برات میں	دولھا جو بیاہنے کو چلا اس پہ ہو سوار
سبزے سے خط سیاہ سیہ سے ہوا سفید	تھا سرو سا جو قد سو ہے اب شاخ بار دار
پہنچا غرض عروس کے گھر تک وہ نوجواں	شیخوخیت کے درجے سے کر اس طرف گزار
جس شکل سے سوار تھا اس دن میں کیا کہوں	دشمن کو بھی خدا نکرے یوں ذلیل و خوار
چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ	تک تک سے پاشنہ کے مرے پاؤں تھے فگار
آگے سے تو بڑھ اُسے دکھلائے تھا سئیس	پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے باربار
اس مضحکہ کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام	اکثر مدبروں میں سے کہتے تھے یہ پکار

پہیئے اسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ رواں — یا بادبان باندھو پون کے دو اختیار

(۸) استعجاب (अद्भुतरस = ادبھت رس)

اس رس کا جذبہ مستقل تعجب ہے۔ اس رس میں بھی مطائبہ کی طرح انقلاب ہوتا ہے مگر دونوں میں فرق ہے۔ مطائبہ میں استقلال کم ہوتا ہے اور اس کے اسباب کچھ نہ کچھ ظاہر رہتے ہیں مگر لطیفہ کے اسباب ظاہر نہیں رہتے اور اگر کچھ ظاہر بھی ہوجائے تو وہ کسی کی بھول اور غلطی پر مبنی نہیں ہوتے محرک جذبہ تعجب میں ڈال دینے والی چیزیں، صوفیوں کے رموز اور کنائے صورت العقالی۔ حیرت ہنسی، غور میں پڑجانا وغیرہ۔ جذبات اضافی، چہرہ فق ہونا، ہنس دینا، پریشان ہوجانا وغیرہ۔

مثال

बिनु पद चलै सुनै बिन काना।
بن پد چلے سنے بن کانا

कर बिन कर्म करे विधि नाना॥
کر بن کرم کرے بدھ نانا

बिन बानी बकता बड़ योगी।
بن بانی بکتا بڑ یوگی

आनन रहित सरस रस भोगी
آنن رہت سرس رس بھوگی

تلسی داس خدا کی تعریف میں فرماتے ہیں کہ وہ بغیر پیر کے چلتا ہے اور بغیر کان کے سنتا ہے اور بغیر ہاتھ کے طرح طرح کے کام کرتا ہے، بلا زبان کے بڑا بھاری خطیب ہے وہ تمام لذات سے بری اور تمام لذات میں ڈوبا ہوا ہے۔ مولوی اسمٰعیل صاحب فرماتے ہیں:۔

ہے وہ بے آنکھ دیکھتا سب کو — ہے وہ بے کان سنتا مطلب کو

اپنی مرضی سے کام کرتا ہے — بے زباں وہ کلام کرتا ہے

अधर जोत विद्रुम भये जो कर मुक्ता लीन
ادھر جوت ودرم بھئے جو کر مکتا لین

निरखत ही गुंजा भये फिर हँसि मुक्ता कीन
نرکھت ہی گنجا بھئے پھر ہنس مکتا کین

حسین عورت نے جب ہاتھ پر موتی رکھا تو سرخ سرخ ہونٹوں کے عکس سے مونگا ہوگیا جب وہ تعجب میں آکر غور سے دیکھنے لگی تو پتلیوں کے عکس سے گھونگھچی ہوگیا اس پر اس کو سخت تعجب ہوا اور

ہنس دی، اب دانتوں کی چمک سے پھر موتی کا موتی ہوگیا۔ ذوق صاحب فرماتے ہیں ؎

رُخ گلرنگ پہ ساقی کے عرق کا قطرہ
کیا تماشا ہے کہ بن جاتا ہے مونگا گوہر

(۹) معرفت (शान्तरस شانت رس)

اس رس کا جذبہ مستقل معرفت ہے۔ اس میں طمانیت قلبی حاصل ہوتی ہے۔ محرک جذبہ دنیا کا ناپائدار ہونا، صحبت صالح، عارفانہ خیالات صورتِ انفعالی، دنیا کو فانی اور تعلقات دنیا کو فضول سمجھنا جذبات اضافی، حیرت، بیزاری، مستی، رنج، خوشی، دیوانگی وغیرہ

مثال

मैं देख्यो निर्धार यह जग कांचो कांच सम। میں دیکھو نردھار یہ جگ کانچو کانچ سم
एकै रुप अपार प्रति विम्बित लखियत तहां॥ ایکے روپ اپار پرت بمبت لکھیت تہاں

میں نے خوب غور سے دیکھا ہے یہ دنیا کچے کانچ کے مانند ہے اسمیں جدھر نظر پڑتی ہے ایک ہی روپ دکھائی دیتا ہے ؎ درد

جوں آئینہ جسپہ یاں نظر کی
ساتھ اپنے دو چار ہوگئے ہم

करम गत टारे नाहिं टरे। کرم گت ٹارے ناہیں ٹرے

मन 'बध' कमी अगाध अगोचर केहि बिधि बुध संचरे॥
من بچے کرم اگادھ اگوچر کہی بدھ بدھ سنچرے۔

جو کچھ قسمت میں لکھا ہے وہ ٹل نہیں سکتا۔ خدا دل۔ زبان۔ افعال یعنی تمام محسوسات سے پرے ہو۔ بھلا وہ عقل میں کیسے آسکتا ہے۔

آتش:۔ معرفت میں اس کی ذاتِ پاک کے — اُڑتے ہیں ہوش وخرد ادراک کے
اکبر:۔ عقل میں جو گھر گیا لاانتہا کیونکر ہوا — جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

مرزا رسوا مرحوم

(۳)

(از مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی)

مثنویات

لذتِ فنا مرزا صاحب کی بہت مختصر مثنوی ہے، اس کا سبب تصنیف یہ ہے کہ ایک دن عرفی شیرازی کا یہ شعر نظر سے گزرا۔

ذوقِ فنا نیافتۂ ورنہ در نظر — رنگیں تر از بہار بود جلوۂ خزاں

دیر تک محویت رہی اوسی عالم میں چند شعر قلم اُٹھا کر لکھنا شروع کئے۔ ایک مختصر مثنوی تیار ہوگئی۔ یہ نظم از اول تا آخر حکیمانہ خیالات سے لبریز ہے۔ میرے خیال میں علٰحدہ یہ نظم کہیں نہیں چھپی ہے اس لئے زیادہ حصہ اُسکا نقل کئے دیتا ہوں۔

موت کلیدِ درِ اسرار ہے — موت مسیحائے ہر آزار ہے
معنیٔ امکان تغیر ہے موت — صورتِ بطلان تحیر ہے موت
موت ہے لاریب کمالِ حیات — علتِ غائیٔ کمالِ حیات
زندگیٔ صاحبِ عرفاں ہے موت — راہبرِ کوچۂ جاناں ہے موت
موت سے ڈرتے نہیں اہلِ کمال — موت سے ڈرنا ہی حماقت پہ دال
مائۂ زحمت ہے پئے اشقیا — آیۂ رحمت ہے پئے اولیا
قیدِ تشخص سے چھڑاتی ہے یہ — عالمِ تجرید دکھاتی ہے یہ
بند کشائے قفسِ تن ہے یہ — سیر نمائے گل و گلشن ہے یہ
زیست ہے اک اسم یہ موسوم ہے — زیست ہے اک لفظ یہ مفہوم ہے
اس سے بنا مطلبِ نست و بود — اس سے کھلا رابطۂ ہست و بود
علت و معلول بقاؤ حیات — حاصل و محصول بقاؤ حیات

شرحِ کُن معنیِ بیم و رجا
درس دہِ مکتبِ فقر و فنا

قاطعِ شہواتِ طبیعی ہے یہ
ہادمِ لذاتِ طبیعی ہے یہ

بادۂ نخوت کا یہی ہے خمار
نشۂ دولت کا یہی ہے اُتار

سرد کُنِ آتشِ ظلم و فتور
زرد کُنِ چہرۂ اہلِ غرور

مہتممِ مجلسِ شور و شغب
محتسبِ محفلِ عیش و طرب

علتِ کابوسِ دماغِ علیل
مورثِ غلیانِ مزاجِ علیل

مبطلِ ہر دعویِ باطل ہے یہ
عجز ہے یاں سب کو وہ مشکل ہے یہ

راسِ غلطیات ہے حبِ حیات
حکمت و عرفاں ہے خیالِ ممات

زیست میں ہے شائبۂ فصلِ دوست
موت میں ہے ذائقۂ وصلِ دوست

موت ہے محبوبِ شہیدانِ عشق
موت ہے مطلوبِ مریدانِ عشق

قلزمِ ہستی کا کنارا ہے یہ
جیتے ہیں جس پر وہ سہارا ہے یہ

ذاتِ خدائے ازل کے سوا
اور ہر اک شئے کیلئے ہے فنا

داخلِ ہر خلوت و جلوت ہے یہ
عارضِ ہر وحدت و کثرت ہے یہ

کونسے جوہر میں نہیں اسکا نور
کونسے عالم میں نہیں اسکا شور

چار عناصر میں اسی کی ہے دھوم
ملکِ ہوا میں ہوئے بادِ سموم

مادۂ خاک سے پیدا ہوئی
زہر کی صورت میں ہویدا ہوئی

آب میں سیلاب کی صورت بنی
نار میں احراق کی علت بنی

مطلعِ انوارِ جمالی ہے یہ
مظہرِ آثارِ جلالی ہے یہ

جوہرِ آئینۂ علم و کمال
گوہرِ گنجینۂ ذکر و خیال

عینِ عنایاتِ عزیزِ علیم
قدرتِ قہارِ قدیر و قدیم

مرہمِ زخمِ غمِ دوری ہے یہ
واسطۂ قربِ حضوری ہے یہ

زیست حجابِ رخِ مطلوب ہے
بندِ نقابِ رخِ محبوب ہے

موت نے کی عقدہ کشائی اگر
شاہدِ مقصود ہوا جلوہ گر

لوثِ ہیولےٰ سے مُبرا کیا
عارِ تعین سے معرا کیا

داخلِ بزمِ جبروتی ہوئی — محرمِ رمزِ ملکوتی ہوئی
عابد و معبود ہوے روبرو — شاہد و مشہود ہوے روبرو
ساجد و مسجود مقابل ہوئے — فانی و موجود مقابل ہوئے
عاقل و معقول ہوئے ایک جا — قابل و مقبول ہوئے ایک جا
عالم و معلوم میں قربت ہوئی — حاکم و محکوم میں قربت ہوئی
باطن و ظاہر کا کھلا مدعا — اول و آخر کا کھلا مدعا
پردہ دوئی کا نہ رہا درمیاں — کھل گئے اسرارِ نہان و عیاں
قطرہ و دریا میں ہوا اتحاد — سہل ہوئی مشکل عود و معاد
لطفِ حیاتِ ابدی مل گیا — نقدِ وصالِ صمدی مل گیا
روک لے مرزا قلمِ رستہ خاک — مسلکِ توحید ہے اندیشہ ناک
ظلمتِ ظلمات سے تاریک ہے — بال سے تلوار کی باریک ہے
پائے خرد لنگ ہے اس راہ میں — جوہرِ کل زنگ ہے اس راہ میں
برتر از ادراک و خیالِ بشر — خارج از امکانِ قیاس و نظر
حرف و حکایت کا یہ موقع نہیں — رمز و کنایت کا یہ موقع نہیں
خوب لکھی تو نے ثنائے ممات — دور ہوئی دل سے ہوائے حیات
عالمِ اجسام ہے ناپائدار — ہستیِ موہوم کا کیا اعتبار

مثنوی امید و بیم | اسا برا تعوبرین کالج میں شب کو پڑھانے جاتے تھے وہاں کسی سے تعلق خاطر ہوگیا اُسی دھن میں مثنوی امید و بیم کہہ ڈالی، اس میں تین جزو ہیں۔ جزو اول میں اُن آرزوؤں کا ذکر ہے جو کبھی پوری نہ ہونگی کسی کے تصور سے رمز و کنایت شکوہ و شکایت کا سلسلہ خواہ مخواہ پیدا کیا گیا ہے۔

جزو دوم میں صنع خدا کی عظمت پر اجمالی نظر پھر انسان کے دل و دماغ کا مختصر بیان ہے۔

جزو سوم میں طلسم امید و بیم کی ایک نمائش دکھائی گئی ہے۔

یہ پوری مثنوی سوائے حصۂ اول کے حکیمانہ خیالات سے مملو ہے۔

اشعارِ ذیل سے شروع ہوتی ہے:-

مدد اے حوصلۂ عشق و وفا — مدد اے ولولۂ حرص و ہوا
مدد اے غلغلۂ جامہ دری — مدد اے سلسلۂ بخیہ گری

مدد اے رنجِ گرفتاریِ دل — مدد اے راحتِ بیکاریِ دل

مدد اے سوزشِ پنہانِ ہوس — مدد اے شورشِ طوفانِ ہوس

مدد اے حسرتِ ناکامیِ شوق — مدد اے وسعتِ بدنامیِ شوق

مدد اے دوستیِ تیغ و جگر — مدد اے دشمنیِ سعی و اثر

مدد اے لذتِ افکارِ محال — مدد اے تلخیِ اوقاتِ خیال

مدد اے ہمتِ دشوار پسند — مدد اے جراَتِ آزار پسند

مدد اے نطقِ پریشاں تقریر — مدد اے خامۂ ہذیان تحریر

اسکے بعد پانچ چار صفحوں میں اپنی جوانی کے افسانے بیان کئے ہیں پھر اپنے عشق کا اظہار کرتے ہیں۔

پھر ہوا عشق دلِ مضطر کو — دو خبر میرے نصیحت گر کو

ہے ابھی تک وہی آشفتہ سری — چارہ گر آکے کریں چارہ گری

کوئی تدبیر نکالیں اب بھی — وہی زنجیر نکالیں اب بھی

آجتک سر سے وہ سودا نگیا — عشقبازی کا وہ لپکا نہ گیا

راہِ الفت میں مجھے ٹوکیں تو — لو میں جاتا ہوں مجھے روکیں تو

دھجیاں ڈھونڈھکے لائے کوئی — پھر رفوگر کو بلائے کوئی

اس حصہ میں تو شاعری ہے اور اصلیت بہت مختصر مگر جزو دوم سے مرزا اپنے فلسفیانہ رنگ پر آگئے اور وہی حکیمانہ باتیں چھیڑ دیں۔

نفس کی تعریف میں کہتے ہیں:۔

سرِ مکتوم ہے کیفیتِ نفس — کسکو معلوم ہے ماہیتِ نفس

محشرستانِ خیالِ انساں — اک طلسمات ہی حالِ انساں

کبھی ناظر ہے کبھی ہے منظور — کبھی مختار کبھی ہے مجبور

مرکزِ دائرۂ بیم و رجا — محورِ دائرۂ حرص و ہوا

جمع ہیں اس میں صفاتِ متضاد — ہے مرید آپ ہی اور آپ مراد

کبھی طاعت میں ملک سے بھی سوا — کبھی رفعت میں فلک سے بھی سوا

رہروِ منزلِ بدنامیِ شوق — گمرہِ وادیِ ناکامیِ شوق

اپنی کوشش پہ کبھی ناز اسے — ناامیدی نے کبھی ساز اُسے

مضمحل کوئے جفا میں نہ کبھی　　مستقل راہِ وفا میں نہ کبھی
کبھی آوارۂ میدانِ ہراس　　کبھی گم کردۂ غولِ وسواس
کبھی جلوہ ہے کبھی طُور ہے یہ　　کبھی سایہ ہے کبھی نور ہے یہ
میکشِ خمکدۂ جوش و خروش　　خود فراموش سراسر مدہوش
کبھی دیوانۂ حسنِ تجرید　　کبھی مستانۂ جامِ توحید

عالمِ کون و فساد کو ایک حکیمانہ نظر سے دیکھتے ہیں:-

قابلِ غور ہیں اسرارِ وجود　　دیکھنا چاہیئے آثارِ شہود
کچھ تو سمجھیں یہ معمّا کیا ہے　　کچھ تو دیکھیں یہ تماشا کیا ہے
ہے جہاں صنعتِ صانع پہ دلیل　　آیۃ اللہ ہے یہ بے تاویل
غور سے دیکھ شہودِ اشیا　　اِک تماشا ہے نمودِ اشیا
دیکھ تو صنعِ خدا کی عظمت　　حیرت افزائے فضا کی وسعت
جسمیں لاکھوں متحرک اجسام　　اک وطیرے پہ ہیں گردش میں مدام
راستوں میں نہ وہ اٹکیں نہ تھکیں　　اپنے محور سے کبھی ہٹ نہ سکیں
نہ اُلجھتے ہیں نہ گرتے ہیں وہ　　ایک ہی وضع سے پھرتے ہیں وہ
کیوں گریں دوڑ کے چلتے ہی نہیں　　حد سے باہر وہ نکلتے ہی نہیں
بیضوی شکل کسی کی تدویر　　حرکت جسمیں اسے بے تاخیر
متکافی متزاید حرکات　　متبائن متباعد حالات
حجم میں کوئی زیادہ کوئی کم　　ایک سے ایک کو ہے ربط بہم
اک نئی شان ہے دیکھو جس کو　　کھینچتا ہے یہ اُسے وہ اسکو
یہ نہ سمجھو کہ ہیں اتنے تارے　　آنکھ سے دیکھے ہیں جتنے تارے
نظر آتے نہیں ہمکو اکثر　　جو کہ ہیں حدِ نظر سے باہر
دیکھ کیا حال ہے سیاروں کا　　عجب انداز سے رفتاروں کا
گردشوں کیلئے میدانِ وسیع　　اک تناسب سے بطی اور سریع
سیکڑوں شمس ہزاروں اقمار　　بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھکے شمار
شمس کے گرد ہیں سارے سیار　　گردِ سیارہ ہیں دائر اقمار

روشنی میں کوئی کم کوئی سوا　　ایک سے ایک کرے کسب ضیا

اس قدر دور ہیں اکثر انجم　　دیکھتے ہی نہیں جنکو ہم تم

بسکہ تیز ہے بہت دور اُن کا　　راستہ میں ہے ابھی نور انکا

دور ایسے ہیں وہ اجرامِ فلک　　روشنی ان کی نہ پہونچے ہم تک

ان کے ابعاد خدا ہی جانے　　ان کی تعداد خدا ہی جانے

ہے فضا جسم اثیری سے بھری　　ضو کی اس وجہ سے ہی جلوہ گری

حاملِ ضو ہے یہی جسم لطیف　　یہ ہوا جس کے مقابل میں کثیف

دیکھ آنکھوں سے یہ ساماں کیا ہے　　دیکھ تو ظاہر و پنہاں کیا ہے

ایک ہی حکم کے سب ہیں تابع　　کیونکہ ہے ایک ہی اُن کا صانع

اِک تماشا ہے یہ چلتی ہوئی کل　　عقل نے جسکی نہ پائی اٹکل

پرزے پرزے میں بھری ہے قوت!　　جس سے قائم ہے نظامِ حرکت

دُور کیوں جا یہ زمیں کیا کم ہے　　بلکہ ہر ذرہ نیا عالم ہے

دیکھ اجرامِ ذواتُ[1] الاذناب　　انکے میقات اور اُنکے اسباب

چھوٹے تارے جنھیں کہتے ہیں شہاب　　ٹوٹتے رہتے ہیں جو مثلِ حباب

راہ میں دَورِ زمیں کے آکر　　جب وہ کھاتے ہیں ہوا سے ٹکر

فوراً آجاتی ہے شامت اُنکی　　یہی ٹکر ہے قیامت اُن کی

اتفاقاً جو کوئی جرم کبیر　　جسکے آگے ہو زمیں جرم صغیر

بیچ میں پڑکے کہیں ٹکر کھائے　　دفعتہً ساری زمیں چکر کھائے

آئے اس طرح اِک آوازِ مہیب　　لوگ جانیں کہ قیامت ہے قریب

پرزے پرزے ہو جہانِ آباد　　ذرہ ذرہ ہو فضا میں برباد

ایک دم میں نہ شجر ہوں نہ حجر　　نہ چرندے نہ پرندے نہ بشر

کچھ زمیں پر نہیں موقوف یہ بات　　نہیں عالم میں کسی شے کو ثبات

کیا تعجب یہ کرہ جب ہو شکست　　یا کوئی اور ہی کوکب ہو شکست

مرکزِ ثقل سے گر جائے قمر　　پھر جہاں میں نہ نظر آئے قمر

[1] دُمدار ستارے۔

شمس پر بھی کوئی آفت آجائے سارے عالم میں قیامت آجائے
ابھی باطل ہو نظام شمسی جائے ظلمت ہو مقام شمسی
روشنی ہو نہ حرارت ہو کہیں زندگی ہو نہ طبیعت ہو کہیں
نہ صورت نہ ہیولیٰ کا پتا نہ ہو قوت نہ انرجی کا پتا
ہیں یہ اعراض و جواہر کیا چیز ایک ہی آن میں ہوں سب ناچیز
اس سے ہی ذاتِ خدا بے پروا کہ ہو اک دم میں جہاں ناپیدا
اُس کی مرضی پہ ہے پیدا ہونا کچھ ضروری[1] نہیں ان کا ہونا
ان گھروندوں کا بنانا بھی ہے سہل اور پھر اُن کا مٹانا بھی ہے سہل
کیوں بنایا یہ ہمیں کیا معلوم کیوں مٹایا یہ ہمیں کیا معلوم
اُسکی حکمت سے ہے یہ کون و فساد اُس کی تقدیر سے ہے عود و معاد
رمز ایجاد کو کیا پہچانیں بھید کی بات ہے ہم کیا جانیں

نوبہار۔ مرزا کی تمام مثنویوں میں اس مثنوی کا پایہ باعتبار زبان و خیالات بہت بلند ہے۔ یہ مثنوی نہایت مختصر ہے اور ابتدائی کلام معلوم ہوتا ہے، زیادہ التفات کے قابل نہیں، چند شعر اس کے سنکر اس باب کو ختم کر دیجیے۔

طفلِ غنچہ کی چمن میں آج بسم اللہ ہے جس طرف دیکھو ادھر اللہ ہی اللہ ہے
کہدو مُلّا سے گلستاں کا سبق ہو اب فضول لیگئے مکتب کے لڑکے جھولیاں بھر بھر کے پھول
ابر دریا بار نے گلبن کے تھالے بھر دیے ساقیِ فیاض نے مے سے پیالے بھر دیئے
باغ میں کالی گھٹا نے آکے چھائی چھاؤنی کھل گئے گلہائے زنگار نگ پھولی ساؤنی

سلام

مرزا صاحب کو مرثیہ و سلام کی طرف کوئی خاص توجہ نہ تھی مگر مرزا محمد جعفر صاحب اَوج مرحوم کی خاطر سے اکثر سلام کہا کرتے تھے حضرت اَوج مرحوم دستور قدیم کے موافق پچیسویں رجب کو نیا مرثیہ میر باقر سوداگر کے امام باڑہ میں پڑھا کرتے تھے۔ اس موقع پر اکثر مرزا صاحب سے اصرار کرکے سلام کہلواتے تھے اور قبل اپنے مرثیہ کے خود پڑھا کرتے تھے۔ مرزا کے ساتھ میں بھی اکثر اُن مجلسوں میں شریک ہوا ہوں جس میں اُنکے سلام پڑھے گئے ہیں۔ مرزا محمد طاہر صاحب رفیع خلف حضرت اَوج مرحوم سے مرزا صاحب کے چند سلام ملے

---

[1] کیونکہ یہ سب ممکنات ہیں ضروری صرف ذات واجب الوجود ہے۔

باقی سرمایہ سلاموں کا بھی ضائع ہوگیا۔ چند اشعار انتخاب کر کے لکھتا ہوں:-

(۱)

شوق تسلیم و رضا بے سر و ساماں نکلا — بے کفن فاطمہ کا زینتِ داماں نکلا
اشک کا تار مسلسل ہے نہ کر فکر مآل — سلسلہ عفو کا اے خجلتِ عصیاں نکلا
لاشِ سرور کا نہیں کوئی چھپانے والا — اب تو ارماں ترا اے ریگ بیاباں نکلا
ہیچ ہو جائے گی خورشیدِ قیامت کی نمود — دل سے میرے جو کوئی داغ نمایاں نکلا
غمِ کونین کو حسرت نے جگہ دی دل میں — ہم جسے تنگ سمجھتے تھے پریشاں نکلا
ذکر مرزا کے جو نالوں کا ہوا گلشن میں — آشیاں سے نہ کوئی مرغ خوش الحان نکلا

(۲)

صورتیں غم کی ہیں یوں تازہ گرفتاروں میں — کوئی دیکھے تو کہے نقش ہے دیواروں میں
اے خوشا گرمیِ بازارِ جمالِ اکبرؑ — نام لکھواتے ہیں یوسف بھی خریداروں میں
پاس تھا صنعت و قدرت کے ذخیرہ جتنا — ہے وہ سب شبرؑ و شبیرؑ کی سرکاروں میں
گو کہ کمسن تھے بہت حضرتِ زینب کے پسر — آنکھ جھپکی نہ چمکتی ہوئی تلواروں میں
سرِ اصغر کو جو دیکھا تو یہ بولا انصاف — کیا یہ بچہ بھی ہے حاکم کے گنہگاروں میں
مشورہ فوج میں ہے لاش کی پامالی کا — نہیں جز یاس کوئی شہ کے طرفداروں میں

(۳)

منزلِ شوق سے تا سرحدِ عرفاں جاتے — کربلا ہوتے ہوئے سوئے خراساں جاتے
بزمِ ماتم بھی نہیں سوزِ الم سے خالی — ہم کہاں جینے کو اے شمعِ شبستاں جاتے
دل بھی ہے درد بھی ہے سر بھی ہے سودا بھی ہے — عرصۂ حشر میں کیوں بے سر و ساماں جاتے
لاشِ اکبرؑ پہ یہ کہتی تھی جوانی رو کر — ایسے دیکھے نہیں دنیا سے پر ارماں جاتے
ہے وہ درگاہِ حسینی کہ بشرطِ اقبال — دن میں سو بار گدائی کو سلیماں جاتے
منزلِ شوق میں جو پاؤں ہوئے گرد آلود — (قلم) کیوں پے زینتِ اورنگِ سلیماں جاتے
تاجِ شاہی کو مبارک رہے رفعت اپنی — خاک ہو کر بھی نہ ہم تا سرِ خاقاں جاتے
آرزو تھی کہ ہم اس راہ میں سر تا بقدم — لپٹے سائے کی طرح خاک پہ غلطاں جاتے
قسم حضرتِ عباس کہ اس وادی سے — ہو کے پیاسے نہ سوئے چشمۂ حیواں جاتے

قتل میں سبطِ پیمبر کے جو ہوتے نہ شریک کس بہانے سے جہنم میں مسلماں جاتے
کربلا جاتے تو اس شان سے جاتے مرزا خستہ دل خاک بسر چاک گریباں جاتے

مرزا صاحب کا اس قدر کلام بہت دقت سے دستیاب ہوا۔ معیار۔ خدنگِ نظر۔ پیام یار لکھنؤ کے پرانے رسالے۔ امراؤ جان وغیرہ سے بعض بعض اشعار نقل کئے گئے، اور اس کا افسوس رہا کہ ان کا کلیات برباد ہو گیا۔

مرزا کی قدر جیسی چاہیئے نہیں ہوئی، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ انھوں نے اپنی خود نہیں کی۔ موجودہ زمانہ اس رنگ کا ہے کہ اربابِ کمال جب تک اپنی شہرت کے اسباب نہ پیدا کریں لوگ پہچانتے ہی نہیں مرزا صاحب فطرتاً اس بات سے محروم تھے۔

مرزا صاحب کے اُن تلامذہ کا شمار ہی نہیں ہو سکتا جنھوں نے کالجوں میں اون سے فیض حاصل کیا۔ گھر پر آنے والے اصحاب بھی بہت کثرت سے تھے جن میں بعض مشہور ادیب اون کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہیں۔ راقم الحروف نے بھی اکثر افادات حاصل کئے مگر مرزا صاحب کی ذات اس سے مستغنی تھی کہ وہ اپنا شاگرد کسی کو بنائیں اور اس پر فخر و مباہات کریں۔ وہ ہمیشہ سب سے دوستانہ حیثیت سے ملتے تھے۔

بہترین تحفہ

(بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو)

میرے لئے صندل کا شربت نہ لاؤ۔ میرے محبوب! مجھے وہ خاکِ پا جمع کر لینے دے جسے تو نے شرفِ خرام بخشا ہے، وہ ذراتِ خاک میرے لئے ریزۂ گل ہیں۔ مجھے قند و شکر کے سرد و شیریں مرصع پیالے درکار نہیں۔ تیرے ہاتھ سے مس کئے ہوئے جام سفالی کا ایک قطرہ میرے لئے اُولمپس کی شراب آسمانی سے زیادہ ہے۔ تیرے خوانِ کرم کے ریزے میرے لئے لذیذ ترین طعام ہیں۔ مجھے کنول کے اس ہار کی ضرورت نہیں جسمیں شبنم در آغوش پھول گندھے ہوئے ہیں اور جنھیں صبح کے چاند نے بیدار کیا ہے۔ میرا تڑپتا ہوا سینہ تیرے نقوشِ پا سے ایک ایسی بڑی مسرت محسوس کرتا ہے۔ ایک ایسی تسکین جو خوابِ حیات کی لذتوں سے زیادہ ہے۔ میرے لئے سمندروں کی تہ سے نادر الوجود موتی نہ لاؤ۔ مجھے گوشہ ہائے عالم کے ناممکن الحصول جواہر درکار نہیں! میرے محبوب! میرے آگے یہ سب سیم و زر ہیچ ہے۔ ذلیل۔ تیرے ایامِ رفتہ کا سوگ اور گرم گرم آنسوؤں کا راز میرے لئے تیرا بہترین تحفہ ہے۔

(عام اخبار)

اینگلو پرشین آئل کمپنی اور حکومت ایران

(از مسٹر منوہر لال طالب بی اے ایل ایل بی۔ وکیل چکوال)

چند ماہ سے بین الاقوامی سیاسیات میں اینگلو پرشین آئل کمپنی اور حکومت ایران کا جو قضیہ چھڑا ہوا ہے، اہل نظر سے اس کی اہمیت پوشیدہ نہیں۔ اینگلو پرشین آئل کمپنی تیل اور متعلقہ معدنیات کے شصت [۶۰] سالہ اجارہ کے تحت کام کرتی ہے۔ یہ اجارہ سنہ ۱۹۰۱ء میں ولیم ناکس ڈی آرکی کے حق میں ہوا تھا۔ بعد میں کناڈا کا مشہور کروڑپتی لارڈ اسٹراتھکونا بھی اس میں شامل ہو گیا۔ تیل دریافت ہونے پر سنہ ۱۹۰۹ء میں یہ کمپنی وجود میں آئی۔ موجودہ حکومت ایران کا خیال ہے کہ یہ معاہدہ ناجائز دباؤ اور دھوکے سے کیا گیا ہے اس لئے حکومت پر اب اسکی پابندی لازم نہیں اور وہ اسے جب چاہے منسوخ کرنیکی مجاز ہے۔ چنانچہ نومبر سنہ ۱۹۳۲ء میں شاہ ایران نے یہ مستاجری نامہ رد کر کے کمپنی کو مطلع کر دیا کہ آئندہ معاہدہ مذکور کالعدم متصور ہو گا۔ بالفاظ دیگر کمپنی کا کام حکماً بند کر دیا۔ ادھر اینگلو پرشین آئل کمپنی بھی کوئی معمولی کمپنی نہ تھی جو خاموش ہو کر بیٹھ جاتی، لہذا کمپنی مذکور نے اس حکم کے سامنے گردن تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ حکومت ایران کو میعاد مقررہ سے پہلے کمپنی کے کاروبار میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔ معاہدہ کی تکمیل عرصہ ہوا ہو چکی ہے اور اکتیس [۳۱] سال سے اسپر عملدرآمد ہو رہا ہے جو مزید اُنتیس سال تک جاری رہیگا۔ اس طرح یہ جھگڑا شروع ہو گیا۔ قضیہ کی تفصیلات میں جانے سے پیشتر اینگلو پرشین آئل کمپنی کے متعلق بعض باتیں عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جن کے بغیر ناظرین کو فریقین کی صحیح پوزیشن کا علم نہیں ہو سکتا۔

ایران میں تیل کے موجودہ کنوئیں پچیس سال کے صبر آزما تجربات کا نتیجہ ہیں۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں مشہور برہما آئل کمپنی نے ایک کمپنی بنائی جسکا نام اینگلو پرشین آئل کمپنی رکھا گیا۔ آج بھی اول الذکر کمپنی موخرالذکر کمپنی کے جاری شدہ سرمایہ میں جو بقدر اُنتالیس کروڑ نوے لاکھ پونڈ ہے ساڑھے تین کروڑ پونڈ کے حصص کی مالک ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں ایک معاہدہ ہوا جسکی رو سے شاہ ایران نے تمام مملکت ایران میں مٹی کا تیل قدرتی گیس وغیرہ ڈھونڈھنے، نکالنے...... اور فروخت کرنیکا اجارہ سنہ ۱۹۰۱ء لغایت سنہ ۱۹۶۰ء ڈی آرکی

کو دے دیا۔ ۱۹۰۹ء میں اینگلو پرشین آئل کمپنی بنائی گئی اور اُس وقت سے تیل نکلنا شروع ہوا۔ ۱۹۱۴ء میں حکومت برطانیہ نے کمپنی مذکور کے بہت سے حصص خرید لئے جنکی مالیت اس وقت چھہتر لاکھ پونڈ ہے، انکے علاوہ ایک ہزار پونڈ کے ترجیحی حصص اور ایک لاکھ نوے ہزار پونڈ کے پانچ فیصدی والے ڈبنچر (تمسکات) بھی اس کمپنی میں حکومت برطانیہ نے خرید کئے ہیں۔ کمپنی نے حکومت برطانیہ کو کئی برس تک تیل کی بڑی بھاری مقدار مہیا کرنا اپنے ذمہ لیا۔ ابھی تک ایرانی تیل کے کنوئیں ایران کے جنوب مشرقی حصہ میں خلیج فارس سے سو میل دُور مسجد سلیمان کے قریب واقع ہیں لیکن ایران میں تیل اسی رقبہ تک محدود نہیں اس کے علاوہ اور بھی کئی علاقوں میں تیل کے زبردست ذخیرے موجود ہیں جو کمپنی کو معلوم ہیں مگر تا حال اُنکی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت نہیں ہوئی۔

کمپنی نے آبادان اور محمرہ میں تیل صاف کرنے کے کارخانے جاری کر رکھے ہیں۔ تیل نلوں کے ذریعہ ان کارخانوں میں پہنچتا ہے۔ تیل صاف کرنیکا ایک کارخانہ کمپنی نے لنڈارسی (ویلز) میں بھی قائم کیا ہے۔ ایران سے کچھ تیل وہاں بھی صاف کرنے کیلئے بھیجا جاتا ہے۔ اس کارخانہ کے علاوہ اینگلو پرشین آئل کمپنی ملحقہ کمپنیوں کی وساطت سے انگلستان۔ فرانس اور دیگر ممالک کے تیل صاف کرنیوالے کارخانوں کے نظام و اہتمام میں بھی عمل دخل رکھتی ہے۔

اینگلو پرشین آئل کمپنی نے حال ہی میں برطانوی جہاز ساز کمپنیوں کو بارہ جہاز بنانے کا آرڈر دیا ہے ان کو ملا کر کمپنی کے پاس تراسی جہاز ہیں جن کا مجموعی وزن سات لاکھ ستر ہزار ٹن ہے۔ کمپنی مذکور بلاواسطہ یا بالواسطہ اینگلو پرشین آئل کمپنی آسٹریلیا (۱۹۲۱ء) سیلون (۱۹۲۶ء) مصر (۱۹۲۶ء) انڈیا (۱۹۲۰ء) کینیا (۱۹۲۶ء) اور جنوبی افریقہ کے تمام جاری شدہ سرمایہ کی مالک ہے۔ مزید براں برٹش پٹرولیم کمپنی اور دس دیگر کمپنیوں کا تمام جاری شدہ سرمایہ بھی کمپنی مذکور کی ملکیت ہے۔ ان کے علاوہ بارہ دیگر کمپنیوں کے سرمایہ میں حصہ کثیر کی بھی مالک ہے۔

نہر سوئز کی تجارت میں پندرہ فیصدی اینگلو پرشین آئل کمپنی کا حصہ ہے۔ فی الواقعہ ایران کی تجارت برآمد میں ۱۹۱۰ء سے ایک انقلاب رونما ہونا شروع ہو گیا۔ اس انقلاب کی ذمہ دار تیل کے کاروبار کی وسعت ہے، کمپنی کی دیگر سرگرمیاں بھی ناقابل لحاظ نہیں۔ کمپنی مذکور تیس لاکھ پونڈ ہر سال ایران میں خرچ کرتی ہے سال ۲۷-۱۹۲۶ء میں کمپنی نے ۱۱،۴۰،۰۰،۰۰۰ پونڈ کی رقم خطیر صرف محصول کی شکل میں ایرانی خزانے میں داخل کی۔ کمپنی ۳۱۔ دسمبر ۱۹۳۲ء تک ایک کروڑ بارہ لاکھ پینسٹھ ہزار پونڈ داخل خزانہ ایران کر چکی ہے۔ ایران میں کمپنی نے سڑکیں بنائیں، ہسپتال جاری کئے، اسکول کھولے، صنعتی اور فنی تعلیم کا انتظام کیا، ایرانیوں کو اپنے

کارخانوں اور کاروبار میں ملازمتیں دیں اور بالواسطہ اور بلاواسطہ ایران کی فلاح و بہبود میں حتی الوسع امداد کی۔

کمپنی مذکور کے منافع کا نقشہ حسب ذیل ہے:۔

	سنہ ۱۹۲۹ء	سنہ ۱۹۳۰ء	سنہ ۱۹۳۱ء
خالص منافع	۷،۵۰۰،۶۰۰	۶،۷۱۷،۴۹۷	۳،۴۰۹،۵۱
محصول (رائلٹی)	۱،۱۶۱،۵۸۹	۱،۵۱۶،۵۹۵	۱۳۴،۷۵۰
منافع جو فی حصہ کمپنی نے کمایا	۳۲٫۱ %	۲۶٫۹ %	۳۰٫۰ %
منافع جو فی حصہ ادا کیا گیا	۲۰ %	۱۵ %	۵ %

کسی کمپنی کے کاروبار کی صحیح حالت کا اندازہ لگانے کے لئے اسکا بیلینس شیٹ (گوشوارہ محاصل و مصارف) دیکھنا چاہیئے کیونکہ یہی اسکے کاروبار کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اسلیئے اینگلو پرشین آئل کمپنی کے بیلینس شیٹ بابت سال ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۳۲ء سے مندرجہ ذیل اعداد اقتباس کرکے ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں:۔

جائداد	۶۰،۰۲۲،۰۰۰ پونڈ	اسٹاک	۷،۱۹۰،۰۰۰ پونڈ
صنعتہائے متعلقہ میں مصارف سرمایہ	۱۶،۵۳۱،۰۰۰ پونڈ	پیشگی	۷،۵۹۶،۰۰۰ پونڈ
ملحقہ کمپنیوں میں لگایا ہوا سرمایہ	۳۰،۲۵۰،۰۰۰ پونڈ	کروڈ آئل کا اسٹاک	۳،۴۲۱،۰۰۰ "
مقروضوں کے ذمے	۳،۳۲۴،۰۰۰ پونڈ	نقد سرمایہ	۱۰،۲۹۸،۰۰۰ پونڈ
برٹش گورنمنٹ اسٹاک	۴،۰۲۰،۰۰۰ پونڈ	میزان	۴۰،۶۹۰۵،۰۰۰ پونڈ

ان اعداد سے ظاہر ہے کہ کمپنی کا ساٹھ کروڑ روپیہ جائداد وغیرہ پر لگا ہے، مندرجہ صدر اعداد سے یہ بھی عیاں ہے کہ اینگلو پرشین آئل کمپنی کوئی ہندوستانی کم مایہ کمپنی نہیں بلکہ اسکی دولت اور رسوخ کئی ہندوستانی ریاستوں کے لئے موجب رشک ہوسکتے ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ برٹش گورنمنٹ اس کمپنی کی حصہ دار ہے اور بطور حصہ دار اسے اس کے کاروبار میں دلچسپی لینا اور اُسے ہر ممکن نقصان سے بچانا اپنے مفاد کی حفاظت کرنا ہے لیکن اس غیر معمولی دلچسپی کی تہ میں محض اقتصادی وجوہات کے علاوہ سیاسی اور فوجی ضرورتیں بھی ہیں۔ ہم نے اس سے پہلے کسی مضمون میں ناظرین زمانہ کی واقفیت کے لئے دَورِ جدید کے فوجی نظام اور بحری بیڑوں کی ضرورت کی روشنی میں تیل کی اہمیت پر اعداد و شمار پیش کئے تھے اس لئے اعادہ غیر ضروری ہے۔ انگلستان کے عدیم المثال بحری بیڑے کی کامیابی کے لئے اسے تیل کے ذخیروں پر اختیار ہونا چاہیئے لیکن بدقسمتی سے انگلستان درکنار تمام برٹش امپائر میں دنیا کی تیل کی پیداوار میں سے صرف ۲½ فیصدی سے زیادہ تیل نہیں نکلتا، اور اگرچہ معاہدہ اوٹاوہ کی

غرض و غایت رو بہ تنزل برطانی تجارت کو سنبھالنے کے علاوہ برٹش امپائر کو غیر ممالک کی دست نگری سے آزاد کرنا بھی ہے، لیکن کیا کیا جائے قدرت نے امپائر کو تیل کا حصہ دینے میں بخل سے کام لیا ہے مقام غور ہے کہ ۰۰۰، ۰۰۰، ۴۰۶، ۳۴ گیلن میں سے ہماری امپائر میں صرف ۰۰۰، ۰۰۰، ۶۹۹ گیلن مہیا ہو سکتے ہیں، آخر ۲ فیصدی ہوتا ہی کیا ہے خصوصاً جب ضرورت اس قدر زیادہ ہو۔ اگر دنیا کی پیداوار (تیل) کو ایک سو فرض کیا جائے تو مختلف ممالک کے حصص حسب ذیل ہونگے:-

ریاستہائے متحدہ امریکیہ	۷۲ر	روس	۵ر۶
میکسیکو	۵ر۲	وینزویلا	۵ر۲
ایران	۲ر۵	رومانیہ	[illegible]
ڈچ ایسٹ انڈیز	۱ر۶	ہندوستان (برہما)	ر۶
دیگر ممالک	۵ر۹		

مندرجہ بالا سطور کے مطالعہ سے اینگلو پرشین آئل کمپنی کی مالی حالت، اسکا وسیع کاروبار، اس کے لامحدود ذرائع اور اس کی سیاسی اہمیت آپ پر واضح ہو گئی۔ آپ نے یہ بھی دیکھ لیا کہ برٹش امپائر بلحاظ تیل کچھ خوش قسمت واقع نہیں ہوئی۔ آپ پر یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ کمپنی کئی لاکھ پونڈ سالانہ ایرانی خزانہ میں بشکل محصول (رائلٹی) داخل کرتی ہے۔ تو کیا یہ وجہ تعجب نہیں کہ ایسی متمول اور کاروباری کمپنی کا اجارہ قبل از وقت منسوخ کر دیا جائے جس نے ملک کی تعلیمی، صنعتی اور مالی حالت کو بہتر بنانے میں مناسب حصہ لیا ہو اور جو اپنے خالص منافع کا ۱۶ سولہ فیصدی ہر سال شاہی خزانے میں داخل کر دے بظاہر مقام حیرت ہے مگر مطالعۂ واقعات و نگاہ تعمق ظاہر بیں آنکھوں سے حیرت کا پردہ اٹھا دیگی۔

جن دنوں (سنہ ۱۹۰۱ء) یہ ۶۰ شصت سالہ اجارہ دیا گیا تھا، ایران میں ذمہ دارانہ حکومت نہ تھی دراصل اس وقت ملک کو شاہ ایران کی شخصی حکومت سمجھنا چاہیئے۔ اہل ایران کی پوزیشن یہ ہے کہ یہ معاہدہ ان حالات پر حاوی نہیں جو جنگِ عظیم کے اختتام کے بعد رونما ہوئے۔ اسکا منشا حدود ایران کے اندر یا ایرانی بندرگاہ تک تیل کی تجارت سے پابندیاں ہٹانے کا تھا۔ اس میں ہرگز ان حالات کا ذکر نہیں جو کمپنی کی سرگرمیوں کے بعد پیدا ہو گئے۔ کمپنی نے تراسی جہازوں کا ایک تجارتی بیڑا بنا لیا۔ اور اپنی کاروبار کو دنیا کے مختلف ممالک میں اتنی وسعت دیدی ہے کہ اینگلو پرشین آئل کمپنی کا حساب بھی مشکل ہو گیا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۰ء میں بھی ان مشکلات کو عبور کرنے کی کوشش کی گئی۔ مختلف مواقع پر حکومت ایران نے شکایت کی کہ اگرچہ کمپنی نے بے حساب منافع حاصل کیا ہے لیکن ایران کو بہت کم دیا ہے۔

چنانچہ زرمحصول میں بتدریج کمی ہورہی ہے (ملاحظہ ہو نقشہ منافع مندرجہ صدر) ۱۹۲۱ء سے کمپنی اور حکومتِ ایران کے مابین خط و کتابت ہورہی تھی مگر جب کوئی نتیجہ نہ نکلا تو ایران نے مجبوراً تنسیخ اجارہ کا سخت قدم اُٹھایا۔ یہ نومبر ۱۹۳۲ء کی بات ہے۔ کمپنی نے ایران کے حق تنسیخ مستاجری سے انکار کیا حکومت برطانیہ نے پُرزور پروٹسٹ کیا۔ اور ایک طرح سے جنگ کی دھمکی دی۔ برطانیہ نے معاملہ ہیگ کورٹ آف جسٹس (عدالت انصاف مقام ہیگ) کے سپرد کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ایران نے یہ تجویز نامنظور کردی۔ برطانیہ نے دفعہ ۱۵ کی رو سے اس معاملہ کو لیگ کونسل میں پیش کردیا سرجان سائمن نے برطانیہ کی وکالت کی۔ ایران کی طرف سے مرزا علی اکبر خاں داور وزیر عدل نے مکمل جواب کا حق محفوظ رکھتے ہوئے بعض الزامات (مثلاً ایران کا برطانی رعایا کے مال وجان کی حفاظت سے انکار وغیرہ) کی تردید کی۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ چونکہ ایران نے اجارہ منسوخ کردیا ہے اس لئے وہ دفعہ ۱۰ کے ماتحت جو مستاجرنامہ کا جزو ہے اور جسے وہ منسوخ کرچکا ہے اس معاملہ کو کسی ثالث کے سپرد کرنے پر تیار نہیں ہوسکتا کیونکہ اسکا یہ فعل تنسیخ اجارہ کی تنسیخ ہوگا۔ مزید براں تنازعہ حکومت ایران اور اینگلو پرشین آئل کمپنی کے مابین ہے۔ حکومت ایران اور حکومت برطانیہ کے مابین نہیں اور اس لئے تاوقتیکہ کمپنی مذکور ایرانی قانون کے مطابق چارہ جوئی نہ کرے۔ یہ معاملہ لیگ کونسل کے سامنے نہیں لایا جاسکتا۔ یہ بات کہ اینگلو پرشین آئل کمپنی میں حکومت برطانیہ بھی حصہ دار ہے، اسکے قانونی پوزیشن پر اثر انداز نہیں ہوسکتی اور اگر یہ اصول تسلیم کرلیا جائے تو حکومت برطانیہ ہر ایک کمپنی میں شامل ہو کر کمزور ممالک کے قوانین کو پامال کرسکتی ہے۔ وہ ہر ایک معاملہ کو لیگ کونسل میں (جہاں اس کا گہرا رسوخ اور اثر ہے) گھسیٹ کر اپنے حسب منشا فیصلہ کراسکتی ہے۔

اگرچہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ لیگ کونسل کا فیصلہ کیا ہوگا لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ مرزا صاحب کی پوزیشن بہت حد تک درست معلوم ہوتی ہے۔ لیکن سردست مسٹر بینس کی وساطت سے سلسلہ گفت و شنید شروع ہوگیا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ معاملہ کا فیصلہ ہوجائے۔ تا فیصلہ قطعی مندرجہ ذیل امور طے پائے ہیں :-

۱۔ فریقین معاملہ لیگ کونسل سے واپس لے لیں گے اور مئی ۱۹۳۳ء سے پہلے اس میں پیش نہ کرینگے۔

۲۔ کمپنی حکومت ایران سے سلسلہ گفت و شنید شروع کردیگی۔

۳۔ اگر کمپنی نیا اجارہ لینے میں ناکامیاب ہو تو فریقین لیگ کونسل کے سامنے اپنی پہلی پوزیشن اختیار کرنے کے مجاز ہونگے۔

۴۔ حکومت ایران کے ۱۹، دسمبر ۱۹۳۲ء کے تار کے بموجب کمپنی اپنا کام اسی طرح جاری رکھیگی، جس طرح وہ ۲۷۔ نومبر ۱۹۳۲ء سے پہلے کرتی رہی ہے۔

یہ تجاویز ۲۳۔ جنوری ۱۹۳۳ء کو مسٹر بینس کی مصالحانہ کوشش سے طے شدہ امور کی شکل میں لیگ کونسل میں پیش ہوئیں۔ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی اور حکومت ایران میں فیصلہ ہوجائیگا کیونکہ برطانیہ کا مشرق میں اب وہ زور نہیں ہے جو پہلے تھا۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ ایران نے سویٹ روس کے زیر اثر ہوکر تنسیخ اجارہ کا اقدام کیا ہے بہرحال خواہ کچھ بھی ہو ایرانی تیل کا تصفیہ بین الملی سیاسیات اور بین الاقوامی حلقوں میں خاص اہمیت حاصل کرچکا ہے۔ اور مشرق قریب کی سیاسیات میں اسے وہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

انسان کا جسم

انسان کو حکماء اور علماء نے "عالم صغیر" کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ آج ہم اپنے معزز ناظرین کو اس "عالم صغیر" کی کسی قدر سیر کراتے ہیں جو ازدیاد معلومات کا باعث ہوگا۔

ہاتھ کی ہتھیلی کے ایک مربع انچ میں ۲۰ ۲۵ مسامات ہیں، اور اوسط قدو قامت کے انسان کے جسم میں ۷۰ لاکھ مسامات ہوتے ہیں، اگر ان مسامات کو مسلسل رکھاجائے تو یہ سلسلہ ۲۰ میل کا ہوگا۔ ۲۴ گھنٹے کے اندر غیرارادی طور پر جسم انسان سے ۳۲ اونس پسینہ خارج ہوتا ہے۔ انسان کے جسم میں بحالت طبعی ۹۸ درجہ حرارت رہتی ہے جسم انسان کے ایک مربع انچ پر چودہ پونڈ ہوا کا دباؤ پڑتا ہے۔ اس طرح گویا تمام جسم پر ۱۲ ٹن (ایک ٹن = تقریباً ۲۸ من) کا وزن رہتا ہے۔ شہروں میں زندگی کا اوسط ۳۸ برس اور دیہات میں ۵۵ سال ہے۔ ۱۲۰ بچے فی ہزار پیدا ہوکر پہلے ہی سال میں فوت ہوجاتے ہیں۔ دوسرے سال کے دوران میں ۵۰ بچے فی ہزار۔ اور آئندہ تین سال کے عرصہ میں ۱۹ بچے فی ہزار، اور آیندہ دو سال کے دوران میں ۱۹ بچے فی ہزار مرجاتے ہیں۔ اس طرح پیدائش سے لیکر سات برس کے اندر ۲۰۰ بچے فی ہزار مرجاتے ہیں۔

میاں ہُدہُد

ازسید مظہر حسین اختر میرٹھی

غدر ۱۸۵۷ء سے پہلے سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کا زمانہ دہلی کی شاعری کا آخری وقت تھا۔ حسن اتفاق سے اردو کے وہ کامل الفن اساتذہ جن پر آخری زمانہ تک اردو شاعری ناز کرے گی اور جن کا کلام گذشتہ اور موجودہ دور ہی میں نہیں بلکہ مستقبل بعید میں بھی اپنے وقار کو برابر قایم رکھے گا۔ اس عہد میں یکجا جمع ہو گئے تھے۔ حکیم مومن خاں مومن۔ مرزا اسداللہ خاں غالب۔ شیخ ابراهیم ذوق میں سے ہر ایک اپنے کمالات کا اُستاد اور سفینۂ شاعری کا ناخدا تھا۔

خاص لال قلعہ میں یا قلعہ والوں کی تحریک پر مشاعرہ ہوتے رہتے تھے۔ اور بادشاہ کے کلام کے ساتھ ساتھ ان درد آشنا طبیعتوں کو جن کے دل اس سے آشنا ہیں اُستادان فن کے کلام سننے کا بھی برابر موقع ملتا رہتا تھا۔ شاعر صرف فطرت کی نیرنگیوں کا مدح خواں نہیں بلکہ وہ اپنی سحر کاریوں سے اُن نیرنگیوں میں نئی روح پھونک کر ایک ایک رنگ میں سو سو رنگ کی بہار دکھاتا ہے صرف اسی پر بس نہیں بلکہ ہر شخص کو اُس کی طبع آزمائی کے اظہار کا موقع دیا جاتا تھا۔ اور مختلف دماغوں میں جو جدا جدا خیالات پیدا ہوتے تھے اُن سب کا مجموعہ گلستان بہار کا وہ بیش قیمت ہار تھا جس میں یاسمن چمپا جوہی کی کلیاں اور گلاب کے پھول ترتیب و قرینے سے گوندھے گئے ہوں اور اُن کی نزاکت خوشبو وضع داری اپنے اپنے درجہ اور مرتبہ پر نمایاں دکھائی دیرہی ہو۔

مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے چند سال ہوئے رسالہ اُردو (حیدرآباد دکن) میں "دہلی کا آخری مشاعرہ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر صرف اردو شاعری سے اپنی دلچسپی کا اظہار ہی نہیں کیا تھا بلکہ دنیائے ادب کو اُن مختلف الخیال اور مختلف المذاق ہستیوں سے روشناس کرانے کی خدمت انجام دی تھی جن سب کا مقصد تو ایک ہی ہے۔ لیکن ہر ایک اپنے رنگ میں ایکدوسرے سے جدا دکھائی دیتا ہے یوں کہیے کہ ایک وسیع دسترخوان پر کھانے چنے ہوئے ہیں اور ہر ایک چیز اپنے

رنگ، مزے اور تاثیر میں ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

اس سلسلہ میں حکیم آغا جان عیش کیساتھ میاں ہُدہُد کا ذکر مرزا صاحب نے چھوڑ دیا ہے جس کی خاص وجہ تو یہ ہے کہ شاعر اُن کو مانتا ہی کون ہے اور وہ بیچارے تھے کس شمار میں۔

لیکن اس موقعہ پر اُن کا ذکر نہ آنے کا سبب یہ بھی ہے کہ مرزا صاحب نے مشاعرہ کا جو نقشہ کھینچا ہے اُس میں دکھایا ہے کہ حکیم آغا جان عیش نے میاں ہُدہُد کو اس خیال سے چھپا دیا تھا کہ میر صاحب نے جو بحر طویل کے زبردست شاعر تھے میاں ہُدہُد کی تعلی و خودستائی سے تنگ آکر ان کی ایک ہجو لکھی تھی اور مشاعرے میں اعلان کر دیا تھا کہ وہ ہُدہُد کی شان میں ایک قصیدہ سنائیں گے۔ حکیم صاحب کو خوف تھا کہ کہیں اس سلسلہ میں بھی نہ پیٹیا جاؤں اور ندامت و شرمندگی اٹھانی پڑے۔

ہُدہُد نہ کوئی بڑے شاعر تھے اور نہ اُن کے کلام میں کوئی خاص بات تھی سوا لغویات کے۔ لیکن چونکہ حکیم آغا جان عیش کے توسل سے اُن کی رسائی شاہی دربار تک ہو گئی تھی اور سرکار شاہی سے کچھ امداد بھی ملتی تھی۔ اس لئے میاں ہُدہُد کا یہ خیال کر لینا کہ وہ شاعر ہیں اور اُن کی شاعری نے دہلی کے گلی کوچوں سے نکل کر لال قلعہ میں بھی اپنا اثر جما لیا ہے بیجا نہ تھا۔

مولوی محمد حسین آزاد مرحوم نے آب حیات میں آپ کا حلیہ یہ لکھا ہے کہ :۔

"یچگی ڈاڑھی لمبی اور نکیلی۔ سر منڈا ہوا جس پر چھوٹا سا عمامہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کھٹ بڑھی ہیں"

ان کا اصلی نام عبدالرحمٰن تھا۔ پورب کے رہنے والے تھے حکیم آغا جان عیش بادشاہی طبیب کے مکان کے پاس ایک مکتب تھا اُسمیں لڑکے پڑھایا کرتے تھے معمولی استعداد تھی لیکن گلستاں، بوستاں، اور سکندر نامہ کے مطالب ایسی خوش اسلوبی سے بیان کرتے تھے کہ اصل مضمون کوسوں دور ہو جاتا تھا۔ حکیم صاحب نے ایکمرتبہ اُن کے شاگردوں سے سکندر نامہ کا سبق سنا تو حیران رہ گئے لڑکوں نے جو مطلب بیان کیا اُس سے حکیم صاحب کو صرف حیرت ہی نہیں ہوئی بلکہ ان حضرت کی ملاقات کا بھی اشتیاق پیدا ہوا۔ حکیم صاحب بڑے خوش اخلاق اور ظریف طبع تھے۔ اُن کا کلام قلعہ معلٰی میں شوخی اور حسن محاورے کے لحاظ سے بہت بلند خیال کیا جاتا تھا۔ بات بات میں ظرافت و بذلہ سنجی تھی۔ انہوں نے ایک ہی نظر میں تاڑ لیا کہ مولوی صاحب بالکل کورے ہیں لیکن ان کو محفل کا بھانڈ بنانا اور دربار کا مسخرہ شاعر مقرر کر کے تماشہ دیکھنے کی خواہش ہوئی۔ چنانچہ اُن کو شعر کی تعریف سمجھائی اور ہُدہُد تخلص رکھ کر مشاعرے میں ہمراہ لے گئے۔ اور مناسب الفاظ میں اپنی زبان سے تعریف کر کے غزل پڑھوائی۔ ہُدہُد کے گھونسلے میں کوڑے کرکٹ کے سوا کیا تھا۔ لیکن لوگوں نے صف سے باہر نکل

نکل کر واہ واہ اور سبحان اللہ کا شور بلند کر دیا تو یہ بے وقوف سمجھے کہ مجھ سے زیادہ کسی کی تعریف نہیں ہوئی اور اب میرے ملک الشعرا ہونے میں تھوڑی ہی کسر باقی رہ گئی ہے

کچھ دنوں کی مشق سخن کے بعد مولوی صاحب مدرسہ کے کام کے تو نہ رہے لیکن امرا کے جلسوں اور مشاعروں میں ان کے بغیر رونق ہی نہ ہوتی تھی غرضکہ ہر جگہ ہُدہُد، ہُدہُد کا گیت گایا جاتا تھا۔ حکیم صاحب نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ نہایت شستہ الفاظ میں ان کی غزلیں اصلاح کر کے مجمع عام میں پڑھوائیں۔ جنکا مطلب تو خاک بھی نہیں تھا لیکن غالب اور مومن کی ہمسری کا دعوی کیا جاتا تھا۔ ایک غزل غالب کے انداز میں تیار کی گئی جنکا مطلع تھا:۔

مرکزِ محورِ گردوں بہ لبِ آب نہیں ناخن توس و قزح شبہۂ مضراب نہیں

غالب مرحوم تو اس مطلع کو سنتے تھے اور ہنستے تھے لیکن مومن خاں کا برا حال تھا۔ کہتے تھے کہ یہ جانور غالب کے رنگ میں کیا شعر کہہ سکتا وہ خود یا اُس کے استاد حکیم صاحب مرزا نوشہ کے اشعار کو سمجھ تو لیں۔

غرض میاں ہُدہُد اپنی وحشیانہ حرکتوں اور اُستاد کی ظریفانہ ترکیبوں سے مشاعروں میں بدنام ہو گئے بھلا اُستاد کی تضحیک کون گوارا کرتا ہے چاروں طرف سے باز اور زاغ وغیرہ پرندوں نے اُن کو گھیر لیا مگر چند دنوں میں یہ شکاری تھک کر بیٹھ گئے لیکن ہُدہُد کی منقار بند نہیں ہوئی۔

جب علمی کا سلسلہ شاعری کے دیوتا کی نذر ہو چکا تو حکیم صاحب کو فکر ہوئی کہ اُن کے دانہ پانی کا بھی بند و بست ہونا چاہئے۔ ان میں قابلیت ہی کیا تھی لیکن حکیم صاحب بڑی سوجھ بوجھ کے آدمی تھے سوچا کہ اُن کے آشیانے کو ایسے مضبوط درخت پر لگادیں جو ہوا اور آندھی میں بھی نہ اکھڑ سکے۔ بہادر شاہ کی شان میں ان سے ایک قصیدہ لکھوایا اور اُن کو اپنے ساتھ دربار میں لے گئے ظفر غربا پروری کے ساتھ ہی سخن پرور بھی تھے۔ اور شاعری سے انہیں خاص انس بھی تھا۔ میاں ہُدہُد دربار میں آئے اور قصیدہ گذرانا تو فرمایا کہ بھئی ہم لیسے تو خالی خولی اڑائیں گے نہیں۔ طائر الاراکین شہپر الملک، ہُدہُد الشعراء، منقار جنگ بہادر خطاب عطا فرمایا اور کچھ ماہانہ بھی مقرر کر دیا۔ قصیدہ کے دو شعر ملاحظہ ہوں:۔

جو تیری مدح میں میں چونچ اپنی وا کر دوں تو رشکِ باغ ارم اپنا گھونسلا کر دوں

میں کھانے والا ہوں نعمت کا اور میرے لئے فلک کہے سے مقرر ہیں باجرا کر دوں

ہُدہُد کی شاعری جس کو حکیم صاحب کی اُستادانہ عنایات و مراعات کہیئے یا اُن کی دماغ سوزی

کا نتیجہ بے معنی اور تعلّی آمیز ہے۔ لیکن مسخرہ پن زمانے کو پسند ہے پھر رئیسوں اور بادشاہوں کی صحبت میں جہاں الفاظ کے تیر برستے ہیں۔ فقروں کی تلواریں چلتی ہیں اور جہاں مضامین نوک سنان بن بن کر دلوں کو چھیدتے ہیں اور صاحب محل کو خوش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے

ان کے چند اشعار ہیں :۔

آشیاں سے جو غزل پڑھنے کو ہُدہُد آیا　　غل ہوا پیش رو ملک سلیماں آیا

ہُدہُد کا مذاق ہے نرالا سب سے　　انداز ہے اک نیا نکالا سب سے

سر دفتر لشکر سلیماں ہے یہ　　اڑتا بھی ہے دیکھو بالا بالا سب سے

جسے کہتے ہیں ہُدہُد وہ تو ہر شیر دل کا دادہ ہے　　مقابل تیرے کیا ہو تو تو اک جرّہ کی مادہ ہے

ادب اے بے ادب اب تک نہیں تجھ کو خبر اسکی　　کہ ہُدہُد سب جہاں کے طائروں کا پیرزادہ ہے

برسات میں ان کا مکان گر گیا۔ حکیم صاحب کے مشورہ سے بادشاہ کے حضور میں گھونسلے کے لئے درخواست گذرانی گئی۔ مطلع ہے :۔

جز تیرے شاہنشہا کس کس کے آگے روئیے　　کس سے کہئے جاکے یہ غم کہ ہمارے کھوئیے

چند شعر ملاحظہ ہوں :۔

حیف آتا ہے کہ فن شعر میں کیوں کھوئی عمر　　کاشکے ہم سیکھتے اس سے بنانے بوریے

رشتۂ عمر شہنشاہ جہاں ہو وے دراز　　یا خدا کھلتے رہیں دنیا میں جب تک ہوئیے

دیوے اس کو بھی زمیں تھوڑی سے بن گھر گھونسلے　　مارا پھرتا ہے ہُدہُد تیرا ٹاپک ٹوئیے

فن شعر میں پھنکر کسی کام کا نہ رہنا اور بیچارگی و درماندگی سے مجبور ہوکر بارگاہ خسروی میں فریاد کرنا اظہار مطلب کیلئے کافی لمبی چوڑی داستان تھی اس پر حکیم صاحب کا نمک مرچ گھوڑا ہمیشہ کھونٹے کے بل کودتا ہے ورنہ ایسے ایسے ہزاروں ہُدہُد و ہُما مارے پھرتے تھے اور کوئی نہیں پوچھتا تھا کہ ہُدہُد کے مکان کا فی الفور بندوبست کر دیا گیا۔

دہلی کی بربادی کے ساتھ ساتھ میاں ہُدہُد اور اُن کی شاعری برباد ہو گئی حکیم صاحب بھی غدر کے تھوڑے دنوں کے بعد انتقال کر گئے۔ یہ چند واقعات باقی رہ گئے ہیں جو اس قابل نہیں کہ اُنکو بار بار دوہرایا جائے اور ماضی کے ان افسانوں پر تبصرہ کیا جائے۔ لیکن یہ پُرانی باتیں ہیں اور سلف کی یادگاریں ان کا مزہ اُن کے دل سے پوچھیئے جو یہ مزے اٹھا کر قیامت کی نیند سو رہے ہیں اور کروٹ نہیں لیتے

تکیہ کلام

(از مسٹر سلیم جعفر)

چتلی قبر کے سامنے ایک بالاخانہ میں چند لوگ روز شام کو جمع ہوتے ہیں۔ یہ کلب اجتماع ضدین کا نمونہ ہے۔ یہاں عہد قدیم کے آخری دور کی شمعیں جھلملاتی اور انھیں کے پہلو بہ پہلو نئی روشنی کی حیرت انگیز شعاعیں بھی نظر آتی ہیں۔ مرزا شہباز ایک پرانی وضع کے مغل کوچہ عاشق میں رہتے ہیں۔ اس کلب میں روز ۵ بجے آتے ہیں اور دنیا کو رنگ بدلتے ہوئے دیکھ دیکھ کر کچھ افسوس اور کچھ حیرت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اُن کی عادت ہے کہ اپنے کلام کو "کیا نام کہ" سے مزین فرمایا کرتے ہیں۔

ایک روز کہیں سرکس دیکھنے چلے گئے۔ دوسرے دن دوپہر کو دیر تک سوتے رہے۔ شام کو حلقۂ احباب میں دیر سے پہنچے۔ دوستوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا "آئیے، قدم رنجہ فرمائیے، تشریف رکھئے" کے شور سے بالاخانہ گونج اٹھا۔ مرزا ابھی اطمینان سے بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک صاحب بول اُٹھے "کہیئے مرزا صاحب آج کہاں رہے"۔

مرزا: "کیا نام کہ رات دیر تک جاگنے کا اتفاق ہوا، اس لئے کیا نام کہ آج دوپہر کو جو سویا تو آنکھ وقت پر نہ کھُلی"۔

دوست: "رات کہیں اکیلے اکیلے جلسہ کا مزا لوٹتے رہے ہونگے"۔

مرزا: "کیا نام کہ میں ایسی جگہ نہیں جایا کرتا"۔

دوست: "تو پھر رات بھر کیوں جاگتے رہے"

مرزا: "کیا نام کہ آپ اسی شہر میں رہتے ہیں یا کہیں اور"۔

دوست: "رہتا تو دہلی ہی میں ہوں، مگر آپکو کونسی دلچسپی کہاں گھسیٹ لے گئی"۔

مرزا: "کیا نام دعوے تو یہ ہیں لیکن کیا نام کہ آپ کو یہ بھی خبر نہیں کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے"۔

دوست: "کچھ فرمائیے تو سہی"۔

مرزا: "کیا نام کہ کل شام کو جب میں یہاں آرہا تھا تو کیا نام کہ کیا نام کہ کیا دیکھتا ہوں کہ اکثر جگہ مکانوں اور دکانوں پر بڑے بڑے سفید کاغذ چپکے ہوئے ہیں جن پر کیا نام کہ ہاتھی گھوڑوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ کیا نام کہ پہلے تو میں نے یہ سمجھا کہ کوئی ہاتھی گھوڑوں کا سوداگر تجارت کرنے آیا ہے اور یہ اُس کا اشتہار ہے اس لئے کچھ خیال نہ کیا، لیکن کیا نام کہ جامع مسجد کے سامنے آیا ہی تھا کہ سامنے سے ایک بگھی آتی دکھائی دی۔ کیا نام کہ اُسکی چھت پر کیا نام کہ ایک لڑکا بیٹھا کیا نام کہ ایک تختہ تھامے ہوئے تھا، جس پر کیا نام کہ موٹے موٹے حرفوں میں ہاتھی گھوڑوں کی تصویروں کے اوپر لکھا تھا "آج رات کو کشمیری دروازہ باہر" اور کیا نام کہ بگھی کے اندر دو آدمی تھے کیا نام کہ ایک زور زور سے ڈھول بجا رہا اور دوسرا کچھ کاغذ کے پرچے بانٹ رہا تھا اور کیا نام کہ بچے بوڑھے سب اس پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ کیا نام کہ بگھی کا گھوڑا چلنے بھی نہ پاتا تھا۔ یہ دیکھکر کیا نام کہ مجھے بھی حیرت ہوئی کہ کیا نام کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ کیا نام کہ میں نے بھی ہاتھ بڑھا کر ایک پرچہ لے لیا کہ فرصت میں گھر جا کر پڑھیں گے۔"

دوست: "خوب! مرزا صاحب خوب! آپ بڑے صبر کے آدمی ہیں۔"

مرزا (بگڑ کر) "کیا نام مجھے آپ نے کوئی گنوار سمجھا ہے کہ کیا نام کہ وہیں کھڑا ہو کر کیا نام پڑھنے لگتا۔"

دوست: "مرزا صاحب، معاف کیجئے، مجھے خیال نہیں رہا کہ آپ ماشاءاللہ یادگار دورِ قدیم ہیں۔"

مرزا صاحب ذرا ٹھنڈے ہوئے اور پہلو بدلکر بولے:۔

"اسکا دعویٰ تو چھوٹا منہ بڑی بات ہے لیکن کیا نام کہ 'بندہ' 'بدنام کنندہ' 'نکو نامے چند' کا مصداق ضرور ہے۔"

دوست: "اچھا مرزا صاحب، جب یہاں سے گھر واپس گئے تو پھر؟"

مرزا: "کیا نام کہ جاتے ہی انگرکھا اُتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا، صحن میں چارپائی بچھی تھی، لیٹ گیا، کیا نام کہ ذرا پسینہ خشک ہونے لگا تھا کہ آپ کی بھتیجی نے پوچھا "ابّا، کھانا لاؤں" کیا نام کہ میں نے کہدیا "لے آؤ"۔ کھانا کھا کر کیا نام کہ میں نے حقے کے دو ہی کش لیے تھے کہ مرزا گلباز کے صاحبزادہ نے کیا نام کہ تصدق حسین خاں صاحب کے لڑکے کو آواز دیکر پوچھا "میاں چلتے ہو؟" خانصاحب کے لڑکے نے جواب دیا "میاں کہاں؟" مرزا صاحب کے صاحبزادہ بولے "میاں بھول گئے، دریبے میں اشتہار لیا تھا نا؟" کیا نام کہ اُس وقت مجھے یاد آیا کہ ایک اشتہار میری جیب میں بھی ہے۔ میں نے لیٹے لیٹے جلدی جلدی حقے کے دو اور کش لیکر کیا نام کہ آپ کی بھتیجی سے کہا "میری جیب

میں کاغذ کا ایک پرچہ ہے نکال لاؤ۔ کیا نام کہ وہ پرچہ دے گئی۔ میں نے جو اُسے غور سے پڑھا تو کیا نام کہ جی چاہا کہ میں بھی یہ تماشا دیکھوں۔ چنانچہ کیا نام کہ حقے کے دو اور کش لیکر کپڑے پہنے اور روانہ ہوگیا۔"

دوست :" تو یہ کہیئے کہ کل آپ سرکس دیکھنے چلے گئے۔"

مرزا: جی۔ ہاں۔ کیا نام کہ کشمیری دروازہ باہر پہنچا۔ کیا نام کہ وہاں جاکر دیکھا تو باجا بج رہا ہے اور آدمیوں کے ٹھٹھ لگ رہے ہیں، کیا نام کہ لوگ ایک کھڑکی کے سامنے کھڑے ہوئے بالکل ویسے ہی ٹکٹ خرید رہے ہیں جیسے کہ کیا نام کہ ریل کے اسٹیشن پر۔ کیا نام کہ میں نے بھی جیب سے ایک روپیہ نکالکر ٹکٹ خریدا، تھوڑی سی دیر میں کیا نام کہ باجا بند ہوگیا اور لوگ ایک طرف دوڑے۔ کیا نام کہ غضب کی ریلا پیلی تھی۔ میں بھی دھکے دیتا دلاتا منڈوے میں داخل ہوگیا۔ اور ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ جب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو کیا نام کہ ایک گھنٹی بجی اور لوگ چپ ہوگئے۔ کیا نام کہ تھوڑی سی دیر میں منڈوے کے ایک کونے سے چند گھوڑے اور کیا نام کہ ایک بندر ہیٹ لگائے اور اُوور کوٹ پہنے کیا نام کہ پورا جنٹلمین بنا داخل ہوا۔ اور گھوڑے آگے پیچھے ایک حلقہ بناکر کھڑے ہوگئے۔ کیا نام کہ پھر ایک شخص نے سیٹی بجائی اور بندر اُچک کر ایک گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہوگیا۔ اس کا سوار ہونا تھا کہ سب گھوڑے دوڑنے لگے کیا نام کہ بندر اس پر اس طرح ران جمائے کیا نام بیٹھا تھا کیا نام کہ جیسے کوئی بڑا چابک سوار ہو۔ کیا نام یہ عجیب بات دیکھی کیا نام کہ جب کوئی گھوڑا کیا نام اِدھر اُدھر ہونے لگتا تو یہ شہسوار کیا نام اس کے چابک مار کر کیا نام اُسے قطار میں لے آتا۔ اسی طرح کے اور بہت سے تماشے دکھلائے گئے۔ لیکن کیا نام سب سے آخر میں ایک عجیب وغریب بات دیکھنے میں آئی۔ کیا نام یہ تو سنتے آئے ہیں کہ بیا توپ چلاتا ہے مگر کیا نام آج تک طوطے کو توپ چلاتے نہ دیکھا نہ سنا۔ کیا نام کہ بیچ منڈوے میں ایک چھوٹی سی توپ۔ ایک کاغذ کی گولی اور ایک گز لاکر رکھا گیا۔ کیا نام کہ پھر منڈوے کے ایک کونے سے ایک طوطا اڑ کر آیا اور توپ کے پاس بیٹھ گیا پہلے تو کیا نام اس نے کاغذ کی گولی کیا نام کہ چونچ سے پکڑ کر کیا نام کہ توپ کے مُنہ میں رکھی۔ پھر چونچ سے پکڑ کر کیا نام گز اُٹھایا اور کیا نام اس ڈاٹ کو ٹھوکنے لگا۔ کیا نام یہ کام کرکے پھر سے اُڑ کر کیا نام کہ توپ کے پیچھے جا بیٹھا۔ کیا نام کہ پھر اس نے پاس ہی جو فتیلہ رکھا تھا اُٹھایا اور کیا نام کہ فتیلہ کو کیا نام رنجک پر رکھ کر کیا نام ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ کیا نام کہ دو ہی سکنڈ میں توپ کی آواز سے کیا نام

سا۔۔۔ سا۔۔۔ منڈوا گونج اٹھا، کیا نام کہ کئی آدمی اچھل پڑے مگر طوطا کیا نام وہیں کا وہیں کیا نام جما رہا۔ کیا نام کہ ایک واہ واہ کا نعرہ بلند ہوا اور تماشا ختم ہو گیا، کیا نام کہ سب واپس اپنے اپنے گھر چلے آئے۔"

اس کے بعد کچھ دیر ہنسی مذاق ہوتا رہا پھر محفل برخاست ہو گئی۔ سب اپنے اپنے گھر روانہ ہوئے مرزا صاحب کے دوست اختر اور انجم کا مکان ایک ہی محلہ میں ہے، دونوں ساتھ ساتھ چلے جا رہے ہیں اور باتیں ہو رہی ہیں۔

اختر: "آج تو مرزا نے غضب کیا۔ کیا نام۔ کیا نام کی جھڑی لگا دی، بات کا سمجھنا دشوار تھا۔"

انجم: "لیکن وہ بیچارے فطرت اور عادت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔"

اختر: "عادت تو خیر، لیکن فطرت کو اس میں کیا دخل ہے۔"

انجم: "اس امر میں فطرت کے بعد عادت کو دخل ہے۔"

اختر: "کیونکر؟"

انجم: "بعض لوگ فطرۃً اس قابل نہیں ہوتے کہ خیال کو مسلسل ظاہر کر سکیں، ان کی قوت بیانیہ ناقص ہوتی ہے۔ خیال کا ایک حصہ ظاہر کرنے کے بعد ہی جواب دے دیتی ہے، گھبرا کر رک جاتے ہیں اس وقت بحالت غیر شعوری کچھ بے معنی لفظ منہ سے نکل جاتے ہیں اور جب وہی لفظ بار بار اکثر موقعوں پر نکلنے لگتے ہیں تو عادت پڑ جاتی ہے کہ ادھر سلسلۂ کلام ٹوٹا اور ادھر وہ لفظ خود بخود منہ سے نکلے۔"

اختر: "لیکن مرزا صاحب تو اکثر ایک ایک دو لفظوں کے بعد ہی 'کیا نام' کا ترکش خالی کرنے لگتے ہیں۔"

انجم: "ہاں جس قدر دماغ کسی جذبہ کے غلبہ سے زیادہ پریشان ہوتا ہے۔ قوت بیانیہ کا نقص اسی قدر زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ اکثر دیکھا ہوگا کہ جب ہکلے کو غصہ آتا ہے تو زیادہ ہکلانے لگتا ہے۔"

اختر: "تو یہ کہئے کہ تکیہ کلام خلقی نقائص کا آئینہ ہے۔"

سلسلۂ کلام یہیں تک پہنچا تھا کہ بیرم خاں کا تراہا آگیا جہاں سے دونوں کے گھروں کو الگ راستہ جاتا تھا۔ اختر سلام علیکم اور انجم وعلیکم السلام کہہ کر اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے۔

مشاہیر عالم

ہر اڈولف ہٹلر

عہدنامۂ وارسائی کے ماتحت جرمنی کچھ ایسا مجبور و معذور ہو کر رہ گیا کہ نہ اس کے پاس کوئی جنگی بیڑہ رہا نہ طیارہ اور نہ فوج۔ اس کے تمام اسلحہ ضبط اور تمام قوائے حربیہ سلب کر لئے گئے۔ اور اربوں پونڈ کا تاوان جنگ عائد ہوا۔ اس سختی کے بعد اس کا ردِّ عمل لازمی تھا۔ دنیا کی عالمگیر اقتصادی پستی کا بھی سب سے زیادہ اثر غریب جرمنی ہی پر پڑا جسے کروڑوں پونڈ کی قسطیں بطور تاوان جنگ ادا کرنی پڑیں۔ شکست کی وجہ سے اس کا سیاسی شیرازہ بھی بکھر گیا تھا چنانچہ تمام ملک میں بیسیوں سیاسی پارٹیاں پیدا ہو گئیں، اور چونکہ ان جماعتوں کے خیالات میں کوئی ہم آہنگی نہ تھی۔ اس لئے تمام ملک طوائف الملوکی میں گرفتار ہو گیا۔ ہر طرف "نفسی نفسی" کی پکار سنی جاتی تھی۔ اتحادی طاقتیں ایک طرف اور یہودی مہاجن دوسری طرف ملک کا خون چوس رہے تھے۔ وحدت قومی کی جگہ افتراق و انتشار اور نشو و نما کی جگہ اضمحلال و انحطاط پیدا ہو گئے۔ جذبۂ وطنیت کو صدمہ پہونچا اور ہر شخص اپنی ناک چوٹی میں گرفتار نظر آنے لگا۔ سب سے زیادہ ظلم جرمنی پر کارل مارکس کی تعلیم یا بالشویت نے کیا۔ ہر طرف اجتماعیت (Communism) کا دور دورہ ہونے لگا۔ قریب تھا کہ بہادر اور غیور جرمن قوم فنا ہو جائے۔ لیکن قدرت نے

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

کے مقولے پر عمل کر کے ایک اولوالعزم رہنما کو میدان میں لا کر کھڑا کر دیا جس کا نام ہر اڈولف ہٹلر ہے اور جو اس وقت جرمنی میں سیاہ و سفید کا مالک یا "ڈکٹیٹر" ہے اور جس پر اس وقت تمام مغربی دنیا کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔

آج سے بارہ سال قبل کوئی شخص ہٹلر کے نام سے واقف بھی نہ تھا۔ جنگ عظیم سے پہلے یہ وائنا کی گلیوں میں کس مپرسی کی حالت میں مارا مارا پھرا کرتا تھا۔ مگر آج وہی مفلس و گمنام ہٹلر جرمنی میں سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے بڑی سیاسی جماعت کا مسلّمہ سردار ہے۔ اس آسٹرین نژاد شخص نے جرمنی کے جسم مردہ میں قومیت و غیرت کی روح از سر نو پھونک دی ہے۔

ابتدائی حالات جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے ایڈولف قومیت کے لحاظ سے جرمن نہیں ہے البتہ وہ جرمن سرحد کے قریب ملک بوہیمیا میں بمقام لِنز پیدا ہوا تھا اور یہ مقام جنگ سے پیشتر سلطنت آسٹریا میں داخل تھا، ہٹلر کا باپ جو بلحاظ نسل بویرین تھا آسٹریا کے محکمہ جمرک (Customs) میں ملازم تھا۔ اس کا خاندان ضرور جرمن نژاد تھا لیکن یہ لوگ عرصہ سے غیر ملک میں آباد تھے۔ لِنز میں جرمنوں کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا جس کی وجہ سے لڑکپن ہی میں ہٹلر کو تیرِ ملامت کا نشانہ بننا پڑا کیونکہ جس اسکول میں وہ پڑھتا تھا وہاں کے لڑکے اُس کو سخت پریشان کیا کرتے تھے۔

ابھی ہٹلر کی عمر تیرہ ۱۳ سال ہی کی تھی کہ اس کے باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اس کے تین سال بعد ماں کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس طرح یتیم و یسیر ہٹلر خدا کی وسیع خدائی میں بے یار و مددگار رہ گیا۔ جو کچھ اندوختہ تھا وہ والدین کی بیماری اور اُن کی تجہیز و تکفین میں صرف ہو گیا تھا اب اُس کے پاس تین پونڈ سے بھی کم رہ گئے، اس وقت دنیا اس کی نظروں میں تیرہ و تار تھی لیکن ہٹلر ایک طاقتور دل اور ہمت عالی کا مالک تھا اُس نے یہ سب اُفتادیں صبر و شکر کے ساتھ برداشت کیں وہ لِنز سے ترک وطن کر کے وائنا پہونچا۔ چونکہ اُس کی طبیعت شروع ہی سے فنون لطیفہ کی طرف مائل تھی اس لئے اُس نے ارادہ کیا کہ وائنا اکیڈمی میں داخل ہو کر فنون لطیفہ میں کمال حاصل کرے اور ایک اعلیٰ درجہ کا آرٹسٹ ہو جائے مگر ہٹلر کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔ اُس نے اکیڈمی میں داخلہ کی درخواست دی۔ چونکہ اُس کو فنِ مصوری میں کوئی سابقہ مہارت یا تربیت حاصل نہ تھی اس لئے اُس کی درخواست نامنظور ہو گئی۔

یہ وہ وقت تھا کہ مفلس و نادار ہٹلر پر تین تین وقت کے فاقے گذرتے تھے اور افلاس و ناداری سے اُسکی زندگی دوبھر ہو گئی تھی، وہ چاہتا تھا کہ اسے کہیں روٹیوں کا سہارا مل جائے۔ آخر کار ایک معمار کو اس پر رحم آ گیا اور اُس نے ہٹلر کو مزدور کی حیثیت سے اپنے کام میں لگا لیا۔ اُس نے ہٹلر کو رہنے کے لئے بھی ایک جھونپڑے میں جگہ دیدی۔ مگر چند در چند وجوہ سے یہ سلسلہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہا۔ ہٹلر کو کئی جگہ ملازمت ملی مگر دیر تک کہیں کام کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ بالآخر دوسروں کی غلامی سے تنگ آ کر وہ تجارت کی طرف مائل ہوا۔ اور شہر کے گلی کوچوں میں پھیری لگا کر تصویریں فروخت کرنے لگا مگر اس سے بھی گذر اوقات کا کوئی معقول ذریعہ نہ نکلا اور وہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد جرمنی کی طرف روانہ ہو گیا اور سنہ ۱۹۱۴ء میں شہر میونخ پہونچا جہاں اُس نے

ے میونخ۔

فن تعمیرات سیکھنا شروع کردیا۔

اس وقت ہٹلر کی عمر بیس برس کی تھی۔ دو سال بعد یعنی ۱۹۱۴ء میں جنگ یورپ چھڑ گئی اور آسٹریا نے اعلان جنگ کردیا اور جرمنی نے اس کا ساتھ دیا۔ اس وقت ہٹلر نے اپنا نام فوراً بویریا کی سولھویں پیدل رجمنٹ میں لکھوالیا، اور جرمن فوج میں داخل ہوگیا اس طرح اب اس کی قومیت جرمن ہوگئی۔ بہرحال جنگ عظیم میں ہٹلر نے خوب دادِ مردانگی دی، کئی جگہ لڑا اور ۱۹۱۶ء میں زخمی ہوا۔ ۱۹۱۸ء میں جب انگریزوں نے مقام اپرس پر حملہ کیا تو وہ زہریلی گیس سے بیہوش ہوگیا۔ ان اعلیٰ خدمات کے صلے میں اسکو "صلیب آہنی" کا تمغہ و نشان بھی عطا کیا گیا۔

سیاسی زندگی جنگ کے بعد فوج سے قطع تعلق کرکے ہٹلر میونخ کو واپس آگیا۔ یہاں آکر اُسے معلوم ہوا کہ جرمنی میں ایک عظیم سیاسی انقلاب برپا ہونے والا ہے اُس نے دیکھا کہ ہر طرف اور ہر جگہ لوگ ارباب حل وعقد سے سرکشی پر مائل ہیں اور حکام وقت کی کوئی نہیں سنتا۔

ہٹلر ابھی فوج ہی میں تھا، وہ وقتاً فوقتاً اپنے احباب سے حالات حاضرہ پر خاص انہاک سے گفتگو کیا کرتا تھا۔ ایک دن اس کے نام ایک تحریری دعوت نامہ آیا جس میں اُسے ایک جدید قائم ہونیوالی سیاسی پارٹی میں شامل ہونیکی دعوت دی گئی تھی۔ ان دنوں جرمنی میں سیاسی پارٹیاں برسات میں حشرات الارض کی طرح نمودار ہورہی تھیں۔ بہرحال ہٹلر نے دعوت قبول کرلی، اور ایک جدید پارٹی "جرمن ورکمینس پارٹی" (German Workmen's Party) کے نام سے قائم کی گئی کہتے ہیں کہ اس پارٹی کا جلسہ گاہ ایک تنگ گلی کے اندر ایک غیر مشہور بوزہ خانہ (Beer House) میں اس طرح منعقد ہوا کہ چھوٹے سے تنگ کمرہ میں ایک گیس برنر ٹمٹما رہا تھا اور اُس کی روشنی میں چار نوجوان بیٹھے تھے کہ اتنے میں ہٹلر بھی کمرہ میں داخل ہوا اور چاروں آدمی اُس کے استقبال کے لئے کھڑے ہوگئے۔ ہٹلر بھی انھیں میں شامل ہوگیا، آپس میں بات چیت ہوئی اور شروع میں یہ نوزائیدہ پارٹی صرف سات افراد سے قائم ہوئی۔ آغاز میں اسکے خزانہ میں سات شلنگ کی رقم تھی۔ ارکان پارٹی نے سات رنگ کے فیتے اپنا نشان امتیاز قرار دیا تھا۔ جب ہٹلر کو یہ باتیں معلوم ہوئیں تو چند منٹ غور وخوض کرنے کے بعد اُس نے سر اُٹھایا اور کہا "اچھا تو میں بھی اسمیں شریک ہوتا ہوں" اس کے بعد سے وہی اس تمام پارٹی کا سردار قرار پایا۔ چنانچہ ہٹلر نے اس پارٹی کا نام تبدیل کرکے "نیشنل سوشلسٹ ڈیموکریٹک ورکمینس پارٹی" (National Socialist Democratic Workmen's Party.) اسکا نام رکھا۔ مگر اب یہ جماعت نیشنل سوشلسٹ پارٹی یا نازی جماعت (Nazis) کے نام سے مشہور ہے،

پارٹی کے نام میں ایک ٹکڑا یعنی "نیشنل" ایک طلسمی ٹکڑا ہے، اسی کی بدولت نازی جماعت نے ملک میں اس قدر اقتدار و ہر دلعزیزی حاصل کر لی ہے۔ کیونکہ "سوشلسٹ" کے اندر "بین الاقوامیت" کا خیال شامل ہے۔ لیکن لفظ "نیشنل" نے اس کو جرمن قوم کے لئے محدود کر دیا ہے۔ اب اس پارٹی کو تقریباً ہر جرمن اپنی "قومی پارٹی" سمجھنے لگا ہے۔ گویا جو شخص اس پارٹی میں داخل ہوتا ہے وہ اپنی "قوم کا سپاہی" بنجاتا ہے۔

بہر نوع جدید پارٹی کے باقاعدہ جلسے ہونے لگے، شروع میں تو صورت حال حوصلہ شکن رہی کیونکہ اس کے جلسوں میں مشکل سے بیس آدمی شریک ہوتے تھے۔ یہ حال دیکھکر ہٹلر نے ایک تدبیر یہ سوچی کہ تھوڑی سی رقم خرچ کرکے ایک مقامی اخبار میں پارٹی کا اشتہار دیدیا، اس سے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے۔ یعنی اشتہار کے بعد جب پارٹی کا دوسرا جلسہ ہوا تو اس میں تقریباً سو آدمیوں نے شرکت کی۔ اشتہار میں یہ بات مشتہر کی گئی تھی کہ "جلسہ میں پہلے ایک مشہور و معروف پروفیسر حالات حاضرہ پر فصیح و بلیغ تقریر فرمائیں گے۔ اس کے بعد ہر ہٹلر کی تقریر ہوگی۔ الغرض جلسہ میں ایک پروفیسر صاحب کھڑے کر دئے گئے جن کی بھونڈی اور خشک تقریر کا لوگوں کے دلوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ لیکن ان کے بعد جب ہٹلر کھڑا ہوا تو اول اول تو وہ کسی قدر رُک رک کر بولا لیکن بعد میں اسکی تقریر میں روانی پیدا ہوگئی اور اُس نے اپنے تمام آلام و مصائب جو اغیار و احباب میں رہکر برداشت کئے تھے نہایت رقت آمیز لہجہ میں بیان کئے۔ اس نے جرمنی سے اپنی پر خلوص محبت کا اظہار کیا، ملک کی موجودہ ذلت و خواری کا مفصل ذکر کیا اور جرمنی کی بیدست وپائی اور بے لبی کا رونا رویا۔ یہ تمام باتیں اس خوش اسلوبی سے بیان کیں کہ سب حاضرین آبدیدہ ہوگئے۔ جب وہ اپنی تقریر ختم کر چکا تو ہر طرف سے واہ واہ اور مرحبا کے نعرے بلند ہونے لگے۔ اور ہٹلر کی خوشی اور کامیابی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب چندہ کے لئے اپیل کی گئی تو فوراً تین سو مارک جمع ہوگئے۔

اجتماعین سے جھگڑا اب ہٹلر کی پارٹی میدان میں سامنے آنے لگی، پروپیگنڈا کیلئے پوسٹروں اور اشتہاروں سے کام لیا جانے لگا۔ اس وقت جرمنی میں کمیونسٹ پارٹی سب سے زیادہ طاقتور تھی چنانچہ یہ پارٹی بھی ہٹلر کی جماعت کو ٹیڑھی نظروں سے دیکھنے لگی۔ رفتہ رفتہ اس درجہ مخالفت بڑھگئی کہ کمیونسٹوں نے ہٹلر کو کچل ڈالنے کا تہیہ کر لیا۔

اول اول صرف اس قدر مخالفت رہی کہ جب کبھی ہٹلر کی پارٹی کا جلسہ ہوتا تو کمیونسٹ پارٹی کے لوگ آکر شور و غل مچاتے، میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو پھینک کر جلسہ کو بھر بھنڈ کر دیتے۔ ان حرکتوں

سے پریشان ہوکر ہٹلر نے یہ تدبیر سوچی کہ اُس نے اپنے بعض ایسے دوستوں کو جلسہ میں مدعو کیا جو اس کے ساتھ فوج میں کام کر چکے تھے۔ جب دوسرے جلسہ میں کمیونسٹوں نے آکر گڑبڑ مچائی تو ہٹلر کے "سپاہیوں" نے فوراً ان لوگوں کو آڑے ہاتھوں لیا اور زدوکوب کر کے جلسہ گاہ سے نکال دیا۔ اس کامیابی کے بعد ہٹلر نے سابق فوجیوں کو اپنی پارٹی میں باقاعدہ بھرتی کرنا شروع کر دیا اس سے نازیوں کے پاس بھی ایک فوجی جماعت ہوگئی جو اس وقت "حملہ باز دستہ" (Storm Detachments = Sturm Abteilung) کے نام سے مشہور ہے۔

نازی فوج نازیوں کی یہ "فوج" درحقیقت کوئی باقاعدہ فوج نہیں ہے مگر اسمیں جو معمولی شہری داخل ہوتے ہیں وہ سب نازی وردی (بھوری کرتی) پہنتے ہیں۔ ساری جماعت باقاعدہ سپاہ کی طرح ڈویژنوں، برگیڈوں، بٹالینوں اور دستوں میں تقسیم ہے۔ اور تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہے سرکاری حیثیت سے یہ سپاہی "غیر مسلح" ہیں اور ان کا مقصد محض اس قدر بتایا جاتا ہے، کہ نیشنل سوشلسٹ پارٹی کی باتیں پُرامن طور پر سُنی جا سکیں، اور اسکے جلسوں میں مخالفین کسی قسم کی گڑبڑ نہ کرسکیں۔

انسائیکلوپیڈیا برطانیکا میں نازی پارٹی کے متعلق لکھا ہے کہ:-

> "اسی اثنا میں نیشنلسٹ جماعتیں تقویت حاصل کرتی گئیں، اور اس قدر خودسر اور متمرد ہوگئیں کہ انھوں نے حکومت کے احکام سے سرتابی کرنا شروع کر دی۔ ان جماعتوں میں سب سے زیادہ طاقتور پارٹی "نیشنل سوشلسٹ" تھی۔ یہ انتہا درجہ کی عسکریت پسند اور قومیت پرور جماعت ہے اور اسکی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ یہودیوں کی سخت دشمن ہے۔ اگرچہ اس پارٹی کا رجحان طبع برائے نام دہوکریسی کی طرف ہے مگر درحقیقت اس سے دولتمند طبقہ کام لیتا ہے چنانچہ یہ ہڑتالوں کو روکنے اور اجتماعین پر حملے کرنے میں کام آتی ہے۔"

قید ۱۹۲۳ء تک ہٹلر نے اس قدر پروپیگنڈا اور اپنی جماعت کو اس قدر منظم و مستحکم کر لیا کہ وہ بڑا لیڈر شمار ہونے لگا۔ شہر میونخ کا میر بلدیہ ہیر ہر کہر (Kahr) بھی اس کا حامی و مددگار بن گیا۔ اور کچھ دنوں بعد جرمنی کا مشہور و معروف جنرل لیوڈنڈارف بھی اسکا دوست اور رفیق کار ہوگیا۔ ان لوگوں کی مدد اور اپنی نازی فوج کے بھروسہ پر ہٹلر نے نومبر ۱۹۲۳ء میں بویریا کی حکومت پر تسلط حاصل کرنیکی کوشش کی۔ یہ کوشش ناکام رہی۔ کہر اور لیوڈنڈارف اس انقلاب کے لئے آمادہ نہ تھے۔ حتیٰ کہ پارٹی کا آخری جلسہ منعقد ہوا، جونہی کہر جلسہ گاہ میں داخل ہوا ہٹلر نے جیب سے ریوالور

نکالکر کہر کے سر کی طرف تول دیا، اور اس طرح اُسکو جبراً مجوزہ انقلاب کی حمایت پر مجبور کر دیا۔

لیکن اسی اثنا میں اس سازش کی خبر کسی نہ کسی طرح ملک کے ارباب حل وعقد کو ملگئی، چنانچہ انھوں نے ردِعمل کے لئے خفیہ طور پر ملیشیا فوج جمع کرلی۔ ہٹلر اور اُس کے ساتھیوں کو بے خبری میں گرفتار کرلیا اس سے پارٹی اس وقت منتشر ہوگئی اور بعض لوگوں کو گلی کوچوں میں بھی گولی ماردیگئی۔

اس کے بعد جماعت کے لیڈروں پر حکومت کے خلاف غداری اور بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا اس مقدمہ میں جنرل لیوڈنڈارف تو بری ہوگئے۔ ہٹلر نے اپنی صفائی میں کئی دن تک تقریر کی مگر عدالت نے اس کو اور پارٹی کے دیگر لیڈروں کو مجرم قرار دیکر سزا دیدی۔ چنانچہ بعض لوگوں کو پاگل خانہ بھیجدیا گیا اور خود ہٹلر کو پانچ سال کے لئے ایک قلعہ میں قید کردیا گیا۔

رہائی کے بعد

ایک سال بعد ہٹلر کو قلعۂ لینڈسبرگ سے رہا کردیا گیا، مگر اسی دوران میں اُس نے اپنی پارٹی کا پروگرام مکمل کرلیا تھا اور اپنی پالیسی میں بھی کئی طرح کی تبدیلیاں کرلی تھیں، یعنی جبر وتشدد کے بجائے تمام کارروائیوں کو "آئین وقانون" کے سانچہ میں ڈھال لیا اور پارلیمنٹری طریقوں سے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت اس پارٹی کا صدر مقام میونخ میں ہے اور اس کے دفتر کی سیاہی مائل وشاندار عمارت سب کو معلوم ہے۔ دروازے پر دو نیزے نصب ہیں جن سے نازی جماعت کی عسکریت پسندی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس دفتر میں بیٹھکر ہر ہٹلر اپنی جنگی کونسل پر فولادی گھونسہ سے حکومت کرتا ہے۔ جس وقت ہٹلر تقریر کرنے لگتا ہے تمام کمرہ میں سکوت وسکون طاری ہوجاتا ہے۔ کسی نے ہٹلر کی نسبت خوب کہا ہے کہ "وہ منھ سے نہیں بولتا بلکہ اپنے چہرہ سے بولتا ہے۔"

ہر فقرہ کے ساتھ ہٹلر کا چہرہ حرکت کرتا ہے، اور اسکے سامعین مسحور ہوجاتے ہیں۔ اسی جگہ سے وہ اس وقت تمام جرمنی پر حکومت کر رہا ہے۔ جو درجہ فی زمانہ ٹرکی میں مصطفےٰ کمال پاشا کا یا اٹلی میں سائنور مسولینی کا یا آئرلینڈ میں ڈی ویلرا کا ہے وہی درجہ اس وقت جرمنی میں ہر ہٹلر کا ہے، اور کوئی تعجب نہیں جو آئندہ وہ تمام یورپ کا ڈکٹیٹر بنجائے۔

ہٹلر کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک ہنٹر رہتا ہے جس پر چاندی کی موٹی سی موٹھ چڑھی ہوئی ہے، اس کے بہت سے پیرو بھی اسکی تقلید میں ہنٹر لئے رہتے ہیں، خصوصاً ڈاکٹر گوبلس تو جو سوشلسٹ جماعت سے ٹوٹکر نازیوں میں جاملا ہے ہٹلر کی ہر ادا کی نقل کرتا ہے۔ اس کی وضع قطع رفتار وگفتار سبھی ہٹلرانہ ہے۔ یہی حال لفٹنٹ روزنبرگ کا ہے۔ نازیوں کی خاکی کرتی (Brown Shirt) اسی لفٹنٹ کی ایجاد کی ہوئی ہے۔

ہٹلر کا وعظ ہٹلر عہد نامہ وارسائی کا سخت دشمن ہے وہ چاہتا ہے کہ جرمن قوم پھر مثل سابق طاقتور ہو جائے۔ وہ جرمنی کی نوآبادیوں کو بھی واپس لینا چاہتا ہے، وہ یہودیوں کا دشمن ہے کیونکہ یہ لوگ غریب اور حاجتمند جرمنوں کو بھاری شرح سود پر قرض دیکر قوم کا خون چوستے ہیں اور ان کو روپئے کے سامنے جرمنوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ وہ جرمن قوم کو بہادر سپاہی بنانا چاہتا ہے۔ ہٹلر اور اسکی نازی پارٹی کے وعظ کا ایک نمونہ مشہور انگریزی اخبار "گارڈین" سے لیکر ہم ذیل میں درج کرتے ہیں

"عہد نامہ وارسائی کا اصلی مقصد یہ ہے کہ جرمنی کے منازلِ ارتقا ہمیشہ کے لئے مسدود کر دیئے جائیں سیاسی طور پر ستانے، ہمیشہ کے لئے غیر مسلح کرنے اور اقتصادی طور پر پریشان کرنے کے علاوہ عہدنامہ مذکور کا یہ بھی مقصد ہے کہ جرمن قوم کو روحانی طور پر بھی بے بس و مجبور بنا دیا جائے۔ جس قوم میں ہر وقت آمادگی اور مستعدی کا خیال عظیم نہیں اس کو زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ جرمنی کے ترقی کے زمانے میں یعنی جنگہائے آزادی، جدوجہد جرمن اتحاد اور ۱۹۱۴ء میں لفظ "جنگ" جذباتِ مردہ کو مشتعل کر دینے کا اثر رکھتا تھا۔ آج بھی ہماری قوم کے دل میں دفاع قومی کے لئے مسلح ہونے کے عزم کا شرر اس طرح چمکنا چاہیئے کہ تمام منتشر و مضمحل، خستہ و درماندہ افراد قومیت کے شعلوں سے جلنے لگیں شجاعانہ خیالات قوم کے اندر جوہر شرافت پیدا کر دیتے ہیں۔

تاریخ ایک ازلی و ابدی چشمہ کی صورت میں بہتی ہے، اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کو قرار ہو۔ تاریخ کا فیصلہ ہمیشہ طاقتور لوگوں کے حق میں ہوتا ہے جو زندہ رہنے کے مستحق ہوتے ہیں۔ قوموں کی قسمت کا فیصلہ عہد ناموں سے نہیں ہوتا بلکہ اخلاقی قوتوں اور زندہ رہنے کے عزم بالجزم اور سلطنت کے لئے سرفروشانہ وفاداری سے ہوتا ہے۔ زندہ رہنے کے معنی ہی جنگ کرنا ہیں۔ تاریخ اور جنگ دونوں ایک چیز ہیں، اور جنگ ہی کسی قوم کی اعلیٰ ترین قسمت ہے۔"

اقتدار کے لئے جدوجہد جرمنی کی تاریخ میں ۱۹۳۲ء کا سال خاص طور پر قابل ذکر ہے، کیونکہ اسی سال میں پریسیڈنٹی کی جدوجہد شروع ہوئی، انتخابات عامہ عمل میں آئے۔ مسئلہ تاوان کا آخری فیصلہ ہوا، اور تمام ملک میں انتشار رہا۔ اسی سال میں دو متضاد طاقتیں یعنی نازی اور حکومت بالمقابل صف آرا ہوئیں اسی اثنا میں اجتماعیت نے زور پکڑا، ملک بھر میں فسادات ہوئے اور ان سب کے بعد تحریک بادشاہت کا سلسلہ جاری ہوا، اس لئے مناسب ہے کہ یہاں پر اس سال کے خاص خاص واقعات کا مختصراً ذکر کر دیا جائے تاکہ ناظرین کو جرمنی کی موجودہ حالت بخوبی سمجھ میں آجائے۔

ڈاکٹر برونِنگ کی وزارت نے اعتماد کا ووٹ حاصل کر لیا۔ اسی اثنا میں ہر ہٹلر کا رفیق اور لفٹننٹ

ہر الفریڈ روزنبرگ لندن پہونچا۔ اور بیان کیا کہ ہٹلر کی پالیسی یہ ہے کہ شرط تاوان پر خط نسخ کھینچ دیا جائے۔ ہٹلر انگلستان کو جرمنی کا دوست مگر فرانس کو دشمن سمجھتا ہے۔ اس کا قول ہے کہ "ملکہ الزبتھ کے وقت سے لیکر اتبک انگلستان نے ایسی ہر سلطنت کی طاقت توڑ دینے کی کوشش کی ہے جس نے یورپ میں عام سطح سے بلند ہو جانا چاہا۔ انگلستان یہ نہیں چاہتا کہ جرمنی دنیا بھر میں سب سے زیادہ طاقتور ہو جائے۔ مگر فرانس اتنا بھی نہیں چاہتا کہ جرمنی کو کسی قسم کی بھی طاقت نصیب ہو، یہی دونوں میں فرق ہے"

ہٹلر نے حکومت برونگ کو شکست دینے کی سخت جدوجہد کی۔ ملک میں نازیوں کی قوت بڑھ رہی تھی اور مارچ ۱۹۳۲ء میں انتخاب پریسیڈنٹ کا مرحلہ درپیش تھا۔ اسلئے جرمن چانسلر ڈاکٹر برونگ اور جنرل گرونر نے ہر ہٹلر سے .... جنرل ہنڈنبرگ کو آیندہ پریسیڈنٹ رکھنے یا نہ رکھنے کا مشورہ کیا۔ اسی اثنا میں چانسلر نے اپنے سفیر متعینہ لندن کے ذریعہ حکومت برطانیہ کو بھی اطلاع دی کہ جرمنی تاوان جنگ کی آیندہ قسط ادا نہ کرسکے گا۔ ہٹلر نے انتخابات عامہ کے بغیر ہنڈنبرگ کو پریسیڈنٹ کے عہدہ پر برقرار رکھنے کی مخالفت کی اور کہا کہ اگر ہنڈنبرگ کو بلا مقابلہ پریسیڈنٹ بنائے رکھنے کا ارادہ ہے تو ڈاکٹر برونگ کی گورمنٹ کو مستعفی ہو جانا چاہیئے اس جواب کے بعد یہ طے پایا کہ پریسیڈنٹ کا انتخاب از سر نو ہو جائے چنانچہ گو اس وقت ہنڈنبرگ کی عمر چوراسی برس کی ہے مگر (فروری ۱۹۳۲ء میں) انھوں نے پھر پریسیڈنٹی کے لئے کھڑا ہونے کا ارادہ کرلیا۔ ہر ہٹلر نے ان کی مخالفت کی اور ہنڈنبرگ کے مقابلہ میں نیشلسٹ جماعت کی طرف سے لفٹننٹ کرنل ڈوسٹربرگ کو کھڑا کر دیا گیا۔ بہرحال پریسیڈنٹی کے لئے چار شخص امیدوار تھے۔ یعنی (۱) ہنڈنبرگ، (۲) ہٹلر (۳) ڈوسٹربرگ (۴) تھالمان کمیونسٹ۔ اور چونکہ اس وقت کی جرمن گورمنٹ ہنڈنبرگ کی طرفدار تھی اس لئے ہٹلر اور اس کی جماعت کو بہت پریشان کیا گیا اور نازی پارٹی کے اخباروں اور مقرروں پر سخت قیود عائد کردی گئیں۔ غرض اس انتخاب میں ہنڈنبرگ ہی کامیاب ہوئے اور ہٹلر کا دوسرا نمبر رہا۔ لیکن چونکہ ہنڈنبرگ کے ووٹ اپنے مخالفین کے ووٹوں کی مجموعی تعداد سے زیادہ نہ تھے اس لئے ۱۰۔ اپریل ۱۹۳۲ء کو دوبارہ رائیں طلب کی گئیں، اس میں بھی ہنڈنبرگ کا نمبر اول رہا۔

۲۴۔ اپریل ۱۹۳۲ء کو ریاست پروشیا میں بھی انتخابات ہوئے اس میں بھی ہٹلر کی جماعت کو سات کے بجائے ایک سو باسٹھ نشستیں حاصل ہوئیں۔ اسی طرح ہٹلر کی پارٹی کو ہر جگہ کامیابی حاصل ہوئی

آخر مئی ۱۹۳۲ء میں بروننگ گورنمنٹ کو مستعفی ہونا پڑا۔ اور جون میں ہرفان پاپن جرمنی کے جدید چانسلر مقرر ہوئے۔ ۲۔ جون ۳۲ء کو پریسیڈنٹ ہنڈن برگ نے پارلیمنٹ شکست کردی اب گویا جرمنی میں تین شخصوں کی حکومت ہوگئی۔ یعنی (۱) ہنڈن برگ (۲) ہرفان پاپن اور (۳) جنرل فان شلیشر وزیر افواج۔

اس زمانہ میں نازی پارٹی گورنمنٹ کی نظروں میں معتوب تھی۔ چنانچہ اپریل ۳۲ء میں اسکے خلاف احکام جاری ہوئے لیکن ڈھائی مہینہ کے اندر ہی اندر پریسیڈنٹ کو یہ احکام منسوخ کرنا پڑے مگر جون ہی میں جرمنی کی مختلف سیاسی جماعتوں کے درمیان فسادات ہونے شروع ہوگئے۔ اور گورنمنٹ کو مجبوراً مارشل لا جاری کرنا پڑا۔ اور مختلف پولیٹیکل جماعتوں کا مخصوص وردیاں پہننا ممنوع قرار دیا گیا۔ اور پبلک جلسے اور ہر قسم کے مظاہرے بند کردیے گئے۔ غرض ۲۰ جولائی ۳۲ء کو برلن میں معمولی قانون معطل کرکے فوجی قانون جاری کردیا گیا۔ اور ہرفان پاپن پروشیا کا ڈکٹیٹر بن گیا۔ چند ہی روز بعد جنیوا میں جرمنی کی طرف سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ عہدنامۂ ورسائی کو منسوخ کردیا جائے۔

۳۱۔ جولائی ۳۲ء کو جو جنرل الکشن ہوا جس میں ہٹلر کی پارٹی کی طاقت ہر جگہ دوگنی ہوگئی اور نازیوں کو پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل ہوگئی۔ اگست ۳۲ء میں بھی فسادات کا سلسلہ جاری رہا جن کی وجہ سے ہنڈن برگ کو فسادیوں کے خلاف ایک سخت فرمان جاری کرنا پڑا۔ اگرچہ یہ فرمان عام تھا۔ لیکن اس کا شکار خاص طور پر نازی جماعت ہوئی۔ جس کا باعث یہ تھا کہ ملک میں سب سے بڑی جماعت ہونے کی وجہ سے وہ اپنے لئے خاص اقتدار کے دعویدار تھے۔ ان کا خاص مطالبہ یہ تھا کہ ہٹلر کو وزیر اعظم اور ان کے دیگر لیڈروں کو وزرا بنا دیا جائے۔ چنانچہ ۱۳۔ اگست کو ہر ہٹلر نے ہرفان پاپن کے پاس جاکر وزارت عظمیٰ کا مطالبہ کیا۔ فان پاپن نے ہٹلر کے لئے وائس چانسلری اور ریاست پروشیا کی وزارت عظمیٰ پیش کی لیکن ہٹلر نے اسے منظور نہیں کیا۔ اس کے بعد ہٹلر نے پریسیڈنٹ ہنڈن برگ کے پاس جاکر اپنے مطالبات پیش کئے۔ مگر انھوں نے بھی ان مطالبات کو منظور نہ کیا۔

ماہ اگست ۳۲ء میں گورنمنٹ اور ہٹلر پارٹی کے درمیان تصادم ہوگیا کیونکہ نازیوں نے ایک کمیونسٹ کو قتل کردیا تھا جس پر پانچ نازیوں کے لئے موت کی سزا تجویز کی گئی مگر ہٹلر نے اس فیصلہ کے خلاف شور و شر برپا کردیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گورنمنٹ کو اس سزائے موت کو قید سے بدلنا پڑا۔

۲۰۔ اگست ۱۹۳۲ء کو ریشتاغ کا جو اجلاس منعقد ہوا، اس میں نازیوں کی اکثریت تھی، اسلئے کپتان گورنگ (ہٹلر پارٹی) ریشتاغ کا پریسیڈنٹ منتخب ہوا۔ مگر اسی اثنا میں ہرفان پاپن نے پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ سے ایک حکم لکھوالیا جس کی رو سے چانسلر کو پارلیمنٹ کے شکست کرنے کے اختیارات ملگئے۔

چنانچہ جب ۱۲۔ ستمبر ۱۹۳۲ء کو ریشتاغ میں ہرفان پاپن کے خلاف ملامت کا ووٹ پاس کرنے کی کوشش کی گئی تو اُنھوں نے پارلیمنٹ ہی کو برخاست کر دیا۔ اس طرح پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ پارلیمنٹ کے بغیر ہی جرمنی پر حکومت کرنے لگے۔

آخری کامیابی

۱۲ ستمبر کے اجلاس پارلیمنٹ میں ہرفان پاپن کی حکومت کے خلاف پانچسو تیرہ ووٹوں کی موافقت اور صرف بتیس ۳۲ ووٹوں کی مخالفت سے عدم اعتماد کا ریزولیوشن پاس ہوا۔ چونکہ پارلیمنٹ توڑ دی گئی تھی اسلئے پھر جنرل الکشن ہوا۔ اسی اثنا میں نازیوں کی طاقت بہت بڑھ گئی اور پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ کو ہٹلر کی طرف سے جو مخالفت تھی وہ زائل ہوگئی۔ بہرحال اس جنرل الکشن میں مختلف جماعتوں کے جو ممبر منتخب ہوئے اُن کی تعداد یہ ہے:۔

(۱) نازی جماعت کے	۲۸۸	(۲) سوشلسٹ اسٹیٹ پارٹی	۱۲۵
(۳) کمیونسٹ	۸۱	(۴) مرکزی پارٹی	۷۳
(۵) نیشنلسٹ پارٹی	۵۹	(۶) بویریا پیپل پارٹی	۱۹
(۷) جرمن پیپل پارٹی	۷۰	(۸) متفرق	۲۰

اس انتخاب کے بعد یکم فروری ۱۹۳۳ء کو پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ نے ہٹلر کو چانسلر کا عہدہ پیش کیا جسے اُس نے بخوشی منظور کر لیا۔

اس طرح نازی جماعت کا تمام ملک پر اقتدار قائم ہوگیا اور اس کا لیڈر ہر ہٹلر جرمنی کا وزیر اعظم بلکہ ڈکٹیٹر بن گیا۔ مارشل ہنڈنبرگ جیسے جہاں دیدہ و تجربہ کار مدبر کا ہر ہٹلر کی تائید و حمایت کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ ہٹلر کی پارٹی کو اس وقت جرمنی میں خاص ہردلعزیزی حاصل ہوگئی ہے اصل واقعہ یہ ہے کہ ہٹلر کو اپنے ذاتی مفاد یا اقتدار کا چنداں خیال نہیں ہے بلکہ وہ اور اس کی جماعت جرمنی کے ترقی خواہ ہیں اور وہ جنگ عظیم کے تباہ کن نتائج سے نجات دلا کر از سر نو اپنے ملک کی عظمت و عزت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت جرمنی میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ ہٹلر کی پارٹی میں شامل ہو رہے ہیں اور اس کو سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا ہے۔ جرمنی میں اس وقت جمہوری نظام کا خاتمہ ہوگیا ہے حتیٰ کہ اس وقت جمہوری جھنڈے کے بجائے تمام سرکاری عمارتوں میں پرانا

شاہی جھنڈا اور اس کے ساتھ نازی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ خاندان قیصر کی واپسی کا پیش خیمہ ہے۔ سابق قیصر ولیم نے ہٹلر کی کامیابی پر اظہار طمانیت کیا ہے۔ اتحادیوں نے جنگ عظیم کی تمامتر ذمہ داری جرمنی پر ڈالی تھی اور اسی لحاظ سے صلحنامہ وارسائی میں اس کے ساتھ اتنی سختیاں روا رکھی گئی تھیں، لیکن ہٹلر نے اس ذمہ داری سے صاف انکار کر دیا ہے۔ بقیہ تاوان جنگ کی عدم ادائگی کا پہلے ہی اعلان ہو چکا ہے۔ اب جرمن نو آبادیوں کی واپسی کا بھی مطالبہ ہے اور فوج کی از سر نو تنظیم کی بھی کوشش ہو رہی ہے۔ غرض اس وقت جرمنی اپنی کھوئی ہوئی عظمت و اہمیت کو دوبارہ حاصل کرنے کی جان توڑ کوشش کر رہا ہے۔ یہ جد و جہد کہاں تک کامیاب ہوگی؟ اس سوال کا جواب مستقبل کے ہاتھ ہے۔

(**نوٹ**) ہٹلر گورنمنٹ کے قائم ہوتے ہی نازیوں نے اپنی توجہ ان یہودیوں کی طرف منعطف کر دی جو جرمنی میں آباد ہیں۔ واضح ہو کہ پولینڈ اور جرمنی میں یہودیوں کی آبادی اس قدر کثیر ہے کہ کوئی حرفت اور کوئی پیشہ ان سے خالی نہیں۔ نازیوں کو ان سے خصومت ہے لہذا انھوں نے یہودیوں کا بائیکاٹ شروع کر دیا ہے جس کی وجہ سے اکثر یہودی جرمنی سے مجبوراً ہجرت کر گئے۔ چنانچہ ڈاکٹروں کا ایک وفد ہر ہٹلر کی خدمت میں حاضر ہو کر اس بائیکاٹ کا شاکی ہوا۔ جس کا جواب ہر ہٹلر نے یہ دیا کہ جرمنی میں علم و فضل کے لحاظ سے یہودیوں نے ایسی طاقت حاصل کر لی ہے جس کی وجہ سے واقعی وہ ملک کے دل و دماغ بن گئے ہیں لیکن وہ دراصل غیر ہیں اور انھیں جرمنی یا جرمنوں سے کوئی محبت نہیں ہے۔ بلکہ وہ جرمن بنکر جرمنوں کا خون چوس رہے ہیں اسلئے ہم چاہتے ہیں کہ جرمنی ان کی گرفت سے رہا ہو جائے۔ بہر حال یہ بائیکاٹ اس حد تک کیا گیا کہ جرمن کارخانوں سے یہودیوں کو برطرف کر دیا گیا۔ یہودی سوداگروں سے خرید و فروخت اور یہودی ڈاکٹروں اور وکلا سے معاملہ وغیرہ بالکل ترک کر دیا گیا۔

ہٹلر گورنمنٹ نے ایک جدید فرمان بھی جاری کیا ہے جسکی رو سے جرمنی کی ریاستوں میں ڈکٹیٹروں کا تقرر عمل میں آسکیگا اور ہر فیڈرل ریاست میں ایسے ناظم مقرر کئے جائیں گے جنکو اپنی ریاستوں کے وزرا کو برخاست کر دینے کا اختیار حاصل ہوگا اور جو صرف ہر ہٹلر کو جوابدہ ہونگے۔ خود ہر ہٹلر ریاست پروشیا کے ناظم اعلیٰ ہونگے۔ اس جدید قانون کی رو سے جرمنی کی ریاستوں میں جدید انتخاب کی ضرورت بھی باقی نہ رہیگی

ہٹلر گورنمنٹ کی یہ تجویز بھی ہے کہ دستور ویمر کے ماتحت جو خطابات اور اعزازات منسوخ کر دیئے گئے تھے وہ پھر بحال کر دیئے جائیں، جدید خطابات و اعزازات دینے کا اختیار پریسیڈنٹ کو ہوگا۔ فی الحال دو قسم کے اعزاز جاری کئے جائینگے (۱) ان لوگوں کیلئے جنھوں نے قومی انقلاب کے سلسلہ میں کار ہائے نمایاں انجام دئیے ہیں (۲) ان لوگوں کیلئے جنھوں نے ادب یا سائینس کے سلسلہ میں خدمات کی ہیں۔

مجلۂ مکتبہ — یادِ رفتگاں

سر جیون جی جمشید جی مودی

علمی دنیا میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ ۲۷ مارچ ۱۹۳۳ء کی صبح کو بمبئی کے مشہور و معروف پارسی عالم اور فاضل سر جیون جی جمشید جی مودی کا اناسی سال کی عمر میں اپنے مکان واقع قلابہ بمبئی میں حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال ہوگیا۔ اگرچہ مرحوم کی عمر کافی زیادہ ہوگئی تھی تاہم آپ میں ابھی جوانوں کی طرح قوت تحریک و عمل تھی۔ چنانچہ مرنے سے چھبیس گھنٹے پہلے آپ سر کاؤس جی جہانگیر ہال بمبئی میں ایک مجمع کثیر کے سامنے لکچر دے چکے تھے۔

دنیا آنی جانی ہے، سرچے جے تو دئی پیدا ہوئے اور مرگئے۔ لیکن "ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق"۔ اور عشق بھی کیسا؟ علم کا۔ اس لئے جب تک ہندوستان میں علم و فضل کا چرچا باقی ہے مرحوم کی شہرتِ عام بصورت دوام قائم رہیگی۔ آپ کو علوم مشرقیہ خصوصاً فارسی لٹریچر اور اوستا کے ترجمہ و تفسیر کے سلسلہ میں خاص شہرت حاصل ہوئی۔ آپ اپنی ان علمی و ادبی خدمات کی وجہ سے نہ صرف بمبئی کے علمی حلقوں بلکہ یورپ و امریکہ کے علما و فضلا میں بھی ادب و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ ملک معظم نے بھی ماہ جون ۱۹۳۰ء میں آپ کی علمی و ادبی خدمات کے صلہ میں آپ کو "سر (نائٹ)" کا خطاب و اعزاز عطا فرمایا تھا۔

سر جیون جی کے والد قلابہ کے پارسی مندر کے متولی تھے یہیں اکتوبر ۱۸۵۴ء میں آپ پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد ۱۸۷۷ء میں آپ نے الفنسٹن کالج سے بی۔اے پاس کیا، اسی کے ساتھ ساتھ آپ نے علوم دینی میں بھی اس قدر فضیلت حاصل کرلی کہ اپنے والد کی وفات پر آپ ہی کو دستور اعظم مقرر کیا گیا۔ اس کے بعد آپ نے علوم دینی میں بھی دستار فضیلت حاصل کرنے کی کوشش کی چنانچہ آپ نے ملا فیروز اور سر جمشید جی کے مدرسوں میں داخل ہوکر اوستا کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ پھر چند سال تک اسی مدرسہ میں پروفیسر رہے۔ چونکہ آپ کو معلوم تھا کہ جرمنی

وفرانس کے علما و فضلا نے زرتشتی لٹریچر کی نہایت محنت و جانفشانی کے ساتھ تحقیق و تدقیق کی ہے اس لئے ان مغربی محققین کی کتابوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے آپ نے جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں بھی مہارت حاصل کی۔

اس زمانہ میں پارسیوں کے اندر (۱) قدامت پرست اور (۲) اصلاح پسند دو جماعتیں پیدا ہو گئی تھیں، اصلاح مذہب کے دلدادوں نے مشہور پارسی عالمِ اوستا مسٹر کے۔ آر۔ کاما کی صدارت میں "رہنمائے مزدایاسنی سبھا" کی بنیاد ڈالی اور نہایت شد و مد کے ساتھ قدامت پرست اور لکیر کے فقیر پارسیوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔ فرامجی کاؤس جی انسٹیٹیوٹ میں تلاطم خیز جلسے ہونے لگے۔ جن کی رپورٹیں خوب نمک مرچ لگا کر پارسی اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتی تھیں۔ چونکہ سر جیون جی پارسی قوم کے مقتدائے اعظم یعنی دستور تھے اس لئے رہنمائی کے لئے تمام قوم کی آنکھیں آپ ہی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ چند سال بعد جب مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ دب گیا تو سر جیون جی نے مذہبی لکچروں کا سلسلہ شروع کیا۔

۱۸۸۰ء میں سر جیون جی بمبئی یونیورسٹی کے فیلو نامزد ہوئے اور آخر عمر تک اس منصب جلیل پر فائز رہے۔ ایک سال تک بمبئی کارپوریشن میں بھی آپ نے یونیورسٹی کی قائم مقامی کا حق ادا کیا۔ جولائی ۱۸۸۹ء میں آپ علمائے مستشرقین کی کانگریس کے اجلاس ہشتم میں شرکت کرنے کے لئے یوروپ تشریف لے گئے۔ یہ کانگریس ماہ ستمبر میں بمقام اسٹاکھام منعقد ہوئی تھی۔ اس کے سلسلے میں شاہ سوئیڈن نے آپ کو ایک طلائی تمغہ مع سند ونشان عطا فرمایا تھا۔

۱۸۹۳ء میں آپ پارسی پنچایت فنڈ کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اور اسی سال آپ کو گورنمنٹ آف انڈیا نے "شمس العلماء" کا خطاب عطا فرمایا۔ ۱۸۹۵ء میں حکومت فرانس نے آپکو "آفیسر اکیڈمی" اور ۱۹۰۲ء میں "آفیسر دولا انسٹرکشیان پبلیک" نامزد کیا۔ ۱۹۱۲ء میں آپ کو یونیورسٹی ہیڈلبرگ سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری عطا ہوئی۔ سالہا سال تک آپ رائل ایشیاٹک سوسائٹی شاخ بمبئی کے ممبر رہے۔ اور ۱۹۰۸ء میں اس سوسائٹی کے وائس پریسیڈنٹ مقرر ہوئے۔ اسی طرح عرصہ تک آپ بمبئی کی انتھراپولاجیکل سوسائٹی کے ممبر رہے اور ۱۹۱۳ء میں اس کے پریسیڈنٹ بنا دیے گئے۔

۱۹۲۵ء میں آپ نے دوبارہ یوروپ کی سیر و سیاحت فرمائی اور جب آپ فرانس گئے تو وہاں کی حکومت نے آپ کو شولیئر دو لیجیان دانر "Chevalir de Legion de Honneur" کا خطاب عطا کیا جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ اسی طرح جب آپ بوڈاپسٹ گئے تو حکومت ہنگری

نے آپ کو "آفیسر دو کرائے میرٹ" (Officer de Croix de Merit) کا خطاب دیا اگست ۱۹۳۱ء میں بمبئی یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو "ایل۔ایل۔ڈی" کی اعزازی ڈگری عطا کی گئی۔ غرض آپ کی وفات سے ہندوستان کا ایسا عالم و فاضل اٹھ گیا۔جس کی شہرت دُور و نزدیک پھیلی ہوئی تھی۔

سر جوالا پرشاد مرحوم

صوبہ بہار کا یہ مایۂ ناز فرزند مارچ ۱۸۵۸ء میں ضلع شاہ آباد صوبۂ بہار میں پیدا ہوا۔اور ۷۵ سال کی عمر میں ۲۵ مارچ ۱۹۳۳ء کو اپنے وہی وطن میں چند روز علیل رہکر وفات پائی۔ آپ نے میور سنٹرل کالج الہ آباد میں تعلیم پاکر ۱۸۹۳ء میں بی۔اے پاس کیا جس میں آپ تمام یونیورسٹی میں اول رہے تھے اور زبان انگریزی میں اعزاز حاصل کیا تھا۔ممکن تھا کہ اس کے بعد آپ سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں منسلک ہوجاتے اور صوبجاتی سروس میں معراج کمال حاصل کر لیتے، لیکن آپ نے ملازمت کو پسند نہ کیا اور وکالت پاس کرکے قانون کا پیشہ اختیار کر لیا جس میں اس قدر ترقی کی کہ ۱۹۱۶ء میں پٹنہ ہائیکورٹ قائم ہونے پر آپ بھی اس کے ایک جج مقرر کئے گئے۔ آپ کئی مرتبہ پٹنہ ہائیکورٹ کے قائم مقام چیف جسٹس بھی مقرر ہوئے۔جج کی حیثیت سے آپ کی قابلیت اور بے لوثی ہمیشہ مسلّم رہی۔قوت فیصلہ میں آپ کو اس قدر کمال حاصل تھا اور آپ کے فیصلے اس قدر مدلل ہوا کرتے تھے کہ بڑے بڑے قانون داں آپ کی قابلیت کا لوہا ماننے لگے تھے۔بہرحال آپ کا شمار ہندوستان کے بہترین ججوں میں تھا۔علم دوستی کی وجہ سے آپ کا پٹنہ یونیورسٹی سے بھی نہایت گہرا تعلق تھا، چنانچہ سالہا سال تک آپ اس یونیورسٹی میں سنڈیکیٹ کے ممبر رہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی سے بھی آپ کا تعلق تھا۔الغرض کیا بلحاظ شخصیت اور کیا بلحاظ جج آپ کا بیحد احترام کیا جاتا تھا۔ہائی کورٹ پٹنہ کے تمام ججوں کے ایک جلسہ میں آپ کی وفات پر انتہائی رنج و ملال کا اظہار کیا گیا۔

دیوان بہادر کیشو پلے

عموماً جنوبی ہند اور خصوصاً صوبۂ مدراس، مشہور محب وطن اور خادم قوم دیوان بہادر کیشو پلے کی وفات حسرت آیات پر جس قدر بھی اظہار غم و ملال کرے اس قدر کم ہے۔تقریباً نصف صدی تک اس جاں نثار قوم نے اپنے صوبہ میں پبلک لائف کا معیار بلند کرنے میں جو انتھک کوشش کی وہ

جنوبی ہند کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ اگرچہ آپ گونٹی جیسے دور افتادہ اور پست ضلع کے وکیل تھے، لیکن اپنے قومی جوش، ہمت عالی، اور لگاتار محنت سے آپ نے احاطہ مدراس میں ایک مسلمہ اور ممتاز ترین پوزیشن پیدا کر لی تھی۔ انتظامی امور اور قانونی موشگافیوں میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ اور چونکہ آپ جمہور کی ترقی میں ہمیشہ سچے دل سے منہمک رہتے تھے، بدیں لئے تمام صوبہ آپ کا بیحد احترام کرتا تھا۔ نومبر ۱۹۲۳ء میں آپ مدراس کونسل کے دوسری مرتبہ باتفاق رائے ڈپٹی پریسیڈنٹ منتخب ہوئے تھے۔ چنانچہ مدراس کونسل کے پریسیڈنٹ دیوان بہادر سر ایم۔ کرشنان نائر نے آپ کی خدمات کا ان الفاظ میں اعتراف فرمایا تھا۔

"آپ ہمیشہ جمہور کے طرفدار رہے، ہمیشہ قوم کی خاطر لڑتے رہے۔ لیکن آپ جب کبھی لڑے صاف دل اور صاف ہتھیاروں سے لڑے، حتیٰ کہ جس شخص پر آپ حملہ کرتے تھے اس کے جسم پر زخم کا نشان تک نہ ہوتا تھا......... وہ بھی دن دور نہیں کہ آپ کو مدراس کی دنیا "بابائے کونسل" کے نام سے پکارے گی۔"

پریسیڈنٹ نے آپ کے لئے "بابائے کونسل" کا لفظ اس لئے استعمال کیا تھا کہ آپ کونسل کے لگاتار سولہ سال تک ممبر رہے تھے۔ در اصل آپ کا شمار ان بزرگوں میں ہے جنھوں نے ہندوستان میں پبلک لائف کی بنیاد قائم کی ہے۔ افسوس اس وقت تمام صوبہ مدراس میں کوئی شخص آپ کا جانشین نظر نہیں آتا۔

سلک جواہر

اگر تمہیں روپیہ کی قدر و قیمت معلوم نہ ہو تو کسی سے قرض لیکر دیکھ لو۔ (بنجمن فرینکلن)

پڑھنے کے بعد اُس پر غور نہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا خوراک کھا کر اسے ہضم نہ کرنا۔ (برک)

ہماری پیدائش کیا ہے موت کی ابتدا۔ (ینگ)

تم کسی جگہ ہو موت تمہیں ضرور ڈھونڈھے گی۔ خواہ تم بڑے بڑے مضبوط قلعوں میں ہی کیوں نہ ہو۔ (قرآن مجید)

میں اُس شخص کو اپنے دوستوں میں شامل نہیں کرونگا جو بلا وجہ ایک چیونٹی پر پاؤں رکھدے۔ (کوپر)

نیند کیا ہے؟ چند گھنٹوں کی موت؟ موت کیا ہے؟ ہزارہا سال کی نیند! (فلیچر)

دولت ایک پرند ہے اور شان و شوکت ایک خواب (کوپر)

عالمِ نسواں

پچھلے ماہ ہندوستان کے دو مشہور مقام لاہور اور دہلی میں عورتوں کا ایک بڑا اسپتال اور کالج کھلے ہیں۔ ۱۱۔ مارچ کو ہز اکسلنسی لیڈی ولنگڈن نے لاہور میں "لیڈی ولنگڈن زنانہ اسپتال" کا افتتاح فرمایا جو زچہ و بچہ اور عام عورتوں کی نفع رسانی کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اس شفاخانہ پر پونے پانچ لاکھ روپیہ خرچ ہوا ہے۔ اور چار لاکھ روپیہ طبی سامان پر مزید صرف ہوا۔ اس کے تین وارڈ ہندوستانی اور ایک وارڈ اینگلو انڈین اور یوروپین عورتوں کے لئے مخصوص ہوگا۔ ہر وارڈ میں بارہ مریضوں کے قیام کا انتظام ہے۔ لیڈی ولنگڈن نے اپنی افتتاحیہ تقریر میں اسپتال کی بہت تعریف کی ہے۔

دہلی میں لیڈی اروِن صاحبہ کی یادگار میں ایک اعلیٰ درجہ کا زنانہ کالج قائم ہوا ہے۔ چنانچہ ۲۰۔ مارچ کو ہز اکسلنسی وائسرائے نے لیڈی اروِن کالج نسواں دہلی کا معززین و حکام کی جمعیت کثیر کے سامنے افتتاح فرمایا۔ مسز فریدون جی نے اپنی تقریر میں بیان کیا کہ تقریباً تین سال کی لگاتار محنت اور غور و فکر کے بعد آج یہ کالج وجود میں آیا ہے۔ جس کی بنیاد ایک کرایہ کی عمارت میں ڈالی گئی تھی۔ کالج کمیٹی کے پاس ساڑھے چار لاکھ روپیہ تھا جس میں دو لاکھ روپیہ حضور نظام کا عطیہ تھا۔ اب مزید عمارتوں کے لئے ڈھائی لاکھ روپیہ کی اور ضرورت ہے، امید ہے کہ کوئی دریا دل اہل ملک ہماری اس ضرورت کو بھی پوری کر دیگا۔ لیڈی جھوے نے کالج کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ یہ کالج قابل نمونہ اُستانیاں، بیویاں اور مائیں وغیرہ پیدا کرے گا۔ وائسرائے نے تقریر کرتے ہوئے ایک پرلطف فقرہ یہ کہا کہ "امید ہے اس کالج کی پڑھی ہوئی عورتیں اپنے شوہروں کو اسی طرح قبضہ میں رکھیں گی جیسے کہ لیڈی ولنگڈن اپنے شوہر کو رکھتی ہیں"۔ مسز ہنا سین نے جو کالج کی سب سے پہلی پرنسپل ہیں، وائسرائے کو پھولوں کے ہار پہنائے۔ بیگم شاہنواز، مسز سریواستو کانپور اور بیگم حبیب اللہ لکھنؤ بھی اس جلسہ میں شریک تھیں۔

پچھلے دنوں شیخ محمد حبیب اللہ صاحب نے قانونی کونسل صوبۂ متحدہ میں یہ تحریک پیش کی کہ صوبہ میں اعلیٰ درجہ کی زنانہ تعلیم کے وسائل بہم پہونچانے کی غرض سے آگرہ و اودھ کے ہر بڑے شہر میں عورتوں کے لئے ایک انٹرمیڈیٹ کالج قائم ہونا چاہیئے۔ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے اس مشورہ کو اصولاً تسلیم کیا۔ اور کہا کہ اگرچہ لکھنؤ، بنارس، الہ آباد اور علیگڑھ میں زنانہ انٹرمیڈیٹ کالج موجود ہیں لیکن تعلیم نسواں کی روز افزوں ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ تعداد بہت کم ہے۔ ہم کو امید ہے کہ ہمارا سررشتہ تعلیم جلد ہی اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔

اس وقت تک عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے سررشتہ تعلیم نے کوئی خاص کورس مقرر کرنے پر غور نہیں کیا ہے۔ چنانچہ ہریتی گرلس اسکول لکھنؤ کے جلسہ تقسیم انعامات کی صدارت کرتے ہوئے مسٹر ایچ۔ میکنزی ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم صوبۂ متحدہ نے اس مسئلہ پر اظہار خیالات فرمایا۔ آپ نے تسلیم کیا کہ تعلیم نسواں کے لئے ایسا نصاب معین کرنے کی سخت ضرورت ہے جو ملکی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستانی لڑکیوں کے لئے مناسب اور مفید ہو آپ کی رائے میں یہ نصاب ایسا ہونا چاہیئے جو ہندوستانی عورتوں کے شمائل و خصائل کے نشوونما میں مدد دے۔ آپ کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ مغربی لڑکوں یا لڑکیوں کے نصاب کی تقلید ہمارے لئے نہ موزوں ہے اور نہ ضروری ہم کو امید ہے کہ ہمارے رہنمایانِ تعلیم اس ضروری مسئلہ کی طرف جلد ہی توجہ فرمائیں گے۔

بیگم شاہنواز صاحبہ جو گول میز کانفرنسوں میں ڈیلیگیٹ تھیں وھائٹ پیپر پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ گورنمنٹ برطانیہ نے عورتوں کو حق رائے دہی دینے میں لوتھین کمیٹی کی سفارشوں پر بھی عمل نہیں کیا۔ علاوہ ازیں فیڈرل اسمبلی کی رکنیت کے لئے عورتوں کے خواندہ ہونے کی سفارش بھی منظور نہیں کی۔ ہندوستان کی عورتوں پر یہ صریح ظلم ہے۔

سرسوتی بھون دہلی میں تقریر کرتے ہوئے غازی رؤف بے نے ترک عورتوں کی بیداری کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا کہ یوں تو تحریک بیداریِ نسواں سلطان سلیم کے عہد ہی میں شروع ہوگئی تھی۔ سلطان عبدالمجید خاں کے زمانہ میں بھی اس کا سلسلہ جاری رہا۔ انیسویں صدی میں تعلیم نسواں شروع ہوگئی۔ لیکن جب جنگ بلقان اور بعد ازاں جنگ یونان میں عورتوں نے کارنامہائے عظیم انجام دیئے

خوشی کی بات ہے کہ گذشتہ پانچ سال کے اندر لڑکوں کے اسکولوں میں پڑھنے والی لڑکیوں کی تعداد یو۔پی میں اُنتالیس ہزار سے ستاون ہزار ہوگئی ہے۔

مس نورجہاں حسین صاحبہ بی۔اے بی۔ٹی۔رانچی میں ڈسٹرکٹ انسپکٹریس مدارس مقرر کی گئی ہیں۔آپ صوبہ بہار کی پہلی خاتون ہیں جنھوں نے لندن یونیورسٹی سے ٹیچری کا ڈپلومہ حاصل کیا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔اے بی۔ٹی پاس کرنے کے بعد آپ کو مسٹر دیپ نراین سنگھ صاحب بھاگلپور نے وظیفہ دیکر ولایت بھیجا تھا جہاں سے آپ نے ٹیچری کا ڈپلومہ حاصل کیا ہے۔

ملک معظم نے ریاست ٹراونکور کی چھوٹی مہارانی صاحبہ کو جو موجودہ مہاراجہ کی والدہ ہیں ہر ہائینس کا خطاب عطا فرمایا ہے۔

۶۔مارچ کی شام کو قصر سلطانی بھوپال میں ولیعہد شہزادی گوہر تاج بیگم کی تقریب رخصتی منعقد ہوئی جس میں بہت سے مہمانان عزیز شریک ہوئے تھے۔ہز اکسلنسی وائسرائے اور لیڈی ولنگڈن بھی جلوہ افروز تھے شہزادی ساجدہ بیگم بھوپال، شہزادی رابعہ بیگم بھوپال بھی شریک تھیں۔علاوہ ازیں بعض دیگر ریاستوں کے روٴسا بھی آئے تھے۔جب شہزادی گوہر تاج عابدہ سلطان کی عمر صرف ایک ہفتہ کی تھی تو ان کو لیڈی ولنگڈن نے گود میں کھلایا تھا۔اس لئے خود لیڈی صاحبہ نے شہزادی اور نواب صاحب کروائی (دولہا) کا جام صحت تجویز کیا۔تمام شہر اور تمام شاہی محلات فرط آرایش وزیبایش سے دُلھن بنے ہوئے تھے،شب کو تمام شہر کثرت چراغاں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا، ریاست کی فوج زرق برق وردیوں میں بارات کے ساتھ تھی۔نواب سرور علی خاں والیِ کروائی بحیثیت نوشہ ایک ہاتھی پر زرنگار ہودہ میں جس میں طلائی عماری بھی تھی سوار تھے دولھا نے اُترتے ہی انگریزی طریقہ پر اپنی تلوار سے ایک بڑا کیک کاٹا اور وائسرائے اور لیڈی ولنگڈن کی مبارکباد قبول کی، بعد ازاں دُلھن کو لیکر جو ایک مرصع پالکی میں جس پر گلابی ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے سوار تھیں، راحت منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔شہزادی کو نواب صاحب نے ستر ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر عطا فرمائی۔تمام تقریب بصد مسرت و کامیابی انجام پذیر ہوئی۔ہم بھی اس تقریب سعید پر دولھا دُلھن اور نواب صاحب بھوپال دونوں کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں۔

انتشارِ شاعر

(از پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم اے)

درد کی سوز کی الفت کی کہانی میری — ذرّہ ذرّہ نے سُنی مجھ سے زبانی میری

پتہ پتہ سے میں سرگرمِ سخن رہتا ہوں — رات کو تاروں سے سب قصۂ غم کہتا ہوں

میرے گائے ہوئے نغمے جو یہ سُن جاتی ہیں — بلبلیں بیٹھ کے گلشن میں چہک آتی ہیں

خوشبوئے مہر و وفا میری جو پا جاتے ہیں — غنچے کھل پڑتے ہیں اور پھول مہک جاتے ہیں

یہ نسیمِ سحری اتنا جو اٹھلاتی ہے — شوخیٔ طرزِ ادا میری چرا لاتی ہے

دشت و دریا نے بھی لی مجھ سے نشانی دل کی — اسمیں وسعت ہے تو اسمیں ہے روانی دل کی

یہ جو اُڑتے ہوئے مرغانِ چمن گاتے ہیں — رنگ اندازِ بیاں میرا اُڑا لاتے ہیں

دیکھکر سوز مرا سوز کا دم بھرتے ہیں — جوش میں آتے ہیں پروانے تو جل مرتے ہیں

سیکھ لی سیکھ لی یہ سوز بیانی میری — شمع رو رو کے سُناتی ہے کہانی میری

کر تو لی جذب یہ پردرد حقیقت میری — مجھ سے ملتی تو ہے آواز پپیہے تیری

دل مرا الفتِ سربستہ کا شیرازہ تھا — کُھل گیا ٹوٹ گیا پھیل گیا پھیل گیا

قمریاں بلبلیں پروانے جو پرّاں ہیں یہ
مجھ کو شک ہے مرے اوراقِ پریشاں ہیں یہ

کلامِ اثر

(از خانصاحب مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی، بی۔اے۔)

اسیری میں جو فکرِ آشیاں ہے — نفس ہم رنگِ شعلہ پرفشاں ہے

کبھی سن لے کہ دلکش داستاں ہے — زباں میری ہے اور تیرا بیاں ہے

کوئی روٹھا ہوا پھر مہرباں ہے — مرے حسرت بھرے دل تو کہاں ہے

خدا را ہمت اے پائے شکستہ — نظر کے سامنے وہ آستاں ہے

چمن کی جان تھے جو پھول توڑے — فغاں ہے دستِ گلچیں سے فغاں ہے

نشیمن سے جو اُٹھا تھا اسیرو — مری آنکھوں میں ابتک وہ دھواں ہے

قفس میں ہو گیا اکثر یہ دھوکا — ستارا صبح کا یا آشیاں ہے

تکلف برطرف، پردہ ہی اچھا — اگر مقصودِ جلوہ امتحاں ہے

ہوئی ہے سرخ جس سے چشمِ عاشق — بہار اُس آتشِ تر کا دھواں ہے

رقم گلشن میں ایک اک برگِ گل پر — مرے خونیں کفن کی داستاں ہے

عیاں ہو اور اے حسنِ جہانتاب — حجابِ جلوہ اب تک درمیاں ہے

مژہ پر بھولا بسرا کوئی آنسو، — کہے جو کچھ، خموشی اپنی زباں ہے

مے جلوہ لٹائے آج ساقی — مگر اس مے کا پیمانہ کہاں ہے

نگاہیں مل کے جھکنا، دل کا جانا — مری آنکھوں میں ابتک وہ سماں ہے

مژہ نمدیدہ، چہرہ زرد، لب خشک — اثر پندارِ خودداری کہاں ہے

سچ ہے محبت زہر نہیں ہے — جینے کی پھر بھی لہر نہیں ہے

کشتوں سے تیرے جو نہ بسا ہو — ملکِ وفا میں شہر نہیں ہے

چپکے سے پی جا اے دلِ مضطر — اشکِ الم ہے، زہر نہیں ہے

مسلکِ اہلِ صبر و رضا میں — جبر نہیں ہے، قہر نہیں ہے

معنیٔ صورت، صورتِ معنی — تو ہی تو ہے، دہر نہیں ہے

دل ہی اثر کا تاب نہ لایا — ورنہ محبت زہر نہیں ہے

تبرکات

(از علامہ شاد عظیم آبادی مرحوم)

غفلت میں گزرتی ہے جوانی | بس طولِ حیات ہے سر بانی
سوتا سنسار، جاگتا حق | سچی تھی اسی قدر کہانی
اب ایک کا بھی پتہ نہیں ہے | چھوڑی تو بہت سی تھی نشانی
بے بال و پر ہوئے نہ افسوس | مرنے پہ بھی جنت آشیانی
تصویر تری ہے اب بھی دل میں | اے مجمع دوستانِ جانی
آتا ہو تو آ کہاں تلک صبر | اے وجہ بقائے زندگانی
موقوف ہے شاید اس جہاں پر | اے روح لقائے یار جانی
خاموش ہوں مدتوں سے اے شاد | موقوف ہے شغل شعر خوانی

طاقت شگفتگی کی نہ نشوونما کی ہے | خوبی یہ اے چمن تری آب و ہوا کی ہے
ہمت ہی ساتھ جادۂ الفت میں ہر جگہ | رہبر کی احتیاج نہ حاجت عصا کی ہے
رکھتا ہوں ٹھیک پاؤں جو تاریک راہ میں | اے چشم روشنی یہ کسی نقش پا کی ہے

خود صفحۂ وجود ہے اے شاد کالعدم
جس شکل پر نگاہ اٹھاؤ فنا کی ہے

موت

(از مولانا محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنوی (از مدراس)

نومبر ۳۲ء کے رسالہ "یادگار" لاہور میں ایک مختصر مضمون "موت" کے عنوان سے چھپا ہے، جو غالباً کسی انگریزی مضمون یا نظم کا ترجمہ ہے۔ یہ نظم بعض تصرفات کے بعد اسی سے تیار کی گئی ہے (محوی)

شرف و جاہ، اور مال و منال ۔۔۔ ہیں حقیقت میں خواب اور خیال
موت کے سامنے ہے کس کی مجال

نہ اولوالعزم بادشاہ رہے ۔۔۔ نہ وہ ارباب عز و جاہ رہے
نہ سرِ لشکر و سپاہ رہے

اب وہ اگلے جہاں پناہ کہاں ۔۔۔ وہ سلاطینِ کج کلاہ کہاں
وہ ستم راں، وہ دادخواہ کہاں؟

آہ بے رحم موت ہاتھ اپنے ۔۔۔ پھیر جاتی ہے آ کے چپکے سے
حلق پر ہر امیر و سلطاں کے

یہ عصا شاہی اور زرّیں تاج ۔۔۔ ہونگے پیوندِ خاک کل یا آج
اک نہ اک دن گیا ہی سمجھو راج

نہ ملی موت سے کسی کو پناہ ۔۔۔ نہیں اس سے نجات کی کوئی راہ
سب ہیں فانی سوائے ذاتِ الٰہ

گو وہ ذی مرتبت ہوں شاہنشاہ ۔۔۔ بینوا بے کسوں کی طرح تباہ
ہونگے دستِ اجل سے اِک دن آہ

زندگی اپنی کھونے والے ہیں ۔۔۔ ابدی نیند سونے والے ہیں
خاک کا ڈھیر ہونے والے ہیں

منتظر اُن کی ہے زمین قبور ۔۔۔ جانے والے ہیں اس جہاں سے ضرور

موت سے آہ وہ بھی ہیں مجبور!

وہ بہادر سپاہیِ جانباز جس پہ میدانِ جنگ کو تھا ناز
کام جس کے ہیں آج تک ممتاز

وہ صفِ کارزار کے ضرغام تیغ تھی جن کی تیغِ خوں آشام
جن کے تاریخ میں ہیں روشن نام

تزک واحتشام سے جاکر اور اپنے غنیم پر چھاکر
آگئے فتح اور ظفر پاکر

تھیں جو ممتاز خدمتیں اُن کی عزت افزائی اُن کی خوب ہوئی
پائے انعام اور تمغے بھی

وہ دلاور، وہ سُورما، وہ جواں جن کے آگے تھی ہیچ قیمتِ جاں
بیگناہوں کا خون بھی ارزاں

جو تھے ممتاز جنگ کے فن میں بڑھ کے گھمسان کے ہر اک رن میں
کر گئے وہ جو آگیا من میں

تیغ کے گھاٹ اسے اُتار دیا ایک حملے میں اُس کو مار دیا
دن اسی کام میں گزار دیا

جن کی تلواریں آخری دم تک برق آسا دکھا رہی تھیں چمک
نہ کھٹک دل میں تھی نہ کوئی جھجک

موت کے چنگلوں سے اُن کو بھی نہ رہائی دلا سکیں محوی
یہ نبرد آزمائیاں اُن کی

آخر کار آگئی وہ گھڑی موت کے آستاں پہ اُن کو بھی
آہ کرنی پڑی جبیں سائی

دیکھو دیکھو وہ اُن کے ہی لاشے آج ہیں خون وخاک میں لتھڑے
رونے والے کہاں گئے اُن کے

جو نمایاں کئے اُنھوں نے کام جب سر انجام پا چکے وہ تمام
تو ملا اُس کا یہ انھیں انعام

فتح و نصرت کے تازہ پھولوں کا　　ایک سہرا ہر اک کے سر پہ بندھا
کہ رہے یادگار نام وفا

آہ وُہ دن بہار دکھلا کر　　رہ گئے ہیں وہ پھول کملا کر
خاک میں مِل رہے ہیں مرجھا کر

رفتہ رفتہ بعینہٖ یوں ہی　　اُن کے اس آفتاب شہرت کی
ہو رہی ہیں تجلّیاں پھیکی

ہونے والا ہے ایک دن یہ غروب　　بھُول جائیں گے ان کو سب کے قلوب
ہے زمانے کا بس یہی اسلوب

اس لئے اپنے کارناموں پر　　جو ہیں جانِ بہادری یکسر
بھُول کر تو غرور و فخر نہ کر!

موت کے بعد سب یہ اے پیارے!　　محو ہو جاتے ہیں ہر اک دل سے
نام لیتا نہیں کوئی اِن کے

رکھتے ہیں زندہ، اے فنا انجام　　بعد مرنے کے آدمی کا نام
نیکیاں اور منصفانہ کام

نیکیاں ہیں اگر طبیعت میں　　ہیں معاون وہی حقیقت میں
آدمی کے حصولِ شہرت میں

وہ معطّر مشامِ جاں سب کے　　کرتی رہتی ہیں اپنی خوشبو سے
تا ابد جیسے تازہ تر غنچے

(ترجمہ)

ملازمت

(از جناب محمود اسرائیلی صاحب)

مانگی ہے بھیک برسوں نواحِ کنشت میں　　جب آئی ہے کہیں یہ غلامی سرشت میں
طوقِ ملازمت رہے گردن میں تا حیات　　غلماں بنوں جو جاؤں خدایا بہشت میں

علمی خبریں اور نوٹ

۱۹۳۲ء کی آخری سہ ماہی میں صوبۂ متحدہ میں مختلف زبانوں کے جس قدر رسالے اور کتب شائع ہوئے اُن کی تعداد حسب ذیل ہے:-

انگریزی	۹۲	سنسکرت	۴۵	عربی	۱
فارسی	۶	نیپالی	۵	مرہٹی	۱
بنگالی	۶	اُردو	۱۵۲	ہندی	۵۸۱
مخلوط	۸۹				

ان مطبوعات میں تقریباً نوے فیصدی درسی کتابیں ہیں، مخلوط قسم میں وہ کتابیں داخل ہیں جو ایک سے زیادہ زبانوں میں ہیں، جیسے ڈکشنریاں، شرحیں، تفسیریں، ترجمے مع متن، ترجمے کی کتابیں وغیرہ۔ ان اعداد و شمار سے ناظرین کرام پر روشن ہوگیا ہوگا کہ فی زمانہ ہندی زبان کس قدر ترقی کر رہی ہے۔ اُردو کتابوں کی تعداد کی کمی قدر دانان اُن کے لئے غور طلب ہے۔

دنیا کے مختلف ممالک کی مردم شماری کے نقشوں سے خواندہ اور ناخواندہ آبادی کا جو تناسب معلوم ہوتا ہے وہ حسب ذیل ہے:-

ملک	ناخواندوں کی تعداد فیصدی	ملک	ناخواندوں کی تعداد فیصدی	ملک	ناخواندوں کی تعداد فیصدی
ہندوستان	۹۱ "	پرتگال	۶۵ "	ہسپانیہ	۴۳ "
اطالیہ	۲۷ "	امریکہ	۶ "	انگلستان	۶ "
فرانس	۴½ "	جرمنی	۲½ "		

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ علمی ترقی کے لحاظ سے ہمارا ملک دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلے میں کس قدر پیچھے ہے؟ آخر اسکا کیا سبب ہے؟ بہی خواہانِ وطن غور فرمائیں اور اس جہالت کے رفع کرنیکی معقول تدابیر سوچیں۔

ہمارے لئے یہ خبر دل خوش کن ہے کہ سوئیزرلینڈ میں شہر جنیوا کے قریب سلیوا نامی پہاڑ پر ایک ہندو کروڑپتی مسٹر دینا نامی اور انکی امریکن بیوی میری ڈکیس ۱۲½ لاکھ پونڈ کے صرف کثیر سے ایک رصدگاہ تعمیر کرا رہے ہیں جو گورنمنٹ

فرانس کو نذر کی جائیگی۔ اس رصدگاہ میں ۱۰۵ انچ قطر کی ایک دوربین نصب کیجائیگی۔ دنیا کی کسی دوسری رصدگاہ میں اتنی بڑی دوربین نہیں ہے۔ اس رصدگاہ کی بلندی ۴½ ہزار فٹ ہوگی، دوربین کے علاوہ اس میں فلکیات کے متعلق اور بھی بہت سے قیمتی آلات رکھے جائیں گے۔

انگریزی کی مشہور ترین ڈکشنری جو آکسفورڈ یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۱۸۵۷ء سے تیار ہو رہی ہے اسمیں کل نو ہزار صفحات اور چار لاکھ الفاظ ہیں۔ الفاظ کے معانی کی تشریح کے ساتھ بطور ثبوت ۱۷۴۴۶۵۰۰ سندیں اساتذہ کے کلام سے پیش کی گئی ہیں۔

رنگپور سے سید اللہ یوسف علی صاحب نے اعلان کیا ہے کہ ان کو غالب مرحوم کی قلمی بیاض کا ایک نسخہ دستیاب ہوا ہے جس پر خود غالب کے دستخط موجود ہیں۔

اس وقت دنیا میں تین ہزار چار سو چوبیس زبانیں بولی جاتی ہیں۔ یورپ کی مختلف زبانوں میں الفاظ کی تعداد حسب ذیل ہے:۔

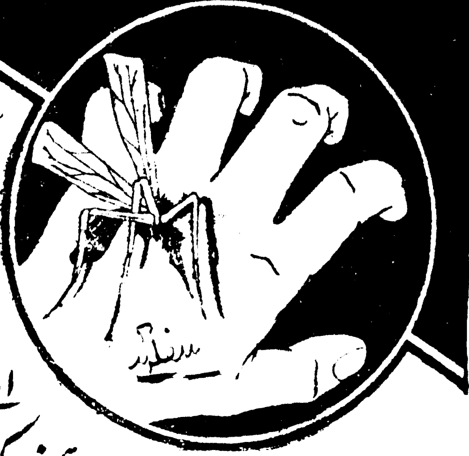
انگریزی	۴ لاکھ ۳۰ ہزار	روسی	ایک لاکھ ۴۰ ہزار
جرمن	ایک لاکھ ۴۰ ہزار	ہسپانوی	ایک لاکھ ۲۰ ہزار
فرانسیسی	۳ لاکھ ۱۰ ہزار	اطالوی	ایک لاکھ ۴۰ ہزار

مشرقی زبانوں میں سب سے وسیع زبان چینی ہے، اس کے بعد اردو اور اسکے بعد عربی کا نمبر آتا ہے۔ عربی بولنے والوں کی تعداد پانچ کروڑ ہے۔

مغربی زبانوں میں انگریزی بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے، دوسرا نمبر جرمن کا بعد ازاں علی الترتیب فرانسیسی، ہسپانوی و پرتگیزی زبانیں ہیں۔

یورپ کے ماہرین السنہ مدت سے اس فکر میں ہیں کہ تمام دنیا کیلئے ایک ایسی مشترکہ زبان ایجاد کیجائے جو مختلف اقوام کے درمیان تبادلۂ خیالات کا ذریعہ بن سکے چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر ایک زبان "اسپرانٹو" کے نام سے ایجاد کیگئی تھی لیکن وہ بین الاقوامی دنیا میں مقبول نہ ہوئی۔ اب آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اگر انگریزی زبان کو نحوی پابندیوں سے آزاد کردیا جائے تو باسانی تمام دنیا کی مشترکہ زبان بن سکتی ہے پروفیسر صاحب کی تجویز ہے کہ انگریزی زبان میں صرف ساڑھے آٹھ سو الفاظ رکھے جائیں تاکہ ہر شخص انھیں باسانی یاد کر سکے

زہریلے کیڑوں کے کاٹنے اور ڈنک مارنے سے جو تکلیف اور خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اسے جڑی بوٹیوں کا حیرت انگیز مرہم زمبک بہت جلد دفع کر دیتا ہے



مچھروں، چیونٹیوں، مکڑیوں، بچھوؤں وغیرہ کے کاٹے پر زمبک لگا دیجئے فوراً آرام ہو جائیگا یہ عجیب و غریب مرہم آپ کی جلد کو متعدد امراض کے خطرہ سے محفوظ رکھے گا۔ درد و تکلیف جادو کی طرح اڑا دیتا ہے۔ زمبک ورم یا جلد کا رنگ تبدیل ہونے نہیں دیتا۔ یہ گوشت سے تمام زہریلا مادہ خارج کر کے نئی کھال پیدا کر دیتا ہے۔

جھلسنے والی گرمی اور دھوپ۔ جلن دار خارش۔ جلے کٹے زخموں، خراشوں، اکزیما، پھوڑوں، پھنسیوں، زہرباد، داد۔ کھردری ٹانگوں، پاؤں کے آبلوں، سر کے گنج اور بواسیر وغیرہ کا نہایت طاقتور اور مؤثر علاج زمبک ہے

زمبک کو ماہر فن دوا ساز کمیاب اور بیش قیمت بوٹیوں کے تیل سے سائنٹفک طور پر تیار کرتے ہیں۔ ہاتھ سے کبھی نہیں چھوا جاتا۔

تمام دوا فروش زمبک کی ڈبیہ عہ اور عا کے حساب سے فروخت کرتے ہیں
میسرز اسمتھ اسٹانسٹریٹ اینڈ کو لمیٹیڈ انٹالی کلکتہ۔

حیوانی چربی سے پاک ہونے کی گارنٹی کیجاتی ہے

زمبک Zam-Buk

گرد آلود حلق کا
حیرت انگیز علاج



اس موسم میں ہوا اسقدر گرد و غبار آلود ہوتی ہے کہ ہر سانس کے ذریعہ سے ہوا حلق اور پھیپھڑوں میں بیماری پہونچاتی ہے امراض کے اس خطرہ سے محفوظ رہیئے۔ گرد آلود حلق اور دیگر خطرات سے بچنے کے لئے لازمی طور پر پیپس استعمال کیجئے سانس کے ذریعہ سے شفا دینے والی حیرت انگیز جراثیم کش ٹکیاں اس ہوا کو جو سانس کے ذریعہ سے اندر پہونچتی ہے صاف کر دیتی ہیں۔ پیپس حلق کو تسکین دیتی ہیں اور متورم یا بیمار آلات تنفس کو اچھا کر دیتی ہیں۔ کھانسی نزلہ زکام وغیرہ میں بھی پیپس کا استعمال کیجئے۔ تمام دوا فروشوں سے ۸ آنہ فی شیشی کے حساب سے مل سکتی ہیں۔

بذریعہ سانس شفا دینے والی جراثیم کش ٹکیاں

پیپس Peps

زمانہ بک ایجنسی کی قابل خرید بے مثل کتابیں

کاس الکرام حکیم عمر خیام کی رباعیات کی بہترین شرح از میر ولی اللہ صاحب بی اے۔ ایل ایل بی وکیل قیمت مجلد سے تین روپیہ

دنیا کے راز ابو الفاضل زار جالندھری کی قدیم و جدید طرز دلکش نظموں کا مجموعہ ہے۔ ہر نظم بلحاظ موضوع مکمل و نتیجہ خیز ہے مع تصویر مصنف ایک روپیہ

مایۂ تسکین جناب محمد یٰسین صاحب تسکین سواتی کے کلام کا دلکش مجموعہ ہے جو عام طور پر مقبول ہے قیمت ایک روپیہ

اردو مضمون نویسی
مضمون لکھنے کے متعلق بابو نانک پرشاد بی۔ اے پروفیسر کی نہایت عمدہ کتاب ہے اس سے بہت جلد مضمون لکھنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے اور واقفیت دماغ ہر موضوع کی نہایت آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ قیمت

اثرستان ملک کے مشہور سخن سنج مرزا جعفر علی خانصاحب اثر لکھنوی کا دیوان جسکا ہر مصرع پر تاثیر و نشتری قیمت ایک روپیہ

حیات بیوہ
جس میں مصنف نے بیوگان کی حالت کا سچا فوٹو اور انکی جانکاہ مصیبتوں کا دلگداز سین پیش کیا ہے قیمت

سیر المصنفین اردو انشا پردازی کی مکمل تاریخ از جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب بی۔ اے شعراء کی طرح نثاروں کا جامع تذکرہ قیمت

خیالات اور نگینے واشنگٹن اِروِنگ کے چند دلکش ناولوں کا بامحاورہ ترجمہ از مولوی محمد یحییٰ تنہائی۔ اے قیمت

زمانہ بک ایجنسی کانپور سے طلب فرمائیے

زمانہ

مرتبہ: دیا نرائن نگم بی اے

جلد ۶۰	مئی سنہ ۱۹۳۳ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت سالانہ ممالک غیر سے سالانہ ۱۰ ششماہی ۶

ہندوستان کے لئے ششماہی تین روپیہ



هزاکسلنسی کپتان نواب سر احمد سعید خان بہادر کے-سی-اس-آئی-کے-سی-آئی-ای
گورنر صوبہ متحدہ اگرہ و اودہ

زمانہ

جلد ٦٠

مئی ۱۹۳۳ء

آئرلینڈ

(از بابو انت پرشاد نگم بی۔اے ایل ایل۔بی)

قدیم آئرلینڈ آئرلینڈ کا رقبہ بتیس ہزار مربع میل سے کچھ کم ہے۔ اس لحاظ سے بمقابلہ سلطنت برطانیہ اس کی حیثیت سمندر میں ایک قطرے سے زیادہ نہیں۔ لیکن آئرلینڈ کی پولیٹکل تاریخ دنیا کی پست قوموں کے لئے ہمیشہ سبق آموز رہیگی اور ان کے دلوں میں معراج ترقی پر پہونچنے کے لئے ہمت و حوصلہ پیدا کرتی رہیگی۔ آئرلینڈ کی تہذیب قدیم ہے۔ سن عیسوی سے صدہا برس قبل اسمیں باقاعدہ حکومت تھی۔ کیلٹ قوم جو اسکاٹ لینڈ اور انگلستان کی قدیم باشندہ تھی اسی کا ایک فرقہ جو گیل کے نام سے موسوم تھا آئرلینڈ میں آباد تھا۔ مختلف حصوں میں جو قبائل آباد تھے۔ ان کے سرداران حصوں پر حکومت کرتے تھے اور ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہی نہیں بلکہ اکثر باہم برسرپیکار رہتے تھے مگر رعایا خوشحال تھی۔ کسی غیر ملکی قوت کے جبر و تشدد کا امکان ہی نہ تھا۔

انگریزی حکومت کی ابتدا سنہ ۱۱۷۰ء میں انگریزوں کی پہلی فوج کشی ہوئی جو آئرلینڈ کے دو سرداروں کی باہمی نااتفاقیوں کا نتیجہ تھی۔ بہرحال شہر ڈبلن کے گرد و نواح میں انگریزوں کے قدم مستقل طور سے جم گئے۔ یہ خطہ پیل کے نام سے مشہور ہوا۔ اس میں انگریزی قوانین نافذ ہوتے گئے اور انگریزی طرز حکومت کا اثر جمنے لگا۔ سنہ ۱۲۹۵ء میں یہاں ایک پارلیمنٹ بھی قائم کر دیگئی۔

جو انگریز پیل میں آباد ہوتے تھے وہ آئرلینڈ کے باشندوں سے ازدواج اور رابطۂ اتحاد قائم کرتے جاتے تھے۔ اس خلط ملط کا یہ نتیجہ ہونے لگا کہ پیل میں انگریزوں کی آبادی آئرش جذبات سے متاثر ہونے لگی۔ یہ لوگ آئرش زبان بولتے آئرش پوشاک پہنتے اور گیل کے رسوم و رواج عمل میں لاتے تھے۔ انگریزی حکومت نے جب یہ دیکھا کہ فاتح قوم آئرلینڈ کی مفتوح قوم میں جذب ہوتی جارہی ہے اور کوئی امتیاز دونوں میں باقی نہیں رہتا۔ تو ۱۳۶۶ء میں ایک قانون نافذ کیا جس کا منشا یہ تھا کہ انگریزوں کے لئے آئرلینڈ والوں سے ازدواج کرنا، اُن کی زبان بولنا یا پوشاک پہننا جرم ہے۔

آئرلینڈ کو انگریزی حکومت کا دست نگر بنانے کے لئے ۱۴۹۴ء میں یہ قانون پاس ہوا کہ تمام انگریزی قوانین آئرلینڈ پر حاوی ہونگے، اور آئرش پارلیمنٹ میں کوئی قانون بلا منظوری شاہ انگلستان پیش نہ ہوسکے گا۔ ۱۷۲۰ء میں یہ بھی قانون پاس کردیا گیا کہ انگریزی پارلیمنٹ کو آئرلینڈ کے متعلق جملہ قوانین کے پاس کرنے کا حق ہے۔ آئرلینڈ کے انتظامی اختیارات ایک وائسرائے کے سپرد کردیے گئے جو آئرش پارلیمنٹ کے سامنے نہیں بلکہ شاہ انگلستان کے سامنے جوابدہ تھا۔ اس طرح آئینی طور سے آئرلینڈ سلطنت برطانیہ کا جزو بن گیا جس کے اوپر حکومت کرنے کا پورا اختیار برطانوی پارلیمنٹ کو تھا۔ لیکن واقعی طور پر پیل کے باہر اب بھی آئرش لوگوں ہی کی حکومت تھی۔

السٹر اس دوران میں آئرلینڈ کی پولٹیکل فضا میں انتہائی اثر ڈالنے والے مسئلہ کی بنیاد پڑ رہی تھی ہنری ہشتم شاہ انگلستان کے عہد حکومت (۱۵۰۹ء-۱۵۴۷ء) میں انگلستان نے پوپ سے رشتہ توڑ کر پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کیا۔ لیکن آئرلینڈ قدیمی کیتھولک مذہب پر ثابت قدم رہا۔ جو کشمکش یورپ میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک مذہب کی بنا پر ہوئی ہے اُس نے یورپ کی پالٹیکس میں کس قدر انقلابات پیدا کئے اس کا اندازہ یوروپین اقوام کی تاریخوں کے مطالعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس مذہبی اختلاف میں انگلینڈ اور آئرلینڈ کی پولٹیکل کشمکش کا سامان بھی موجود تھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد انگریزوں نے شمالی آئرلینڈ کو مغلوب کرنا شروع کردیا۔ ملکہ ایلزبتھ کے زمانہ میں انگلینڈ اور اسکاٹلینڈ سے جاجا کر لوگ آئرلینڈ میں آباد ہونے لگے جیمس اول کے زمانہ میں یہ سلسلہ زیادہ تیز ہوا۔ آئرلینڈ کے شرفاء اور امراء شاہ انگلستان کے تشدد سے تنگ آآکر براعظم کو بھاگنے لگے اور اُنکی جاگیریں ضبط ہو ہو کر انگلینڈ اور اسکاٹلینڈ سے آئے ہوئے پروٹسٹنٹوں کو دی جانے لگیں۔ یہ لوگ یہاں مستقل طور پر آباد ہوگئے۔ اس طرح شمالی آئرلینڈ میں ایک صوبہ ایسا بنگیا جسمیں رئیس اور زمیندار طبقہ زیادہ تر پروٹسٹنٹوں کا ہوگیا اور متوسط طبقہ کے لوگ بھی جو اپنے اپنے ہمسایوں اور رئیسوں کے ظلم نہ برداشت کرسکتے تھے رفتہ رفتہ جنوب کی طرف رجعت کرتے گئے۔ اور شمالی آئرلینڈ

کا یہ صوبہ "السٹر" کے نام سے ہمیشہ کے لیئے ایک خار بنکر کھڑا ہوگیا۔ انگریزوں کے اس برتاؤ نے آئرش قوم کے دلوں میں انتقام کے جذبات پیدا کردیے۔ اُن کے دلوں میں انگریزوں سے نفرت بھر گئی۔ چارلس اول کے زمانہ میں جبکہ پارلیمنٹ اور بادشاہ میں جنگ چھڑی ہوئی تھی آئرلینڈ نے بھی موقع غنیمت جانکر انگریزوں کے خلاف جہاد برپا کردیا۔ سیکڑوں انگریز تہ تیغ ہوئے۔ اور شہر ڈبلن کے علاوہ قریب قریب تمام آئرلینڈ میں انگریزی حکومت کو سخت نقصان پہونچا۔ جب کرامویل کا عروج ہوا وہ اس جرم کی سزا دینے کیلیئے آئرلینڈ پہونچا اور وہاں اس سختی سے پیش آیا کہ آئرلینڈ والے اس کو آج تک بھول نہ سکے ہونگے۔ ایک قتل عام سا جاری کردیا گیا۔ خون کی ندیاں بہہ نکلیں۔ وسیع جاگیریں مقامی زمینداروں سے چھین چھین کر انگریزی فوجی سرداروں کو دیدی گئیں۔ ان مصیبت زدہ لوگوں کو اپنا وطن چھوڑ دینا پڑا۔ اکثر امریکہ بھاگ گئے، کچھ مغرب کی طرف بڑھکر صوبہ کناٹ میں آباد ہوگئے۔ کاشتکاروں کو اپنے نئے زمینداروں کے جبر و تشدد کا سامنا کرنا پڑتا۔ غرضکہ ہر طبقہ پریشان تھا۔

گو آئرلینڈ عہد کرامویل کے بعد سر اُٹھانے کی ہمت نہ کرسکتا تھا لیکن بعد میں شاہان انگلستان کا کارویہ بہتر ہونے لگا۔ اس کی وجہ آئرلینڈ میں پروٹسٹنٹوں کی موجودگی تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ۱۷۲۰ء کے قانون سے انگریزی پارلیمنٹ نے اپنے لئے آئرلینڈ کے متعلق تمام اختیارات لیلیئے تھے۔ لیکن اب انگریزی حکومت نے اپنے زاویۂ نظر میں تبدیلی پیدا کرلی اور ۱۷۸۲ء میں آئرلینڈ کی پارلیمنٹ کو حسب مرضی قوانین بنانے کا اختیار دیدیا۔ مگر چونکہ وائسرائے اب بھی انگریزی کابینہ کا ممبر ہوتا تھا اس لئے عملی حکومت میں اس نئے قانون کا کوئی نمایاں اثر نہ ہوا۔ لیکن اصولاً ۱۷۸۲ء کا قانون آئرلینڈ کی پولیٹکل تاریخ میں ایک اہم واقعہ ہے۔

انگلینڈ اور آئرلینڈ کا اتحاد انقلاب فرانس نے مثل دیگر ممالک کے آئرلینڈ میں بھی مساوات اور آزادی کی روح پھونک دی۔ آزادی کی اس اُمنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۷۹۸ء میں ایک بار پھر بغاوت ہوگئی۔ اس ناکامیاب بغاوت کا یہ نتیجہ ہوا کہ انگریزی پارلیمنٹ نے ۱۸۰۰ء میں ایکٹ آف یونین پاس کیا۔ جزائر برطانیہ اور آئرلینڈ ایک متحدہ سلطنت ہوگئے۔ آئرش پارلیمنٹ توڑدی گئی، اور انگریزی دارالعوام میں سو ممبر اور دارالامراء میں اٹھائیس ممبر آئرلینڈ سے منتخب ہونا قرار پایا۔ غرضکہ آئرلینڈ اب پورے طور پر برطانیہ کا محتاج ہوگیا، صرف اس قدر اطمینان تھا کہ چند نمایندے اس کے بھی اس مجلس میں موجود رہا کریں گے جو حکومت کی پالیسی وضع کرتی تھی۔

مصائب کا زمانہ اس اتحاد کے مضر اثرات ظاہر ہونے لگے۔ درآمد پر جو محاصل آئرش پارلیمنٹ نے عائد

کر رکھے تھے فری ٹریڈ کے اصولوں کا شکار ہوئے۔ آئرلینڈ کے بازاروں میں انگریزی مال آکر فروخت ہونے لگا اور آئرش صنعت و حرفت کا نام و نشان مٹنے لگا۔ آئرلینڈ بھی ہندوستان کی طرح انگلینڈ کے تجار اور صناعوں کے لئے ایک مفید بازار بن گیا۔ آئرلینڈ والوں کی روزی کے ذرائع مفقود ہونے لگے۔ غریبوں کے لئے سوائے زمین کی پیداوار کے کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ امیروں کے لئے سوائے لگان کے کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا۔ غذا کافی مقدار میں نہ ملتی تھی۔ ۱۸۴۵ء کے اس قحط نے جو آلو کی فصل پر نازل ہوا آئرلینڈ کو تباہ کر دیا۔ آلو یہاں کی خاص پیداوار ہی نہیں بلکہ عوام کی خوراک کا ایک اہم جزو ہے۔ اس قحط کا شکار ہو کر لاکھوں آدمی مر گئے۔ اور ایک کثیر تعداد نے امریکہ میں پناہ لی۔ جو لوگ امریکہ گئے تھے ان کے سینہ میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور غصہ تھا۔ انگریزی سلطنت کا جھنڈا اُن کے دلوں میں غم و غصہ کا طوفان پیدا کرتا تھا۔ جو لوگ آئرلینڈ میں رہ گئے اُن کی قسمت کا خدا ہی مالک تھا۔ پروٹسٹنٹ رؤسا ان کو اپنے کھیتوں سے بیدھڑک بیدخل کر دیتے تھے۔ پارلیمنٹری انتخاب کے موقعوں پر سوائے اسکے کہ پروٹسٹنٹ زمینداروں کے حق میں ووٹ دیں اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کیتھولک والوں میں سے نہ کوئی پارلیمنٹ کا ممبر ہو سکتا تھا نہ کوئی جج کی کرسی پر متمکن ہو سکتا تھا۔ میونسپلٹی کی ممبری تک ان کے لئے ممنوع تھی۔ غرضیکہ یہ جماعت اپنے ہی ملک میں ایک کمتر اور بے عزت جماعت بن گئی۔

آئینی جدوجہد کی ابتدا بالآخر وطن پرستی اور خودداری کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ اہل دل ملکی ترقی کی تدابیر سوچنے لگے، اور رفتہ رفتہ یہ جدوجہد زمیندار اور کاشتکاروں کی کشمکش کی صورت میں نمودار ہو گئی۔ کاشتکاروں کا طبقہ اور ان کے معاونین قوانین اراضی میں اصلاحات کا مطالبہ کرنے لگے۔ کاشت کی مقررہ میعاد لگان میں غیر مناسب اضافہ کی موقوفی اور کاشتکاروں کو اپنی کاشت کے منتقل کرنے کا حق اُن کے مطالبات تھے۔ ان مطالبات میں برطانوی گورنمنٹ کی مخالفت کی جھلک تھی، اور اس جدوجہد کا پہلا رہنما ڈانیال او کانیل تھا۔ پارلیمنٹ میں اس نے ایک ہوم رول پارٹی بنائی جس کا نصب العین آئینی جدوجہد تھا۔ پارلیمنٹ کے پلیٹ فارم سے آئرش اصلاحات کا حاصل کرنا اس کا مدعا تھا۔ آئزک بٹ بھی اس پارٹی کا ایک سرغنہ تھا جس نے ۱۸۷۴ء میں آئرش ہوم رول بل پارلیمنٹ میں پیش کیا تھا لیکن جب رائے لینے کا موقعہ آیا تب اس بل کی تائید میں تمام دارالعوام میں صرف آٹھ ممبروں نے ہاتھ اُٹھایا۔ چارلس اسٹوارٹ پارنل اس پارٹی کا مشہور لیڈر گذرا ہے۔ اسکی پارلیمنٹری قابلیت نے انگریزی مدبرین سے بھی خراج تحسین وصول کیا۔ اس نے پارلیمنٹ کے کام میں دقتیں پیدا کر کے اصلاحات حاصل کرنا اپنا نصب العین

قرار دیا۔ آئرش ممبروں کی وہ پارٹی جو اس کے ساتھ تھی ہمیشہ اس کے ساتھ ووٹ دیتی اور اس کی انگلی کے اشاروں پر کام کرتی تھی۔ چنانچہ اس پارٹی نے انگریزی پالیٹکس میں بھی ایک خاص اہمیت حاصل کرلی۔ لبرل اور کنسرویٹو جماعت خود اپنی ہستی کے لئے اس پارٹی کا سہارا ڈھونڈھنے لگے۔ جس جماعت کو یہ پارٹی مدد دیتی اسی کی کثرت ہونے کی وجہ سے حکومت کی باگ پر قبضہ کرسکتی تھی۔ اور اس امداد کے صلہ میں آئرلینڈ کے جذبات کے ساتھ رواداری کا سلوک اپنا فرض سمجھتی تھی۔ پارلیمنٹری پارٹی کا یہ حال تھا مگر اس کے علاوہ بھی لوگ تھے جو انگلینڈ سے بزور شمشیر سمجھوتہ کرنے پر آمادہ تھے۔ فینئن سوسائٹی اس آخرالذکر جماعت کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اسی کی ایک شاخ امریکہ میں بھی قائم تھی جہاں کہ ہم دیکھ چکے ہیں ایک کثیر تعداد آئرلینڈ والوں کی آباد ہو چکی تھی جو برطانوی حکومت سے انتہائی نفرت رکھتے تھے۔ اس جماعت کا مقولہ تھا کہ انگریزوں کو کوئی دلیل بجز قوت کی دلیل کے اپیل نہیں کرتی۔ اور آئرلینڈ کو اپنے حصول مقاصد کے لئے انگلینڈ کی مشکلات کا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اس جماعت نے چند ناکام کوششیں کیں۔ بالآخر ۱۸۷۹ء میں مائیکل ڈیوٹ نے ایک لینڈ لیگ قائم کی جس کی رہنمائی بالآخر پارنل نے قبول کرلی۔ آئرلینڈ میں اراضی کے قوانین و قواعد کی اصلاح اس لیگ کا مقصد تھا۔ اور جو لوگ اس لیگ کے بنائے ہوئے پروگرام کو نہ مانتے ان سے قطع تعلق کرلیا جاتا۔ لوگ اس کو ہر قسم کی مدد دینے سے گریز کرتے۔ اس کی ملازمت ترک کردیتے۔ اس کا کوئی کام مثلاً کاشتکاری اور معمولی خدمتگاری وغیرہ انجام پانا غیر ممکن ہو جاتا۔ سب سے پہلا شخص جو اس لیگ کے حملوں کا شکار ہوا کیپٹن بائکاٹ تھا۔ لیگ کے حکم کے مطابق یہ شخص کاشتکاروں کے لگان میں کمی کرنے پر تیار نہ ہوا لیگ سے مڈبھیڑ ہوئی۔ ملازموں نے ملازمت چھوڑ دی۔ وارنٹ قرقی کی تعمیل کے لئے چپراسی میسر نہ ہوئے۔ کھیتوں کی فصل کاٹنے والے دستیاب نہ ہوئے۔ غلہ گھر تک لانا محال ہوگیا۔ بالآخر حضرت بائکاٹ کو اپنا نام ایک بڑی پولٹیکل تحریک کو ہمیشہ کے لئے دیکر بھاگتے ہی بن پڑا۔ اس پولٹیکل طرز عمل کا نام "بائیکاٹ" آپ ہی کی ذات کا نتیجہ ہے۔ اس لیگ کے کارنامے رفتہ رفتہ پریشان کن ثابت ہونے لگے اور گورنمنٹ نے ایسے اختیارات حاصل کئے کہ بلا مقدمہ چلائے کسی شخص کو گرفتار کرلے اور کسی مدت تک مقید رکھے۔ پارنل اور دیگر بہت سے لوگ گرفتار کئے گئے اور لینڈ لیگ کا خاتمہ کردیا گیا لیکن باوجود اس تشدد آمیز پالیسی کے جدوجہد بند نہیں ہوئی۔ بالآخر پارنل اور گورنمنٹ کے درمیان اس شرط پر صلح ہوئی کہ پارنل اور ان کے دوستوں کو رہا کردیئے جائیں اور گورنمنٹ کے بقایا لگان کے مسئلہ کا مناسب حل تجویز کرنے پر یہ لوگ عدم ادائی لگان کی جدوجہد بند کردیں۔

پارنل اس دوران میں اپنے ایک دوست کی بیوی کے ساتھ ناجائز تعلقات کے سلسلہ میں بہت بدنام ہوا اور اس کی پولیٹیکل لیڈری ماند پڑ گئی۔ پارنل نے ۱۸۹۱ء میں وفات پائی، اور پارلیمنٹری جماعت کی آخری رہنمائی کا سہرا جان ریڈمنڈ کے سر باندھا گیا۔ لینڈ لیگ کو ختم کر دی گئی تھی، اور انتہا پسند جماعت کا ظاہرا جوش و خروش کسی قدر ٹھنڈا پڑتا معلوم ہوتا تھا لیکن اس سرگرم ایجی ٹیشن نے برطانوی مدبرین حکومت کے دلوں میں ہلچل مچا دی تھی۔ چنانچہ مسٹر گلیڈاسٹن وزیر اعظم برطانیہ نے ۱۸۸۶ء میں ایک آئرش ہوم رول بل پارلیمنٹ میں پیش کیا جسکا منشا آئرلینڈ میں پارلیمنٹ قائم کرنا تھا جس کے سامنے آئرلینڈ کی وزارت جوابدہ ہو، لیکن بیرونی محاصل کے عاید کرنے کا اختیار حکومت برطانیہ کو تھا۔ انگلستان میں اس بل کی حمایت کی فضا پیدا نہیں ہوتی تھی۔ السٹر نے بھی اس کی مخالفت کی اور بل پاس نہ ہو سکا۔ گلیڈاسٹن کی وزارت بھی ختم ہو گئی۔ جب جدید انتخاب پر گلیڈاسٹن پھر وزیر اعظم مقرر ہوئے انھوں نے دوبارہ آئرش ہوم رول بل پیش کیا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ آئرلینڈ کو برطانوی دارالعوام میں بھی نمایندگی دیگئی۔ لیکن آئرلینڈ کے نمایندوں کو دارالعوام میں صرف انھیں مسائل پر ووٹ دینے کا حق تھا جو آئرلینڈ کے متعلق ہوں۔ دارالعوام سے یہ بل پاس ہو گیا لیکن دارالامرا نے نامنظور کر دیا۔

۱۹۱۱ء میں دارالامرا کے اختیارات میں کمی ہو گئی۔ اب بلا لحاظ دارالامرا کی رائے کے اگر تین متواتر اجلاسوں میں کوئی قانون دارالعوام پاس کر دے تو وہ نفاذ پا سکتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں آئرش ہوم رول بل تیسری مرتبہ پارلیمنٹ میں پیش ہو کر منظور ہوا اور آخری مرتبہ ستمبر ۱۹۱۴ء میں دارالعوام سے منظور ہو کر اس نے قانون کی حیثیت اختیار کر لی۔ لیکن اسی سال عالمگیر جنگ یورپ کی ابتدا ہو جانے کی وجہ سے۔ نیز السٹر کی پرزور مخالفت کی وجہ سے یہ مناسب سمجھا گیا کہ اسکا نفاذ جنگ کے خاتمہ تک روک دیا جائے۔

انتہا پسند پارٹی

پارلیمنٹری پلیٹ فارم پر آئرلینڈ کیلئے اصلاحات کا مختصر نقشہ اوپر لکھے ہوئے مضمون سے ظاہر ہے۔ لیکن دوسری پارٹی خاموش نہ تھی جس کا مقولہ تھا کہ انگلینڈ کو معقول کرنے کے لئے قوت کی دلیل بہترین ہوا کرتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ وسط انیسویں صدی ہی میں فینین سوسائٹی قائم ہو چکی تھی اس کے ارکان یکے بعد دیگرے جیل خانوں کی سیر کرتے تھے۔ جو رہ جاتے وہ اپنا کام چھپ چھپ کر کرتے اور نوجوانوں میں حمیت قومی اور حب وطن کا جوش پیدا کرتے رہتے تھے۔ آرتھر گرفتھ اس جماعت کا سرگرم رکن تھا۔ وہ انجمن "گیلک لیگ" کا ممبر ہوا جس کا

جس کا منشا یہ تھا کہ آئرلینڈ کی مادری زبان کو ترقی دی جائے "کیلٹک لٹریری سوسائٹی" کا بھی وہ سرگرم رکن تھا۔ "آئرش ریپبلکن برادرہوڈ" بھی جس کا منشا آئرلینڈ میں جمہوری حکومت قائم کرنا تھا ایک با اثر جماعت تھی اور آرتھر گرفتھ اس کا بھی سرگرم ممبر تھا گرفتھ نے سنہ ۱۹۰۹ع میں ایک اخبار نکالنا شروع کیا۔ اور ریپبلکن برادرہوڈ سے مستعفی ہوکر اپنا نصب العین یہ قرار دیا کہ انگلستان اور آئرلینڈ دونوں کی علحدہ علحدہ پارلیمنٹیں ہوں اور تاج برطانیہ کے ماتحت دونوں ملک مساوی الاختیار ہوں اس قسم کی آزادی حاصل کرنے کیلئے جو طریقہ اس نے بتلایا تھا وہ وہی تھا جس پر بعد میں آئرلینڈ نے عمل کر کے آزادی حاصل کی۔ گرفتھ نے اس پالیسی کا اعلان اس سوسائٹی کے جلسہ میں کیا تھا جسکا نام "گیلس کی سوسائٹی" تھا۔ لیکن جو نام عام طور پر اس سوسائٹی کا رایج ہوا وہ "شن فین" تھا۔ آئرلینڈ کی مادری زبان میں "شن فین" کے لفظی معنی ہیں "صرف ہمارے لئے"۔ گرفتھ کا مقولہ تھا کہ آئرلینڈ کو آزادی محض آئرلینڈ والوں کی متحدہ کوششوں سے مل سکتی ہے۔ یہ کوشش مخالفت مجہول کے طریقہ پر عمل میں آئیگی۔ محاصل اور لگان کا دینا بند کیا جائے، انتظامات حکومت رفتہ رفتہ اپنے ہاتھ میں لے لیے جائیں۔ حکومت کی مشین سے نہ صرف کام نہ لیا جاوے بلکہ اس کو بیکار کر دیا جائے۔ گرفتھ گو اسلحہ کے استعمال کے خلاف نہ تھا لیکن وہ اسے علی پالیٹکس کے دائرہ سے باہر سمجھتا تھا۔ اس جماعت کا دوسرا سرگرم ممبر ٹامس کلارک تھا جو فینین ہونے کے جرم میں بیس سال کی قید سخت کاٹ کر سنہ ۱۹۰۹ع میں رہا ہوا تھا۔ اس نے ڈبلن میں ایک دوکان کر لی تھی لیکن اس کے دل میں وطنیت کا جوش لہریں مارتا تھا۔ نوجوان لوگ اس کے گرد و پیش جمع ہوتے اور وہ ان کو وطن پر مرمٹنے کی تلقین کرتا تھا۔ میکڈرماٹ بھی ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دورہ لگاتا اور قومی لڑائی کے لئے والنٹیر بھرتی کرتا رہتا تھا۔ اسی طرح اس جماعت کو دیگر مستعد اور سرگرم کارکنان کا فخر حاصل تھا جن میں خاص طور پر قابل ذکر جان میکسل جیمس لارکن اور جیمس کنولی ہیں۔ سنہ ۱۹۱۲ع میں جب ہوم رول بل دار العوام میں پیش تھا اس وقت آلسٹر کے صوبہ نے اس کی مخالفت میں اپنی آواز بلند کی۔ یہ صوبہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں زیادہ تر پروٹسٹنٹوں کا ہے اور اس میں رؤسا و امرا کی ہستی کی بنیاد آئرلینڈ کے قدیم امرا کی جائدادوں کی ضبطی پر قائم ہے۔ چنانچہ بقیہ آئرلینڈ سے اس کو کوئی ہمدردی نہیں ہے اور اس کو آئرلینڈ کے قومی لیڈروں کے زیر حکومت رہنا اسی قدر نفرت آمیز ہے جتنا کہ کسی دیگر قوم کے ماتحت ہو کر رہنا۔ غرضکہ ہوم رول بل ان کے لئے موت و زندگی کا سوال ہو گیا۔ ان کو انگریزی پارلیمنٹ کی حکومت پسند تھی لیکن ڈبلن پارلیمنٹ ان کے لئے حقارت آمیز تھی۔ انھوں نے ہوم رول بل کے خلاف ایک

زبردست ایجی ٹیشن کا آغاز سر ایڈورڈ کارسن کی رہنمائی میں کیا۔ اور یہاں تک دھمکی دی کہ جس روز ڈبلن میں پارلیمنٹ قائم ہوگی اس روز سے شہنشاہ جارج ہمارے بادشاہ کہلانے کے مستحق نہ ہونگے۔ السٹر والوں نے ہوم رول بل کی مخالفت میں والنٹیر بھرتی کرنے اور کھلم کھلا جنگ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ السٹر کی روش نے فدایان وطن کی آنکھیں کھول دیں۔ ان لوگوں نے خیال کیا کہ اگر پارلیمنٹ کے پاس کئے ہوئے قانون کی مخالفت میں والنٹیر بھرتی کرنا اور اسلحہ فراہم کرنا جرم نہیں ہے تو اس کی حمایت میں ایسا کرنا کب ممنوع ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہوم رول ایکٹ کے تحفظ کے لئے اس جماعت نے بھی والنٹیر بھرتی کرنا شروع کر دئے۔ ہزاروں نوجوانوں نے اپنے نام درج کرائے۔ سن فین پارٹی کا ستارہ بلند ہونے لگا۔ گو بظاہر یہ بھی ہوم رول ایکٹ کی حمایت میں تھی لیکن حقیقتاً اس جماعت کے لئے یہ ایک موقعہ غنیمت تھا کہ وہ کھلے میدان میں آکر فوجی قواعد سیکھے اور آنے والی بغاوت کے لئے تیار ہو سکے۔

جان رڈمنڈ نے جو پارلیمنٹری پارٹی کا سرغنہ تھا، اس جماعت میں اپنے لئے نمایندگی حاصل کر لی لیکن کارکن جماعت کی منظوری کے بغیر اس نے والنٹیروں کی جماعت کی طرف سے جنگ یورپ میں برطانیہ کی امداد کا وعدہ کر لیا۔ چنانچہ والنٹیروں کی جماعت دو پارٹیوں میں منقسم ہوگئی، ایک ریڈمنڈ کی رہنمائی میں برطانیہ کی اعانت پر آمادہ تھی، دوسری انگلینڈ کی مشکلات سے اپنی مطلب برآری کرنا چاہتی تھی۔

۱۹۱۶ء کی بغاوت السٹر میں ۱۹۱۶ء میں والنٹیروں کی انتہا پسند پارٹی نے ایک شورش برپا کر دی جرمنی نے امداد کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن جو جہاز اسلحہ سے بھر کر آئرلینڈ کی اعانت کے لئے وہاں سے بھیجا گیا تھا وہ گرفتار ہو گیا اور سر راجر کیسمنٹ کو جو اس کے انچارج تھے بالآخر پھانسی دی گئی۔ ٹامس کلارک میکڈرماٹ جیمس کنولی وغیرہ لیڈروں کو پھانسی دی گئی۔ مائیکل کالنس اور آرتھر گرفتھ قید خانہ میں ڈال دیے گئے۔ آئرلینڈ کے موجودہ رہنمائے قوم یعنی ڈی ویلیرا بھی باغی فوج کی رجمنٹ کے سرگروہ تھے۔ آپ کو سزائے موت دی گئی لیکن بعد میں یہ سزا قید میں تبدیل کر دی گئی۔ صدہا آدمی محض شک پر گرفتار کر کے جیل خانوں میں ڈال دیے گئے۔ مارشل لا جاری کر دیا گیا۔ اس وقت تک آئرلینڈ میں گو انگلینڈ سے نفرت بھری ہوئی تھی مگر ملک اس حد تک تیار نہ تھا کہ اس کے خلاف مسلح جنگ کرنے پر آمادہ ہو جائے لیکن ۱۹۱۶ء کی بغاوت فرو کرنے میں جس سختی کا برتاؤ آئرلینڈ کے ساتھ کیا گیا۔ اس نے سلگتی ہوئی آگ کو ایک دم بھڑکا دیا۔ جن گوشوں میں بغاوت کی گرد بھی نہ پہونچی تھی وہاں بھی ایسی فضا تیار ہو گئی جو

آنیوالے انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

فوج میں بھرتی کا قانون جنگ یورپ سرگرمی کے ساتھ جاری تھی۔ حکومت برطانیہ کو ہر کس وناکس کی امداد کی ضرورت تھی، وہ یہ محسوس کرتی تھی کہ رعایا کو رضامند رکھکر اس مہم میں زیادہ کامیاب ہوسکتی ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ جبر و تشدد سے کام لیا جائے۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں عام معافی کا اعلان کیا گیا اور قیدی چھوٹ چھوٹ کر اپنے وطن کو واپس آئے لیکن کچھ نئے جوش وخروش کے ساتھ جیل خانہ کی آب وہوا نے ان کے دلوں میں ایک تازہ جوش پیدا کردیا تھا۔ ان کو اپنی طاقت پر پہلے سے کہیں زیادہ بھروسہ ہوگیا تھا۔ پارلیمنٹری پارٹی کا اثر زائل ہوچکا تھا، شن فین پارٹی اب اہل وطن میں ہر لعزیز ہونے لگی تھی۔ گورنمنٹ کی فوج میں بھرتی کی پالیسی نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ نے پارلیمنٹ میں یہ تجویز پیش کی کہ فوجی بھرتی کا قانون آئرلینڈ پر بھی عاید کردیا جائے۔ آئرلینڈ نے متفقہ آواز سے اس کی مخالفت کی۔ ڈبلن کے لارڈ میئر نے ایک کانفرنس کو مدعو کیا جسمیں آئرلینڈ کی تمام پولٹیکل پارٹیوں نے حصہ لیا۔ ڈی ویلیرا نے بھی شن فین پارٹی کی حیثیت سے شرکت کی۔ آپ کی صفائے قلب، سچائی اور دانشمندی نے تمام کانفرنس پر ایک سکہ سا جمالیا۔ اہل وطن کے لئے ایک عہدنامہ مرتب کیا گیا جس کے الفاظ کی ترتیب مسٹر ڈی ویلیرا کی دی ہوئی تھی۔ یہ طے ہوا کہ آئندہ اتوار کے روز یہ عہدنامہ ہر گرجا گھر میں ہر شخص اپنی زبان سے دہراوے۔ پادریوں کے جلسہ نے بھی اس عہدنامہ کو منظور کرلیا، چنانچہ بھرتی کے قانون کی مخالفت آئرلینڈ کی تمام پارٹیوں کا نصب العین ہوگیا۔ بھرتی کے قانون کی مخالفت کے لئے ملک اس قدر تیار تھا کہ جب فیلڈ مارشل فرنچ نے آئرلینڈ کے ایک ہوٹل میں کسی سے پوچھا کہ بھرتی کے بارے میں ملک کی کیا حالت ہے تو اس نے جواب دیا کہ "حضور ہم لوگ ستر آدمی اس مکان میں ہیں۔ ہم لوگوں نے اپنے آپ کو ایشور کی مرضی پر چھوڑ دیا ہے۔ آپ ہماری لاشیں لے سکتے ہیں لیکن آپ ہم سے اور کوئی امید نہ رکھیں"

آخری جدوجہد خوش قسمتی سے ان واقعات کے دوران ہی میں جنگ کا خاتمہ ہوگیا، اور ۱۹۱۸ء میں عام انتخابات ہونے لگے۔ شن فین پارٹی نے اپنے امیدوار اس الکشن میں کھڑے کئے۔ اور انگلینڈ سے پوری علیحدگی کے اعلان سے انھوں نے الکشن میں حصہ لیا۔ آئرلینڈ کی ایکسو چھ ۱۰۶ نشستوں میں سے تہتر ۷۳ ممبر شن فین جماعت کے منتخب ہوئے۔ اس پارٹی کی عام مقبولیت کا اندازہ الکشن کی اس کامیابی سے کیا جاسکتا ہے۔ ان تہتر ۷۳ ممبروں نے بجائے پارلیمنٹ میں شریک ہونے کے اپنی علیحدہ پارلیمنٹ ڈیل کے نام سے منعقد کی اور بجائے ویسٹ منسٹر جانے کے شہر ڈبلن میں اس کا اجلاس منعقد کیا۔ ڈیل نے خود مختاری

کا اعلان کردیا، وزرا منتخب کئے اور ایک باقاعدہ گورنمنٹ قائم کرلی۔ اس کے خفیہ اجلاس ہونے لگے جب ایک ممبر گرفتار ہوجاتا تو دوسرا اُس کی جگہ پر کام کرنے لگتا۔ ڈیل نے چار لاکھ پاؤنڈ کے قرضہ کا اعلان کیا، اور باوجود خلاف قانون قرار دیے جانے کے وہ قرضہ وصول ہوگیا۔ گورنمنٹ اپنی بھرپور کوشش ڈیل کو توڑنے اور اس کی کارروائیوں کو خاک میں ملانے کے لئے کرنے لگی۔ اور ڈیل اپنی ساری قوت صرف اپنی ہستی کو قائم کرنے میں نہیں بلکہ برطانوی قوت کی جڑ کاٹنے میں صرف کرنے لگی۔ گرفتھ اور کالنس کا قول تھا کہ انگریزی پولیس کے سپاہی برطانوی حکومت کے آنکھ اور کان ہیں، انھیں کے ذریعہ سے ہماری کارروائیوں کو وہ دیکھتے اور ہمارے حالات سنتے ہیں۔ چنانچہ اس کا خاتمہ کرنے سے حکومت کی مشین بیکار ہوجائیگی۔ قومی والنٹیر پولیس والوں کو چُن چُن کر نشانۂ اجل بنانے لگے۔ گورنمنٹ انتقام لینے کی غرض سے پولیس اور فوج سے نہ صرف والنٹیروں ہی پر بلکہ امن پسند باشندوں پر بے انتہا ظلم کراتی تھی۔ ایک باقاعدہ جنگ جاری ہوگئی۔ حکومت نے پولیس اور موجودہ فوج کو کافی نہ سمجھ کر جنگ یورپ سے واپس شدہ پنشن یافتہ سپاہیوں کی ایک کثیر تعداد آئرلینڈ کو زیر کرنے کے لئے بھرتی کی۔ یہ لوگ اپنی پوشاک کے رنگ کی وجہ سے "بلیک اینڈ ٹینس" کہلاتے تھے۔ بے رحمی میں ان کا ہم پلہ ہونا ناممکن تھا۔ موقعہ و بے موقعہ امن پسند باشندوں کے مکانات پر چھاپہ مارتے اور بیگناہوں پر جبر و تشدد کرتے تھے۔ سیکڑوں آدمی ان کی گولیوں کا نشانہ ہوگئے۔ ہزاروں کے مال و اسباب لوٹ لئے گئے۔ مٹی کا تیل چھڑک کر مکانوں میں آگ لگا دیتے اور ان سے نکلتے ہوئے بچوں بڈھوں عورتوں کو جان بچانے کی غرض سے بھاگتے ہوئے دیکھکر مضحکہ اُڑاتے تھے۔ نہتے آدمی قتل کر دیے جاتے تھے، سر بازار کوڑے لگائے جاتے تھے مجمع پر گولی چلانا معمولی بات تھی۔ مگر وطن پرستوں نے بھی ایک بے مثل نظام قائم کیا تھا۔ حکومت کی کارروائیوں کو معلوم کرنے اور جوابی کارروائیوں کے اجراء اور سہولت کے لئے انھوں نے ایسی مکمل خفیہ پولیس بنائی تھی جس کے حسن انتظام نے سرکاری افسروں کو حیرت میں ڈال رکھا تھا۔ جملہ سرکاری احکام کی ان کو اطلاع رہتی تھی، افسروں کے تبادلے، سرکاری فوج کی نقل و حرکت اور پولیس کی تمام بندشوں سے ان کو ایسی مکمل آگاہی ہوتی تھی کہ گویا سرکاری دفتر ان کے گھروں میں ہے۔ جب کسی فوج کے دستہ کی کسی خاص سڑک سے آنے کی خبر معلوم ہوتی تو فوراً سڑک کے پُل بارود سے اُڑا دیے جاتے اور راستے مسدود کر دیے جاتے۔ دن میں سرکاری مسلح لاریوں کا چلنا محال ہوگیا تھا۔ سرکاری افسروں کے لئے کھلی سڑکوں پر گذرنا خطرناک تھا۔ یہ کارگذاریاں تھیں ان فدائیان وطن کی جو اپنے آپ کو گولی اور جیل سے بچا سکتے تھے۔ مگر جیل جانے والوں میں بھی سیکڑوں ہزاروں

آدمی تھے جن سب کا سرغنہ خود ڈی ویلیرا تھا جس وقت حکومت نے بھرتی کے قانون کی مخالفت پر تشدد کی پالیسی جاری کی سب سے پہلے ڈی ویلیرا۔ آرتھر گرفتھ اور پلنکٹ وغیرہ شن فین لیڈروں ہی کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا تھا۔ سنہ ۱۹۱۸ء کے عام انتخابات کے بعد غیر قانونی ڈیل نے اپنے پہلے جلسہ منعقدہ ۲۱۔ جنوری سنہ ۱۹۱۹ء میں ڈی ویلیرا کو پریسیڈنٹ اور آرتھر گرفتھ کو وائس پریسیڈنٹ منتخب کیا حالانکہ یہ دونوں جیل میں قیدیوں کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ قیدیوں کی رہائی کے لئے سیکڑوں پبلک جلسے ہوئے لیکن گورنمنٹ ٹس سے مس نہ ہوئی، بالآخر ڈی ویلیرا کے ایما پر ایک ایسا پلاٹ تیار کیا گیا کہ ڈی ویلیرا ۳۔ فروری سنہ ۱۹۱۹ء کو جیل سے بھاگ نکلا۔ عمال حکومت نے لاکھ پتہ لگانے کی کوشش کی لیکن باوجود دنیا کی بہترین خفیہ پولیس رکھتے ہوئے ڈی ویلیرا کا سراغ نہ لگا سکے۔ اس دوران میں ڈی ویلیرا دیگر شن فین لیڈروں سے ملتا۔ ان کو مشورے دیتا تھا کہ امریکن اور فرانسیسی اخباروں کے نمایندوں سے ملاقات کرتا رہا۔ مگر کسی کو یہ خبر نہ ہوئی کہ ڈی ویلیرا کہاں ہے۔ چند روز کے بعد ہی جب حکومت نے دوسرے قیدیوں کو بھی رہا کر دیا، تو ڈی ویلیرا کھلے میدان نکلنے اور پلیٹ فارموں پر تقریریں کرنے لگا۔ جب جنگ یورپ کے بعد صلح کانفرنس ہو رہی تھی تو ڈی ویلیرا اس کوشش میں تھا کہ آئرلینڈ کے خود مختار نمایندے اس میں شریک ہوں۔ طول طویل خط و کتابت ہوتی رہی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ جون سنہ ۱۹۱۹ء میں ڈی ویلیرا نے یک بیک آئرلینڈ سے غائب ہو کر ایک بار پھر عمال حکومت کو حیرت میں ڈال دیا۔ بالآخر جب امریکہ کے نیویارک شہر سے ڈی ویلیرا کی تشریف آوری کی خبر مشہور ہوئی تب یہ گتھی کھلی۔ امریکہ میں ڈی ویلیرا نے آئرلینڈ کے لئے کثیر رقمیں جمع کیں اور صدہا تقریریں کر کے امریکن پبلک کو اپنے مشن کے محاسن کا یقین دلایا۔ جس زمانہ میں ڈی ویلیرا امریکہ میں تھا اس وقت آئرش پبلک پر سرکاری تشدد زوروں سے ہو رہا تھا کوئی متنفس گرفتاری اور جیل کے خوف سے مطمئن نہ ہو سکتا تھا۔ کارک کے لارڈ میئر ٹرنس میکسوینی نے اپنی بیجا گرفتاری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے جیل کے اندر فاقہ سے گھل گھل کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ جس وقت میکسوینی وطن کے لئے اس انتہائی قربانی میں مصروف تھا عوام الناس کی نگاہیں ہر سمت سے اس جیل خانہ کی طرف پڑتیں۔ اور خدائے پاک کی طرف رجوع ہو کر آئرلینڈ کی آزادی کی ملتجی ہوتی تھیں۔ ڈی ویلیرا نے امریکہ سے جو پیغام اس بہادر فنافی القوم کے دلیرانہ فعل پر بھیجا تھا اس کے ایک فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈی ویلیرا کے دل میں آزادی وطن پر شہید ہونے کا کتنا گہرا جوش تھا۔

"ہم اپنے ملک کے لئے اپنی زندگی وقف کرتے ہیں، اور آپ کا مرنا بیکار نہ ہونے دیں گے"

جب سختیاں حد سے تجاوز کرنے لگیں اور ڈی ویلرا نے دیکھا کہ اب ان کی موجودگی آئرلینڈ میں ضروری ہے، وہ اسی طور سے خفیہ آئرلینڈ واپس آیا جس طرح کہ وہاں سے نکلا تھا۔ اس کے پہلے برطانوی گورنمنٹ نے آئرلینڈ کو راضی کرنے کے لئے ۱۹۲۰ء کا ہوم رول ایکٹ بھی پاس کر دیا تھا جس کے بموجب السٹر کے چھ ضلعوں کی ایک پارلیمنٹ اور بقیہ آئرلینڈ کی دوسری پارلیمنٹ ہونا قرار پائی تھی۔ ہر دو پارلیمنٹوں سے منتخب ہو کر چالیس ممبروں کی ایک فیڈرل کونسل ان اختیارات کو عمل میں لاسکتی تھی جو دونوں پارلیمنٹیں باتفاق رائے اس کے سپرد کریں۔ مگر محکمہ افواج اور امورات خارجیہ اب بھی برطانوی گورنمنٹ ہی کے ہاتھ میں تھے۔ السٹر نے اس قانون کے مطابق عملدرآمد شروع کر دیا اور اپنی پارلیمنٹ بنائی۔ لیکن جنوبی آئرلینڈ اب بھی اپنی ریپبلکن پارلیمنٹ ڈیل ہی کی حکومت کو مانتا رہا۔ ان باتوں نے برطانوی حکومت کو مزید سختی پر آمادہ کیا اور جو طریقے آئرش ڈیل کی کارروائیوں کے بند کرنے کے لئے اوپر بیان کئے گئے ہیں استعمال میں آتے رہے۔

"بلیک اینڈ ٹینس" کے سیاہ کارناموں نے بالآخر مہذب دنیا کی توجہ اپنی طرف کھینچنا شروع کی مختلف سوسائٹیوں، انجمنوں اور اخباروں کے نمایندے اور کمیشن آئرلینڈ کی اصلی حالت کی تحقیقات کرنے کے لئے جانے اور اپنے تجربات اور مشاہدات اخباروں میں شائع کرنے لگے۔ ان میں سے ایک کمیشن کا اقتباس حسب ذیل ہے:-

"برطانوی حکومت آئرلینڈ کی اسّی فیصدی آبادی پر قائم نہیں ہے۔ ماڈریٹ لوگ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جو کچھ بھی حفاظت ان کو حاصل ہے وہ شن فین کی پالیسی کی بدولت ہے۔ امن صرف ان علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ جہاں سے انگریزی فوج اور پولیس ہٹالی گئی ہے"

ان تحقیقاتی کمیٹیوں کی رائے میں آئرلینڈ میں حکومت کے کارنامے تہذیب کے دائرے سے گذر چکے تھے۔ اور شن فین کی طاقت کو توڑنا ایک امر محال ہو گیا تھا۔ ملک کی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے ان کمیشنوں کا بیان تھا کہ شن فین پارٹی کا اثر زائل کرنے کے لئے صرف ایک ہی ترکیب ممکن ہے کہ ملک بھر میں قتل عام کا حکم دیدیا جائے۔ جب مہذب دنیا کے سامنے انگلینڈ کے کارنامے ان شکلوں میں پیش ہونے لگے اور انگلینڈ کو آئرلینڈ کی قوت برداشت اور طاقت مقابلہ کا یقین ہو گیا تب صلح جوئی کا رجحان پیدا ہوا۔ جون ۱۹۲۱ء میں مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ نے مسٹر ڈی ویلرا کو گفتگوئے صلح کے لئے لندن میں دعوت دی جس کے لئے صرف پانچ سال قبل بغاوت کے الزام میں انھوں نے

سزائے موت کا حکم صادر کیا تھا۔ ۱۱۔جولائی ۱۹۲۱ء کو التوائے جنگ کا عارضی عہدنامہ ہوگیا۔ صلح کی گفتگو نے کئی بار کروٹیں بدلیں۔ اکثر جنگ کی دوبارہ چھیڑ چھاڑ کا گمان ہوتا تھا۔ بالآخر آرتھر گرفتھ اور کالنس کی سرکردگی میں جو صلحنامہ آئرلینڈ نے انگلستان کے ساتھ کیا اس کی بنا پر ۱۶۔جنوری ۱۹۲۲ء کو ڈبلن کا قلعہ پھر آئرلینڈ کو واپس ملا جو گذشتہ سات صدیوں سے انگلینڈ کی آئرش حکومت کا مرکز بنا ہوا تھا۔

افکار ٹیگور

(۱) تیرا بیان سادہ ہے، اے میرے مالک مگر ان کا نہیں، جو تیرے مداح ہیں۔

میں تیرے ستاروں کی صدا اور درختوں کے سکوت سے آشنا ہوں۔

مجھے معلوم ہے کہ میرا دل ایک خوشنما پھول کے مانند کھل جائیگا اور میری حیات کسی چشمۂ حیواں پر لبریز ہو چکی ہے

تیرے پُرکیف اور وجد آفریں نغمات میرے کاشانۂ دل میں طائران خوش الحان کی طرح سکونت پذیر ہوا چاہتے ہیں

.......اور میں ایک موسم خوشگوار کے انتظار میں ہوں۔!

(۲) رات تاریک ہے، اور تو نیند کی گہرائیوں میں غرق! جاگ اے دردِ محبت، کیونکہ میں تیرا دروازہ کھولنے سے عاجز ہوں۔ اور باہر کھڑی ہوں۔

"وقت انتظار میں ہے، ستارے چشم براہ، ہوا ساکن اور سکوت میرے دل پر حاوی ہے۔

اُٹھ! اے محبت کی دیوی! اُٹھ!! مجھ بھکارن کی جھولی بھر دے، اور اک نفس موسیقی سے تمام رات کو پریشان کر دے"

(۳) میں اپنا مٹی کا چراغ اپنی جھونپڑی سے باہر لا کر پکاری: میرے بچو! آؤ میں تمہاری راہ کو روشن کر دوں، شاہراہ کو خاموش چھوڑ کر جب میں واپس لوٹی تو رات بھیانک اور سیاہ تھی۔ میں نے چلانا شروع کیا۔

مجھے اپنی ضیاؤں سے منور کر دے، اے شمع محبت! کیونکہ میرا مٹی کا چراغ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گرد و غبار میں مل چکا ہے۔

(.......)

محاکمہ

مرزا رسوا مرحوم کی نثر

(از مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی)

مرزا صاحب کا پہلا نقش ادبی افشائے راز ہے جسمیں اونھوں نے اپنی بیتی لکھی ہے اس کے بعد شریف زادہ اور امراؤ جان ان کتابوں نے خاص مقبولیت حاصل کی۔

مولانا عبد الماجد صاحب کے سحر نگار قلم نے ہندوستانی میں مرزا صاحب کے ناولوں پر ایک تبصرہ کیا ہے۔ اور بہترین اقتباسات پیش کئے ہیں، اب ضرورت نہیں کہ اسکا ذکر کیا جائے خصوصاً امراؤ جان کی سرگذشت کا آخری حصہ جو مولانا نے نقل کیا ہے میں نے پڑھا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو گر پڑے۔ مرزا نے دو ایک افسانے ابتدا میں اپنے شوق سے لکھے باقی کتب فروشوں کے اصرار سے مجبور ہو کر۔

مرزا صاحب اکثر مفلس رہا کرتے تھے، امین آباد اور چوک کے کتب فروش اکثر گھیرے رہتے اُس زمانہ میں ناولوں کا بازار گرم تھا، عام طبیعتیں راغب تھیں کبھی کبھی معقول رقمیں پیشگی دے جاتے تھے، منت خوشامد کی کوئی حد نہ تھی۔ اس طرح مرزا قلم برداشتہ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ میں لکھکر کچھ دیدیا کرتے تھے۔

تصنیف و تالیف کے اوقات میں مَیں نے ان کو دیکھا ہے کہ ان کا قلم بغیر تفکر کے نہایت روانی سے چلتا تھا۔ یہ تو افسانے ہیں، علمی موضوعات پر جو کچھ اُنھوں نے لکھا ہے وہ کارنامے ہیں، رسالہ اشراق و رسالہ الحکم دیکھنے والے مرزا کے علم و فضل اور اُن کی قوت تحریر کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

رسالہ معیار جب پہلے پہل نکلا ہے تو اُس کے دورِ اول میں مرزا صاحب کے مضامین مسلسل ہوتے تھے اُس وقت اس رسالہ کی اشاعت بہت کم تھی اور زمانہ بھی ہو گیا لہذا اُن کے بعض مضامین کو جو فلسفۂ شعر کے متعلق ہیں ناظرینِ زمانہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ یہ مضامین مراسلہ کے عنوان سے معیار کے مختلف نمبروں میں شائع ہوئے تھے۔

مراسلہ مرزا رسوا مرحوم نمبرا

میرے اس خط اور دوسرے خطوں کا جو اس کے بعد لکھے جائیں گے یہ منشا ہوگا کہ علم شعر کی ان خوبیوں کو جنھیں اردو زبان کی شاعری ڈھونڈھ رہی ہے حتی الوسع بیان کروں۔ مگر سخت مشکل یہ ہے کہ ان امور کو سمجھنے کے لئے جنھیں میں ذکر کیا چاہتا ہوں مبادی اور مسائل علم نفس سے واقف ہونا بہت ضروری ہے۔ اور اس علم کی کوئی کتاب بالفعل زبان اردو میں نہیں ہے۔ شیخ ابو علی سینا کا ایک رسالہ زبان فارسی میں میرے پاس تھا اور اس کا ترجمہ بھی میں نے اردو میں لکھا تھا اور تحقیقات جدید کے موافق بعضے حواشی اور تعلیقات اس پر زیادہ کر دیے تھے، وہ گم ہو گیا۔ شیخ کی کتاب شفا جلد طبیعات میں بھی اس علم کا بیان موافق تحقیقات قدیم کے ہے مگر وہ عام نظروں سے دور ہے۔ میں نے ایک رسالہ خاص اس علم میں تصنیف کیا ہے مگر وہ چھپا نہیں اور اگر چھپے بھی تو اصطلاحات علمی کی فہم سے اکثر اذہان قاصر ہیں اسلیے وہ بھی اس مطلب کے لئے مفید نہیں۔

امور مذکورہ بالا پر نظر کر کے یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اولاً ایک مختصر اور عام فہم طریقہ سے علم نفس کے بعض اصول کا ذکر کر دوں جس سے اُن مطالب کے سمجھنے میں سہولت ہو جنھیں میں بیان کیا چاہتا ہوں۔ دنیا میں جتنی چیزیں پائی جاتی ہیں جب ہم اُن کی صفتوں کو جدا جدا کر کے ہر ایک پر غور کریں تو ایسا معلوم ہوگا کہ کسی نہ کسی حاسہ کے ذریعہ سے شعور حاصل ہوا ہے۔ مثلاً گلاب کے پھول کا رنگ اور شکل خاص بذریعہ حاسۂ بصر کے اور خوشبو شامہ سے اور وزن کا ہلکا پن ہتھیلی پر رکھ کے اندازہ کرنے سے معلوم ہوا ہے۔ ایسی چیزوں کو جو بذریعہ کسی حاسہ کے معلوم ہوں محسوس کہتے ہیں۔ ذہن کے اُس فعل کو جس سے محسوس کا علم ہوا ہے احساس کہتے ہیں۔ احساس کی تعریف یہ ہوئی احساس مراد ہے اُس اثر کے شعور سے جو کہ نظام آلی پر کسی مؤثر کی تاثیر سے حادث ہوتا ہے۔ مثلاً روشنی کے ذریعہ سے آنکھ پر جو اثر ہوتا ہے اُس سے مبصرات کا شعور ہوتا ہے۔ یا ہوا کے تموج اور تصادم سے کان پر جو اثر ہوتا ہے اُس سے مسموعات کا۔ اور لو دار جسموں کے اجزائے لطیف جو ہوا میں مل کر مشام تک پہونچتے ہیں اُس سے مشمومات۔ اور پانی میں حل ہو جانے والے جسموں سے ذائقہ پر جو اثر ہوتا ہے اُس سے مذوقات اور اجسام کے چھونے سے اُنکی نرمی یا سختی اور گرمی یا سردی کا جو شعور ہوتا ہے اُنھیں ملموسات کہتے ہیں۔ اجسام کی مزاحمت اور وزن کا علم بذریعہ عضلات کے ہوتا ہے حرکت کا شعور بھی عضلات اور دوسرے حواسوں کی شرکت سے ہوتا ہے۔

احساس کی شرط یہ ہے کہ شے محسوس اُس آلہ جسم سے متصل ہو جس سے اُس کا تعلق ہے مثلاً جب تک گلاب کے پھول سے روشنی کی شعاعیں آنکھ پر نہ پڑینگی اُس رنگ اور شکل کا شعور نہیں ہو سکتا ہے

یا جب تک اُسکی خوشبو کے اجزائے لطیف ہوا میں مل کر مشام تک نہ پہونچیں گے، اُس کی خوشبو نہ معلوم ہوگی۔ یا جب تک ہم اُس کو نہ چھوئیں گے اُس کی نرمی کا حال نہ کھلے گا۔ خلاصہ یہ کہ احساس کے لئے شئے محسوس کا حاضر ہونا شرط ہے۔

مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شئے کی صرف ایک ہی صفت کا ہمیں احساس ہوتا ہے اور سب صفتیں ہمکو یاد آجاتی ہیں۔ اگرچہ وہ بالفعل غائب ہوں۔ مثلاً گلاب کے پھول کی خوشبو سے ہمکو اُس کی رنگت اور شکل یاد آجاتی ہے۔ یا مثلاً ایک قسم کے عطر کی خوشبو ہم نے پہلے کبھی سونگھی تھی، اب ایک مدت کے بعد جب ویسی ہی خوشبو ہماری ناک میں آئی تو ہم کو فوراً یاد آجاتا ہے کہ یہ اُس عطر کی خوشبو ہے۔

دونوں مثالوں سے واضح ہوگا کہ شئے حاضر نے شئے غائب کو یاد دلا دیا۔ مگر فرق یہ ہے کہ دوسری مثال میں ایک ہی حاسہ کے محسوس نے اُسی حاسہ کی ویسی ہی محسوس کو یاد دلایا اور پہلی مثال میں ایک حاسہ کے محسوس نے دوسرے حواس کے محسوسات کو یاد دلا دیا۔

ان صورتوں سے حکما نے دو قانون اخذ کیئے ہیں، اُن کو لزوم ذہنی کے قانون کہتے ہیں:۔

اول۔ قانون مماثلت، دو یا زیادہ چیزیں ایک دوسرے کے مثل جب مختلف وقتوں میں ملاحظہ ہونگی تو ایک دوسرے کو یاد دلا دیں گی۔

دوم۔ قانون مقارنت، دو یا زیادہ چیزیں جو ایک وقت میں ایک ہی ساتھ ملاحظہ ہونگی اگرچہ فی الحقیقت مماثل نہ ہوں، ایک دوسرے کو یاد دلا دینگی۔

جب دو چیزیں ذہن میں ایک ساتھ حاضر ہوتی ہیں اُن میں ہم دو نسبتیں قائم کیا کرتے ہیں۔

اول۔ تماثل، یہ چیز مثل اُس چیز کے ہے۔

دوم۔ تباین، یہ چیز مثل اُس چیز کے نہیں ہے۔

ہر ایک احساس کی تین حیثیتیں ہوتی ہیں:۔

(۱) شعور محض (۲) اُس احساس سے خاص لذت یا الم کا حاصل ہونا۔ (۳) وہ احساس کسی خاص تحریک کا باعث ہو۔

مثلاً گلاب کے پھول کو دیکھنے سے ایک تو یہ علم ہوا کہ اس کا رنگ ایسا، شکل ایسی اور خوشبو ایسی ہے۔ یہ شعور محض ہے۔ دوسری یہ کہ گلاب کا رنگ اور شکل کے دیکھنے سے یا خوشبو کے سونگھنے سے ہم کو مسرت یعنی لذت حاصل ہوئی۔ یا مثلاً اُس کا کانٹا چبھ جانے سے ہمیں الم ہوا۔ یا وہ لذت اس حد تک پہونچی کہ گلاب کے پھول کو توڑنے کا ہمیں شوق ہوا۔ چنانچہ ہم نے اُسکے توڑنے کا قصد کر کے اُسے توڑ لیا

اور کانٹے کے چُبھ جانے سے جو الم ہوا تھا اس لئے اُس سے بچتے رہے

حکمانے ان میں سے ہر ایک حیثیت کا ایک جداگانہ نام رکھا ہے۔ اول کو شعور دوسرے کو وجدان تیسرے کو ارادہ کہتے ہیں۔

شعور کے کئی درجے قائم کئے ہیں جن کا ظہور انسان کے رشد اور بلوغ تک ہو جاتا ہے۔ کسی میں کم اور کسی میں زیادہ۔

پہلے درجہ کا نام ادراک ہے، یعنی کسی چیز کے مجموعہ صفات کے احساسات سے اُس چیز کو شناخت کرنا۔

دوسرے تعمیم، یعنی چیزوں میں عموم اور خصوص کی نسبتوں کا قائم کرنا۔ صنف اور نوع اور جنس کا قرار دینا۔ مثلاً ایک خاص طرح کی شکل اور رنگ اور خوشبو کے اعتبار سے گلاب ایک نام رکھ لیا۔ یا ایسی بہت سی چیزیں کہ اگرچہ اُن کی رنگت اور شکلوں میں اختلاف ہے مگر بعض اوضاع خاص کی وجہ سے ملتے جلتے ہوئے ہیں اس لیے اُن کو پھول کہنے لگے۔

تیسرے استدلال۔ جزئیات سے کلّی اور کلیات سے جزئی پر خاص حکم لگانا مثلاً زید فانی ہے، عمر فانی ہے، بکر فانی ہے، خالد فانی ہے۔ لہذا انسان فانی ہے۔ یا مثلاً کل انسان فانی ہیں، زید انسان ہے لہذا زید فانی ہے۔

پہلی صورت کو استقرا، اور دوسری کو قیاس کہتے ہیں۔

چوتھے تمثیل، ایک قسم کے مجموعہ صفات کو ذہناً ایک فرد میں تجویز کر لینا۔

یہ چار طبیعی درجے ذہن انسان کی ترقی کے ہیں، ان کے علاوہ توہمات۔ خواب۔ مشی النوم اور جنون یہ حالتیں غیر طبیعی ہیں۔

تمثیل کے معنے لغت میں نگاشتن پیکر کے ہیں، اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ جو صورتیں کبھی عندالذہن حاضر تھیں اُنکو پھر ذہن کے سامنے لانا دوسری نئی صورتیں جو عالم خارجی میں موجود ہی نہوں اُن کو ایجاد کرنا۔

بعض لوگوں کو یہ خیال ہوگا کہ تمثیل خواہ مخواہ ایک جدید اصطلاح ایجاد کی گئی ہے، حقیقتاً یہ وہی ہے جس کو تخئیل کہتے ہیں، اور محاکات اور اختراع اُسکی دو قسمیں ہیں۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ تخئیل ایک شرط ذہن کی ہے جس کا بروز ابتدائے نشو و نما سے ہوتا ہے۔ اور جس پر دو دو قانون تذکر اور تقابل کے قائم کئے گئے جن کا ذکر سابقاً ہو چکا ہے۔ اور تمثیل کا ظہور ترقی ذہنی کا

آخری درجہ ہے جس سے اکثر اذہان بہت ہی کم بہرہ یاب ہوتے ہیں۔

اگر تمثیل کے اور اس کی دونوں قسموں کے ساتھ ساتھ لفظ شاعرانہ زیادہ کر کے ہم شاعرانہ تمثیل شاعرانہ محاکات اور شاعرانہ اختراع کہیں تو ہمارے مطلب کے لیئے مفید ہو سکتا ہے۔ محاکات وہ حالت ذہن کی ہے جبکہ وہ چیزیں جو کبھی عندالذہن حاضر تھیں اُن کی صورتیں جو خزانہ حفظ میں موجود ہیں پھر ذہن کے سامنے آجائیں اُس کو استرجاع کہتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں (۱) غیر ارادی (۲) ارادی اور باعتبار اُن کے مدت تک ذہن کے سامنے حاضر رہنے کے استحضار کہتے ہیں اور یہ بھی یا ارادی ہے یا غیر ارادی۔ شاعرانہ محاکات کے لیئے انتخاب کا سلیقہ ہونا چاہیئے۔ تاکہ جب الفاظ کے ذریعہ سے ان کا بیان کیا جائے، تو وہ عندالسامع مقبول ہو یا موجب کسی قبض و بسط کا ہو۔

قبض ایک حالت وجدانی ہے مشابہ الم کے جو مضرات سے اجتناب یا اُن کے دفع کرنے کی آمادگی ذہن میں پیدا کرتی ہے۔

بسط ایک حالت مشابہ لذت کی ہے جو لذات سے متمتع ہونے کے شوق کا باعث ہوتی ہے۔

محاکات محض واقعہ نویس یا مورخ کے لئے زیادہ مفید ہے نہ کہ شاعر کے لئے اختراع صرف شاعر کا حصہ ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ بت تراش، مصور، طراح بھی شاعر کے شریک فی الصناعت ہیں مگر اُن کا ذکر ہمارے مقصود کے لئے مفید نہیں۔ اس لئے ہم نے اُن سے زیادہ تعرض نہ کیا۔ باعتبار حیثیات احساس کے جن کا ذکر سابقاً ہو چکا ہے تمثیل کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) وہ جن کا تعلق شعور سے ہے (۲) جن کا تعلق وجدان سے ہے (۳) جن کا تعلق ارادہ سے ہے۔

اور جب ان کے اجتماع کو عقل ایک فرد واحد میں تجویز کرتی ہے تو اس سے ایک مثالیہ کا ظہور ہوتا ہے جسے کمال کہتے ہیں۔

وہ ذات مقدس جس میں یہ صفات کمالیہ پائے جاتے ہیں حق الحق جمیل لذاتہ۔ خیر مطلق اور غایت الغایات ہے۔ ایاہ نعبد وایاہ نستعین۔ مثالیہ اول یعنی حق موضوع فلسفۃ الوجود کا ہے جمال۔ موضوع علم ذوقیات کا ہے خیر موضوع علم اخلاق کا۔ اور تصور باری تعالیٰ عزاسمہ موضوع الٰہیات کا ہے حقیقت نفس الامری سے وہ امر مراد ہے جس کی موجودگی کو عقل خارج میں تجویز کرتی ہے نہ صرف ذہن میں۔ بخلاف امر ذہنی کے جس کا وجود صرف ذہن میں ہے۔ خارج میں نہیں ہے۔ فافہم۔

جمیل[1] سے مرغوب لذاتہ مقصود ہے نہ وہ جس کو ہم کسی غرض سے دوست رکھیں جسکے حصول کا وہ واسطہ ٹھہرے بلکہ اُسی کا حصول عین مراد ہو۔

---

[1] غرض ادنیٰ جس سے بقاء شخصی مقصود ہے۔ غرض اعلیٰ جو بقائے نوع کے لئے مفید ہو۔

ممکن ہے کہ امر جمیل نافع بھی ہو، یعنی کسی غرض ادنی یا اعلی سے اُسکا حصول مطلوب ہو مگر جس حیثیت سے کہ وہ واسطہ کسی غرض کا ہے اس حد میں داخل نہیں۔ مرغوب لذاتہ کی ایک بہت عمدہ مثال بچوں کے کھیل سے مل سکتی ہے اس لئے کہ اُس سے اُن کی کوئی غرض شخص نوعی نہیں ہوا کرتی۔ یہی کھیل کا شوق جو بچوں میں پایا جاتا ہے ترقی کرتے کرتے اُس حد تک پہونچ گیا ہے جس سے بت تراشی۔ مصوری۔ طراحی۔ موسیقی۔ شعر ایسے ایسے فنون لطیفہ نکل آئے ہیں۔ بچوں کے کھیل اور کھلونے بہت ہی سیدھے سادے ہوتے ہیں، اور بوڑھوں نے اپنے کھیلوں میں طرح طرح کی پیچیدگیاں اور لطافتیں پیدا کرلی ہیں۔ جسکو ہم حقیقت ہیں کے نزدیک اصل دونوں کی ایک ہی ہے وہ امر جسے غرض یا اُس کی متقارب لفظ نفع سے تعبیر کرلے دونوں میں نہیں ہے۔ فنون لطیفہ کے مقابل وہ فن ہیں جن کو فنون نافعہ کہنا چاہیئے۔ مثلاً (فن میکانات کلیں بنانے کا فن) کے ذریعہ سے وہ چیزیں بنائی گئی ہیں جو انسان کی بقا اور ترقی شخصی اور نوعی کے مفید ہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جمال اور نفع دونوں صفتیں ایک ہی شے میں جمع ہوجاتی ہیں۔ مثلاً ایک خوبصورت جیبی گھڑی، ایسی چیزیں عندالذوق و نیز عندالعقل مستحسن ہیں۔

ہر صاحب فن کی غرض یہ ہونا چاہیئے کہ اس کے ایجاد میں دونوں صفتیں پائی جائیں۔ مگر ایسا نہو کہ ایک کی رعایت سے دوسرا ناقص رہ جائے۔ ہر ایک صاحب فن کو اپنے خاص فن کی مراعات لازم ہے اگر اُس سے دوسرا مطلب بھی نکل آئے تو فہوالمراد۔ مثلاً شاعر کا مقصود یہ ہونا چاہیئے کہ اس کا شعر اصول سے درست ہو اُس میں کوئی ذاتی خوبی ہو۔ پھر اگر اُس سے کوئی نصیحت بھی نکلتی ہے۔ تو سبحان اللہ۔ ورنہ نصیحت گری کو ناصح مشفق کے حوالے کرے اور خود بزم شعرا میں اپنی عزت بچانے کے لئے شعر عمدہ کہے۔

تقسیم فنون کی باعتبار اُس آلہ اور مادہ کے جو اُن میں استعمال کئے جاتے ہیں یہ ہے:-

فنون لطیفہ میں سے بعض وہ ہیں جن کا تعلق حس بصر سے ہے۔

(۱) بت تراشی (۲) طراحی (۳) مصوری۔ ان فنون میں شکل اور رنگ سے کام لیا جاتا ہے

(۲) وہ فن جس کا تعلق حس سمع سے ہے موسیقی ہے۔ اس میں لحن و ایقاع سے کام لیتے ہیں۔

(۳) فنون ادبیہ کا تعلق تخیل سے ہے۔ اور اس میں بذریعہ الفاظ کے کام لیتے ہیں۔ فنون ادبیہ کے لیے لفظ شعر بہت ہی مناسب ہوتا مگر از انجا کہ اسکو اکثر کلام منظوم کے لیے بولتے ہیں لہذا خوف التباس سے ترک کیا۔

شعر کا اصل مقصود صرف یہ ہے کہ بذریعہ الفاظ کے شعور و وجدان متاثر ہو کر موجب قبض و لبسط کے ہوں۔

لیکن فنون ادبیہ میں ضمناً اور اغراض عمدہ بھی شامل ہیں مثلاً حکایت ۔ توجیہ ۔ استدلال ۔ موعظت اس صورت میں چاہیئے کہ مصنف ترتیب مقدمات میں ایسی لیاقت اور سلیقہ کو صرف کرے جس سے اُس کی تصنیف اُن دونوں غرضوں کے لئے بدرجۂ اتم و اکمل مفید ہو۔ اگر کوئی مورخ کسی واقعہ تاریخی کو اس طرح بیان کرے جس سے سامع یا ناظر کی تخئیل میں ہوبہو تصویریں کھنچ جائیں ۔ یا کوئی حکیم کسی قانون فطرت کی توجیہ اس صورت سے کرے کہ ہر کڑی میں ہمیں اس کے آثار نظر آجائیں تو کہا جائیگا کہ وہ بیان اور توجیہ دونوں غرضوں (یعنی غرض علمی اور غرض شعری) کے لئے بدرجۂ اتم و اکمل مفید ہے ۔ وہ علم جو بہت ہی خشک خیال کئے جاتے ہیں مثلاً ریاضی یا منطق اُن کے بیان میں بھی اگر سلیقہ شعری سے کام لیں تو سامع اور ناظر اس سے محفوظ ہو سکتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ غرض علمی بھی بخوبی حاصل ہوتی ہے بلکہ اُس میں ایک قسم کی مدد ملتی ہے۔

علوم ادبیہ میں بہ نسبت اور فنون لطیفہ کے وسعت بہت زیادہ ہے اس لئے کہ اُس میں سے ہر ایک ایک ہی حاسّہ کے موضوع کے استعمال تک محدود ہے ۔ رنگ شکل ۔ آواز ۔ فنون ادبیہ بلکہ احساسات بلکہ جمیع وجدانیات اور عقلیات کے استعمال پر بشرطیکہ وہ بذریعہ لفظ و عبارت کے ادا ہو سکیں قادر ہیں ۔ اگرچہ ادیب مصور کی طرح کسی چیز کی رنگت اور شکل آنکھ سے نہیں دکھا سکتا نہ خوش آیند سُر کانوں تک پہونچا سکتا ہے ۔ لیکن وہ الفاظ کے ذریعہ سے ہر چیز کی صورت صفحۂ تخئیل پر کھینچ سکتا ہے نہ صرف ایک رخ سے بلکہ مختلف رخوں سے اور یہ ذہنی تصویر بہ نسبت جسمانی تصویر کے زیادہ تر پائدار ہے ۔ الفاظ کے انتخاب اور تالیف سے نہ صرف نظم بلکہ نثر میں بھی اصول موسیقی کا مزا پیدا کر سکتا ہے اور لطف یہ کہ ایسی حالت میں کسی اشکال تاریخی یا مسئلہ حکمی کا ثبوت اور حل بھی دیا جائیگا جو اُسکی غرض خاص ہے۔

اگرچہ شاعر بھی واقعات کی ہوبہو تصویریں کھینچنے میں محاکات سے بہت کام لیتا ہے لیکن اُس کے حسن کا تعلق خاص اختراع سے ہے بخلاف مورخ کے جس کا تعلق محاکات سے ہے جب شاعر محاکات سے کام لیتا ہے اُس وقت بھی اختراع سے باز نہیں رہتا اس لیے کہ شاعر کی نظر اکثر مرغوب لذائذ اور جمیل کی طرف رہتی ہے لہذا اُسکو انتخاب کرنا ہوتا ہے مثلاً جب اُسے کسی واقعہ

کی تفصیل بیان کرنا ہے تو وہ عدالت کے گواہوں کی طرح ہر جزئی کے ذکر کا پابند نہ رہیگا بلکہ صرف اُن امور کو انتخاب کرے گا جو اُسکے مطلوب کے لئے مفید ہوں۔

اس صورت میں مکروہات کے ذکر سے قطعاً احتراز کریگا اور دوسرے ایسے امور کو بھی ترک کردیگا جن کو وہ غیر مفید یا مضر خیال کرتا ہے۔

مکروہات سے وہ امور مراد ہیں جن کا ذکر بسط و قبض دونوں کے لئے مفید نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے امور موجب ایک طرح کے انقباض کے ہوتے ہیں۔ مگر شدت انقباض کی وجہ سے قوت توجہ اُن کی طرف اس قدر مبذول ہو جاتی ہے کہ اور امور سے متاثر ہونے کے قابل نہیں رہتی، اس صورت میں بیجا صرف قوت کا ہوتا ہے۔ اور اگر اس امر میں کوئی اور خوبی خلقی یا ذوقی نہیں ہوتی تو گویا مفت تضیع اوقات ہے۔

ہم اس موقع پر ایک بہت ہی سہل قانون امور مکروہ سے احتراز کرنے کے لئے تحریر کئے دیتے ہیں اگر اُسے یاد رکھیں گے تو شعر اپنے مقصود میں عمدہ ہوگا۔ وہ قانون یہ ہے۔ ہر ایک شعر کے ماحصل پر غور کرکے دریافت کریں کہ اُس سے کس قسم کی تصویر ذہن میں پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس تصویر کے اجزا یا لزومات قریبہ میں کوئی امر مکروہ شامل ہے تو اس کو نظری کر دینا چاہیئے۔ ہم اس مقصود کو ذوق کے ایک شعر سے سمجھائے دیتے ہیں ؎

واہ رے شور محبت خوب ہی چھڑکا نمک ۔۔۔ استخواں میرے ہما کس مزے سے کھائے ہے

اس شعر کو بطور مذکور ملاحظہ کرنے سے ایک تصویر ذہنی ایسی پیدا ہوتی ہے جس میں ایک امر مکروہ شامل ہے۔ یعنی انسان کی ہڈیوں کا نمکیں ہونا اور ایک جانور کا اُسے کھانا۔ عمدہ تخئیل نہیں ہے۔ یا کسی اور شاعر کا بہت ہی مشہور مطلع اور شاید اکثر صاحبوں کو پسند بھی ہے ؎

شغل اگر چاہتے ہو جی کے بہلنے کے لئے ۔۔۔ دل میں آبیٹھو کلیجہ میرا ملنے کے لئے

اس کے ماحصل میں ایک تصویر ذہنی بنتی ہے جو بعید القیاس مضحک اور مکروہ ہے۔ دل میں ایک شخص کا آبیٹھنا اور ہاتھ بڑھا کر کلیجہ کو ملنا ایک مہمل سی بات ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس شعر میں مخاطب معشوق مجازی ہے معشوق حقیقی اس سے منزہ ہے۔ کہ کسی کے دل میں بیٹھکر اس کے کلیجہ کو مسلے۔

یا غالب کا ایک شعر فارسی کا:۔

داغم ز سوز دل نہ نجا ہ دارد م ز خلق ۔۔۔ بوئے کہ تن ز سوختن استخوان دہد

ہڈیوں کے جلنے سے چراندھ کا پیدا ہونا جو شاعر کو خلق سے تجل رکھتا ہے واقعی ایک مکروہ امر ہے۔ اور اسی مضمون کو غالب نے اردو میں بھی کہا ہے :-

داغ دل گر نظر نہیں آتا — بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

داغِ دل کی بو میں چراندھ ضرور ہوگی، صرف داغ دل کا ذکر کیا کم تھا کہ اُس کے جلنے اور اُسمیں سے بو کے پیدا ہونے کا بیان مشرح کیا گیا ہے۔ اور اس موقع پر بُو کا استعمال اُسی امر مکروہ پر دلالت واضح ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ امور صرف مجازاً کہے گئے ہیں اس کی اصلیت کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ تو اُس کا یہ جواب دیا جائے گا۔ کہ مجاز کا مقصود یہی ہوتا ہے کہ حقیقت اُس کے ذریعہ سے ذہن نشین ہو کیونکہ مجاز میں اکثر امور عقلی کو محسوسات کے ذریعہ سے جو اقرب الی الفہم ہیں بیان کرتے ہیں مثلاً علم کو جو ایک امر عقلی ہے شمع کہنا وغیرہ۔ اگرچہ وہ مجازات جو اشعار مرقومۂ بالا میں شامل ہیں اپنی حد میں درست ہیں لیکن اُن کی تخئیل مکروہ ہے اس سے اُس کا لطف معدوم ہو جاتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ اس قسم کے بے شمار شعر متقدمین اور متاخرین کے کلام میں پائے جاتے ہیں تو اُس کا جواب یہ ہے کہ اسی طرح اکثر اغلاط لفظی بھی اُن کے کلام میں پائے جاتے از لبسکہ زمانۂ دراز سے مشرقی شاعری کو درستی الفاظ کا لحاظ رہا ہے لہذا معنویت کی باریکیوں کی طرف غور کرنے کی فرصت نہیں ملی۔

شعر پر نظر کرنے کے دو رُخ ہیں۔ ایک آزادیِ لفظ، دوسرے آزادیِ معنیٰ، جس زمانہ میں الفاظ کی باریکیوں کی طرف زیادہ نظر کی جاتی ہے۔ توجہ اُسی کی طرف مبذول ہو جاتی ہے معنویت کا خیال جاتا رہتا ہے۔ اور جب معنویت کا خیال پیدا ہوتا ہے تو لفظی باریکیاں ترک ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں میں نسبت عکسی ہے۔ ایک کی افراط۔ دوسرے کی تفریط کا موجب ہوتی ہے۔ اکثر ایسے شاعر جو مضمون عمدہ کہتے ہیں اُن کے الفاظ میں وہ سلاست اور نزاکت نہیں ہوتی جو ان شاعروں کے کلام میں ہوتی ہے جن کو مضمون کی جدت اور ندرت کا چنداں لحاظ نہیں ہوتا۔ وہ صرف لطفِ زبان کے دلدادہ ہیں اور یہ بھی ایک امر قابل لحاظ تھا کہ جو شاعر خلاق مضمون ہیں۔ اُن کو طرزِ ادائے مقصود میں بڑی دقت پڑتی ہے۔ اس لیے کہ ہر ایک جدید خیال کے لیئے ایک جدید لفظ چاہیئے۔ اُن کو زبان مروجہ میں تصرفات کرنا ہوتے ہیں اور اس صورت میں اُن کا کلام موافق روزمرہ عوام کے نہیں رہ سکتا۔ لہذا اکثر اشخاص جن کی نظریں سطحی ہیں اُن کو ایک قسم کی اجنبیت معلوم ہوتی ہے۔

شیکسپیر شاعر جس کو سعدی انگلستان کہنا چاہیئے اُس کے کلام میں اکیس ہزار الفاظ استعمال ہوئے، اور ملٹن نے سات ہزار لفظیں استعمال کی ہیں، اہل صناعت کا یہ خیال ہے کہ شیکسپیر کا دائرۂ خیال بہ نسبت ملٹن کے سہ چند تھا۔ ہمارے ہندوستان میں میر کی سلاست مشہور ہے۔ مگر پہلے دیوان کی پہلی غزل میں فرماتے ہیں۔

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا

ذرا ہنگامہ گرم کُن کو دیکھیئے اور اُردو زبان کو۔ مگر کرتے کیا اس مضمون کو اور کسی طرح ادا کرنا ممکن ہی نہ تھا۔

مگر ہاں اتنا کہہ سکتے ہیں کہ غزل میں زیادہ تر سلاست ہی مناسب ہے۔ اس لئے کہ اُس کا موضوع سنجیدہ نہیں ہوتا۔ قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ میں خیالات اور اُن کے ساتھ ہی زبان کو وسعت دینا چاہیئے۔

علم طب کا ایک مسئلہ ہے اعتدال حقیقی کا وجود خارج میں محال ہے۔ وہی امر یہاں بھی صادق آتا ہے۔

وزن اور قافیہ کی پابندی شاعر کے لیے کم نہ تھی کہ اُس پر ردیف بڑھائی گئی پھر اور لفظی جھگڑے نکالے گئے۔ بیچارہ جدید مضمون کہاں سے پیدا کرے۔ لفظی جھگڑوں کے بڑھانے سے مضامین کا دائرہ تنگ ہوتا جائے گا۔ ہندوستان میں سو برس اُدھر کی شاعری آجکل کی شاعری سے اچھی تھی۔ متوسطین نے جھگڑے حد سے زیادہ بڑھا دیئے اس لئے مزا جاتا رہا۔ مگر اس زمانہ میں پھر رجوع معنویت کی طرف ہے۔ اس لئے مجھکو ان مراسلات کے لکھنے کی جرأت ہوئی۔ ان مراسلات میں بعض امور ایسے پائے جائیں گے۔ جن سے معاصرین نابلد ہیں اور اس سے ممکن ہے کہ اکثر صاحبوں کو تعریض کا موقع ہاتھ آئے۔

مثلاً اس مراسلہ میں مسلم الثبوت اُستادوں کے بعض شعر جو نظری کر دئیے گئے ہیں ممکن ہے کہ بعض طبیعتوں پر گراں گذرے لیکن یہ ایک اچھی بات ہے چاہیئے کہ معشر کلام کی طرف رجوع کریں اور اصل مطلب کو سمجھیں جو زیادہ تر مفید اور مستحسن ہے۔ ان لفظوں پر میں اپنے پہلے مراسلہ کو ختم کرتا ہوں۔ آئندہ اُن اُمور کو تفصیل کے ساتھ ذکر کرونگا جس سے میدان شاعری کا تنگ اور تاریک ہوتا جاتا ہے اور اُسکے وسعت کے اسباب بھی عرض کرونگا۔

کلام مومنؔ[۱]

(از سید مقبول حسین، بی۔ اے۔ احمد پوری)

نہ دے تیغِ زباں کیونکر شکستِ رنگ کو طعنے
کہ صفہائے خرد پر حملہ ہے فوجِ خجالت کا

کلام مومن پر ابتک جتنی تنقیدیں دیکھنے میں آئی ہیں وہ اس بات پر ضرور متفق ہیں کہ وہ صاحب طرز ہیں، اور یہ کہ انھوں نے اپنے لئے غزل کا میدان علیحدہ تجویز کیا۔ "روشِ عام پر کبھی چلنا پسند نہیں کیا" لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ کونسی خصوصیت ہی جو انھیں روشِ عام سے علیحدہ کرتی ہے۔

کسی ادیب کی وہ خصوصیت جس کی وجہ سے وہ صاحب طرز کہلائے۔ عموماً اس کے احساسات میں پنہاں ہوتی ہے اجو اس کی طبیعت کا خمیر اور کیرکٹر کے اجزا و عناصر ہوتے ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ دردؔ صوفی تھے، میرؔ رقیق القلب تھے، غالبؔ فلسفی تھے، شبلیؔ نقاد تھے، حالیؔ رفارمر تھے، اور اقبالؔ بہی خواہِ ملت، یہ اس بنا پر کہ دردؔ کے کلام میں تصوف ہے، میرؔ میں رقت، غالبؔ میں تخئیل اور متانت شبلیؔ میں تنقید، حالیؔ میں رفارم، اور اقبالؔ میں جذبۂ ملی، یہ خصوصیتیں کیرکٹر کا معیار ہیں۔ اور یہی اسکا عکس و آئینہ، اس طرح کسی شاعر کے کلام کی وہ نوعیت جو اسے شاہراہ عام سے الگ کرے اسکے کیرکٹر کی

---

[۱] حکیم مومن خاں (سنہ ۱۲۱۵ھ سنہ ۱۲۶۸ھ۔ مطابق سنہ ۱۸۰۰ء۔ سنہ ۱۸۵۱ء) انکے والد کا نام حکیم غلام نبی تھا۔ انکے دادا حکیم نامدار خاں اصل نجبائے کشمیر سے تھے سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں کشمیر سے آکر بادشاہی طبیبوں میں داخل ہوئے شاہِ عالم کے زمانے میں چند مواضع جاگیر میں پائے جب انگریزی حکومت ہوئی تو انکی پنشن مقرر ہوگئی۔ جس کا کچھ حصہ مومن خاں کو بھی ملتا تھا فن طب ان کا آبائی پیشہ تھا۔ عربی فارسی میں وہ مہارت تامہ رکھتے تھے۔ شاعری کے علاوہ نجوم میں بھی کمال حاصل کیا ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھلاتے تھے۔ امیروں رئیسوں کی دربارداری سے سخت نفرت تھی انکی تصانیف میں ایک کلیات ہے جسمیں ایک دیوان چھ مثنویاں ہیں۔ شاعری کی ہر صنف میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے انکے دیوان کی ترتیب انکے مشہور شاگرد نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے کی۔ مشاہیر ادب میں تسلیم دہلوی، امیر اللہ تسلیم اور مولنا حسرت موہانی انکی طرز کے پیرو ہیں۔"
(انتخاب از تاریخ ادب اردو مصنفہ بابو رام سکسینہ صاحب، و مترجمہ مرزا عسکری صاحب)
مومن خاں کا حلیہ یہ ہے (بیالیس سال کی عمر تصور کیجئے) "کشیدہ قامت" سرخ سفید رنگ جسمیں سبزی جھلکتی تھی (بقیہ صفحہ دیگر پر)

کسوٹی ہے۔ اور اس اعتبار سے کسی شاعر کے کلام پر تنقید و تبصرہ کرنا اس کے مخصوص انداز کو نمایاں کرنیکے ساتھ ساتھ اسکے کیرکٹر و کردار کی تہ تک پہونچنے کی کوشش بھی کرنا ہے۔

آدمی کی رفتار و گفتار اس کے شعار انسانیت کا معیار ہے، رفتار کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں مثلاً رقص رفتار کی ایک حالت ہے، موسیقی گفتار کی ایک کیفیت نظم کی نوعیت بھی ایسی ہی ہے غزل نظم کا شباب ہے، اس کے لغوی معنی اس کی دلیل ہیں۔ یعنی یہ کہ فلسفہ، تصوف، حکمت، معرفت اور نعت وغیرہ کو تغزل سے کوئی نسبت نہیں ہے، شعرائے لکھنؤ کی مجازی شاعری کو اسی اعتبار سے فوقیت حاصل ہے۔ کہ غزل کا تعلق عشق مجازی سے ہے۔ نہ کہ عشق حقیقی سے اور چونکہ عشق مجازی "شباب کا جنون" ہے۔ اس لئے جوانی ہی ایسا وقت ہے جبکہ شاعر کے جذبات تغزل کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ مومن خاں کا شباب حقیقی معنی میں شباب تھا۔ کیونکہ اس عہد میں نہ تو وہ مولوی تھے، نہ فلسفی۔ نہ صوفی۔ نہ رند۔ انھوں نے نیکی و بدی کی مدح و ذم نہیں کی، نہ تخییل کی گتھیاں سلجھائیں۔ ہم ان کو کسی سبزہ آغاز ترک شیراز کے لب لعلین پر اشکہائے خونیں بہاتے ہوئے نہیں پاتے، نہ وہ شراب ناب کے نشے میں چور نظر آتے ہیں۔ وہ تو اپنے شباب کے کنھیا تھے۔ اُن کا عشق خدا کی اس مخلوق سے تھا جس سے عشق ہونا چاہئے۔ یہ مانا کہ وہ عشق حقیقی نہ تھا مگر نیچرل ضرور تھا اور حقیقت کو نیچر سے بیر نہیں۔

اُردو شاعری میں ان کے معشوق کی حیثیت ایک یوسف کی ہے جس کے لئے وہ زلیخا ہیں۔ اور سوائے ان کے تمام دنیا رقیب، ناصح کو وہ نادان سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اگر ناصح انکے یوسف کو دیکھلے تو بیخودی میں اپنے "ہاتھ کاٹ ڈالے" ان کا عشق رادھا کا عشق ہے جسکی نظر میں کنھیا کی رفتار و گفتار پر بھی نظر غیر لگ جانیکا اندیشہ رہتا ہے۔ اس لئے انکی شاعری میں اشارے ہیں، کنائے ہیں، نقرے ہیں، آوازے ہیں، طعن و طنز کی جھٹکیں ہیں، اور آداب، کورنشات، تسلیمات وغیرہ کے پردے میں چلی کٹی باتیں ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس، اسکے علاوہ نہیں معلوم کیا کچھ ہے، اس طرح انکے کلام میں کہیں تو آن بان ہے اور کہیں آن ہی آن۔

اس انداز کو بظاہر طنز کہا جائے گا۔ واقعی یہ طنز ہے مگر طنز کی کئی قسمیں ہیں۔ مومن کے شاعرانہ

بقیہ صفحہ - بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں، کھنچی ہوئی بھویں، لمبی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹھ، ان پر پان کا لاکھا جما ہوا، مسی آلودہ دانت، ہلکی ہلکی مونچھیں، خشخاشی داڑھی، بھرے بھرے ڈنڈ، پتلی کمر، چوڑا سینہ، لمبی انگلیاں، گھونگر والے بال لمبے لمبے کاکلوں کی شکل میں کچھ تو پشت پر اور کچھ کندھوں پر پڑے ہوئے۔

طعنوں میں عجیب نرالا پن ہے، عجیب شان یا رعنائی ہے جس کے لئے کوئی لفظ نہیں ملتا لیکن اس کو اگر "طنز ملیح" کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔ کیونکہ مومن کے طنز میں ایک طرح کی ملاحت ہے، جسکے مختلف پہلو ہیں، اور چونکہ اس کا انحصار جذبات پر ہے اس لئے ہر نشتر کسی نہ کسی احساس کا آئینہ ہوگا۔ اور اس احساس میں "رشک" کی حرارت کا ہونا لازمی ہے، طنزیہ ملاحت کے نشتروں کی مختلف شکلیں کلام مومن سے بطور تمثیل ذیل کے اشعار میں ملیں گی۔ مثلاً

(۱) "رجعتِ کنایہ":-

رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے، میں نے ہی تم سے بیوفائی کی،

لاش کس کی ہے یہ عدو سے نہ پوچھ میں ہوں کشتہ ترے تجاہل کا

(۲) "رجعتِ مبالغہ":-

کر علاجِ جوشِ وحشت چارہ گر لادے اک جنگل مجھے بازار سے

(۳) "ندرتِ ادا":-

دیکھ لو شوقِ ناتمام مرا غیر لیجائے ہے پیام مرا

قتل ہو کر ہم بچے آزار سے عمر کے دن کٹ گئے تلوار سے

(۴) "کیفیت ادا":-

چارۂ دل سوائے صبر نہیں سو تمہارے سوا نہیں ہوتا،

گر دعا کرتا ہوں مومن وصل کی ہاتھ باندھے ہے وہ بُتِ زنار سے،

دل لگانے کے تو اٹھائے مزے جی بلا سے رہا رہا نہ رہا،

اسی طرح کی اور بہت سی شکلیں ہیں جن کا الگ نام تجویز کرنا مشکل ہوگا۔ بہرحال ہر شکل پر در پردہ اشارے کنائے ضرور ہیں۔ جو کہیں تو بالکل "طعن عریاں" ہیں۔ مثلاً ذیل کے اشعار ہیں:-

اور ایسا کوئی کیا بے سر و سامان ہوگا کہ مجھے زہر بھی دیجئے گا تو احسان ہوگا

کہہ سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل تمسے بے رحم پہ مرنیسے تو آسان ہوگا

بات کرنے میں رقیبوں سے ابھی ٹوٹ گیا دل بھی شاید اُسی بد عہد کا پیمان ہوگا

دوستی اس صنم آفت ایمان سے کرے مومن ایسا بھی کوئی دشمنِ ایمان ہوگا

کہیں یہ کنائے کیفِ مایوسی ہیں۔ اس کیف کی مثال سورداس کا یہ شعر ہے ؎

آئے تھے موہن گھوم گئے آنگن | میں بیرن رہی سوئے
سورداس پر بھواب جو ملو گے | راکھونگی نین سموئے

ظاہر ہے کہ اس شعر میں کوئی کنایہ نہیں مومن کے یہ اشعار کنایہ کی چشمک بھی رکھتے ہیں ؎

وصل کی شب شام سے ہیں سو گیا | جاگنا ہجر ان کا بلا ہو گیا
ساتھ نہ چلنے کا بہانہ تو دیکھ | آکے میری نعش پہ وہ رو گیا

کنایوں کا تنقیدی پہلو ذیل کے شعر میں بطور مثال ملاحظہ ہو ؎

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں | اے ہم نشین نزاکتِ آواز دیکھنا

اکثر جگہ یہ کنائے "آوازے" ہو جاتے ہیں مثلاً ؎

گرنہ کھیلیں جان پر جی ہار دیں | عشق بازی سیکھیے اغیار سے

جان پر کھیلنے' اور محض زبان سے کہکر "جی ہارنے" میں کتنا بڑا فرق ہے۔

کہیں کہیں یہ اشارے خوشامد اور حسن طلب کا پہلو بھی لیئے ہوتے ہیں۔ حسن طلب کا یہ انداز بچوں کے رشک میں بہت پایا جاتا ہے اس لئے اُن سے کہتے ہیں کہ دیکھو یہ چیز لے لو اگر تم نہ لوگے تو ہم اس کو (یعنی کسی دوسرے کو) دیدیں گے۔ واسوخت کی بنیاد رشک کے اسی پہلو پر ہے، مگر واسوخت میں عموماً جلی کٹی ہی سنائی جاتی ہے، یہاں اسکا رنگ ہی اور ہے، یعنی تعریف کر کے دل بڑھایا ہے مثال کے طور پر سورداس جی کا یہ مشہور شعر غور طلب ہے ؎

باہیں (بانہہ) چھوڑائے جات ہو نیبر جان کے موہیں (مجھکو)
ہردے سوں (سے) جب جایئے سبل (زور آور) بدونگی توہیں (تجھکو)

مومن خاں اسی مفہوم کو دوسرے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اُن کا مخاطب دل ہے یعنی ؎

جو پھر جائے اس بے وفا سے تو جانوں | کہ دل پر نہیں زور چینا اُسی کا

کنایوں میں شکایت کرنا عام بات ہے، کیونکہ طنز و تعریض کا مقصد ہی شکایت ہوتا ہے مگر مومن خاں کے کلام میں شکایت کی یہ چشمکیں ایک خاص کیفیت لئے ہوئے ہیں مثلاً ؎

دھیان ہے غیر کے تحمل کا | ہوش دیکھا ترے تغافل کا

اور کہیں کہیں شکایت کے پیرایہ میں رقیب کی غیبت بھی کی گئی ہے مثلاً ؎

شوخ کہتا ہے بے حیا جانا   دیکھو دشمن نے تم کو کیا جانا

گویا لفظ "شوخ" بھلے مانسوں کے لئے استعمال کرنا ان کی ہتک کرنا ہے کیونکہ یہ ایک بازاری لفظ ہے۔

جیسا اوپر ظاہر کیا گیا، واسوخت کی بنیاد شکایت پر ہے، اور شکایت بھی کیسی؟ جلی کٹی باتوں میں، ذیل کے اشعار میں یہ بات اس قدر زیادتی کے ساتھ ہے کہ مومن کے عام انداز یعنی "طنز ملیح" کی ملاحت بھی رخصت ہو گئی ہے، اور طنز و طعن کا دکھتا انگارہ باقی رہ گیا ہے، مثلاً ؎

اب اور سے لو لگائیں گے ہم   جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

دل دیجئے اک اور لالہ رو کو   پھر داغ یہ داغ کھائیں گے ہم

گر تیری طرف کو بے قراری   کھینچیگی تو لوٹ جائیں گے ہم

بتخانہ چین ہو گو تیرا گھر   مومن ہیں تو اب نہ آئیں گے ہم

آخری دو شعر عرفی کے طرز کے ہیں اور ان سے شاعر کی خودداری کا اظہار ہوتا ہے، عرفی میں کنایہ کی چشمک زیادہ نہیں، وہاں تو دو ٹوک جواب ہے مثلاً یہ شعر ؎

ہمرہ غیر دمی گوئی بیا عرفی تو ہم   لطف فرمودی برو کین پائے رفتار نیست

جہاں کہیں یہ کنائے محض اظہار واقعہ کی صورت میں ظاہر کئے گئے ہیں زبان و بیان کی ایک عجیب کیفیت پیدا ہو گئی ہے جیسے یہ اشعار ؎

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے   ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

رسم پر خصم جان غیر نہ ہو   سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں   سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرض مضطر مومن   صنم آخر خدا نہیں ہوتا

متانت و سنجیدگی کے اعتبار سے مومن کا رنگ غالب سے ملتا ہے مگر غالب کا تتبع انھوں نے بالکل نہیں کیا۔ مومن کے کلام کی ایک خصوصیت اور بھی ہے وہ یہ کہ مومن نے باوجود اس طنز و تشنیع کے ارباب شریعت مثلاً زاہد، واعظ، شیخ، موذن، اور اسی طرح دیگر مذہبی ارکان کو اپنا تختۂ مشق نہیں بنایا۔ اس اعتبار سے ان کا کلام عالمانہ ہے چنانچہ ذیل کے اشعار اس رنگ کے شاہد ہیں، مومن اپنے تخلص کی وقعت اس طرح نبھا گئے ہیں کہ اردو کا شاید ہی کوئی دوسرا شاعر یہ خوبی

پیدا کرسکا ہو مثلاً ؎

دوستی اُس صنمِ آفتِ ایمان سے کرے ۔۔۔ مومن ایسا بھی کوئی دشمنِ ایمان ہوگا

واقعی مومن یا مسلمان کو بتوں سے محبت کرکے اپنے ایمان کو ڈانواں ڈول کرنے کی کیا ضرورت ہے،

دوسرا شعر:- بتخانہ بھی ہو گر تیرا گھر ۔۔۔ مومن ہیں تو اب نہ آئیں گے ہم

سچ ہے مومن کو بتخانے میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں، اسی طرح یہ شعر ؎

کیوں سُنے عرض معترض مومن ۔۔۔ صنم آخر خدا نہیں ہوتا

اخلاق کے اس دلچسپ پہلو کے علاوہ ان کے کلام میں صرف خودداری کا پہلو ہے جو رشک سے بری نہیں، تصوف اور موعظت کا ذکر بالکل نہیں، اپنے عشق کو وہ مجازی خود تسلیم کرتے ہیں یعنی ؎

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن ۔۔۔ آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے۔

اس وضعداری کو انھوں نے ہمیشہ قائم رکھا، کیونکہ جیسا انکا ابتدائی کلام ہے ویسا ہی آخری، انھوں نے تصوف کو کبھی ہاتھ ہی نہیں لگایا۔

جذبات سے قطع نظر زبان و بیان میں بھی وہ غالب کی طرح وسیع النظر واقع ہوئے ہیں۔ غالب کا کلام منتخب ہے اگر مومن کے کلام کا بھی انتخاب کیا جائے تو شاید وہ زبان کے اعتبار سے غالب کے مقابلے میں پیچھے نہ رہیں۔ کیونکہ غالب کی طرح وہ بھی دریا کو کوزے میں بھرتے ہیں اور طویل گفتگو کو چند الفاظ میں بیان کر جاتے ہیں، اور لطف یہ کہ زبان کی سنجیدگی بھی پوری طرح سے قائم رہتی ہے، بہرحال کلام مومن میں زبان کی حسب ذیل خصوصیتیں موجود ہیں۔

(۱) "محاورہ بندی" مثلاً ؎

چل الگ ہٹ مجھے نہ دکھلا مُنھ ۔۔۔ اے شبِ ہجر تیرا کالا مُنھ

شبِ غم کا بیان کیا کیجئے ۔۔۔ ہے بڑی بات اور چھوٹا مُنھ

جب کہا یار نے دکھا صورت ۔۔۔ ہنسکے بولا کہ دیکھ اپنا مُنھ

کس کو خونِ جگر پلائے گا، ۔۔۔ ساغرِ مے کو کیوں لگایا مُنھ

گھر میں بیٹھے تھے کچھ اُداس سے وہ ۔۔۔ ق ۔۔۔ بولے بس دیکھتے ہی بھرا مُنھ

ہم بھی غمگین سے ہیں آج، کہیں ۔۔۔ صبح اُٹھے تھے دیکھ تیرا مُنھ

سنگ اسود نہیں ہے سنگِ بتاں ۔۔۔ بوسہ مومن طلب کرے کیا مُنھ

(۲) "زبان ہم آہنگ بیان" مثلاً یہ پوری غزل جس کا مطلع یہ ہے، ؎

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے | فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہونگے

خصوصاً یہ اشعار تو نہایت پاکیزہ ہیں یعنی ؎

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں | اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہونگے

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم | لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھسے بھی ناداں ہونگے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس | ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہونگے

(۳) "زبان ہم آہنگ جذبات" یعنی روانی جذبات مثلاً ؎

ہوئی تاثیر آہ و زاری کی | رہ گئی بات بیقراری کی

شکوۂ دشمنی کریں کس سے، | واں شکایت ہے دوستداری کی

یاس دیکھو کہ غیر سے کہدی، | بات اپنی امیدواری کی

کیا مسلماں ہوئے کہ اے مومن | حاصل اس بت سے شرمساری کی

(۴) "تشبیہات و استعارے" مثلاً ؎

دیدۂ حیران نے تماشا کیا | دیر تک وہ مجھے دیکھا کیا

بجھ گئی اک آہ میں شمع حیات | مجھکو دم سرد نے ٹھنڈا کیا

غیر عیادت سے برا مانتے، | قتل کیا آ کے اچھا کیا

جور کا شکوہ نہ کروں ظلم ہے | راز میرا صبر نے افشا کیا

دشمن مومن ہی رہے بت سدا | مجھسے میرے نام نے کیا کیا کیا

مومن کی بلند پروازی خیالات کی بلند پروازی نہیں، بلکہ جذبات و استعارات کی ہے۔ اگر جذبات نہ ہوتے تو ان کا کلام لکھنوی شعرا کے مشابہ ہوتا۔

اگر مومن کے انداز میں رنگ تصوف یا فلسفیانہ خیالات کی آمیزش ہوتی تو ان کا رنگ شعرائے دلی سے ملتا جلتا نظر آتا۔ لیکن مومن نہ تو داغ ہیں نہ آمیر، نہ درد ہیں نہ غالب، گو داغ اور امیر کی طرح انکی زبان ہے، کلام درد کی طرح انکے جذبات رواں ہیں، اور غالب کا فارسی رنگ بھی ان پر غالب ہے پھر بھی وہ سب سے الگ ہیں، انکا "عشق" بھی نیچرل ہے نہ کہ "بازاری"۔ اپنے عشق کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں، ع

"عشق پردہ نشیں میں مرتے ہیں"

اور اخلاقاً اس قسم کے عشق سے انکو خوف بھی ہے، جیسا کہ وہ دوسرے مصرعہ سے ظاہر کرتے ہیں یعنی۔ ع

"زندگی پردہ در نہ ہو جائے"

اگر ان کا عشق "بازاری" ہوتا تو ان میں خودداری نہ ہوتی، اور معشوقۂ فرہاد یعنی شیریں کے متعلق اس قسم کا خیال ظاہر نہ کرتے کہ ؎

شوخ بازاری تھی شیریں بھی مگر ورنہ فرقِ خسرو و فرہاد کیا

مومن کے خلاف غالب نے فرہاد کے عشق کو قصوروار ٹھیرایا ہے اور کہا ہے کہ فرہاد کا عشق کامل نہ تھا ؎

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

غالب اور مومن کے یہ دو اشعار ترازو کے دو پلّے ہیں، ایک میں فرہاد کا عشق وزن کیا گیا ہے، دوسرے میں شیریں کا حسن، فرہاد کی یہ کمزوری ننگ عشق نہیں، لیکن بقول مومن شیریں تو معشوق بنانے کے قابل ہی نہیں، غالب حقیقت کو حقیقی بنانے کی کوشش کرتے ہیں، اور مومن مجاز کو حقیقت کی طرف لانا چاہتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ جس سیڑھی پر غالب کا پچھلا قدم ہے اس پر مومن کا اگلا قدم، غالب اور مومن کے جذبات کا اگر مقابلہ کیا جائے تو اکثر جگہ یہ اختلاف ظاہر ہوگا مثلاً ذیل کے اشعار ؎

غالب:- قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

مومن:- کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

غالب:- کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

مومن:- کرکے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں گر وہ ہونگے بھی تو بے وقت پشیماں ہونگے

مومن خاں نے قصیدہ، مثنوی، واسوخت، رباعی، مرثیہ، معمہ، سہرا، تاریخ وغیرہ بھی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، یہ ان کی ہمہ گیری کی دلیل ہے، تاریخیں تو مخصوص طور پر خوب ہوتی ہیں۔ خصوصاً شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تاریخ وفات جو تاریخ ہی نہیں بلکہ ایک مکمل مرثیہ ہے۔ افسوس اس فقیہ کامل کے وفات پر تو شریعت و ہدایت کی تعلیم ہند میں بہت کمزور ہوگئی بقول شاعر ؎

دستِ بیدادِ اجل سے بے سروپا ہوگئے فقر و دین، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

اگر غزل کے لغوی معنی "سخن بازناں" کے ہیں تو مومن خاں اس مفہوم کو رنگ تغزل سے بخوبی نبھا گئے، اور سچ تو یہ ہے کہ اس اعتبار سے اگر اردو زبان میں کسی نے غزل لکھی ہے تو صرف مومن نے،

مومن خوددار و صداقت شعار ہونیکے ساتھ رنگیں مزاج بھی تھے، اور انکے مزاج کی رنگینی صرف شاعری تک محدود نہ تھی، ان کا دل کسی سبز خط معشوق پر نہیں آیا اس لئے انکے عشق کو، "بازاری" کہنا ظلم ہے، انھوں نے شریعت پر کوئی چشمک نہیں کی، اس لئے ان کے کلام کو "بدعت" کہنا

تعصب ہے، اور چونکہ انکا انداز عالمانہ تھا اس لئے ان کے اشعار کو بے معنی کہنا نادانی ہے اور ان کے کلام میں عیوب تلاش کرنا خود اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے،

مومن کا کلام ملکی جذبات سے بھی خالی نہیں ہے، ان کی غزلوں میں بسنت بھی ہے اور بہار بھی، ہولی بھی ہے اور نوروز بھی، دراصل خودداری کے اعتبار سے اگر وہ عرفی ہیں تو نزاکتِ زبان کے لحاظ سے سُور داس، عشق مجازی کے اکسائے ہوئے جذبات کی تنقید میں بھی انھیں یدطولیٰ حاصل تھا، بہ اعتبار عبرت دنیا کو وہ "زالِ بیسوا" نہیں کہتے، اور بہ اعتبار تصوف خدا سے عشق کا دعویٰ کرنا ان کے نزدیک چھوٹا منہ بڑی بات ہے، اس لئے انھوں نے صرف یہ کہدیا کہ خدایا ؎

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیرے خواہش ہے
نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنت کا

اور نعت میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ صرف یہ شعر ہے کہ ؎

مرا جوہر ہو سرتا پا صفائے مہر پیغمبرؐ
مرا حیرت زدہ دل آئینہ خانہ ہو سُنت کا



مومن کے کلام میں تغزل کے سوائے کچھ اور تلاش کرنا سعیِ حاصل ہے، کیونکہ جس طرح میر صاحب کے نشتر جذبات کے نشتر ہیں، مومن کے طنزیہ کنائے حقیقی تغزل کے نشتر ہیں، اور نشتر نہ تو خارِ مغیلاں ہو سکتا ہے نہ تریاق عراق ؎

جَل سمندر کے پان سے پیاس نہ کاہوں جائے
بادَل دوارا جَل وہی برشا سے جو آئے

تصویر اور رسالے "یا مکتبہ"

(از مولوی ظہیر الدین اظہر صاحب)

آجکل ملک کے گوشہ گوشہ سے اردو رسائل واخبارات شائع ہورہے ہیں۔ اور اگر موقت الشیوع رسائل کی کثرت ہی کسی زبان کی ترقی کا سبب ہوسکتی ہے تو ہی خواہان اُردو کو مسرت ہونی چاہیئے لیکن افسوس ہے کہ عام اُردو رسائل کی روش کچھ زیادہ مستحسن نہیں۔ کثرت تعداد کے ساتھ تجارت میں باہمی مقابلہ کا سوال پیدا ہوگیا۔ اور ہر رسالے کی یہ کوشش ہونے لگی کہ زیادہ سے زیادہ خریدار بہم پہونچائے۔ اگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اعلیٰ درجہ کا مفید لٹریچر پیش کرنے میں ایک رسالہ دوسرے رسالے سے سبقت لیجانے کی کوشش کرتا تو اس سے بہتر کیا بات تھی۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ ذوق سلیم رکھنے والوں کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی ہے۔ عام طور پر تو دنیا کے لوگ ظاہر پرست ہوتے ہیں شاید اسی لئے توسیع اشاعت کیلئے رسالوں کو بظاہر نظر فریب بنانے میں اتنا غلو کیا گیا کہ حسن معنوی کا لحاظ نہ رہا۔ کتابت وطباعت اور کاغذ کی عمدگی کے ساتھ ساتھ آرائش وزیبائش میں مختلف جدتیں کی گئیں۔ ٹائیٹل اور تصویروں کی رنگینی اور دلکشی بھی زیبائش کا جزو لاینفک قرار پائیں چنانچہ بعض ان ماہانہ رسالوں کے علاوہ جن کا شمار انگلیوں پر کیا جاسکتا ہے۔ اس وقت قریب قریب تمام رسالے باتصویر شائع ہوتے ہیں۔ اس مضمون میں اسکی گنجائش نہیں کہ تصویر کی ابتدائی تاریخ اور اس کی تدریجی ترقی پر روشنی ڈالی جائے یا اس امر پر بحث کیجائے کہ رسالوں میں تصویروں کا رواج کب سے اور کیوں ہوا اس کے لئے ضمناً یہ تذکرہ کرنا کافی ہوگا کہ مولوی محمد اظہار الحسن صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل غازی آباد کو خیر خواہ ہند بابت اکتوبر ۱۸۴۷ء جلد دوم کا ایک نمبر دستیاب ہوا ہے جس کے متعلق موصوف نے ایک مضمون جنوری ۱۹۳۳ء کے ہندوستانی میں شائع کرایا ہے۔ غالباً یہ رسالہ اُردو کا اولین ادبی ماہانہ رسالہ تھا جو مصور شائع ہوا۔ اُردو رسائل کے دور جدید کا آغاز اسی صدی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس دور میں اوّل اوّل مخزن وزمانہ اُردو رسائل میں ایک یا دو تصویریں شائع کیجاتی تھیں جو عام طور پر مشاہیر کی ہوتی تھیں مگر چند سال گذشتہ کے بعض پنجابی رسائل نے کثرت سے ہر قسم کی تصویریں شائع کرنا شروع کردیں جسکے بدولت آج ۱۹۳۳ء میں یہ حال ہے۔ کہ تصویر رسالے کا لازمی جزو تصور کیجانے لگی ہے

ہمیں اس مضمون میں صرف اسقدر دیکھنا ہے کہ دورِ حاضرہ میں ہمارے ادبی رسائل کس قسم کی تصویریں شائع کر رہے ہیں اور درِ اصل تصویروں کی اشاعت ہونی چاہیئے یا نہیں، اور اگر ہونی چاہیئے تو کس قسم کی تصویروں کی۔

مصوری اور شاعری مقاصد کے اعتبار سے بالکل متحد ہیں جن خیالات اور جذبات کے ماتحت ایک شاعر اپنے خیالات وجذبات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر شعر کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ مصور انھیں جذبات کو موقلم کی مدد سے نقشِ دلفریب کی صورت دیتا ہے۔ تخئیل دونوں میں قدر مشترک ہے۔ فطرت انسانی کو شاعری اور مصوری سے جو لگاؤ ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ اس لحاظ سے کوئی بامذاق شخص تصویروں کی اشاعت کا مخالف نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ ضرور محلِ نظر ہے کہ کس قسم کی تصویریں شائع کی جائیں۔

حاؔلی کے زمانہ سے ابتک غزل اور عشقیہ شاعری پر جسقدر اور جس قسم کی تنقیدیں ہو چکیں اور ہو رہی ہیں انکا اعادہ یہاں پر بے محل اور طوالت کا باعث ہوگا۔ بہر نوع ملک کے گوشہ گوشہ سے سنجیدہ اور متین نظم ونثر کے لئے صدائے احتجاج بلند کی جارہی ہے بعض حضرات نے تو اس قدر افراط وتفریط سے کام لیا اور غزل گو شعرا پر اس قدر بیجا اتہامات تھوپے کہ خدا کی پناہ۔ غزلیہ شاعری کو شہوت پرستی سے تعبیر کیا اور کسی غزل گو شاعر کو امرد پرست کہا۔ کسی کو راجہ اندر کا خطاب دیا اور کسی کو حضرت لوطؑ کی نافرمان امت سے منسوب کیا۔ غرض جو منہ میں آیا کہہ ڈالا۔ اور مخرب اخلاق اور حیا سوز اشعار کی مخالفت کے جوش میں سرے سے غزل ہی کے مٹا دینے پر آمادہ ہو گئے۔ خدانخواستہ میں اس بات کا حامی نہیں کہ خواہ مخواہ اس قسم کے اشعار لکھے جائیں جو ایک لڑکی اپنی ماں، ایک بھائی اپنی بہن، اور ایک بیٹا اپنے باپ کے سامنے نہ پڑھ سکے اس قسم کے اشعار سے ہمارے شعرا کو صرف احتراز ہی نہیں بلکہ دلی نفرت کرنی چاہیے خدا کا شکر ہے کہ ہمارے اہل الرائے اور مصلح اہل قلم کی مساعی مشکور ہوئیں۔ اور موجودہ زمانے میں ہمارے اکثر شعرا نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے متین اور سنجیدہ پہلو تلاش کئے اور نوے فیصدی شعرا اس منحوس وبا کے حملے سے محفوظ ہو گئے خدا کرے۔ باقی دس فیصدی شعرا بھی اس مہلک اور خطرناک مرض سے جلد شفایاب ہوں۔

لیکن احتساب کی کمی نے ہمارے رسائل کو اپنی ذمہ داریوں سے قطعی غافل کر دیا ہے۔

ادھر تو متبذل و رکیک ادب کے خلاف ہمارے اہل قلم کا یہ جہاد اور ادھر شاعری کی سگی بہن مصوری کی یہ درگت کہ اکثر رسالوں میں ایک دو فحش اور نیم عریاں تصویریں خاص خاص عنوانات کے ساتھ ضرور مل جاتی ہیں سمجھ میں نہیں آتا کہ سنجیدہ اور متین ادب کے علمبردار اہل قلم حضرات اسطرف کیوں متوجہ نہیں

ہوتے ؟ اگر شاعری کی بدمذاقی، ورفحاشی کی کچھ اصلاح ہوئی تو مصوری جو بعض علما کے نزدیک شاعری سے زیادہ سریع الاثر چیز ہے اخلاق کو تباہ کر رہی ہے۔ خرابی اخلاق کے متعلق جو خطرات شاعری سے تھے وہی امکانات موجودہ مصوری سے ہیں۔ ایک شاعر کے اس شعر پر کہ ؎

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ　　دیکھا مجھے تو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ

چاروں طرف سے شعر کی عدم متانت پر شور مچ رہا ہے۔ لیکن اس قسم کی تصویر کی اشاعت پر جس میں انگڑائی کے ساتھ ساتھ سینہ کا ابھار بھی خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہو کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا اگر داغ کے یہاں یہ شعر نکل آتا ہے ؎

اللہ رے حجاب بدگمانی تیری　　بھیجی ہے مجھے نصف بدن کی تصویر

تو داغ مرحوم کے پورے دیوان کو مجموعہ خرافات کہا جاتا ہے لیکن اگر کسی رسالے میں اسی شعر کے لگ بھگ بالکل عریاں تصویر معہ ایک شاندار عنوان یا نظم کے شائع ہوتی ہے تو شاہکار ہے۔ غالب جیسا متین اور سنجیدہ شاعر اگر ایک کیفیت کی تصویر یوں کھینچتا ہے ؎

اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے　　کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

تو اس کی ساری متانت اور سنجیدگی خاک میں ملا دی جاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی رسالہ ایک نوجوان حسین خاتون کی تصویر جس نے اپنے عاشق کے گلے میں باہیں ڈال رکھی ہوں شائع کرتا ہے تو کچھ نہیں۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں موجود ہیں بخیال طوالت ترک کی جاتی ہیں۔

بعض رسائل ایکٹریسوں اور طوائفوں کی تصویروں سے اپنے صفحات کو زینت دیتے ہیں جن رسالوں کا موضوع قلم ہو ان میں ایکٹریسوں کی ہیجان انگیز تصویریں شائع کی جائیں تو کوئی بات نہیں لیکن علمی اور ادبی رسالوں میں ایسی تصویروں کو جگہ دینے کی کیا تک ہے میں نہیں سمجھ سکا مجھے یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ حال ہی میں ایک نئے رسالے میں جس کے ایڈیٹر صاحب ماشاء اللہ ایم اے ہیں ہنسا بائی کی تصویر شائع ہوئی ہے یہ وہی ہنسا بائی ہیں جن کے متعلق پچھلے دنوں دہلی کی عدالت میں مقدمہ بھی چلا تھا۔ اور لطف یہ ہے کہ تصویر جس انداز سے کھنچوائی گئی ہے۔ اس کو اردوئے جدید میں "دعوتِ شباب" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ خدا معلوم ایڈیٹر صاحب کو اپنے ذوق حسن پرستی کی نمایش کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی۔ بعض ایڈیٹر صاحبان کی پستی مذاق کا تو یہ عالم ہے کہ انھیں یورپ کے فحش اور نیم عریاں تصویر کارڈوں کے بلاک بنوا کر شائع کرنے میں بھی تامل نہیں ہوتا۔ بعض رسائل ایسے بھی ہیں کہ وہ اس قسم کی فحش اور عریاں تصویریں شائع نہیں کرتے بلکہ ان میں ایک حد تک سنجیدگی ہوتی ہے لیکن بدقسمتی سے نگراں یا ایڈیٹر صاحب کی فن تصویر

سے عدم واقفیت کی بنا پر ان میں بھی کبھی غلط اور عنوان سے غیر متعلق تصویریں شائع ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ وہ مخرب اخلاق اور حیا سوز تو نہیں ہوتیں مگر مذاق سلیم ضرور مجروح ہو جاتا ہے مثال کے طور پر ایک تصویر کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ ماہ فروری ۱۹۳۳ء کے ایک رسالہ میں ایک تصویر بعنوان "مرحوم شوہر کے مزار پر" شائع ہوئی ہے۔ اگر تصویر کے ساتھ عنوان نہ ہوتا تو غالباً دیکھنے والوں کی توجہ مصور کے خیال کیطرف منعطف نہ ہو سکتی تھی۔ ایک نوجوان حسین عورت انتہائی رنج وغم کی حالت میں گردن جھکائے کھڑی ہے اس کے سامنے پتھر کی جالی ہے جس سے شاید مزار کا کٹہرہ دکھانا مقصود ہے۔ عورت سر سے پاؤں تک زیورات سے لدی ہوئی ہے اور اپنی آرائش اور زیبایش کے لحاظ سے بیوہ نہیں دلہن معلوم ہوتی ہے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک متوسط الحال ماں باپ کی لڑکی اور شوہر کی بیوی جو آج ہی عقد کے بعد رخصت ہو کر اپنے شوہر کے گھر آئی ہو اس سے زیادہ آراستہ نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان کا دستور ہے کہ شوہر کے انتقال کے بعد فوراً اسی وقت زیورات، رنگین لباس، غرضکہ جملہ سامان آرائش عورت سے علحدہ کر دیا جاتا ہے تا وقتیکہ وہ عقد ثانی نہ کرے بعض جماعتوں میں مذہباً اور بعض میں رواجاً اسے کسی طرح کے سنگار یا آرائش کرنیکا حق حاصل نہیں ہوتا۔ مندرجہ بالا امور کو مدنظر رکھتے ہوئے اس تصویر کو کس طرح صحیح کہا جا سکتا ہے؟ ایک بیوہ کا اس طرح آراستہ ہو کر شوہر کی قبر پر جانا قطعی خلاف فطرت اور کم از کم ہندوستانی رواج کے خلاف تو ضرور ہے۔ اس تصویر کا فطرت اور ملکی رسم و رواج کے خلاف ہونا اس بدنصیب بیوہ کی طرف سے ہمدردانہ جذبات کو بالکل فنا کر دیتا ہے اور دیکھنے والوں کا دماغ تصویر کے اغلاط کیطرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اگر اسی تصویر میں اس بیوہ کو سوگ کے لباس میں پیش کیا جاتا تو یقیناً تصویر کا مقصد پورا ہو جاتا۔ اگرچہ اس غلطی کی تمام تر ذمہ داری مصور پر عائد ہوتی ہے مگر ایڈیٹر صاحب بھی بری الذمہ نہیں ہو سکتے کہ اس قدر غلط تصویر کو اپنے رسالہ میں کیوں جگہ دی اور سب پر مستزاد یہ کہ "مرحوم شوہر کے مزار پر" کے عنوان سے ایک نظم بھی شائع کر دی جسکے مضمون سے تصویر کو کچھ یونہی سا تعلق ہے۔ بہرحال اس قسم کی غلط اور فحش تصویروں کے انسداد کی کوشش کرنی چاہئے اور مہذب اور شائستہ تصویریں شائع کرنی چاہئیں ورنہ ان بظاہر نظر فریب اور دلکش رسالوں سے وہ رسالے جو سادہ اور غیر مصور شائع ہوتے ہیں بدرجہا بہتر ہیں۔

ادبی رسالوں میں جو تصویریں شائع ہوں اُنسے ادب کو بھی تو کوئی واسطہ ہو۔ سیاسی، مذہبی، یا ادبی مشاہیر کے فوٹو شائع ہونے چاہئیں۔ یا پھر ایسی تصویریں شائع کیجائیں جنمیں کسی نفیس اور پاکیزہ خیال کی نقاشی کی گئی ہو، یا مناظر قدرت کا عکس ہو، اور اگر نقوش حسن و عشق کی اشاعت ہی منظور ہو تو پھر عشق و ہوس میں کوئی امتیاز ہونا چاہئے۔

اشک حسرت

(از سید محبوب حسین اجمیری)

دنیا میں سکوت نیم شبی طاری تھا، ذرہ ذرہ محو خواب تھا، اور میں اپنے غم آلود جذبات کے آغوش میں ساکت، یکایک خیالات میں تلاطم ہوا، کتاب زندگی کے ورق کھل گئے، اور مجھے اپنا حسین و معصوم عہد طفلی یاد آگیا جب لوگ میری ضدیں پوری کرتے تھے، شاہوں کا عزل و نصب میرا کھیل تھا، لکڑی کے گھوڑے کو میں سرپٹ بھگایا کرتا تھا۔ ہاں میں مجسم شادمانی تھا۔ مگر آہ اب نہ وہ دن ہیں نہ وہ راتیں۔ میرے لبوں کا تبسم غائب ہوگیا، سینہ چاک ہے، غموں کی یورش ہے، میری شہنشاہی ختم ہوگئی، اب میری دلکش دنیائے تصور پر کس کی حکومت ہے، میرے خیالات پر کس کا قبضہ ہے میری تیرہ و تار زندگی مہیب اور خوفناک مرحلوں سے گذر رہی ہے، میری روح کسی کی جستجو میں پریشان ہے۔ میں تکلیفوں کے خون آلودہ آستانہ پر جبیں سائی میں مصروف ہوں۔ میرے دل کی بے پایاں گہرائیوں میں کسی کی طلب ہے، میری آنکھوں سے جوئے خون جاری ہے، جگر میں ناسور ہے۔

برکھا رت آئی اور چلی گئی، سردیاں آئیں اور گذر گئیں، گرمی شروع ہوکر ختم ہوگئی، رات دن میں اور دن رات میں بدلتا رہا، مگر یہ محبت کیش کسی کی یاد کی مالا جپتا ہی رہا ہے، کسی تغافل شعار کی مفارقت میں گل بداماں ہے، اب بھی رات کے پرسکون لمحات میں یہ وفا شعار گڑگڑا کر التجا کیا کرتا ہے، اے کاش اب بھی کوئی اسکی طرف متوجہ ہوکہ اسکی کاوشوں کی داد دے اور مجبور و مہجور کا خیال کرے، آہ یہ حرماں نصیب کسی کے نغمۂ شیریں کے لئے ہمہ تن منتظر ہے۔

جذبات کا غلبہ ہوا اور آنکھوں سے چند دُر ناسفتہ دامن پر گر گر کر غائب ہوگئے لیکن پھر بھی سکون خاطر نصیب نہوا کیونکہ ان شفاف موتیوں میں بھی تیرا عکس موجود نہ تھا اے کاش ؎

یہی آنسو کے قطرے گوہر مقصود بن جاتے
جو آجاتا تمہارا عکس میرے دیدۂ تر میں

تنقید کتب

بھگوت گیتا کے اُپدیش

یہ کتاب شریمد بھگوت گیتا کی بنیاد پر رادھاسوامی ست سنگ سبھا دیال باغ آگرہ کے صاحب جی مہاراج رائے بہادر سری یت آنند سروپ صاحب نے اپنے ست سنگی بھائیوں اور دیگر پریمیوں کیلئے تصنیف فرمائی ہے۔ خود شریمد بھگوت گیتا پر تنقید یا تبصرہ کرنا تو انسانی طاقت سے باہر ہے۔ بھگوان کرشن کا یہ اپدیش جو ارجن کو کورکشیتر کے میدان جنگ میں دیا گیا تھا۔ "مہابھارت" کے "بھیشم پرب" (باب) کا ایک حصہ ہے۔ جسے بیاس جی نے تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح بصورت مکالمہ تحریر فرمایا تھا۔ گیتا کی تصنیف کی یہ مدت اس لئے معین کی گئی ہے کہ یہ اپنشدوں کے بعد کی تصنیف ہے۔ چنانچہ بعض مقامات پر اسمیں اپنشدوں کی سطریں بجنسہ نقل ہیں۔ سانکھیہ و یوگ فلاسفی کا بھی اس میں مفصل ذکر آیا ہے جو پتنجلی رشی سے منسوب ہیں۔ جن کا زمانہ تقریباً دو سو برس قبل از مسیح تسلیم کیا جاتا ہے۔

ہندو اوتاروں میں سری رامچندر جی اور سری کرشن جی کو وشنو کا مکمل اوتار مانا جاتا ہے۔ رامچندر جی وشنو جی کے مظہر جمالی ہیں۔ اور کرشن جی مظہر جلالی ہیں گیتا میں جو کچھ مواعظ حسنہ درج ہیں۔ ان کا ہندوؤں میں خاص احترام کیا جاتا ہے۔

گیتا کی تعلیم کا لب لباب یہ ہے کہ کائنات میں دو قوتیں کار فرما ہیں۔ جن میں ایک فانی ہے اور دوسری لافانی۔ تمام موجودات فانی ہے اور تغیر و تبدل سے آزاد آتما لافانی ہے۔ ان دونوں سے افضل ایک تیسری طاقت ہے جو سب جگہ حاضر و ناظر اور جہاں میں ساری ہے۔ تین لوک کی پرورش اسی طاقت عظمیٰ کا کام ہے جسے پرشوتم کہتے ہیں۔ اسی سے واصل ہونا روحانی ترقی کی منزل اعلےٰ ہے۔ اگرچہ کرشن بھگتی پر زیادہ زور دیا گیا ہے لیکن گیتا میں رہبانیت یا ترک فعل کو پسند نہیں کیا گیا۔ فرمایا ہے کہ :-

"یگیہ کرموں کے ذریعہ سے انسان دیوتاؤں کو خوش کر کے دنیوی سامان حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن دیوتاؤں کی پرستش کرنیوالوں کی صرف دیوتاؤں کے دنیا میں رسائی ہوتی ہے۔ اور کچھ مدت کے لئے بعدہٗ ان کو اسی دنیا میں پھر واپس آنا پڑتا ہے اور سانکھیہ درشن کی تعلیم کے بموجب گیان کے ذریعہ سے

انسان کی آتما مادی آلودگیوں سے منزہ ہو کر انسان موت و حیات کے چکر سے چھوٹ جاتا ہے ۔۔
...... انسان کے لئے فعل یعنی کرم کا تیاگ ناممکن ہے ۔ فعل کئے بغیر انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔"

بھگوت گیتا کے تیسرے ادھیائے میں جو مندرجہ ذیل نصیحت کی گئی ہے وہ انسان کے لئے بہترین درس عمل اور خضر راہ ہدایت ہے فرمایا:-

"اے ارجن! تین لوک میں کون ایسا کام ہے جو مجھے کرنا لازمی ہو؟ یا ایسی کون سی چیز ہے جسکے حصول کی کوشش مجھ پر واجب ہو؟ لیکن باینہمہ میں کرم کرتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں اگر کرم کرنے میں سستی دکھاؤں تو میری دیکھا دیکھی سب لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائینگے جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ تینوں لوک بہت جلد نشٹ ہو جائینگے۔" وغیرہ" (شلوک ۲۲-۲۳ و ۲۴)

اچھوتوں کے متعلق بھی گیتا کا فیصلہ ناطق ہے۔ تاریخی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو موجودہ رسم و رواج کی بنیاد منوسمرتی پر قائم ہے جس میں ورن آشرم کی بنیاد "جنم" پر قائم کیگئی ہے۔ منوجی بقول محققین دو سو برس قبل مسیح گذرے ہیں۔ گیتا منوسمرتی سے پانچ سو برس پیشتر لکھی جا چکی تھی۔ بہرحال گیتا میں ورن آشرم کی بنیاد بجائے "جنم" کے "کرم" پر رکھی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

"دنیا میں گن اور کرم فرق کی بنیاد پر میں نے چار ورن رچے ہیں" (ادھیائے ۴ شلوک ۱۳)

"برہمنوں، کشتریوں، ویشیوں، اور شودروں کے جو الگ الگ کرم" فرائض) قائم کئے گئے ہیں۔ وہ خود ان کے سوبھاؤں کے گنوں کے حساب سے مقرر کئے گئے ہیں۔" (ادھیائے ۱۸ شلوک ۴۱)

مندرجہ بالا شلوکوں سے صاف ظاہر ہے کہ ہر شخص کو افعال و اعمال کی وجہ سے اخلاقی درجہ ملتا ہے۔ ہمارے نزدیک صاحب جی مہاراج نے یہ کتاب لکھ کر اردو ہندی داں اصحاب پر احسان عظیم کیا ہے۔ اسکی زبان میں صفائی اور سلاست کا کافی خیال رکھا گیا ہے۔ حتیٰ کہ معمولی سمجھ بوجھ کا شخص بھی کتاب کے مطالعہ سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ کاغذ سفید قیمتی، کتابت و طباعت دیدہ زیب قیمت عہ

ملنے کا پتہ:- اسٹور کیپر رادھا سوامی سنٹرل ست سنگ دیال باغ آگرہ

تخت طاؤس

مصنفہ مولوی محمد عبداللطیف خان صاحب گستہ قادری منشی فاضل (آنریزان پیشن) مطبوعہ لاہور رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلشرز، کاغذ کتابت طباعت عمدہ

قیمت ۱۲؍ (مجلد مع نام بحروف طلائی)

کتاب کے نام سے تو صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب دولت مغلیہ کے پانچویں شہنشاہ شاہجہاں کے شہرۂ آفاق "تخت طاؤس" کے تاریخی حالات ہیں لیکن فی الحقیقت فاضل و محقق مصنف نے اس میں مختلف حواشی کے ذریعہ دریا کو اس طرح کوزہ میں بند کر دیا ہے کہ کتاب نہ صرف عہد شاہجہانی بلکہ سلطنت مغلیہ کے متعلق واقعات و اشخاص کی ایک مکمل تواریخ بنگئی ہے۔ فاضل مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اسمیں بہت کچھ دماغ سوزی اور تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے۔

شروع کتاب میں چالیس ۴۰ صفحات پر مشتمل سید ظہیر الدین احمد علوی صاحب ایم۔ اے ایل ایل بی (علیگ) وکیل مین پوری کا لکھا ہوا "تعارف و تبصرہ" بھی ہے۔ جسکے ابتدائی پندرہ صفحات میں مصنف کتاب کے حالات زندگی اور ان کی علمی و ادبی خدمات کا حال بیان کیا گیا ہے بقیہ صفحات میں کتاب پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ جس میں کتاب کی تمام خوبیاں مفصل بیان کر دیگئی ہیں۔ ہمکو افسوس ہے کہ اس تنقید میں بعض بعض مقامات پر اس قدر مبالغہ اور غلو سے کام لیا گیا ہے۔ جس سے پروپگنڈا کی بو آتی ہے۔ اس کتاب کا ایک دوسرا نقص یہ ہے کہ اس کا طرز تحریر غیر ضروری حد تک عالمانہ ہے۔ یعنی جس چیز کو سلاست زبان کہتے ہیں وہ اس میں مفقود ہے۔ اکثر مقامات پر صاحب تبصرہ اور خود لائق مصنف نے ایسے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ استعمال کئے ہیں جو مذاق سلیم کو گراں گذرتے ہیں۔ وہی مفہوم جو ان فارسی و عربی کے الفاظ یا مصطلحات سے ادا کیا گیا ہے۔ اردو کے معمولی اور عام الفاظ سے ادا کیا جا سکتا تھا۔ نمونتہً ہم یہاں پر اس کتاب کے چند الفاظ درج کرتے ہیں تاکہ اگر مناسب سمجھا جائے تو آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہو جائے۔

(۱) سُرُر جمع سریر بمعنی تخت۔ (۲) صخور جمع صخرہ بمعنی پتھر۔ چٹان، اسی سلسلہ میں انگریزی اصطلاح (Igneous Rocks) کا ترجمہ "ناری الاصل صخور" کیا گیا ہے۔ (۳) مجوف (کھوکھلا) (۴) طواویس جمع طاؤس بمعنی مور پرندہ (۵) احتکاک بمعنی رگڑ (Friction) (۶) نفت بمعنی مٹی کا تیل۔ (۷) احیاض جمع حوض بمعنی معروف (۸) حبشی اللون حطب متحجر بمعنی پتھر کا کوئلہ۔ اگر زیادہ ضرورت تھی تو لفظ "زغال" استعمال کیا جا سکتا تھا جو فی زمانہ مستعمل ہو چلا ہے۔ (۹) ازہار جمع زہرہ بمعنی پھول (۱۰) دنی القدرت بمعنی تھوڑی سی یا قلیل۔ (۱۱) اتخاذ بمعنی خلاصہ عربی اخذ سے نکلا ہے۔ (۱۲) صلد بمعنی ٹھوس انگریزی (Solid) (۱۳) اقمشۂ نفیسہ بمعنی عمدہ عمدہ چیزیں۔ (۱۴) عطایا و نوال بمعنی بخشش و سخاوت۔ (۱۵) مخطط بمعنی خط کشیدہ (Under-lined)

مگر اس کے باوجود کتاب خوب ہے، اور ایک بہت بڑی تاریخی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اس قابل ہے کہ کتب خانوں میں رکھی جائے۔

معاشیات: مقصد اور منہاج[1]

یہ کتاب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب پی ایچ ڈی۔ پرنسپل جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی ان عالمانہ تقریروں کا مجموعہ ہے جو موصوف نے مارچ ۱۹۳۲ء میں ہندوستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ الہ آباد کی دوسری ادبی کانفرنس میں پڑھی تھیں اب یہ اکیڈیمی ہی کی طرف سے ٹائپ میں عمدہ کاغذ پر شائع ہوئی ہے۔

اس کتاب میں معاشی زندگی کی تشکیل کے امکانات، رجحانات اور لوازمات کا ایک نظری خاکہ پیش کیا ہے۔ تمدن کے ہر دوسرے شعبہ کی طرح معیشت انسانی پر نظر ڈالنے کے تین مختلف طریقے ممکن ہیں۔ یعنی (۱) مابعد الطبیعی نقطۂ نظر۔ (۲) علوم طبیعی کا نقطۂ نظر۔ اور (۳) علوم تمدنی کا نقطۂ نظر گویا معیشت کا علم یا تو معیاری علم ہو سکتا ہے، یا ترتیبی، یا الہامی، اور یہی تین شکلیں اس علم نے اختیار بھی کی ہیں۔ اور فاضل مصنف نے انھیں تینوں نقطہائے نظر سے معاشیات پر بحث کی ہے۔

فاضل ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا تبحر علمی محتاج تشریح نہیں ہے، اس کتاب کی خوبیوں کے متعلق صرف اسکے مصنف کا نام کافی ہے حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس تصنیف سے زبان اردو پر احسان عظیم کیا ہے۔ آپ نے حتی المقدور اسکو عام فہم اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ تاہم اس کا مفہوم ادق ہے، جس کی وجہ سے بعض مقامات پر طرز بیان خشک اور عام طبقہ کی فہم سے کسی قدر بالا ہو گیا ہے۔ بہرحال اردو ادب میں اس کتاب سے ایک قابل قدر اضافہ ہو گیا ہے۔

گلدستہ محاورات اردو[2]

مصنفہ مولوی عابد حسین خاں صاحب ہیڈ ماسٹر مڈل اسکول مٹھی گنج شہر الہ آباد۔

سوا دو سو (۲۲۵) صفحے کی یہ ایک چھوٹی سی کتاب ایک کوزہ ہے جس میں اردو محاورات کا دریا حسن و خوبی بند کر دیا گیا ہے۔ اس میں کل ۲۳ ابواب ہیں جن کی ترتیب بحساب حروف تہجی کیگئی ہے لائق مصنف نے اس میں دو ہزار کے قریب اردو محاورے درج کر کے ان کے معنی کی تشریح کی ہے اور ثبوت میں اساتذہ

[1] قیمت عہ ملنے کا پتہ:۔ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد

[2] قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ:۔ محمد بقا خاں صاحب ۲۳۴۔ پرانی منڈی الہ آباد۔

کے کلام سے سند بھی پیش کی ہے اور حسب ضرورت نثر کے فقرے درج کر کے محاورہ کا محل استعمال بھی بتایا ہے۔ مندرجہ ذیل نمونوں سے کتاب کی خوبیوں پر کافی روشنی پڑ سکیگی:۔

اجارہ کرنا۔ ذمہ لینا ؎

غالب ترا احوال سنا دینگے ہم ان کو		وہ سن کے بلالیں یہ اجارہ نہیں لیتے

فقرہ:۔ محنت کرنا ہمارا کام ہے مگر محمود ہم تمہارے پاس کرانے کا اجارہ نہیں لیتے۔

ٹھیک بنانا:۔ سزا دینا۔ گوشمالی کرنا ؎

اے خالِ رخِ یار تجھے ٹھیک بناتا		پر چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر

فقرہ:۔ محبوب اگر تم نے شرارت نہ چھوڑی تو میں تمھیں ٹھیک بنا کر چھوڑوں گا۔

جان جوکھوں:۔ جان کا خطرہ۔ ؎

اٹھانا عشق میں کیوں لے دلِ ناداں جوکھوں ہے		ابھی تو مال جوکھوں ہی پھر آگے جان جوکھوں ہے

(ذوق)

فقرہ:۔ ایسے پرانے اور اندھیرے کنویں میں گھسنا جان جوکھوں ہے۔

الغرض فاضل مؤلف نے اشعار کے انتخاب میں حتی الامکان غور و فکر اور محنت سے کام لیا ہے اور ایسے شعر درج کئے ہیں جو زبان اور خیال دونوں لحاظ سے موزوں ہیں۔ فقرے بھی آسان اور روزمرہ کی زندگی سے متعلق لکھے ہیں اگرچہ یہ کتاب برائے استفادہ طلباء مرتب کی گئی ہے لیکن اس سے عوام بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔

سرکارِ دو عالم ؐ

یہ کتاب مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے سیرت محمدی پر شائع کی ہے چھوٹی تقطیع کے ۱۳۹ صفحے ہیں۔ جنمیں رسول عربی کی زندگی کے تمام حالات، شمائل وخصائل، معاشرت، اقوال و افعال، غزوات و دیگر حالات مجملاً سب آگئے ہیں۔ شروع میں عرب، باشندگان عرب، مذاہب و معاشرت عرب پر بھی مختصر بحث کی گئی ہے۔ طرز ادا دلچسپ اور موثر ہے۔ جس سے ہر قوم و مذہب کا معمولی لکھا پڑھا

؎ قیمت ۸ ر مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے مل سکتی ہے۔

آدمی بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ زیادہ زور رسول عربی کی پرائیویٹ زندگی اور اخلاق پر دیا گیا ہے۔
اس کتاب میں ایک ذراسی کمی یہ رہگئی ہے کہ کتاب کے صفحہ ۱۰ سطر ۱۲ میں لکھا ہے "نقشہ میں دیکھو" حالانکہ کتاب میں کوئی نقشہ نہیں ہے۔

سالنامہ رسالہ کارواں لاہور ۱۹۳۳ء

محلہ چابک سواران لاہور سے پروفیسر تاثیر ایم۔ اے کی ادارت میں ۱۴۲ صفحات پر نہایت آب و تاب کے ساتھ نکلتا ہے۔

پنجاب کو عموماً اور لاہور کو خصوصاً اگر رسالوں اور اخباروں کا گھر کہا جائے تو بیجا نہ ہو گا۔ آئے دن نت نئے رسالے اور اخبار نکلتے رہتے ہیں۔ ان رسالوں میں کارواں بھی ہے جو سال بھر میں صرف ایک مرتبہ بصورت سالنامہ شائع ہوا کرے گا۔

محاسن ظاہری یعنی لکھائی چھپائی آرائیش و زیبائیش اور کاغذ کے اعتبار سے ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ سالنامہ کارواں لاہور سے زیادہ "حسین وجمیل" رسالہ اس سال ہندوستان میں کوئی دوسرا شائع نہیں ہوا ہے۔ لیکن مضامین کے اعتبار سے ہم کو اسے دیکھکر بہت مایوسی ہوئی۔ کیونکہ اس میں ڈھائی ڈھائی اور تین تین سطروں کی عبارتوں کو بھی "مضامین" میں شمار کر لیا گیا ہے۔ دراصل صفحہ ۵۲ پر ایک "مضمون" زیر عنوان "بچہ کی موت پر" صرف نصف سطر کا ہے۔

اس رسالہ کے بعض مضامین نظم و نثر بہت گرانقدر اور قابل تعریف ہیں۔ مثلاً "جاوید نامہ"، "لا صفر"، "جدید ہندوستانی مصوری"، "جدید تھیٹر اور ڈرامہ"، "اردو شاعری کا مستقبل اور رکاوٹیں"، "قصہ چہار درویش"، "عبدالحلیم شرر"۔ وغیرہ لیکن اسکے ساتھ ہی ہمکو افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ بعض مضامین نظم و نثر بہت ہی معمولی قسم کے درج کر دئے گئے ہیں۔ مثلاً ہمکو تعجب ہے کہ نظم "دعائے صحرا" کو اس پرچے میں کیوں جگہ دیدی گئی۔ اگرچہ اس کے پہلے دو شعر تو بہت اچھے اور صاف ہیں لیکن بحیثیت مجموعی یہ نظم بہت کمزور ہے۔ البتہ اسی شاعر کی دوسری نظم "تین نغمے" نہایت بلند پایہ نظم ہے۔ اس رسالہ کے مضامین کی ترتیب میں تناسب کا بھی خیال نہیں رکھا گیا مثلاً صرف مصوری اور متعلقات آرٹ پر سولہ سے زیادہ مضامین درج کر دئے گئے ہیں۔

بہرحال جہاں گل ہوتے ہیں وہاں خار بھی ہوتے ہیں۔ اور گل و خار دونوں ملکر زینت چمن کی تکمیل کر دیتے ہیں۔ کارواں کا یہ سالنامہ اس قابل ہے کہ ہر شخص اس کا مطالعہ کرے اور کتبخانوں میں رکھا جائے۔

قیمت ۱۲ ؍ ملنے کا پتہ:۔ منیجر صاحب رسالہ کارواں چابک سواران لاہور۔

سرمانبر بزم خیال شیلانگ

یہ رسالہ لیاقت علی صاحب صدیقی عاشق شرقی کی ادارت میں گورنمنٹ آسام کے صدر مقام شیلانگ سے ۱۰۴ صفحات پر شائع ہوا ہے۔ جو مختلف قسم کے ۵۳ مضامین نظم و نثر پر مشتمل ہے۔ بعض مضامین گراں پایہ ہیں۔ ملا رموزی کا "غصہ" بہت پر لطف ہے۔ جو رسالہ عالمگیر سے لیا گیا ہے۔ اسی طرح بعض دیگر مضامین بھی دوسرے رسالوں سے ماخوذ ہیں۔ انتخاب اچھا ہے اگرچہ ترتیب مضامین پر مولویت کا رنگ غالب ہے کاغذ معمولی، لکھائی چھپائی بھی کچھ اچھی نہیں لیکن آسام جیسے دور افتادہ مقام میں یہ بھی غنیمت ہے رسالہ کا عام چندہ تین روپیہ سالانہ، اور اس خاص پرچہ کی قیمت غالباً عہ ہے جو بہت زیادہ ہے۔ رسالہ مصور رہے۔

سالنامہ ۳۳ء سدابہار لاہور

یہ علمی ادبی و تاریخی مضامین سے معمور رسالہ مسٹر رگھبیر داس چوپڑہ کی ادارت میں لاہور سے شائع ہوا ہے۔ رسالہ کے دو حصے ہیں ایک ادبی، اور دوسرا فلمی، جسکے مدیر کے شرما صاحب ہیں اول حصہ میں ۵۸ مضامین نظم و نثر ہیں۔ اور فلمی حصہ آٹھ دلچسپ مضامین پر مشتمل ہے۔ رسالہ بعض قابل قدر مضامین اور نظموں، اور جاذب نظر و قابل تعریف تصویروں کا حامل ہے۔ ترتیب مضامین بھی اچھی ہے۔ کاغذ عمدہ، طباعت و کتابت نفیس ہے۔ عام چندہ سالانہ دو روپیہ پندرہ آنہ، اور سالنامہ کی قیمت ۱۲/ ہے۔ رسالہ ہر طرح سے قابل قدر ہے۔

اقبال (وزیر آباد پنجاب)

اس نام کا ایک ماہوار رسالہ زیر ادارت قاضی محمد رمضان صاحب تبسم قریشی و زیر سرپرستی نواب احمد یار خاں دولتانہ ۲۰×۳۰/۸ کی تقطیع پر جنوری سنہ ۱۹۳۳ء سے ۲ ½ جزو پر شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ ترتیب مضامین اکثر پنجابی رسالوں سے اچھی ہے، مارچ نمبر میں "نیکی کا بدلہ" فسانہ بہت دلچسپ اور پر اثر ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ، ٹائیٹل سادہ۔ قیمت سالانہ ســے

یادِ رفتگاں

جام صاحب نوانگر

لفٹننٹ کرنل مہاراجہ شری رنجیت سنگھ معروف بہ جام صاحب والی ریاست نوانگر کاٹھیاواڑ۔ جی، سی، ایس، آئی۔جی، بی، ای۔کے، سی، ایس، آئی جن کے انتقال سے رؤسا ہند کی جماعت کو ایک غیر معمولی صدمہ پہونچا ہے۔ ماہ ستمبر ۱۸۷۲ء میں بمقام سرودر کاٹھیاواڑ پیدا ہوئے تھے۔ آپ جیون سنگھ جی کے دوسرے صاحبزادہ تھے جنھیں ان کے عم بزرگوار سروبھے سنگھ جی جام صاحب نوانگر نے متبنیٰ کرکے اپنا ولیعہد بنا لیا تھا۔ آپ کی گدّی نشینی کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ بات یہ ہے کہ سروبھے سنگھ جی جام نوانگر کی تیرہ یا چودہ رانیاں تھیں لیکن ان میں کسی کے بطن سے بھی کوئی اولاد زندہ نہیں بچی۔ راجپوت رانیوں کے علاوہ سروبھے سنگھ نے ۱۸۵۶ء میں جام نگر کے ایک مسلمان خاندان کی چار حسین و جمیل بہنوں سے بھی شادی کرلی تھی لیکن ان میں سے کسی کے لڑکے کو ریاست کی گدّی نشینی کا قانونی حق حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

۱۸۵۶ء میں مسلمان بیویوں میں سے سب سے بڑی بیوی کے بطن سے ایک لڑکا کالوجی یا کالو بھائی نامی پیدا ہوا جسے ۱۸۶۸ء میں ریاست کا جائز ولیعہد تسلیم کرلیا گیا۔ ۱۸۷۶ء میں کالوجی کے بھی ایک لڑکا لاکھوجی پیدا ہوا۔ مگر ۱۸۷۷ء میں کالوجی معتوب ہو کر ولیعہدی سے محروم کر دیا گیا۔ اور اس کے خلاف اپنے والد مہاراجہ صاحب کے خلاف سازش کرنے کا الزام عائد کیا گیا جس کی علت میں کالوجی کو جلا وطن کر دیا گیا۔ اور اب ریاست نوانگر پھر بغیر کسی ولیعہد کے رہ گئی، کیونکہ باپ کے ساتھ اس کا بیٹا لاکھوجی بھی معتوب ہو گیا۔

اس کے بعد سروبھے سنگھ جی نے ایک بچہ متبنیٰ کیا جو دو سال بعد فوت ہو گیا۔ بالآخر مہاراجہ کی نظر انتخاب رنجیت سنگھ جی پر پڑی۔ اور حکومت ہند سے اُن کی تبنیت اور ولیعہدی کی منظوری حاصل کی گئی۔ لیکن یہ منظوری اس شرط سے ملی کہ اگر جام صاحب کی کسی راجپوت رانی سے کوئی ماجکمار

پیدا ہوا تو ریاست کا جائز مالک وہی قرار پائیگا۔ بہر نوع اس کے بعد رنجیت سنگھ جی کو راجکمار کالج راجکوٹ میں تعلیم کی غرض سے بھیجا۔ ادھر ۱۸۸۲ء میں جام صاحب کی دوسری مسلمان بیوی سے ایک اور بیٹا پیدا ہوا جس کا نام جسونت سنگھ رکھا گیا۔ چنانچہ اس کے لئے بھی وراثت کا جھگڑا شروع ہوگیا، اور گورنمنٹ آف انڈیا نے معاملہ کی تحقیقات کے بعد جسونت سنگھ کو ولیعہد تسلیم بھی کرلیا۔ چنانچہ یہ ۱۸۹۵ء میں ریاست نوانگر کی گدی پر بیٹھا اور رنجیت سنگھ مرحوم کے لئے ریاست کے خزانہ سے دس ہزار روپیہ سالانہ کا وظیفہ منظور کیا گیا۔ یہ معاملہ پارلیمنٹ تک پہونچا مگر وزیر ہند نے جسونت سنگھ ہی کو برقرار رکھا۔ ریاست نوانگر کاٹھیاواڑ کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے جس کا رقبہ ۳۷۹۱ مربع میل اور آبادی پانچ لاکھ ہے۔ ریاست کی طرف سے چونسٹھ ہزار چوبیس روپیہ کا خراج مہاراجہ گیکواڑ بڑودہ کو اور پچاس ہزار تین سو بارہ روپیہ برٹش گورنمنٹ کو دیا جاتا ہے۔

اس اثنا میں رنجیت سنگھ نے راجکمار کالج راجکوٹ میں کرکٹ کھیلنا شروع کردیا تھا۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہوکر وہ مارچ ۱۸۸۸ء میں کیمبرج کے ٹرنیٹی کالج میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان گئے اور یہاں انھوں نے کرکٹ کی دنیا میں "رنجی" کے نام سے غیرمعمولی شہرت حاصل کرلی۔ اور اس میدان میں "جہان پہلوان" (World Champion) کہلائے۔

کیمبرج پہونچکر تعلیم کے علاوہ رنجیت سنگھ جی خاص انہماک کے ساتھ کرکٹ کھیلنے میں مصروف ہوگئے اور بڑے بڑے ماہرین فن اور پیشہ ور کھلاڑیوں سے داد تحسین لی۔ کرکٹ کے ساتھ ٹینس کا بھی سلسلہ جاری رہا، اور ۱۸۹۰ء میں انھوں نے ای۔ رینشا کو شکست دی جو اس زمانہ میں چوٹی کا کھلاڑی سمجھا جاتا تھا۔ بہر حال ۱۸۹۳ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کو کرکٹ کا بہت اچھا کھلاڑی تسلیم کرلیا گیا، اور وہ اپنا پہلا میچ "جنٹلمین ٹیم" کی طرف سے "پلیرز ٹیم" کے خلاف کھیلے جس میں اُنھوں نے فن کرکٹ بازی کا وہ کمال دکھایا کہ آئندہ سال انگلستان کے اضلاع نے ان کو اپنی طرف سے کھیلنے کی دعوت دی۔

رنجیت سنگھ جی نے سسکس ٹیم میں شامل ہوکر کھیلنے کا فیصلہ کیا، اور ۱۸۹۵ء میں ان کا سب سے پہلا بڑا کرکٹ موسم شروع ہوا۔ اور سسکس کی ٹیم نے ۱۸۹۵ء لغایۃ ۱۹۰۲ء جتنے میچ کھیلے ان سب میں سب سے زیادہ رن رنجیت سنگھ جی کے تھے۔ ۱۸۹۶ء اور ۱۹۰۰ء میں وہ کرکٹ میں "آل انگلینڈ چمپئین" (انگلستان بھر میں چوٹی کا کھلاڑی) ہوگئے۔ اور ایک فصل میں ۳۰۸۰ رن کئے جن کا اوسط فی میچ ۵۹٫۹۱ رہا تھا۔ رنجیت سنگھ یا "رنجی" کے کھیل کی خوبی یہ تھی کہ وہ نہایت تیز اور چابکدست ہونے کے ساتھ نہایت سکون و سکوت سے کھیلتے تھے جس میں نمود و نمائش کا کوئی رنگ نہ ہوتا تھا۔ جب تک گیند

اُن کے سامنے آکر نہ پڑتا تھا اُس وقت تک وہ خاموش اور ساکن کھڑے رہتے تھے لیکن گیند کا پڑنا تھا کہ ان کا بیٹ بجلی کی طرح چمکا اور گیند کا پتہ نہ لگا۔ کرکٹ کی دنیا میں "رنجی" پہلے شخص تھے جنھوں نے ایک فصل میں تین ہزار رن کئے۔ اور مسلسل تین سال تک یہ کمال دکھاتے رہے۔ یارک شائر کے خلاف ایک میچ ہوا جس میں اُنھوں نے ایک ہی دن میں دو مرتبہ (اننگ) سَو سَو سے زیادہ رن کئے۔ ۱۸۹۹ء میں وہ سسکس ٹیم کے کپتان ہو گئے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں تمام انگلستان کے بہترین کھلاڑیوں میں سے منتخب کر کے ایک ٹیم بنائی گئی جس کا نام "آل انگلینڈ اسٹوڈ ارٹس ٹیم" رکھا گیا۔ یہ ٹیم ۱۹۰۶ء میں آسٹریلیا میں جا کر کھیلی۔ اس میں "رنجی" بھی تھے۔ ۱۸۹۹ء کے موسم خزاں میں وہ ایک ٹیم کناڈا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کو لے گئے۔ دوسرے سال یعنی ۱۹۰۰ء میں انھوں نے ایک فصل میں پانچ مرتبہ "ڈوڈو" سو رن کئے۔ "رنجی" فی الحقیقت کرکٹ کی دنیا کے "شہنشاہ" تھے۔ مادرِ ہند نے ایسا شاندار اور نامور کرکٹ باز آج تک پیدا نہیں کیا۔ بڑے بڑے مشہور انگریز ماہرین کرکٹ کا فتویٰ ہے کہ ایسا "بیٹ" ایسا فیلڈر اور ایسا کپتان کبھی پیدا نہیں ہوا۔ یعنی "رنجی" تینوں خصوصیات میں لاثانی تھے۔ پہلے یہ قاعدہ تھا کہ لنچ کے وقت پیشہ ور اور شوقین کرکٹ باز علیحدہ علیحدہ کھانا کھاتے تھے لیکن رنجیت سنگھ نے سب سے پہلے یہ رسم توڑی۔ آپ نے فن کرکٹ بازی پر ایک مستند کتاب چھوڑی ہے جس کا نام "جوبلی بک آف کرکٹ" ہے۔

۱۹۰۴ء میں بمقام برائٹن سسکس اور لنکا شائر کے درمیان ایک میچ ہوا جس میں لنکا شائر کی طرف سے "رنجی" نے ۲۰۷ رن کئے اور پھر بھی "آؤٹ" نہیں ہوئے۔

گدی نشینی کمار جسونت سنگھ نے جام نوانگر ہو کر آٹھ سال تک حکومت کی۔ مگر وہ لاولد تھے اس لئے ان کی وفات کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا نے رنجیت سنگھ جی کے حق میں فیصلہ کیا جسے لارڈ مارلے نے منظور کر لیا۔ اور مارچ ۱۹۰۷ء میں کرکٹ کی دنیا کا "شہنشاہ رنجی" گدی نشین ہو کر جام صاحب نوانگر کہلایا۔ جس چیز نے ان کی گدی نشینی میں مدد دی، وہ ان کی کرکٹ میں ہر دلعزیزی تھی کیونکہ انگلستان میں اسکول کا کوئی لڑکا ایسا نہ ہوگا جو "رنجی" کا نام احترام کے ساتھ نہیں لے گا۔

خدمات ایک فرمانروائی حیثیت سے جام صاحب انتہا درجہ کے مطلق العنان تھے۔ اور ان کی سختی بعض اوقات اس حد تک پہونچ جاتی تھی کہ اُن کی رعایا اس کو "ظلم و ستم" سے تعبیر کرنے لگتی تھی۔ بایں ہمہ وہ حد درجہ کے جفاکش اور محنتی نہ مانروا تھے۔ وہ دن کے بارہ بجے سے شام کے پانچ بجے تک کام کر کے امور ریاست کو انجام دیتے تھے، اور کوئی بات اپنے عہدیداروں پر نہ چھوڑتے تھے۔

بعض اوقات روزانہ عرضیوں کی تعداد پچاس تک پہونچ جاتی تھی اور وہ سب کا مناسب فیصلہ کرکے اُٹھتے تھے۔ فرصت کے اوقات کرکٹ۔ فٹ بال، ٹھنکا رو غیرہ تفریحات میں صرف کرتے تھے۔ آپ کی ریاست میں کرکٹ کی دو ٹیمیں تھیں جن میں دو آدمی پیشہ ور کرکٹ باز ملازم تھے۔

جام مرحوم نے اپنی ریاست کو بہت کچھ ترقی دی۔ خصوصاً بندرگاہ بیڑی کی ترقی کے باعث تو بمبئی والے جلا اُٹھے تھے، کیونکہ اس کی وجہ سے ان کی تجارت میں معتد بہ کمی ہوگئی۔ جام صاحب نے ریاست میں بعض اصلاحات بھی کیں۔ لیکن آزاد سیاسی نظامات کے وہ سخت مخالف تھے، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی پسند نہ کرتے تھے کہ پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ یا اس کے ایجنٹ ریاستوں کے نظم و نسق میں کسی قسم کا دخل دیں، چنانچہ اسی بارہ میں کئی مرتبہ اُن کی گورنمنٹ سے بحث بھی ہو چکی تھی۔

گذشتہ جنگ میں انھوں نے گورنمنٹ کو فوجی امداد دی اور خود بھی میدان جنگ میں گئے۔ ولایت میں آپ نے اپنے محل کو زخمیوں کا اسپتال بنا دیا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں آپ کو کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ کا خطاب عطا ہوا۔ اور ۱۹۱۸ء میں آپ کو "مہاراجہ" بنا دیا گیا۔ اور بعدہٗ آپ کو جی سی۔ ایس۔ آئی۔ اور جی بی۔ ای۔ کے خطابات بھی ملے۔ ۱۹۲۰ء میں آپ نے جنیوا میں ہندوستان کی نمایندگی کا حق ادا کیا اور اس کے بعد ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۳ء میں بھی یہی خدمت انجام دی۔

چند سال سے جام صاحب مرحوم انگریزی تجارت کو فروغ دینے کے بڑے حامی تھے جس کو اہل ملک بے اطمینانی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لیکن اس کی تہ یہ تھی کہ جام صاحب اپنی ریاست کے بندرگاہ بیڑی کو فروغ دینا چاہتے تھے اور غیر ممالک سے مال درآمد کرکے چونگی (کسٹم) کے ذریعہ اپنی ریاست کی آمدنی بڑھانا چاہتے تھے۔

جام صاحب مرحوم بھی ایوان والیان ریاستہائے ہند کے کاموں میں بہت دلچسپی لیتے تھے ۱۹۳۲-۳۳ء میں آپ ہی نواب صاحب بھوپال کے بعد ایوان مذکور کے چانسلر منتخب ہوئے تھے آپ آل انڈیا فیڈریشن کی تحریک کے بھی سخت خلاف تھے۔ آپ کا خیال تھا کہ اگر دیسی ریاستیں فیڈریشن میں شامل ہوگئیں تو والیان ریاست کی شان فرمانروائی جاتی رہیگی۔ انھوں نے فیڈریشن کے خلاف اپنے اثر سے کام لیا اِس قدر پروپیگنڈا کیا کہ کاٹھیاوار کی چودہ ریاستیں اُن کی ہمخیال

ہو گئیں چنانچہ اُن کی وفات سے ایک ہفتہ پہلے جب لارڈ ویلنگڈن کی زیر صدارت ایوان والیان ریاست کا اجلاس ہوا تو جام صاحب نے بحیثیت چانسلر اس وفد کے کام کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے جو تیسری گول میز کانفرنس میں ریاستوں کی طرف سے شریک ہوا تھا فیڈریشن کی اسکیم کے خلاف بھی اپنے ذاتی خیالات کا اظہار فرمایا۔ مگر وائسرائے نے مداخلت کر کے روک دیا۔ اور فرمایا کہ ریاستی وفد کی رپورٹ پر تبصرہ کرنے کے بجائے آپ فیڈریشن کے خطرات پر اپنے ذاتی خیالات کا اظہار فرمانے لگے جس کا یہ موقعہ نہیں ہے۔ اس پر جام صاحب مرحوم بیٹھ گئے، اور رپورٹ بھی نہ پڑھی۔

عادات وخصائل

جام صاحب اپنے عادات وخصائل کے لحاظ سے آپ ہی اپنی نظیر تھے۔ آپ بیحد مہذب اور خلیق آدمی تھے۔ تقریر اس قدر فصیح وبلیغ کرتے تھے کہ سامعین مسحور ہو جاتے تھے۔ جس سوسائٹی میں شریک ہو جاتے تھے اس کی روح رواں بن جاتے تھے۔ جواہرات کا آپ کو بہت شوق تھا اور اُن کی شناخت میں آپ اس قدر نظر رکھتے تھے کہ بڑے بڑے جوہری آپ کا لوہا مانتے تھے۔ جواہرات کا ادنیٰ اساعیب بھی آپ سے نظر انداز نہ ہوتا تھا حتیٰ کہ جو قیمت آپ تجویز کرتے تھے وہ بالکل ٹھیک ہوتی تھی۔ آپ کا اخلاق اور آپ کی مہمان نوازی بھی ضرب المثل تھی۔ اور شکار پارٹیاں دینے میں بیحد مشہور ہو گئے تھے۔ چند ہفتے ہوئے کہ آپ کے یہاں مہاراجہ صاحب جیپور مہمان تھے جنھیں آپ نے خود شکار کھلایا۔ انگلستان کے مشہور ادیب مسٹر اے۔ جی۔ گارڈنر نے آپ کی نسبت اب سے سترہ برس پیشتر یہ لکھا تھا:-

"چھوٹی سی ریاست کے راجہ مگر ایک بڑے کھیل کے بادشاہ ہیں...... ہمارے زمانہ میں کرکٹ کے میدان میں کوئی شخص ایسا نہیں جس کے عمدہ کھیل کی مثال ان کے کھیل سے دی جا سکے ان کے کھیل میں حیرت انگیز اور غیر معمولی فقدان نمائش ہے، وہ شرقی سکون اور شرقی تیزی کے معجون مرکب ہیں۔ ان میں چیتے جیسا سکون اور چیتے ہی جیسی اچانک جھپٹ ہے۔ اُدھر سے بولر وکٹ کی طرف آ رہا ہے اور ادھر یہ بالکل بے حس وحرکت کھڑے ہیں۔ گیند کے ہاتھ سے چھوٹنے تک وہ بت بنے رہتے ہیں، اور جب تک گیند اُن کے قریب نہیں پہونچ جاتا وہ حرکت نہیں کرتے۔ بس اس کے بعد بغیر کسی نمائش یا تصنع کے ان کا بیٹ بجلی کی طرح چمکتا ہے اور گیند پر ضرب پڑ جاتی ہے، بایں ہمہ ان کے جسم کی پوزیشن میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ ان کے پاؤں اور بیٹ جہاں پہلے تھے وہیں بدستور نظر آتے ہیں۔ الغرض اس کے سوائے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ عین وقت پر بجلی

کی طرح اچانک بیٹ جھکا اور ضرب پڑ گئی۔ اگر عمدہ کرکٹ کے یہی معنی ہیں کہ کم از کم محنت سے زیادہ سے زیادہ نتائج برآمد ہوں تو یقیناً جام صاحب اپنی نظیر آپ ہیں۔"

کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ انگلستان جیسے ملک میں جہاں کے لوگ کرکٹ کے پیچھے دیوانے ہیں، اور ایک سے ایک اعلیٰ ماہر فن موجود ہے وہاں ایک ہندوستانی بزور بازو گوے سبقت لے جاتا ہے۔ اور لاکھوں کروڑوں انگریز اس کے معترف و مداح ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو ہر دلعزیزی برطانوی قوم کے تمام طبقات میں "رنجی" کو حاصل ہوئی وہ اب تک کسی دوسرے کو میسر نہیں ہوئی۔ مسٹر گارڈنر تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"اگر ہندوستان نے اس بات کی کوشش کی ہوتی کہ جو لوگ دور دراز فاصلہ پر اس کی قسمت کی باگ ہاتھ میں لئے بیٹھے ہیں وہ اس کی آواز سنیں اور سمجھیں، تو اس کو تسم بلب وبیٹ بدست جام سے زیادہ کامیاب مشنری نہیں مل سکتا تھا۔ ہمارے یہاں بڑے بڑے ہندوستانی آتے ہیں، جن میں جید عالم، متبحر فاضل، بے نظیر مقرر اور اعلیٰ کردار کے گوکھلے، بنرجی اور ٹیگور بھی ہوتے ہیں۔ لیکن وہ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ نہ ان کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہے نہ کوئی اُن کی بات سنتا ہے۔ مگر جام صاحب نے مشرق کو لاکر ہمارے خوش وقت جمہور کے قلوب میں بٹھا دیا ہے اور سکھا دیا ہے کہ مشرق والے بھی آدمی ہیں اور لطف و کرم کے مستحق"۔

الغرض ع خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنیوالے میں۔

وفات دہلی میں ایوان والیان ریاست کے اجلاس میں شریک ہو کر آپ چلے تو آپ کو خفیف سا نزلہ زکام ہو گیا جس نے بڑھتے بڑھتے کھانسی اور حلق کی سوزش کی صورت اختیار کر لی۔ یکم اپریل یوم شنبہ کی شب کو آپ [illegible] ضعیف ہونے لگی، بالآخر سرسام کی سی کیفیت طاری ہو گئی ہذیان ہو گیا۔ اسی حالت میں آپ بیہوش ہو گئے اور ۲۔ اپریل کو بروز اتوار ۵ بجے صبح کے انتقال فرمایا ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے آج وہ کل ہماری باری ہے۔

آپ نے شادی نہیں کی تھی اس لئے لاولد فوت ہوئے۔ اب آپکے جانشین آپکے بھتیجے راجکمار دگبجے سنگھ جی ہوئے ہیں۔ آپ کی وفات پر اعلیحضرت ملک معظم، ہزا کسلنسی والسرائے اور تمام والیان ریاست اور رؤسا ملک نے اور ہندوستان اور انگلستان کے بیشمار معززین نے اظہار غم و ملال کیا ہم بھی اس سانحہ پر اپنے دلی افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔

مشاہیر زمانہ

ہز اکسیلنسی نواب سر احمد سعید خاں بہادر آف چھتاری

گورنر صوبۂ متحدہ

ہز اکسیلنسی کپتان سر نواب احمد سعید خاں صاحب آف چھتاری بلند شہر کے ایک مشہور مسلم لال خانی راجپوت خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ ۱۸۸۸ء میں ضلع رہتک میں پیدا ہوئے اور قصبہ باغپت ضلع میرٹھ میں پرورش پائی۔ آپ کے سر سے والدین کا سایہ بچپن ہی میں اٹھ گیا تھا اس لئے آپ کے دادا نواب محمد محمود علی خاں صاحب نے آپ کو چھتاری بلا لیا تھا۔ اُس وقت آپ کی عمر آٹھ برس کی تھی، چنانچہ آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی اور چونکہ آپ کے خاندان کو دینیات سے خاص شوق تھا اس لئے سب سے پہلے آپ نے قرآن شریف حفظ کیا۔ بعد ازاں مدرسۃ العلوم علی گڈھ میں جا کر تکمیل تعلیم کی۔

۱۹۱۵ء میں آپ کو "نواب" کا ذاتی خطاب دیا گیا لیکن ۱۹۱۹ء میں یہ خطاب خاندانی ہو گیا۔ جنگ عظیم میں آپ نے حکومت کی جو امداد کی اس کے صلہ میں آپ کو "ایم۔ بی۔ ای" کا خطاب ہوا۔ بعدۂ ۱۹۲۱ء میں آپ سی۔ آئی۔ ای۔ ہو گئے۔

کچھ عرصہ تک تو آپ ریاست و زمینداری کے کاموں میں منہمک رہے، اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیمی اور تمدنی تحریکات میں بھی حصہ لیتے رہے آپ نے بلند شہر میں ایک مسلم اسکول قائم کیا جو اب زیادہ تر آپ ہی کی فیاضی کی بدولت چل رہا ہے۔ آپ نے راجپوت مسلمانوں کی تمدنی اصلاح میں بڑی جدوجہد کی۔ اور اسی سلسلہ میں ریفارم کانفرنس، اور آل انڈیا مسلم راجپوت فیڈریشن کی صدارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ اسی دوران میں آپ کی ہر دلعزیزی میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔ آپ نے سیاسیات کے میدان میں بھی ملکی خدمت انجام دینا شروع کر دی جنگ عظیم کے بعد جب مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کے ماتحت کونسلیں بنیں تو ۱۹۲۰ء میں آپ بھی صوبجات متحدہ کی قانونی کونسل میں منتخب شدہ ممبر کی حیثیت سے داخل ہوئے اور آپ کے حلقۂ انتخاب میں آپ کی خدمات اس قدر مقبول عام ہوئیں

کہ ۱۹۲۳ء میں جب دوبارہ الکشن ہوا تو آپ بلا مقابلہ ممبر منتخب ہوئے۔ آپ مختلف کمیٹیوں اور
اجلاسوں میں بحیثیت ایک غیر سرکاری رکن کے ممتاز حصہ لیتے رہے۔ کونسل میں اول دن ہی
سے آپ کی ہردلعزیزی اور قابلیت کا اعتراف کیا گیا۔ اور جب سرہارکورٹ بٹلر گورنر صوبہ متحدہ نے
مسٹر سی۔ وائی۔ چنتامنی اڈیٹر لیڈر الہ آباد کو قلمدان وزارت سپرد کیا تو مسٹر چنتامنی نے نواب صاحب
کو کونسل کے سکریٹری کا عہدہ پیش کیا، مگر آپ نے اس وقت اپنے تئیں جونیر خیال کرکے اس کو
قبول کرنا نامناسب سمجھا اس ادنیٰ واقعہ سے آپ کے کیرکٹر پر روشنی پڑتی ہے۔ واقعی آپ جس
خدمت کو قبول کرتے ہیں اُس کو محض اعزاز کے خیال سے قبول نہیں کرتے بلکہ اس کے لئے
استحقاق اور اہلیت پیدا کرنا ضروری خیال فرماتے ہیں۔ بہرحال تین چار سال بعد جب ۱۹۲۴ء
میں پھر وزارت کا عہدہ خالی ہوا تو قرعہ فال آپ ہی کے نام نکلا، اور ہز اکسیلنسی سر ولیم میرس کی
نظر انتخاب نے آپ ہی کو چن لیا اور آپ وزیر ہو گئے۔ وزارت میں آپ اپنے پیشرو وزراء
کی پالیسی برقرار رکھتے اور کونسل کی رائے کا ہر موقعہ پر احترام کرتے رہے۔

۱۹۲۶ء میں آپ اگزکٹیو کونسل کے ممبر منتخب کئے گئے اور جب ۱۹۲۸ء میں سر الگزینڈر
موڈیمن گورنر صوبہ کا اچانک انتقال ہو گیا تو قانون نافذہ کی رو سے صوبہ کی عنان حکومت آپ
ہی کے ہاتھ میں آگئی اور آپ دو ماہ تک اس عہدۂ جلیلہ کے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے
انجام دیتے رہے اور اعلیحضرت ملک معظم نے آپ کے خدمات حسنہ کے اعتراف میں آپ کو ۱۹۲۸ء
میں "کے سی آئی۔ ای" کا خطاب عطا فرمایا اور ۱۹۳۲ء میں "کے سی۔ آئی۔ ای" بنا دیئے گئے۔

اوائل ۱۹۳۲ء میں آپ آنریبل سر فضل حسین کی جگہ اگزیکٹیو کونسل گورنر جنرل ہند کے ممبر
مقرر ہوئے۔ اس حیثیت سے بھی آپ نے دو ماہ تک اپنی اہم ذمہ داریوں کو نہایت لیاقت کے ساتھ
پورا کیا۔ اول اور دوم گول میز کانفرنس لندن کے مباحثات میں بھی آپ زمینداران صوبہ کے نمائندہ
کی حیثیت سے شریک رہے اور تیسری لندن کانفرنس میں بھی آپ جانیوالے تھے لیکن بعض اہم
پبلک کاموں کے باعث شریک نہ ہو سکے

آپ کے عہدۂ ہوم ممبری میں دو مرتبہ توسیع ہوئی، آخری توسیع مئی سنہ حال تک کے لئے
ہوئی تھی لیکن پچھلے ماہ ہز اکسیلنسی سر مالکم ہیلی گورنر صوبہ متحدہ کو وزرائے سلطنت نے اصلاحات ہند
کے متعلق مشورہ کرنے کی غرض سے لندن طلب کیا۔ چنانچہ آپ کے تشریف لے جانے پر اعلیحضرت ملک معظم
نے صوبہ کی عنان حکومت آپ ہی کے سپرد کی۔ اس سے پہلے بھی اسی قسم کا موقعہ پیش آیا تھا لیکن

اس وقت آپ کو موقع نہیں دیا گیا تھا جس سے تمام اہل ملک میں ایک طرح کی ناخوشی پھیل گئی تھی مگر اس دفعہ حق بحقدار کے مسئلہ پر عمل کیا گیا۔ چنانچہ صوبہ میں ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک آپ کے تقرر کو نظر استحسان سے دیکھا گیا ہے، جیسا کہ آپ نے خود حال ہی میں ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا۔ آپ کا تقرر تمام ہندوستانیوں کی عزت افزائی ہے۔ صوبے کی قانونی کونسل میں بھی ہر طبقے کے سربرآوردہ ممبروں نے آپ کے تقرر پر اظہار مسرت کیا ہے اور سرکاری و غیر سرکاری سبھی نمایندوں نے آپ کے دل و دماغ کے اوصاف حمیدہ کا اعتراف کیا ہے۔ ہم بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ مسند گورنری پر آپ کے تقرر سے تمام اہل صوبہ کو سچی خوشی حاصل ہوئی ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ کی ذات والاصفات ہندوستانی اخلاق اور مشرقی تہذیب کا بہترین نمونہ ہے، ہر طبقہ سے آپ کے تعلقات ہمیشہ شگفتہ رہے ہیں۔ آپ راجپوت نومسلم ہیں اور آپ کے خاندان کا اعلیٰ ترین راجپوتوں میں شمار ہے اور آپ اپنے قدیم خاندانی اعزا کیسا جو ابتک ہندو ہیں اُسی خلوص و محبت سے پیش آتے ہیں۔ درحقیقت آپ کا اخلاق اس قدر وسیع ہے کہ اس میں ذات۔ فرقہ۔ مذہب و نسل کے امتیازات بیجا کا کوئی دخل نہیں ہے اپنے سیاسی مخالفین سے بھی آپ ہمیشہ ہمدردی اور دلجوئی سے پیش آتے رہتے ہیں۔ کونسل میں بھی سوراج پارٹی کے لیڈر ہمیشہ آپ کے حسن سلوک کے معترف رہے۔ آپ نے اپریل گذشتہ میں قانونی کونسل میں سوراج پارٹی کے لیڈر مسٹر گوبند ولبھ پنتھ کی عدم موجودگی پر علانیہ اظہار افسوس فرمایا تھا بقول مسٹر چنتامنی آپ اپنے سخت سے سخت نکتہ چینوں کو بھی ہنسکر ہی جواب دیتے ہیں۔ آپ کی مہمان نوازی بھی مشہور خاص و عام ہے۔ آپ ایک علم دوست رئیس ہیں اور غرور و تمکنت کا نام و نشان بھی آپ کے مزاج میں نہیں ہے۔ زمانہ کو بھی عرصہ دراز سے آپ کی خدمت میں باریاب ہونے کا شرف حاصل ہے۔



مجلہ مکتبہ

عالمِ نسواں

موجودہ زمانہ کی ہندوستانی لڑکیاں بھی زندگی کے کسی شعبہ میں لڑکوں سے کم نہیں رہنا چاہتی ہیں۔ ہماری خاتونیں جدوجہد حیات میں اپنا پورا حصہ لینا چاہتی ہیں۔ چنانچہ ۴ اپریل کو سنٹرل ہندو اسکول بنارس کے دیالم منڈل کے زیر اہتمام لڑکیوں کے لئے تیراکی کا ایک مخصوص مقابلہ ہوا جس میں مندرجہ ذیل دو لڑکیاں کامیاب ہوئیں۔ پہلا انعام سنٹرل ہندو گرلس اسکول بنارس کی کماری ساوتری دیوی کو ملا جن کی عمر ابھی صرف تیرہ سال کی ہے دوسرا انعام کماری جانتی دیوی (عمر ۱۰ سال) کو جو سناتن دھرم کنیا پاٹ شالہ بنارس میں تعلیم پا رہی ہے۔ دونوں لڑکیوں نے دریائے گنگا کو تیر کر کے پار کیا، اور دونوں کو مسٹر پنا لال پرائز اور راجہ سر موتی چند کے عطیہ تمغے انعام میں ملے۔

گرانٹ میڈیکل کالج بمبئی کی طالبہ مسز کملا راجوار ڈی نے ڈاکٹری کے گذشتہ امتحان ایم۔ بی۔ بی۔ ایس میں سب سے زیادہ نمبر پائے ہیں۔ آپ کو دو وظیفے اور دو بیش قرار انعامات ملے ہیں۔

خانصاحب صاحبزادہ مجید الدین صابری رئیس میرٹھ نے صوبے کی خاتونوں میں ادبی شوق کو ترقی دینے کی غرض سے لیڈی ہیلی صاحبہ اور مسز مارش صاحبہ کے نام سے دو طلائی تمغے ان خاتونوں کو بطور انعام دینے کا اعلان کیا تھا جو ہندوستانی زبان میں کسی موضوع پر بہترین مضمون لکھیں چنانچہ لیڈی ہیلی میڈل شریمتی راجیشوری دیوی مصر لکھیری کو اور مسز مارش میڈل مس اختر جہاں لائق علی طالبہ مسلم کالج نسواں علیگڈھ کو ملا ہے جنھوں نے اس موضوع پر کہ "عورتیں ہندوستان کی ترقی میں کس طرح مدد دے سکتی ہیں" بہترین مضمون لکھے ہیں۔

میلا بیٹھ الہ آباد نے عورتوں کو ہندی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے متعلق بہت سی سہولتیں دے

رکھی ہیں۔ حال میں اُس نے ہندی کی شاعرہ خاتونوں کی ایک خاص کانفرنس الہ آباد میں منعقد کی تھی۔ اسی کے ساتھ ایک مخصوص مشاعرہ بھی منعقد ہوا جس میں صرف عورتوں نے اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ یہ کوی سمیلن ۱۶۔ اپریل ۱۹۳۳ء کو صوبہ متوسط کی شریمتی سوبھا راؤ دیوی چوہان صاحبہ کی زیر صدارت ودیاپیٹھ ہال الہ آباد میں ہوا تھا جس میں تقریباً چالیس خاتونوں نے شرکت فرما کر دادِ سخن دی۔ مندرجہ ذیل خاتونوں کا کلام بہت پسند کیا گیا۔

مسز ودیا وتی تخلص "کوکل" کو کئی تمغے دیئے گئے۔ مسز راج رانی چوہان جھانسی کو بھی ایک تمغہ ملا۔ شریمتی تورن دیوی لکھنوی المتخلص بہ "لالی" شریمتی وشنو کماری دیوی کانپور، شریمتی راجکماری دیوی جھانسی کی نظمیں بھی خاص طور پر قابل داد تھیں۔ شریمتی کوکل کی نظم "آنسو" اس قدر رقت انگیز تھی کہ تمام حاضرین اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

مسز مُتنی اہلیہ محترمہ خان بہادر شیخ محمد مُتنی ڈپٹی کمشنر ادناؤ نے گلگھا میں ایک گرلس اسکول کا افتتاح فرمایا جو رانی صاحبہ گلگھا نے حال ہی میں قائم کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک ایٹ ہوم پارٹی بھی دی گئی جس میں متعدد معزز خواتین شریک تھیں۔

شریمتی رادھا پیاری ماتھر جو مسٹر کنور بہادر منصف ایٹہ کی اہلیہ محترمہ ہیں آنریری مجسٹریٹ مقرر کی گئی ہیں۔

۴۔ اپریل کو خواتین صوبہ دہلی کا چھٹا سالانہ اجلاس زیر صدارت لیڈی نوئیس منعقد ہوا منجملہ دیگر خواتین کے مسز گپتا، مسز کلاڈ، مسز ماز مدار، مسز سوہن لال، مسز شرف، مسز بسنت لال، ڈاکٹر بینیل، مس ایف سی مارٹن، مس ونسنٹ، مس ینگ اور مس شرما بھی شریک تھیں۔ کونسل مذکور کی اگزیکیٹو کمیٹی نے ممبروں اور مہمانوں کی چائے وغیرہ سے تواضع کی۔ بعد ازاں مس پلے آنریری سکریٹری نے سالانہ رپورٹ پڑھ کر سنائی گونگوں بہروں کے اسکول کی رپورٹ مس مارٹن نے پڑھی۔ ڈاکٹر بینیل نے کونسل کی آئندہ سرگرمیوں کے متعلق بہت سی تجویزیں پیش کیں مس شرما نے روح پرور نغموں سے اور مس پلے نے بین بجا کر غذائے روحانی کا سامان بہم پہونچایا۔

جب سے چین و جاپان کے درمیان جنگ شروع ہوئی ہے جاپانی جرنیلوں کی بیویوں نے اپنے خانگی مصارف میں بے حد تخفیف کر کے فوج کے لئے ایک امدادی فنڈ جمع کیا ہے۔ اس فنڈ میں بارہ ہزار عورتوں نے چندہ دیا جس میں سے تینتیس ۳۳ ہزار ین (جاپانی سکہ) کی قسط دی جا چکی ہے۔

امسال لیڈی ایولین کابولڈ نے جو ایک انگریز امیرزادی اور نومسلمہ ہیں فریضۂ حج ادا کیا۔ آپ پہلی انگریز خاتون ہیں جن کو یہ سعادت نصیب ہوئی۔

آبشار

(از جناب علی اشرف صاحب ایڈیٹر روزنامہ صبح دکن حیدرآباد)

آستینوں میں چھپائے ہوئے برقِ بیتاب — ہوں میں اِک نور کا پیکر کہ بہ شکلِ سیماب
ہر طرف بڑھ کے لٹاتا ہوا دُرِّ نایاب — پھیلتا جاتا ہوں دُنیا پہ میں مانندِ سحاب
یہ روانی ہے کہ ہے اشک فشانی میری
موجِ مضطر کا تماشا ہے کہانی میری

میں کہیں نغمۂ پرورد سنانے نکلا — مضطرب ہو کے کہیں شور مچانے نکلا
کہیں دامانِ تجلّی کو اُٹھانے نکلا — حُسنِ بے پردہ کو سو حشر دکھانے نکلا
آپ منظور ہوں میں آپ ہی میں ناظر ہوں
آپ مسحور ہوں میں آپ ہی میں ساحر ہوں

ہوں کبھی وقفِ بلندی کبھی صرفِ پستی — جنسِ بربادی و رفعت بھی ہے کتنی سستی
دیکھنے والا جو دیکھے مرے دل کی بستی — پائے اِس رنگِ تغیّر میں نمودِ ہستی
ہے اجل دیکھ کے حیرت میں تماشائے حیات
ایک آفت ہے قیامت ہے سراپائے حیات

آہ! یہ رنگِ تغیّر کا تماشا کیا ہے — جس طرف دیکھئے ایک کھیل نیا ہوتا ہے
کس کے جلوے ہیں یہ سب کون یہ در پردہ ہے — آخر اس جلوہ نمائی کا بھی کیا منشا ہے
کچھ نہیں پاتا تو اپنے ہی میں کھو جاتا ہوں
اور اِس کیفِ تجسّس ہی میں سو جاتا ہوں

شادی و غم

(از جناب سید اعظم حسین اعظم)

عندلیبِ بوستاں کُنجِ قفس کی ہوگئی ۔۔۔ بھولی بھالی عشرتی چودہ برس کی ہوگئی
جوشِ عہدِ بیخودی انگڑائیاں لینے لگا ۔۔۔ پاسِ رسوائی مگر درسِ حیا دینے لگا
عقل کی ہر گام پر جذبات سے ہوتی ہے جنگ ۔۔۔ اب وہ بچپن کی چہلیں ہیں نہ وہ طفلانہ رنگ
دل میں بجلی کی تڑپ اس پر بھی شرمائی ہوئی ۔۔۔ اب سہیلی تک سے ملتی ہے تو گھبرائی ہوئی
کھیل کے بدلے عدیم الفرصتی رہنے لگی ۔۔۔ کام دھندے میں اب اُلجھی عشرتی رہنے لگی
باخبر سود و زیاں سے طبع سادہ ہوگئی ۔۔۔ گھر کی ہر اک چیز سے الفت زیادہ ہوگئی
دفعتہً سب کے خیالوں میں تغیر آگیا ۔۔۔ عشرتی مانجھے بٹھائی جائے یہ طے پاگیا
لیکے گلشن سے صبا تہنیتِ شادی بڑھی ۔۔۔ خانۂ عشرت کی مہمانوں سے آبادی بڑھی
کٹ گئے حسرت کے دن عشرت کی رات آہی گئی ۔۔۔ آخر اک وقتِ معیّن پر برات آہی گئی
مطربہ کرنے لگی اک سو ترنم ریزیاں ۔۔۔ زلف میں کیں تازہ آرائش نے عنبر بیزیاں
فرطِ شادی سے کھلی جاتی تھی ہر دل کی کلی ۔۔۔ بج رہا تھا گوشے گوشے میں عجب سازِ خوشی
رات بھر یہ جشن تھا دن بھر یہی تھی دھوم دھام ۔۔۔ دفعتہً لٹکائے زلفیں آگئی لیلیٰ شام
رخصتی کی ہر طرف تیاریاں ہونے لگیں ۔۔۔ عشرتی سے مل کے سب ہمجولیاں رونے لگیں
دل کو برمانے لگی بابل کے گانے کی صدا ۔۔۔ گھر کا گھر عشرت کدے سے بن گیا ماتم کدا
دیدنی ہے مادرِ ناشاد کی بیچارگی ۔۔۔ یوں سراسیمہ ہے گویا لٹ گئی یکبارگی
کس قدر تکلیف دہ ہے قلبِ دختر کے لئے ۔۔۔ چھوٹنا ماں باپ سے اور زندگی بھر کیلئے

دل میں دردِ ہجر لب پر آہِ آتشبار ہے
سوچتی ہے ماں سے چھٹ کر زندگی دشوار ہے

ایسی حسرت کی گھٹا اُس پر کبھی چھائی نہ تھی
قلب تھا بے چین لیکن تابِ گویائی نہ تھی

غل ہوا باہر عروس اندر سے آنا چاہیئے
دیر ہو جائے گی اب ڈولہ اُٹھانا چاہیئے

اُٹھتے ہی ڈولہ ہر اک تصویرِ حرماں ہو گیا
ایک کے جلنے سے گھر آباد۔ ویراں ہو گیا

ایک گھر آباد ہے تو ایک گھر برباد ہے
اے رواجِ دہر تو بھی کس قدر جلاد ہے

چھوڑنا اپنوں کو، کرنا غیر سے قہری نباہ
روحِ شاعر مانگتی ہے اس عقوبت سے پناہ

مسکراتی ہے مگر فطرت کہ تو ناداں ہے
مدتوں سے خوگرِ رنج والمِ انسان ہے

عشرتیؔ ماں باپ سے چھوٹی اگر تو کیا ہوا
ایسے کتنے غم ہیں انساں جنکو ہے بھولا ہوا

رشحاتِ نگم

(از جناب ڈپٹی لال نگم ایم۔اے)

کام کرنے میں تھے اگرچہ فرد
حوصلہ مند اور جیالے مرد

مرتے دم تک بھی کچھ نہ کام ہوا
کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد

سنو ہند والو! یہ دنیا کی ریت
کہ پردیسیوں کو نہیں ہوتی پیت

بھلا اُن کو ہو تم سے الفت بھی کیوں
مثل ہے کہ جوگی ہوئے کسکے میت

پارہ ہائے جگر

(از حضرت جگر مراد آبادی - بی - اے)

دل ہو گیا غرقِ بادۂ ناب
تصویرِ جہاں نظر میں ہے خواب

بیگانۂ اصل ہو چلا ہوں
بیدادِ خرد کی اب نہیں تاب

کچھ گل میں کچھ آرزوئے گل میں
پنہاں ہیں اذیتوں کے اسباب

ہوش و خرد و شعور و ادراک
ڈالے ہیں حقیقتوں پہ جلباب

رفتہ رفتہ ہو نہ رہے گی
اپنے مرکز پہ روح بیتاب

کھلتے گئے غم سے جس قدر ہم
ہوتی گئی کشتِ روح سیراب

نکہت سے سحر ہوئی معطر
پھولوں پہ تھا کس کا بسترِ خواب

بالیدہ ہو روح جن سے ملکر
ایسے ہیں عزیز دوست کمیاب

ہوں بندۂ بندۂ محبت
جنت ہے جگر خلوص احباب

غم نے بیہوش کر دیا مجھ کو
خود فراموش کر دیا مجھ کو

وہ دلِ دردمند کی آواز
ہمہ تن گوش کر دیا مجھ کو

گل رنگیں کہ ساغرِ مے ہے
مست و مدہوش کر دیا مجھ کو

خانہ آباد اے سحابِ بہار
سر بسر جوش کر دیا مجھ کو

آہ اے جلوۂ بہارِ ازل
تو نے مے نوش کر دیا مجھ کو

اب کہاں وہ نشاط و شوق جگر
دل نے غم کوش کر دیا مجھ کو

علمی خبریں اور نوٹ

صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ کے علمی ذوق کی کیفیت ان اعداد و شمار سے ظاہر ہو سکتی ہے جو تعلیم کے متعلق گذشتہ مردم شماری کے سلسلے میں حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ ۱۹۱۱ء میں صوبہ میں خواندہ آدمیوں کا اوسط ۳۴ فی مربع میل، ۱۹۲۱ء میں ۳۷ فی مربع میل اور ۱۹۳۱ء میں ۴۷ فی مربع میل تھا۔ تعداد کے حساب سے خواندہ اشخاص کا شمار ۱۹۱۱ء میں ۱۶ لاکھ ساڑھے اٹھارہ ہزار ۱۹۲۱ء میں ۱۶ لاکھ ۰۰ ہزار آٹھ سو ستر اور ۱۹۳۱ء میں بائیس لاکھ ۵۹ ہزار چھ سو اڑتیس تھا۔ یعنی ابھی تک خواندہ اشخاص کا اوسط صوبہ کی مجموعی آبادی سے پانچ فیصدی سے بھی کم ہے۔

ان میں کتنے مرد اور کتنی عورتیں خواندہ ہیں اس کا جواب یہ ہے:۔

سال	خواندہ مردوں کی تعداد	اوسط فی مربع میل	خواندہ عورتوں کی تعداد	اوسط فی مربع میل
۱۹۱۱ء	۱۵۰۵۹۴۵	۶۱	۱۱۲۵۲۰	۵
۱۹۲۱ء	۱۵۵۶۶۲۶	۶۵	۱۳۲۲۴۶	۶
۱۹۳۱ء	۲۰۴۳۴۱۰	۸۰	۲۱۶۲۲۸	۱۰

ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ آخری عشرہ میں زیادہ ترقی ہوئی۔ لیکن ابھی تک دیگر مہذب ممالک کے مقابلے میں ہماری خواندہ آبادی کا اوسط افسوسناک حد تک کم ہے ملک کے دیگر صوبجات اور ریاستوں میں پڑھے لکھے آدمیوں کا اس سے بھی کم اوسط ہے۔

مختلف اضلاع کی خواندہ آبادی کا اوسط فی مربع میل یہ ہے:۔

بنارس	۱۹۲	ڈیرہ دون	۱۹۰	گڈھوال	۱۸۳	الموڑہ	۱۶۷
نینی تال	۱۵۹	جالون	۱۴۵	آگرہ	۱۴۳	متھرا	۱۴۰

کانپور	۱۳۹	جھانسی	۱۳۷	ریاست ٹیہری گڑھوال	۱۳۶	غازیپور	۱۳۰
ریاست بنارس	۱۲۶	بلیا	۱۲۴	لکھنؤ	۱۲۳	الہ آباد	۱۱۸
فتحپور	۱۱۸	علیگڈھ	۱۱۵	میرٹھ	۱۰۹		

تعلیم نسواں کے لحاظ سے ڈیرہ دون کا نمبر اول ہے یعنی (۵۴) اس کے بعد علی الترتیب یہ اضلاع ہیں:- لکھنؤ (۲۷)، آگرہ (۲۶)، بنارس (۲۶)، نینی تال (۲۶)، الہ آباد (۲۰)، میرٹھ (۱۹)، متھرا (۱۷)، فرخ آباد (۱۷)، جھانسی (۱۶)، بجنور (۱۶)

گورنمنٹ رپورٹ میں خواندہ اشخاص کی تعداد بہ لحاظ مذاہب بھی دی گئی ہے۔ چنانچہ ناظرین زمانہ کی دلچسپی کے لئے ہم اس کو بھی درج ذیل کرتے ہیں

نام مذہب	مرد سنہ ۱۹۲۱ء	مرد سنہ ۱۹۳۱ء	عورت سنہ ۱۹۲۱ء	عورت سنہ ۱۹۳۱ء
ہندو سناتن دھرم	۶۴	۹۴	۷	۱۴
آریا	۲۹۳	۳۳۷	۹۳	۸۴
جین	۵۶۰	۵۹۰	۷۷	۱۲۸
سکھ	۳۲۷	۳۷۵	۵۶	۳۰
مسلم	۶۴	۹۷	۸	۱۶
عیسائی	۳۱۸	۳۳۷	۲۰۹	۲۱۴

مختلف ذاتوں اور فرقوں کی تعلیمی حالت دیکھی جائے تو تمام ذاتوں میں کائستھوں کا نمبر اول ہے یعنی ان میں ستر فیصدی مرد اور اُنیس ۱۹ فیصدی لڑکیاں خواندہ ہیں، دوسرا نمبر ویش قوم اور تیسرا نمبر سیدوں کا ہے۔ ان کے بعد علی الترتیب حسب ذیل تناسب ہے:- برہمن۔ مغل۔ سنار۔ کلوار۔ شیخ۔ راجپوت۔ ہریجن (اچھوت)

اُردو کے قدیم محسن نواب حیدر یار جنگ بہادر علامہ علی حیدر طباطبائی نظم کے چند خود نوشت حالات زمانہ کے کسی پچھلے نمبر میں شائع ہو چکے ہیں۔ اب ناظرین زمانہ یہ سُنکر خوش ہونگے کہ آپکا مکمل مجموعہ کلام بہ ردیف وار صوت تغزل کے تاریخی نام سے دارالاشاعت مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

کے اہتمام سے شائع ہو رہا ہے قیمت صرف دو روپیہ مقرر کی گئی ہے۔ شائقین دار الاشاعت مذکور سے طلب فرمائیں

اس سال کے آغاز میں اس صوبے کے چار نوجوان مصنفوں نے جن میں ایک لیڈی ڈاکٹر بھی ہیں "انگارے" نام سے اپنے دس قصوں کو کتابی صورت میں شائع کیا۔ ان میں چند افسانے ضرور ایسے تھے جن میں موجودہ زمانہ کی ریاکاریوں پر روشنی ڈالنے اور مروجہ رسم و رواج کی اندرونی خرابیوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہمارے نام نہاد اعلیٰ طبقے کی روزمرہ معاشرت کے نقائص کا مضحکہ اُڑایا گیا تھا۔ گو اس مجموعہ کا طرز بیان اکثر مقامات پر سوقیانہ تھا جو مذاق سلیم کو کھٹکتا تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نوجوانان عالم نے دنیا میں جو علم بغاوت بلند کر رکھا ہے اسی کا ایک ادبی کرشمہ اس کتاب کی اشاعت ہے۔ اسلامی بزرگوں اور مولوی صاحبان نے اس کو اپنے تقدس و احترام پر زبردست حملہ خیال کر کے اس پر لعن طعن میں کوئی کسر باقی نہ رکھی اس طرح اس چھوٹی سی کتاب کے خلاف ایک طوفان عظیم برپا ہو گیا جس نے ایوان کونسل میں ایک ہلچل سی برپا کر دی۔ ہمارے صوبے کے اخباروں میں بیسیوں مضامین اس کے خلاف شائع ہوئے۔ اکثر مقامات میں خاص جلسوں میں اس پر اظہار نفرت و حقارت کیا گیا اور گورنمنٹ سے اسے ضبط کرنے کی استدعا کی گئی جو بالآخر منظور و مقبول ہوئی۔ ۲۵۔ مارچ گذشتہ کے سرکاری گزٹ میں "انگارے" کو بحق سرکار ضبط کر لیا گیا ہے۔ گو اس کے پبلشر صاحب اس کی تمام جلدوں کو پہلے ہی نذر آتش کر چکے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اخلاق اور روحانیت کے علمبردار اور مذہب کے احترام و تقدس کے دعویدار حضرات اپنے اپنے طبقوں کی کمزوریوں اور خامیوں سے کب تک آنکھ بند کئے رہیں گے کوئی شبہ نہیں کہ انگارے کے لائق مصنفین کا طرز بیان شروع سے آخر تک مزاحیہ اور ظریفانہ تھا۔ اُنھوں نے بڑی ہستیوں کا بھی مضحکہ اڑایا تھا۔ یہ دونوں باتیں ادبی نقطۂ خیال سے آرٹ کے حدود کے اندر ہیں لیکن ہمارے نوجوان مصنفین نے اکثر مقامات پر خواہ مخواہ رکیک فقرے اور خلاف تہذیب جملے استعمال کر کے جو ٹکسال باہر ہیں اپنے تئیں مفت میں ہدف ملامت بنایا لیکن مسلم پریس میں جس انداز سے اس کتاب پر نکتہ چینی ہوئی ہے۔ اس سے زمانہ حال کی مروجہ تنگ خیالی کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ زمانہ حال کے مولوی صاحبان کچھ ہی کیوں نہ کہیں سوسائٹی کے ہر طبقے میں ریاکاری کے نقائص داخل ہو گئے ہیں۔ ہماری رائے میں ان نقائص کے باضابطہ علاج کی ضرورت ہے آپ ان نقائص کے نمایاں کرنے والوں کو مردود و ملعون کرنے یا ان کی تحریرات و تصانیف کو سرکاری اثرات سے کام لیکر ضبط کرا دینے سے ملک و مذہب کا کوئی بھلا نہیں کر سکتے ہیں۔

خط و کتابت

(از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی۔ الہ آباد یونیورسٹی الہ آباد)

بخدمت ایڈیٹر صاحب رسالہ "زمانہ" کانپور۔

جناب من،

میں شکرگذار ہونگا اگر آپ یہ چند سطریں اپنے گراں بہا رسالے کی اگلی اشاعت میں درج فرمادیں گے۔

مارچ ۱۹۳۴ء کے رسالہ زمانہ (ص ۹۸۔۱۶۳) میں جناب سلیم جعفر صاحب کا قابل قدر مضمون "نستعلیق ٹائپ" شائع ہوا ہے اور اس میں میرے تجویز کئے ہوئے ٹھپّوں کا بھی ذکر ہے۔ اس کے متعلق مجھے صرف اسقدر عرض کرنا ہے کہ:-

(۱) صفحہ ۹۴ پر (۳-الف) کی دوسری سطر میں جو شکل حرف کاف کی دکھائی گئی ہے اُسے میری تجویز سے اصلا تعلق نہیں۔ کاف کی یہ شکل نستعلیق کمیٹی حیدرآباد کے صاحب صدر نے تجویز فرمائی تھی جو فن خوشنویسی کے ماہر ہیں۔ دارالطبع سرکار عالی نے ایک ہی دن میں اس کا ٹھپہ تیار کرکے اسی کے مطابق چند لفظ چھاپے جو دوسرے ہی دن کے اجلاس میں پیش کئے گئے۔ مگر اس نئی شکل کو کمیٹی نے پسند نہیں کیا۔ میری رائے میں کاف کے مرکز کی وضع کو بدلنا چنداں ضروری نہیں۔

(۲) اُسی صفحہ پر (۳-ب) کی دوسری اور چوتھی سطر میں جو لفظ لکھے ہیں وہ کہنے کو تو میری تجویز کے مطابق ہیں لیکن صورت حال یہ ہے:-

ستمبر ۱۹۳۳ء میں نستعلیق کمیٹی کے دوسرے اجلاس میں میں نے اپنی تجویز پیش کی اور نہایت عجلت میں کچھ لفظ لکھوا کر دکھلائے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ان شکلوں میں ضروری تبدیلی و ترمیم کرنے کے بعد ایسے حرف بن سکتے ہیں جن میں نستعلیق کی شان ایک بڑی حد تک قائم رہے گی۔ کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ اجلاس میں میں اپنے تجویز کئے ہوئے حرفوں کو مکمل صورت میں پیش کردوں۔ اس کے بعد دارالطبع کے کارپردازوں نے اپنے طور پر میری مجمل تجویز کی بنا پر حرف بنائے۔ نہ ان حرفوں کے خاکے میری رائے سے بنے نہ اس کا مجھے علم تھا کہ دارالطبع میں یہ کام ہو رہا ہے۔ جب اکتوبر ۱۹۳۳ء میں کمیٹی کا تیسرا اجلاس منعقد ہوا تب معلوم ہوا کہ میری تجویز کی ہوئی شکلیں چھپ بھی گئیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایسی چیز میری طرف کیونکر منسوب کی جاسکتی ہے۔

اسی تیسرے اجلاس میں میں نے اپنے خاکے پیش کئے جن کو منجملہ گیارہ اراکین کے سات نے بہت پسند کیا اور موافقت میں رائے دی۔ کمیٹی کا یہ فیصلہ بعد کو محکمۂ سرکاری میں بھیجا گیا لیکن ابھی تک مجھے یہ نہیں معلوم ہوا کہ سرکار نے کیا فیصلہ صادر فرمایا۔

(۳) ملک کے سامنے میں نے اپنی تجویز کو ابھی تک اس لئے نہیں پیش کیا کہ ایک تو جہاں یہ تجویز ابتدائً پیش ہوئی وہاں سے ابھی تک کوئی جواب نہیں ملا۔ دوسرے یہ کہ میں نمونے کے طور پر کچھ ٹھپے بنوانے کی کوشش کر رہا ہوں، وہ ابھی تیار نہیں ہیں۔

امید ہے کہ میں جلد اپنی تجویز کو شائع کر سکوں گا۔

یونیورسٹی الہ آباد
۱۵۔ اپریل ۱۹۳۳ء

نیازمند
عبدالستار صدیقی

"مجاہ مکتبہ"

(۲)

(از پنڈت امبکا پرشاد باجپئی سابق اڈیٹر "بھارت متر" کلکتہ)

بخدمت اڈیٹر صاحب "زمانہ" کانپور

جناب من۔ تسلیم! میں نے کلکتہ یونیورسٹی کے طلباء ہندی ایم۔اے۔ کے لئے ایک کتاب "ہندی پر فارسی کا اثر" نامی لکھی ہے۔ مولانا آزاد کی کتاب "آبحیات" کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ قلندر بخش جرأت نے کچھ دوہے اور کبت لکھے تھے، مگر وہ میری نظر سے نہیں گذرے۔ مجھے مولانا عبدالقادر صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج کلکتہ سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مرزا جانجاناں مظہر کے لکھے ہوئے کچھ دوہے بعض اردو رسالوں میں شایع ہوئے ہیں، چونکہ یہ رسالے یہاں نہیں مل سکتے اس لئے میں آپ کے ناظرین سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ان کی اطلاع میں مذکورہ دوہے کہیں دستیاب ہو سکتے ہوں تو براہ کرم مجھے اس کی اطلاع دیکر شکر گذاری کا موقع دیا جائے۔ اگر وہ دوہے کسی اردو رسالے میں شایع ہوئے ہوں تو اس رسالہ کے پرچے میرے نام بذریعہ قیمت طلب پارسل بھیجدیئے جائیں۔ اس توجہ فرمائی کے لئے شکر گذار رہوں گا۔

نیازمند: امبکا پرشاد باجپئی
لوکمانیہ ٹائپ فاؤنڈری۔ ۱۰۲ مکتارام اسٹریٹ کلکتہ

ملاحظہ ہو

علمی ذوق رکھنے والے حضرات مندرجہ ذیل کتابیں ضرور منگائیں

پریم چند کی تازہ تصنیف

بیوہ

اس کتاب میں بیوہ کے دردناک واقعات لکھے گئے ہیں اور ان کی تعمیلات کا ذکر کیا گیا ہے جو ایک بیکس بیوہ کو آزمائش میں ڈالتے ہیں اسکے ساتھ ہی اس مسئلہ کو حل کرنیکی کوشش کیگئی ہے کہ بیواؤں کیلئے کس قسم کی زندگی بہترین ہے۔ حجم ۲۵۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ ۸ؔ

رامائن مسدس

(مصنفہ جناب منشی رامجی مل صاحب کنور سنبھلی)

اول تو اس رامائن میں مخصوص ایک یہ خوبی نمایاں ہے کہ قابل مصنف نے شری رامچندر جی کے چرتر کو عجیب مرغوب انداز و دلکش پیرائے میں ظاہر کیا ہے جو بمقابلہ دیگر رامائنوں کے نیا اور انوکھا ہے اور فرسودہ مضمون سے پاک و صاف ہے۔ آپ کی جدت طراز ذہن رسا نے ایسے ایسے نازک و نادر استعارات و تشبیہات دلکش اس حسن و خوبی سے استعمال کئے ہیں جو دیدہ زیب جامہ سے مزین و روحانی و وجدانی لطافت سے مملو اور معنی آفرینی میں قریب المافوق ہیں ہر شعر ملتا ہوا جادو اور نشتر کا کام کرتا ہے لطف محاکات و بلند پروازی تخیل تحسین و داد سے۔ اشلوک کی نوعیت کا رنگ بالکل نیا ہے فصاحت کا دریا لہریں لے رہا ہے غرضکہ یہ رامائن تنہائی کا مونس اور افسردگی خاطر کا ذریعہ تفریح اور عبرت کا درس دینے میں بے نظیر ہے معہ رنگین تصاویر حجم ۳۰۰ صفحات قیمت صرف تین روپیہ ؏

زمانہ بک ایجنسی نیا چوک کانپور سے طلب فرمائیے



بذریعہ استعمال سناٹوجن

پھر وہی بے برداشت بھوک!

بذریعہ استعمال سناٹوجن معدہ میں تعجب انگیز تقویت حاصل ہوجانیکے باعث بھوک کی کمی رفع ہوجاتی ہے اور دیگر تکالیف بھی اس کے ساتھ ساتھ جاتی رہتی ہیں آپ پھر ہر طرح کی غذاؤں کی لذت اُٹھانے کے قابل ہو جائینگے اور تمام جسم میں اسکے تقویت دینے والے اثر رسائی کی بدولت آناً فاناً میں بہ نسبت قبل اور بھی صحت مند اور طاقتور ہو جائینگے

سلطنت بھوپال سے محمود علی خانصاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"سناٹوجن کا استعمال کرکے میں ہمیشہ کارگر اور خوش مزاجی کے ساتھ رہتا ہوں اور علاوہ اسکے تقریباً دوگنی خوراک ہضم کرسکتا ہوں"

جبکہ بذریعہ استعمال سناٹوجن جملہ تکالیف جسمانی رفع ہوجاتے ہیں تو آپ کیوں معدہ کی گڑبڑی کی تکلیف کو برداشت کر رہے ہیں آج ہی اس تعجب انگیز مقوی غذا کا استعمال شروع کر دیں۔

SANATOGEN

ہر ایک دواخانہ اور بازار میں ملتا ہے

سناٹوجن تیار کرنیکے وقت سے پیک کرتے وقت تک ہاتھوں سے نہیں چھوا جاتا ہے

منتخب کتابیں

تاریخ
مدارالفاظ

کتاب	قیمت
تاریخ مغربی یورپ	عاؔ/
تاریخ ہند۔ قدیم	۸/
تاریخ الدولتین	۱عہ/
تاریخ الامت (۷ حصے)	۵عہ/

سوانح

کتاب	قیمت
سیرت محمد علی	سے/
تلاش حق (۲ حصے)	عاؔ/
حیاۃ حافظ	۱عہ/
سیرۃ عمرو بن العاص	عہ/
ٹالسٹائی	۳/
خادمات خلق	۱۰/

ڈرامے

کتاب	قیمت
پردۂ غفلت	عہ/
کھیتی	۶/
گناہ کی دیوار	۸/
صید زبول	۱۰/

ادب

کتاب	قیمت
سیر المصنفین (دو حصے)	چعہ/
کیمیاگر (افسانے)	عہ/
دیوان غالب (جرمنی)	عاؔ/
دیوان شیدا (")	عاؔ/
انتخاب میر	۱۲/
انتخاب سودا	۱۲/
انتخاب حسرت	۱۲/
نیرنگ (ادبی مضامین)	۱عہ/

متفرق

کتاب	قیمت
نفسیات شباب	سے/
آزادی (ترجمہ لبرٹی)	۱عہ/
مشاہدات سائنس	۱عہ/
ترکی جمہوریہ	۱عہ/
اسلامی تہذیب	۴/
مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ	۴/
نہرو رپورٹ (مکمل)	عاؔ/

مکتبہ جامعہ۔ دہلی

[illegible] جنرل پریس کانپور
ایڈیٹر و پبلشر دیانرائن نگم بی اے

حقوق محفوظ ہیں

رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۱۱

زمانہ

مرتبہ: دیانرائن نگم بی۔اے

جلد ۶۰	جون سنہ ۱۹۳۳ء	نمبر ۶

فہرست مضامین

تصویر:- سید حسن امام مرحوم

زمانہ پریس کانپور سے شایع ہوا

قیمت سالانہ ممالک غیر سے ۱۰، ششماہی ۵/ - ہندوستان کیلئے ششماہی تین روپیہ

قیمت فی پرچہ ۸/

قیمت سالانہ ۵ر

Zam-Buk زمبک

انتہا درجہ کا حیرت انگیز مرہم جو آجتک زخموں جراحتوں

یا مرض جلد کے لئے ایجاد ہو سکا

حیرت انگیز طور پر تسکین دیتا ہے فوراً آرام کرتا ہے

بیش قیمت جراثیم کش ہے

اور خالص جڑی بوٹیوں سے بنا ہے



حیوانی چربی سے پاک

تمام دوا فروش زمبک کو ایک روپیہ یا
اڑھائی روپیہ فی ڈبیہ فروخت کرتے ہیں۔
ایجنٹس: میسرز اسمتھ اسٹانسٹریٹ اینڈ کو لمیٹڈ اسٹالی کلکتہ



سید حسن امام مرحوم

تاریخ پیدائش ۳۱ اگست سنہ ۱۸۷۱ء تاریخ وفات ۱۹ اپریل ۱۹۳۳ء

زمانہ

جلد ۶۰   جون ۱۹۳۳ء   نمبر ۶

آئرلینڈ

(۲)

(از بابو انتت پرشاد نگم بی اے ایل ایل بی)

۱۹۲۱ء کا صلحنامہ

دسمبر ۱۹۲۱ء کا پہلا ہفتہ آئرلینڈ کے لئے عجیب بےچینی کا زمانہ تھا۔ ہر متنفس کی نگاہیں لندن کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ جہاں آئرش نمائندے اور برطانوی مدبرین حکومت آئرلینڈ کے مستقبل کا نقشہ کھینچ رہے تھے۔ ۶۔ دسمبر کی صبح کو اس تاریخی عہدنامہ پر دستخط ثبت ہوگئے۔ اس کی خبر آتے ہی ڈی ویلرا خوشی سے جامے میں پھولا نہ سماتا تھا۔ اس نے کہا کہ ہماری فتح ہوگئی۔ نمائندوں کو ہدایت تھی کہ دستخط کرنے سے پہلے مسودے کی ایک نقل بھیجکر دوبارہ منظوری حاصل کریں لیکن منظوری کی درخواست آئے بغیر صلح ہو جانے کے یہی معنی تھے کہ آئرش مطالبات بلاچون وچرا تسلیم کر لئے گئے۔ ڈی ویلرا کی خوشی کا یہی باعث تھا۔ لیکن جلد ہی اُس کی امیدوں پر پانی پھر گیا کیونکہ عہدنامہ کی جو نقل بعد میں آئی اس میں آئرلینڈ کے لئے مکمل آزادی کا سامان نہ تھا۔ اس عہدنامہ کی شرطیں مختصراً حسب ذیل ہیں :-

اول۔ دوم و سوم شرائط کا یہ منشا تھا کہ آئرلینڈ کی سیاسی حیثیت سلطنت برطانیہ میں کناڈا وغیرہ نوآبادیوں کی سی ہوگی۔ اس کا نام آئرش فری اسٹیٹ ہوگا۔ فری اسٹیٹ میں حکومت برطانیہ کی طرف سے ایک گورنر جنرل ہوگا جس کے تقرر وغیرہ کا وہی طریقہ ہوگا جو کناڈا کیلئے ہے

چوتھی دفعہ میں آئرش فری اسٹیٹ کی پارلیمنٹ کے ممبروں کے لئے مندرجہ ذیل حلف وفاداری

لینا طے ہوا :-

"میں .... سچے دل سے حلف لیتا ہوں کہ آئرش فری اسٹیٹ کے آئین کا جو قانونی طریقہ پر قائم ہے سچا وفادار رہونگا۔ اور ہز مجسٹی کنگ جارج پنجم ان کے ورثا اور جانشینوں کا بھی وفادار رہونگا۔ کیونکہ مجھے بحیثیت آئرش باشندہ ہونے کے برطانیۂ عظمیٰ کے باشندوں سے مساوات کے حقوق حاصل ہیں اور اس لئے بھی کہ آئرلینڈ ان اقوام کی سیاسی مجلس کا ایک ممبر ہے جس کو "برٹش کامن ویلتھ" کہتے ہیں۔"

پانچویں دفعہ میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ آئرلینڈ کے جائز مطالبات کا لحاظ رکھتے ہوئے ملکی قرضہ کی ذمہ داری آئرلینڈ پر رہیگی۔ ان مطالبات کا فیصلہ اگر آپس میں نہ ہوسکا تو ایسے اشخاص کی پنچایت کے سپرد کر دیا جائیگا جو سلطنت برطانیہ کے باشندے ہوں۔

دفعہ ۶ میں یہ طے کیا گیا، کہ آئرلینڈ کی بحری حفاظت اس وقت تک برطانیہ کریگا جبتک ہردو حکومتیں اس مسئلہ کو آپس میں طے نہ کرلیں۔ البتہ محاصل وغیرہ کی وصولیابی کے لئے جس حدتک جنگی جہاز ضروری ہیں آئرلینڈ رکھ سکے گا۔ ہردو حکومتوں کی کانفرنس پانچ سال بعد ہوگی جبکہ آئرلینڈ کی بحری حفاظت کا مسئلہ طے کیا جائیگا۔

دفعہ ۷ میں برطانوی افواج کے لئے زمانۂ امن میں چند مخصوص بندرگاہوں نیز دیگر مخصوص سہولتوں کا بہم پہونچانا آئرلینڈ کا فرض قرار دیا گیا تھا۔ لیکن زمانۂ جنگ میں آئرلینڈ ان تمام بندرگاہوں اور سہولتوں کو بہم پہونچائیگا جنکی ضرورت برطانیہ کو محسوس ہو۔

دفعہ ۸۔ آئرلینڈ کی فوج برطانیہ کی فوج سے وہی تناسب رکھیگی جو برطانوی آبادی کے ساتھ آئرلینڈ کی آبادی کو ہے۔

دفعہ ۹ ہردو ممالک کے بندرگاہ ایک دوسرے کے جہازوں کے لئے حسب معمول ٹکیس ادا کرنے پر کھلے رہیں گے۔

دفعہ ۱۰۔ جن سرکاری ملازموں کو فری اسٹیٹ گورنمنٹ موقوف کرگی یا جو بوجہ تبدیلی طرز حکومت بطور خود ترک ملازمت کریں گے ان کو مناسب معاوضہ دیا جائیگا۔

دفعہ ۱۱ لغایت ۱۵ کے روسے صوبہ آلسٹر کے بارہ میں یہ طے ہوا کہ عہدنامہ کی منظوری کے ایک ماہ بعد تک آلسٹر پر کوئی اثر ان شرائط کا نہ ہوگا بلکہ وہاں بدستور ۱۹۲۰ء کے قانون کے مطابق حکومت جاری رہیگی۔ لیکن ایک ماہ کے اندر آلسٹر کو اپنے لئے خود طے کرنا ہوگا کہ وہ اس عہدنامہ کی شرائط کا پابند

ہونا چاہتا ہے یا نہیں۔ اگر اُس نے عہد نامہ کو منظور نہ کیا تو وہاں ۱۹۲۰ء کا قانون بدستور جاری رہیگا۔ اور ایک کمیشن تین ممبروں کا مقرر ہوگا جو آئرش فری اسٹیٹ اور شمالی آئرلینڈ کے حدود مقرر کریگا۔ حدود کے فیصلہ کے لئے اس کو جغرافیائی کیفیت، تمدنی حالات اور باشندگان ملک کی مرضی کا لحاظ کرنا ہوگا۔ اس کمیشن میں السٹر اور فری اسٹیٹ کا ایک ایک ممبر ہوگا اور تیسرا ممبر جو چیرمین بھی ہوگا برطانوی حکومت نامزد کریگی۔

دفعہ ۱۶ مذہبی آزادی کے متعلق تھی۔

دفعہ ۱۷ میں یہ طے کیا گیا تھا کہ جب تک جدید قوانین مرتب ہوں اور ان کے مطابق جدید حکومت قائم ہو انتظام ملکی کے لئے ایک عارضی حکومت ان ممبران پارلیمنٹ کی قائم ہوگی جو موجودہ قانون کے مطابق پارلیمنٹ کے لئے جنوبی آئرلینڈ کے منتخب کنندہ حلقوں سے منتخب ہوئے تھے۔ مگر اس عارضی حکومت کے ہر ممبر کو اس عہد نامہ کی شرائط کے متعلق تحریری رضامندی داخل کرنا لازمی ہوگا۔ اور عارضی حکومت ایک سال سے زائد قائم نہ رہ سکے گی۔

دفعہ ۱۸۔ یہ عہد نامہ برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے منظوری کیلئے حکومت برطانیہ پیش کریگی اور آئرش نمایندے اس کو جنوبی آئرلینڈ کے منتخبہ ممبران پارلیمنٹ کی میٹنگ کے سامنے بنا بر منظوری پیش کریں گے۔ اور بعد منظوری عہد نامے کی شرائط کے مطابق ضروری قوانین بنا دیے جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ اس عہد نامے سے آئرلینڈ کو مکمل آزادی کا مرتبہ حاصل نہیں ہوا۔ اور شاہ برطانیہ کے لئے حلف وفاداری لینا ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو انگلینڈ کی رعایا تسلیم کرنے کے برابر تھا اور وہ بھی خود اپنے دستخط سے۔ ڈی ویلرا کا خون پھر جوش کھانے لگا۔ اس نے ایک پیغام اپنی قوم کے نام شائع کیا کہ وہ یہ عہد نامہ منظور نہ کریں۔ بالآخر قوم کی منظوری یا نامنظوری کے لئے عہد نامہ باقاعدہ ڈیل کے جلسہ میں پیش ہوا

آپس میں تفرقہ اُس وقت آئرلینڈ کے قوم پرست طبقہ میں کھلی ہوئی دو پارٹیاں ہو گئی تھیں۔ ایک فرقہ ڈی ویلرا کی رہنمائی میں عہد نامہ کو نامنظور کرنے کے حق میں تھا مگر دوسرا فرقہ جو کافی زور پکڑ چکا تھا اور جس کے رہنما خود آرتھر گرفتھ اور مائیکل کالنس تھے جنھوں نے عہد نامے پر دستخط کئے تھے وہ عہد نامہ کی منظوری کے حق میں تھا۔ کئی روز کے سرگرم بحث ومباحثہ کے بعد ڈیل نے ستاون مخالف اور چونسٹھ موافق ووٹوں سے یہ عہد نامہ منظور کر لیا۔ پارلیمنٹ برطانیہ نے بھی اس کو قبول کیا اور قانونی طور پر یہ عہد نامہ آئرلینڈ کی آئندہ حکومت اور سیاسی اقتدار کے لئے بنیادی پتھر بن گیا۔ ۱۶۔ جنوری ۱۹۲۲ء کو عارضی حکومت قائم ہوگئی۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ

عہد نامہ کی شرطوں کے مطابق صرف وہی اشخاص عارضی حکومت کے ممبر ہو سکتے تھے جو عہد نامے کے شرائط بذریعہ تحریر کے تسلیم کریں۔ ایسی حالت میں ڈی ویلرا کا عارضی حکومت میں داخل ہونا غیر ممکن تھا۔ لہذا آرتھر گرفتھ اس کے پریسیڈنٹ مقرر ہوے۔ اگرچہ باضابطہ طریقہ پر آئرلینڈ کا حکمران آرتھر گرفتھ تھا لیکن قوت اب بھی ڈی ویلرا کے ہی ہاتھوں میں تھی کیونکہ ریپبلکن فوج صرف ڈی ویلرا کی رہنمائی تسلیم کرتی تھی۔ حکومت کی پشت پناہ برطانوی گورنمنٹ تھی جس نے عہد نامہ کے شرائط کے مطابق فری اسٹیٹ کی عارضی حکومت کو انتظام ملکی میں مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔ گویا قوم پرستوں کے دو فریق جواب تک دوش بدوش غنیم کی جڑ کاٹنے کی کوشش میں تھے خود آپس میں مرنے مارنے پر تیار ہوگئے۔ ۲۶۔ مارچ کے ایک اہم جلسہ میں ریپبلکن فوج نے پھر ایک بار مکمل آزادی کے حق میں آواز بلند کی اور بالاعلان کہہ دیا کہ اس کا کوئی تعلق آئرش فری اسٹیٹ کی عارضی حکومت سے نہیں ہے۔ اس نے فور کورٹ اور دیگر تاریخی عمارتوں پر قبضہ کر لیا۔ مگر اب ڈی ویلرا کا کام پہلے سے زیادہ مشکل تھا۔ کیونکہ یہ جنگ صرف انگریزوں کے خلاف نہ تھی بلکہ اس کو اپنے ہموطنوں اور انگریزی حکومت کی مجموعی طاقت کا مقابلہ کرنا تھا۔ مگر ڈی ویلرا نے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ اس کا قول تھا کہ ہم نے برطانوی گورنمنٹ کے لئے آئرلینڈ پر حکومت کرنا غیر ممکن کر دیا ہے اور اسی طرح آئرش گورنمنٹ کو بھی جو برطانیہ کے زیر سایہ کام کرتی ہے حکومت کرنا غیر ممکن کر دیں گے۔ انگریزوں کا ایک جنگی جہاز بھی جو فری اسٹیٹ کی حکومت کی امداد کے لئے آیا ہوا تھا لوٹ لیا گیا اور اس میدان میں بھی ڈی ویلرا کی کامیابی کے آثار نظر آنے لگے ارباب حکومت نے جب ڈی ویلرا کا اثر اہل ملک پر جمتا ہوا دیکھا تو انھوں نے ایک جدید انتخاب کا اعلان کر دیا تاکہ وہ عوام الناس کو یہ دکھلا سکیں کہ جمہور آئرلینڈ اُن کے ساتھ ہے۔ اور ڈی ویلرا کی حرکات محض اس کی ضد یا خود غرضی پر مبنی ہیں۔ یہ انتخاب جون ۱۹۲۲ء میں ہوا، اور چونکہ اس کا انتظام کلیتاً حکومت کے ہاتھوں میں تھا اس لئے ڈی ویلرا کی پارٹی کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ اب عارضی حکومت کو شن فین پارٹی کے ساتھ تشدد آمیز برتاؤ جاری کرنیکا موقع ملا۔ اس کے خلاف فوجی طاقت کا استعمال شروع کر دیا گیا۔ اس کے صدر مقامات پر انگریزی توپوں سے گولہ باری شروع کر دی گئی۔ فور کورٹ وغیرہ عمارتیں جو اس کے قبضہ میں تھیں مسمار کر دی گئیں، غرض اس طرح ڈبلن میں عارضی حکومت کا سکہ جم گیا۔ لیکن آئرلینڈ کے جنوبی حصوں میں اب بھی شن فین پارٹی ہی برسر اقتدار تھی اس خانہ جنگی میں سیکڑوں محبان وطن کی قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ اور جان و مال کے ناقابل تلافی

نقصانات برداشت کرنے پڑے۔ مارشل لا جاری تھا اور جن لوگوں کے خیالات گورنمنٹ کے خلاف تھے اُن کے ساتھ بیدردی کا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ اگرچہ شن فین پارٹی انتہائی مصائب برداشت کرنے کی عادی اور حب وطن کے جوش میں عظیم قربانیوں کے لئے تیار تھی۔ لیکن قومی بربادی کے نظارہ کی تاب نہ لا سکی۔ اب وہ محسوس کرنے لگی اس کشمکش کے جاری رکھنے میں ملکی مفاد کا خون ہو رہا ہے اور اگر خانہ جنگی کا خاتمہ نہ کیا گیا تو رفتہ رفتہ وہ عناصر ضائع ہو جائیں گے جن کا وجود قوم کی ترقی و بہبودی کے لئے لازمی ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں ڈی ویلرا نے موجودہ حکومت کے ساتھ مسلح جنگ موقوف کر دی جس سے حکومت کا کام بآسانی اور بلا رکاوٹ چلنے لگا۔

حکومت کا طرز عمل | ۱۶ جون ۱۹۲۲ء کو جبکہ اول اول برٹش گورنمنٹ نے آئرش گورنمنٹ کا چارج اہل آئرلینڈ کے حوالہ کیا اور عارضی حکومت قائم ہوئی تو اس کے صدر مسٹر آرتھر گرفتھ تھے جو اگست ۱۹۲۲ء میں فوت ہو گئے۔ ان کے بعد صدارت کی کرسی پر مسٹر مائکل کالنس متمکن ہوئے۔ لیکن خانہ جنگیوں کی کشمکش میں اُسی ماہ وہ بھی گولی کا شکار ہو گئے۔ اور عنان حکومت ولیم کاسگریو کے ہاتھ میں آئی جو عرصہ تک آئرلینڈ کے حکمران رہے۔ آپ فطرتاً اعتدال پسند واقع ہوئے ہیں اور سیاسی اعتبار سے آپ کے خیالات برطانیہ کے کنسرویٹو طبقہ سے ملتے جلتے ہیں مگر آزادیٔ وطن کی جدوجہد میں آپ کا بھی حصہ کچھ کم نہ تھا۔ ۱۹۱۳ء کی آئرش والنٹیروں کی فہرست میں آپ کا بھی نام تھا۔ ۱۹۱۶ء کی خونریزی میں آپ بھی اپنے ہموطنوں کے ساتھ شریک تھے اور قید خانہ کی آب و ہوا کا لطف اُٹھا چکے تھے۔ آزادی کی آخری لڑائی میں آپ کا کام یہ تھا کہ مقامی کونسلوں کو انگریزوں کے ساتھ اتحاد عمل سے باز رکھیں۔ چنانچہ عارضی حکومت ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں تھی جس پر ملک کا ایک با اقتدار فرقہ بھروسہ رکھتا تھا۔ عہدنامہ کی شرائط کے مطابق اس نے آلسٹر کو فری اسٹیٹ کے ساتھ شریک کرنے کی کوشش کی لیکن بسود آلسٹر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتا رہا۔ اور فری اسٹیٹ کے ساتھ شرکت کرنا کفر سمجھا۔ اسطرح عہدنامہ کی شرائط کی پابندی محض فری اسٹیٹ کے چھبیس ۲۶ اضلاع ہی پر رہی۔ اس کے لئے علیحدہ اور باقاعدہ آئین مرتب کرنا اور عہدنامہ کی تاریخ سے ایک سال کے اندر اس کا نفاذ کرنا بھی عارضی حکومت کا فرض تھا۔ چنانچہ آئین مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی مرتب کی گئی جس نے دیگر ممالک میں نظم و نسق کے عیوب و محاسن پر غور کر کے ایک آئین مرتب کیا۔ ستمبر ۱۹۲۲ء میں عارضی پارلیمنٹ کی نشست ہوئی جس میں کمیٹی کا مرتب کیا ہوا آئین پاس کیا گیا۔ برطانوی پارلیمنٹ نے بھی

اس آئین کو طویل بحث ومباحثہ کے بعد منظور کرلیا۔ اور اس کا باضابطہ نفاذ شاہی اعلان کے ذریعہ ۶۔ دسمبر ۱۹۲۲ء کو ہوگیا۔

دوسرا اہم کام جو گورنمنٹ کے ذمہ تھا وہ عہدنامہ کی شرائط کے مطابق آئرش فری اسٹیٹ اور آلسٹر کے حدود کا تعین تھا۔ ۱۹۲۵ء میں مجوزہ کمیشن کا تقرر ہوا۔ عہدنامے کی شرائط کی منظوری کے وقت آئرش نمایندوں کا یہ خیال تھا کہ باشندگان ملک کی رضاجوئی کے لحاظ سے آلسٹر کے حدود اس قدر تنگ کردیے جائینگے کہ اس کو فری اسٹیٹ سے علٰحدہ رہنا مشکل ہوجائیگا۔ اور بالآخر اس کو فری اسٹیٹ سے الحاق کے سوائے کوئی چارہ نہ رہیگا۔ مگر کمیشن کی کارروائی شروع ہونے پر فری اسٹیٹ کے نمایندوں کی آنکھیں کھل گئیں، اور انھیں برٹش مدبرین کی سیاسی قابلیت کی داد دینا اور پولیٹیکل شطرنج میں مخالفین کی چالوں کے سامنے مات کھانا پڑی۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ فری اسٹیٹ کے نمایندوں نے میدان خالی کردیا۔ فری اسٹیٹ کی حکومت نے مجبوراً اس طور سے صلح کرلی کہ عہدنامہ کے وقت جو حدود آئرلینڈ کے جنوبی اور شمالی حصوں کی قائم تھیں وہی قائم رہیں اور اس کے صلہ میں شاہی قرضہ کی جو رقم آئرلینڈ کے ذمہ تھی برٹش گورنمنٹ نے معاف کردی، حکومت کے اس فعل نے اہل ملک کے سامنے اس کو شرمندہ کردیا۔ اور وہ اب نفرت اور بےعزتی کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی۔

ڈی ویلیرا کا عروج اسکے بعد پھر اہل ملک کی توجہ ڈی ویلیرا کی پارٹی کی طرف منتقل ہوئی لیکن چونکہ حلف وفاداری کی شرط ڈیل کے داخلہ میں حارج تھی اس لئے وہ ملک کے نظم ونسق میں کوئی حصہ نہ لے سکتی تھی۔ اس دقت کو محسوس کرتے ہوئے اُس نے عزم کیا کہ کسی ترکیب سے مجلس قانون ساز میں دخل حاصل کرے۔ چنانچہ شن فین پارٹی دو گروہوں میں تقسیم ہوگئی۔ اور مسٹر ڈی ویلیرا کی سرکردگی میں ایک گروہ نے فاننا فیل پارٹی کے نام سے اپنا مسلک یہ قائم کیا کہ ڈیل میں داخل ہوکر قوم کی خدمت کرے۔ ۱۹۲۷ء کے انتخاب میں اس پارٹی کے چند ممبر ڈیل میں داخل ہوئے اور اُنھوں نے حلف وفاداری لے لیا مگر اس اعلان کے ساتھ کہ یہ حلف کچھ معنی نہیں رکھتا۔ فاننا فیل کے اُن چوالیس ۴۴ ممبروں میں جو ڈیل میں داخل ہوئے مسٹر ڈی ویلیرا بھی تھے۔ ڈی ویلیرا نے ڈیل میں داخل ہوتے ہی اپنی پارٹی کا مقصد یہ بتلایا کہ تیس لاکھ پونڈ سالانہ کی کثیر رقم جو آئرلینڈ ٹیکس اراضی کی شکل میں انگلستان کو ادا کرتا ہے وہ ناواجب و قانوناً ناقابل وصول ہے۔ یہ رقم اس قرضہ کی ادائی میں تھی جس سے زمینداروں کی اراضی خرید کر کاشتکاروں کو دیگئی تھی

وليم كاسگریو کا کام اب پہلے سے بہت زیادہ مشکل ہوگیا، مگر رعب داب قائم رکھنے کی غرض سے اس نے تشدد کی پالیسی بدستور جاری رکھی۔ ریپبلکن خیالات کے لوگوں پر برابر سختیاں ہوتی رہیں، اور محبان وطن اب بھی گرفتار ہو کر قید خانہ میں بھیجے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے کاسگریو کا عہد حکومت مقبول نہ ہو سکا۔ اور فائنا فیل پارٹی اہل ملک کے دلوں میں جگہ پاتی رہی۔ ۱۹۳۲ء کے انتخاب میں اس پارٹی کو حیرت انگیز کامیابی نصیب ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مارچ ۱۹۳۲ء میں آئرش فری اسٹیٹ کی حکومت کا صدر ڈی ویلرا مقرر ہوا۔ اس طور پر آئرلینڈ کی تاریخ میں پہلا موقع ہاتھ آیا جبکہ انتہا پسند پارٹی کا سرغنہ حکومت کے اعلیٰ ترین عہدہ پر ممتاز ہوا۔ نیرنگی زمانہ نے اس شخص کے سر پر حکومت کا تاج رکھدیا جو سولہ برس پیشتر بغاوت کے جرم میں پھانسی کا مستوجب قرار پا چکا تھا۔ مگر یہ وہ شخص ہے جس نے حب وطن کے جوش میں اپنی زندگی قوم اور ملک کے لئے وقف کر دی۔ اس نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں تمکنت اور غرور کے ساتھ نہیں بلکہ انکساری اور عاجزی کے ساتھ لی۔ قومی خدمت اس کا مسلک ہے اور اپنے ملک کو دنیا کی سربرآوردہ قوموں کی فہرست میں داخل کرنا اس کی سیاست کا منتہائے نظر۔ اس نے پہلا کام بحیثیت پریسیڈنٹ یہ کیا کہ خود اپنی اور دیگر وزرائے حکومت کی تنخواہوں میں معقول کمی کر دی۔ دوسرا کام پولیٹیکل قیدیوں کی رہائی تھا۔ کاسگریو کی حکومت نے پولیٹیکل قیدیوں کی تعداد میں بہت بڑا اضافہ کر دیا تھا۔ ڈی ویلرا نے ان کو ایک دم آزاد کر دیا۔ حقیقتاً قوم کے اس فرقہ کو جس کی کوشش، ہمت اور ایثار نے ملک کو غیر قوم کے پنجہ سے آزاد کرایا تھا اب تک اس نعمت عظمیٰ کا لطف اٹھاتے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ اس کے لئے آزادی کی نعمت "آسمان سے گری کھجور میں اٹکی" بنگئی تھی۔ برطانوی تشدد کی جگہ کاسگریوین پالیسی نے لے رکھی تھی اور ان کی زندگی اب بھی جیل کی چہار دیواری کے اندر ہی کٹتی تھی۔ ڈی ویلرا نے ان کو یہ موقع دیا کہ وہ اپنے حقیقی جذبات کا اظہار کریں۔ اس واقعہ کے بعد ہی قوم کے حریت پسند فرقہ نے قبرستان میں جا کر ۱۹۱۶ء کے شہیدان وطن کی یاد تازہ کی اور تہ دل سے ان کی روحوں کا احترام کرتے ہوئے ایک بار پھر قومی آزادی کا حلف اٹھایا۔

۲۳۔ مارچ ۱۹۳۲ء کو ڈی ویلرا نے حکومت برطانیہ کے سامنے اپنا دعویٰ زوردار الفاظ میں پیش کیا۔ اس نے لکھا کہ ان لوگوں کے لئے جو شاہ برطانیہ کی اطاعت کا حلف منسوخ کرنیکی کوشش میں ہیں اب حلف لینا ناقابل برداشت ہے اور امن و امان قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے

کہ یہ حلف موقوف کر دیا جائے۔ اور ٹیکس اراضی کی شکل میں جو کثیر رقم انگلستان ہر سال آئرلینڈ سے وصول کرتا ہے وہ جرمنی کے تاوان جنگ سے بھی زیادہ سخت ہے چنانچہ فری اسٹیٹ گورنمنٹ نے یہ طے کر لیا ہے کہ اب کوئی مزید رقم اس ٹیکس کی مد میں ادا نہ کی جائیگی وزرائے برطانیہ کے حلقے میں اس مراسلت کے موصول ہوتے ہی کھلبلی مچ گئی۔ نوآبادیوں کے سکریٹری مسٹر ٹامس نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ فری اسٹیٹ گورنمنٹ کے اس فعل کو عہدنامہ ۱۹۲۱ء سے انحراف تصور کریگی۔ فری اسٹیٹ کو اوٹاوہ کانفرنس میں شرکت کی دعوت نہ دیے جانے کی دھمکی بھی دی گئی۔ جون ۱۹۳۲ء میں ڈی ویلرا اور مسٹر میکڈانلڈ میں گفتگو کے لئے کانفرنس بھی ہوئی، لیکن ڈی ویلرا کے قدم نے جنبش نہ کی۔ اس کا اشارہ ایک ایسی سیاسی مفاہمت کی طرف تھا جس میں شمالی اور جنوبی آئرلینڈ ایک متحدہ شکل اختیار کر کے ریپبلک تسلیم کر لی جائے۔ اور برطانیہ آئرش ریپبلک اور نوآبادیوں کی ایک مجلس اقوام قائم ہو جس کا ہر ایک ممبر مساوی المرتبہ ہو اور شاہ برطانیہ اس مجلس کے صدر ہوں۔

بہرحال فائنا فیل پارٹی کے برسر حکومت ہونے سے آئرلینڈ کی پولیٹیکل حیثیت ایک بار پھر مائل بہ عروج ہونے لگی ہے۔ حال ہی میں ۲۰ مئی ۱۹۳۳ء کو ڈبلن میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر ڈی ویلرا نے فرمایا ہے کہ ہم ان تمام باتوں پر نظر ثانی کریں گے جو آئرلینڈ کی خودمختاری اور مکمل آزادی کے راستے میں حائل ہیں۔ ہم کو توقع ہے کہ متحدہ آئرلینڈ کی ریپبلک قائم ہو جائیگی اور ہر شخص بہت جلد یہ محسوس کریگا کہ اگر ہم چاہیں تو آئرلینڈ میں ریپبلک کا اعلان کر سکتے ہیں۔ لیکن کوئی ایسا اعلان عوام الناس کی رائے معلوم کئے بغیر نہ کیا جائیگا۔ حلف وفاداری کی تنسیخ کا قانون بھی ۳ مئی ۱۹۳۳ء کو پاس ہو گیا ہے۔ غرضکہ آئرلینڈ کی سیاسی گاڑی مکمل آزادی اور جمہوریت کی طرف بھاگا بھاگ دوڑ رہی ہے۔ اس کا گاڑیبان ایسا چابکدست، تجربہ کار اور مشاق ہے جو راستہ کی رکاوٹوں سے پست ہمت نہ ہو کر مہینوں کا راستہ ہفتوں میں طے کرنا چاہتا ہے۔ ہموطنوں کو جو اس گاڑی میں جتے ہوئے ہیں تیزروی پر آمادہ کرنے کے لئے کبھی پچکارتا ہے اور کبھی چابک سے کام لیتا ہے، دائیں بائیں جھاڑیوں اور کانٹے دار شاخوں سے ذرا نہیں گھبراتا۔ جونہی کوئی چیز سد راہ نظر آئی کاٹ کر پھینکا اور راستہ صاف کر کے قدم آگے بڑھایا۔ نہ منزل کی طوالت سے ڈرتا ہے اور نہ سفر کی صعوبتوں سے مرعوب ہوتا ہے۔ اگر یہ رفتار قائم ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ چند ہی روز میں آئرلینڈ مہذب ترین اور خودمختار ممالک کی صف میں نہ آ کھڑا ہو گا۔

مرزا رسوا مرحوم کی نثر

(۲)

(از جناب مولوی محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی)

(مراسلہ نمبر ۲)

اگلے زمانہ سے شاعری کی مدح وذم میں بہت کچھ افراط وتفریط کی گئی ہے۔ مدح کی انتہا تو یہ ہے کہ یہ مصرعہ مشہور ہے۔

شاعری جزویست از پیغمبری

اور ذم میں مثلاً ؎

در شعر مپیچ و در فنِ او ۔ چوں اکذب اوست احسنِ او

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شعر اچھا بھی ہوتا ہے اور بُرا بھی۔ میں اور حیثیات سے قطع نظر کرکے صرف یہ کہتا ہوں کہ بعض اشعار اخلاق کے لئے مفید ہیں اور بعض مضر۔ مثلاً وہ اشعار جن میں اخلاقی مضامین ہوں وہ قسم حسن میں داخل ہیں، اور جن میں نفس پرستی کے مضامین ہوں وہ قبیح ہیں۔ لیکن ہمارے اور ہمارے بعض معاصرین کے بعض اشعار (بلکہ ہمارے اکثر اشعار) ان دونوں صفتوں سے معرّا ہیں نہ ان میں کوئی حسن ہے نہ قبح۔ لہذا ایسے شعر نہ اُس مدح کے لائق ہیں اور نہ ذم کے۔ ایسے شعر کہنا ایک فعل عبث ہے۔ مصرعہ

شاعری جزویست از پیغمبری

یعنی مضامین القائی اور الہامی ہوتے ہیں۔ اب میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ مضامین القائی والہامی سے کیا مراد ہے۔

آپ ہی انصاف سے دیکھیئے کہ جس قسم کے اشعار آج کل ہمارے گلدستوں میں شائع ہوتے کیا وہ ع

شاعری جزویست از پیغمبری

کے مصداق ہوسکتے ہیں۔ لا واللہ ایسا نہیں ہے۔

اس کا ایک سبب کم علمی ہے۔ علم سے میری مراد بہت سی کتابیں پڑھ لینا یا کم از کم سلسلہ نظامیہ کو کسی نہ کسی طور سے تمام کر لینا نہیں ہے۔ عقل اور فطرت تحصیل علم کے لئے کافی ہے مگر عقل سے کام لینا اور فطرت میں تصرف کرنا کسی قدر محنت چاہتا ہے اور اس کی ہمیں فرصت نہیں جس قدر مضامین پیش پا افتادہ تھے اُن کو اگلے کہہ گئے اب ہماری استادی صرف اُس سے استنباط کرنے میں صرف ہوتی ہے اور اگر اس کا سلیقہ بھی ہم کو نہیں تو اُن کو اور خراب کرتے ہیں۔ ہماری شاعری سماعی اور کتابی ہے نہ نظری۔ ہم خود فطرت کو مشاہدہ کر کے غور کرنے اور کتاب فطرت سے مضامین پیدا کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ اگلوں کے مضامین کو اپنے لفظوں میں دوہرا دینا ہمارا خاص کام ہے اور اسی پر ہمیں فخر ہے۔

علم طبیعیات، الہیات اور شعر بظاہر ان کے مقاصد جدا جدا ہیں اور شاعر کو حکیم سے اول مرتبہ پر رکھا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ حکیم سے وہ کام نہیں ہو سکتا جس کو شاعر نازک خیال انجام دے سکتا ہے۔ فطرت سے دقیق مضامین کو اخذ کرنا اور اُس کو عام فہم اور موثر الفاظ میں کہہ جانا خاص شاعر ہی کا کام ہے اور کسی سے نہیں ہو سکتا۔ میں اس سے بھی زیادہ ترقی کر کے کہتا ہوں کہ حقایق اور معارف کو جس پیرایہ سے شاعر ادا کرتا ہے فلسفی کی مجال نہیں ہے کہ اُسے بیان کر سکے۔ خیال کے آئینہ خانہ میں عالم جبروت کی جھلک نظر آتی ہے۔ پیاری پیاری صورتیں مجسم ہوتی ہیں اور صوت و حرف کے ذریعہ سے سامعہ تک پہونچتی ہیں۔

شاعری کی وسعت مثل فسحتِ عالم کے لامتناہی ہے، اس کا جولان گاہ فلسفہ کی حدرسائی سے کہیں آگے ہے۔ جن امور کو فلسفہ نے اب ثابت کیا ہے شاعروں کی تخیل کئی قرن پہلے اُن کو پا چکی ہے۔ شاعر اعلیٰ رموزِ حکمت کو اس طرز دلآویز سے کہہ جاتے ہیں کہ فلسفی کو اُس کے بیان کرنے کے لئے بڑی بڑی دقتیں پیش آتی ہیں۔ تمہید مطالب اور ترتیب مقدمات میں بہت سا وقت صرف ہو جاتا ہے۔ اور پھر بھی جیسا چاہیئے وہ امر ذہن نشین نہیں ہوتا۔ شاعر کی زبان میں خداداد اثر ہوتا ہے مگر ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء "جس طرح کوئی شخص اپنی کوشش سے حسین نہیں ہو سکتا اوسی طرح فطرت سلیم بھی بنانے سے نہیں بنتی۔ دیکھا گیا ہے کہ اکثر صاحب شعر کہتے کہتے بوڑھے ہو گئے مگر کوئی شعر مزے کا نہ نکلا اور ایک طفل مکتب نے وہ شعر پڑھ دیا کہ مشاعرہ اُلٹ گیا۔

ممکن ہے کہ میری اس تقریر سے بعض نوعمر شاعر بیدل ہو جائیں اس لئے کہ جب شاعری امر خداداد ٹھہرا تو پھر اُس کا اکتساب غیر ممکن ہو گیا لہٰذا ہر شخص کو جو شعر کہنا چاہیئے پہلے یہ دریافت کرنا

ضروری ہوا کہ آیا اُس کی طبیعت اس کے مناسب ہے یا نہیں۔ اس موقعہ پر صرف یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ فطرت نے ہر انسان کو اوسط استعدادات عطا کیئے ہیں۔ فطرت کے قواعد کلیہ میں اتفاقات اور عوارض کو بہت کم دخل ہے۔ حدِ خاص سے زیادہ خوبصورت اور حد خاص سے زیادہ بدصورت بہ مشکل مل سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک مزاج اور عادت کو بھی اس امر میں بہت کچھ لگاؤ ہے۔ فطرت نے ہر ملک کے مناسب ایک صورت خاص اور ایک طبیعت مخصوص ہر باشندہ کو عنایت کی ہے۔ انگشت نمائی کے لائق معدودے چند ہوتے ہیں۔ اگر فطرت نے کسی کو موزوں طبع نہیں پیدا کیا تو وہ ہرگز شعر موزوں کرنا کیسا موزوں پڑھ نہیں سکتا۔ مگر ایسے ناموزوں طبیعت والے مشکل سے ملیں گے۔ لہذا اوسط درجہ کے دماغ والے اکثر موزوں طبع بھی ہوا کرتے ہیں۔ مگر اکثر استعدادات بہ سبب عدم فراولت کے ضائع ہو جاتے ہیں یا بہ سبب عدم علم کے ابتدا خراب ہوکر درستی کے قابل نہیں رہتی۔ جو لوگ ابتدا میں کسی کامل اُستاد سے موسیقی نہیں حاصل کرتے اور ابتدا ہی میں سُر بیورہ ٹھیک نہیں کر لیتے اُن کو بدآواز اور بے اصول گانے کی مشق ہو جاتی ہے۔ لہذا ہر مبتدی کو اپنی ابتدا کی درستی کا خیال نہایت ہی ضروری ہے اگر طبیعت ابتدا ہی میں خراب ہوگئی تو استاد کامل کی کوششوں سے بھی کوئی اثر مترتب نہوگا مثلاً ہمارے شہر کے اکثر شعرا اور اُن کے تلامذہ کو مناسبات الفاظ کا لحاظ حد سے زیادہ ہے۔ اگرچہ یہ ایک صنعتِ شعری ہے اور محسنات کلام میں داخل ہے مگر اب سلیقۂ شعر اس کو عیوب شعر میں شمار کرنے لگا ہے اور اس بدعادت کا اثر اس قدر شائع و ذائع ہوگیا ہے، کہ اب اُس کا ترک من قبیل محالات سمجھا جاتا ہے، اسی طرح بعض تشبیہات جو کسی اگلے اُستاد نے کسی موقع پر نظم کر دیے تھے۔ اب اس کی اس کثرت سے جھاڑ کی گئی کہ سننے والوں کو اُن سے نفرت ہوگئی۔ اور نفرت کی وجہ یہ ہے، اولاً یہ غور کرنا چاہیئے کہ:۔

تشبیہ استعارہ مجاز مرسل کنایہ اور صنائع و بدائع معنویہ و لفظیہ یہ سب مجموعاً و کلیۃً کیوں باعثِ لذت ہوتے ہیں؟ اس مسئلہ کا جواب ہم کو علم نفس سے مل سکتا ہے جس کو ہم ابھی بیان کریں گے پہلے اتنا کہہ لینے دیجئے کہ اگر وہ شرط جس کی وجہ سے یہ امور باعثِ لذت ہوئے تھے۔ فوت ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اُس کا مشروط یعنی لذت بھی فوت ہو جائے گی۔ واضح رائے عالی ہو کہ ان امور میں صرف قوت باعث لذت ہے یعنی قائل کا قول سامع کے لئے صرفِ قوت کا باعث ہوتا ہے۔ قوت سے یہاں قوتِ ذہنی مراد ہے۔ توجیہ مزید اس کی یہ ہے کہ انسان میں دو سبب لذت

کے ہیں۔ (۱) استعمال قوئے بحالت صحت (۲) ارتفاع الم۔ اور وہی استعمال قوی ایک حدِ خاص سے تجاوز کرنے کے بعد موجب الم ہو جایا کرتا ہے۔ اس صورت میں ترک فعل ضروری ہو جاتا ہے۔ اور یہ دوسری قسم میں داخل ہے یعنی ارتفاع الم ہیں۔

تشبیہات غریب و بعید کے سننے کے بعد سامع کو قوت فکر کے استعمال کا موقع ملتا ہے اور یہی موجب لذت ہوتا ہے۔ تشبیہ کی ندرت ایک استعجاب خاص کا باعث ہوتی ہے اور استعجاب خود ایک فعلیت دماغی کا نام ہے۔ کیونکہ اس صورت میں دماغ کے اُن مرکزوں تک اثر پہونچتا ہے جو ایک مدت سے بیکار پڑے تھے۔ تشبیہات قریب و مبتذل میں نہ استعمالِ قوت کا موقعہ ملتا ہے نہ وہ باعثِ استعجاب ہوتے ہیں۔ اس لئے اُن میں کسی قسم کی لذت نہیں ہے۔ ایسے مضامین کو سنانا سامعہ خراشی ہے اور سامعہ خراشی درحقیقت ایک امر مولم ہے۔ لہذا اس قسم کے شعر درحقیقت مولم اور موذی ہیں۔ اور اُن کے سننے اور سُنانے سے احتراز اولیٰ ہے۔

آپ نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہوگا کہ شعر میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہو۔ وہ مجہول الکنہ بات یہی ہے جس کی اصلیت کو ہم نے بیان کر دیا۔ یعنی شعر میں ایسی کوئی بات ضرور ہو جس سے سامع کو قوتِ دماغی کے استعمال کے صرف کرنے کا موقع ملے۔ مگر اس کی بھی ایک حدِ خاص ہے یعنی صرفِ قوت کو اعتدال ضروری ہے بعض صاحب معنی بند شعر کہتے ہیں۔ ایسے لوگ دہلی میں بہت تھے جن کے ہر شعر کے سمجھنے کے لئے قوتِ فکر کو حد اعتدال سے زیادہ محنت کرنا ہوتی تھی۔ اس قسم کے اشعار بھی لذت اور تفریح کے لئے مفید نہیں ہیں۔ ایسے چند شعر سن کے طبیعت تھک جاتی ہے اور اور پھر اُس طرف تا دیر متوجہ نہیں ہوتی۔ دماغ کے پردے بہت ہی نازک ہیں، اُن کی لذت کے لئے نازک خیالیوں کی ضرورت ہے: نازک خیالی اور دقت مضمون دو امر جداگانہ ہیں۔ ایک کے دھوکے سے دوسرے کو اختیار کر لینا بڑی غلطی ہے۔

پہلے میں کہہ چکا ہوں کہ شاعری کی وسعت مثل صنعتِ عالم کے غیر محدود ہے، اس سے میری یہ مراد ہے کہ مبادی مضامین جس کو مبادی تشبیہ بھی کہہ سکتے ہیں لاتعد و لاتحصیٰ ہیں۔ ان میں سے بعض کا میں ذکر کرتا ہوں۔

آسمان۔ اس سے ہم کو عظمت۔ وسعت۔ رفعت کے ایسے عالی مضامین مل سکتے ہیں مگر ان سب کے ساتھ ہی خوف کی اصل بھی اس میں شامل ہے۔ علم نجوم کے اعتقاد نے اُس کے ساتھ ہمارے

تعلقات کو بہت وسیع کردیا ہے. عام اس سے کہ کسی کو نجوم پر اعتقاد ہو یا نہ ہو زبان مروجہ اُس کے لوث سے بہ مشکل پاک ہوسکتی ہے. علم نجوم نے آسمان کے صفات اعلیٰ مثلاً فضا اور نظام کے تصورات کو بہت نقصان پہونچایا. اب ہمارے شعرا اُس کو ظالم اور کجرفتار ہی کے خطاب سے اکثر یاد کرتے ہیں. نظام بطلیموسی نے آسمان کو محدود کردیا ہے. اس لئے ہم کو اُس کی فضائے لامتناہی کا تصور جس کا بہت ہی عمدہ اثر تخیل بلکہ اخلاق پر ہوسکتا ہے اُسے محدود کردیا. مسائل ابتدائی علم ہیئت جس سے کہ اجمالی تصور عالم سماوی کا ذہن میں پیدا ہوجائے شاعر کے لئے منجملہ واجبات ہے. صرف نظام شمسی جس میں ایک آفتاب اور نو سیارے اور متعدد اقمار شامل ہیں، اگرچہ وہ اس قدر وسیع ہے کہ ہمارا وہم اُس کے ادراک سے قاصر ہے پھر بھی کل عالم کی وسعت کے مقابلہ میں ایک ذرہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا. اس کے ساتھ ہی مجھکو یہ بھی کہدینا چاہئیے کہ ہمارے معاصرین اکثر کم متصل اور منفصل کے تصور اور تقابل سے بے بہرہ ہیں، اور اس صورت میں ممکن نہیں کہ عالم کی وسعت کا ایک اجمالی تصور بھی اُنکے ذہن میں آسکے.

عظمت مضامین شعریہ میں سے اصل اول ہے. جب اس کے تصور سے شاعر بے بہرہ رہیگا تو اُس کے ذہن پر اصل کا اثر ہی نہ ہوگا. اور نہ اشعار میں اُس کے اُن کا پرتو پایا جائے گا. ہم فضائے ایتھری اور اُن بے شمار اجسام سے جو اُس میں ایک وضع خاص و رفتار خاص کے ساتھ حرکت کرتے رہتے ہیں بالکل واقف نہیں، نہ ہم کو اجرام سماوی کا وزن اور حجم اور رنگ اور اُن کے تغیرات کے میقات پر اطلاع ہے. نہ ہم اُس نظام موسیقی سماوی کو سمجھ سکتے ہیں جس کا فیثاغورث نے تقریباً دو ہزار چھ سو برس پیشتر ذکر کیا تھا. علم موسیقی نظری سے ہم بالکل بے بہرہ ہیں. علم تالیف اور ایقاع کو جانتے ہی نہیں. چند وزن متعارف کو جن پر اُردو شاعروں نے خامہ فرسائی کی ہے اپنی موزونی طبع کا جولانگاہ سمجھے ہوئے ہیں. مثلاً ہم کو یہ نہیں معلوم کہ کونسا وزن شعری کس قسم کے بیان کے لئے مناسب ہے.

شاعری ہمارے دو مصرعوں پر موقوف ہے. اگر اُن میں مناسبات معمولی ہوئے اور بعض وہ صنعتیں جو رائج الوقت ہیں شعر میں پائی گئیں تو گویا ہم نے شاعری کا حق ادا کردیا. جس طرح ہمارے مضمون مصنوعی یعنی غیر طبعی ہیں اُسی طرح ہماری طبیعت بھی اُس کی معتاد ہوگئی ہے. ہمارا مذاق شعر بالکل صحیح نہیں ہے. نہ ہم فطرت کی عظمت جمال اور لطافت سے متاثر ہوسکتے ہیں اور نہ اُس کا انعکاس ذریعہ ہمارے اشعار کے ہمارے سامعین یا ناظرین پر پڑسکتا ہے ہم نے اصلی باغ کو نہیں دیکھا. کاغذ کے کترے ہوئے پھول آرائش کے تختوں پر دیکھ لئے ہیں اُسی کو تختہ گلزار سمجھے ہوئے ہیں. ہم نے ریل کا انجن کبھی نہیں دیکھا مگر اپنے قیاس سے (جس کی وسعت معلوم) اُس کا نقشہ کھینچنے کے لئے آمادہ ہیں. بغیر علم

ہیئت کے مبادی کو سمجھے ہوئے ہم کم از کم ایک ثلث اپنی شاعری کا نذرِ غفلت کر دیتے ہیں۔ باقی رہے دو ثلث اُن کا حال آئندہ معلوم ہوگا۔ اس مقام پر ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اگلے شاعروں میں سے بھی اکثر اُن علوم سے بے بہرہ تھے جن کا ذکر اب تک کیا گیا یا آیندہ کیا جائے لیکن اُن کے اشعار مقبول ہیں۔ اگر اگلے شاعروں سے عرب کے زمانۂ جاہلیت کے شاعر یا اور اُسی طبقہ کے شعراجو اور ملکوں اور قوموں میں سر آمد روزگار ہوگئے ہیں مراد ہیں تو ہم کہیں گے کہ اُن کی شاعری ہرگز کتابی نہ تھی۔ اُن کے اذہان علوم کتابی سے خالی تھے مگر اُن کا دل فطرت کا آئینہ تھا، اُن کی توجہ صوت و حرف میں مقید نہ تھی۔ وہ حقیقتوں کا معائنہ اپنی آنکھوں سے کر کے اپنی زبان سے اُس کو ادا کر دیتے تھے۔ متاخرین یورپ اس بھید کو سمجھے ہوئے تھے، اُن کے شعرا نے اپنی طبیعت کو اس آزادی کے ڈھرے پر ڈال دیا جو شاعری کے لئے موزوں ہے۔ وہاں کا ہر ایک شاعر عجائبات دنیا کی سیر خوشنما جھیلوں اور جزیروں گھاٹیوں اور آبشاروں کو دور دراز سفر کر کے ملاحظہ کرنا، تاریخی مقامات پر جانا منجملۂ واجبات سمجھتے ہیں، لہٰذا اُن کے اشعار سے ناظرین کو سیر بین کا لطف آتا ہے۔

والٹر اسکاٹ ایک رزم گو شاعر اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا، اُس کے وطن کے پہاڑ سبزہ زاروں سے آراستہ نہ تھے، اُس نے عالم طفولیت و شباب میں انھیں پہاڑوں کی ایک ایک گھاٹی کو نہایت شوق سے دیکھا تھا۔ اس کو اس قسم کے سنگستان سے ایک اُنس سا تھا۔ ان پہاڑوں کے سیر کرنے والے پر ظاہر ہے کہ سوائے ہول اور وحشت کے اور کیا اثر ہو سکتا ہے۔ ہول اور وحشت کے مقابلے کے لیے انسان میں ایک قوت ہے جس کو قوت غضبی کہتے ہیں۔ اسی قوت کی تہذیب کا نام علم الاخلاق میں شجاعت رکھا گیا ہے۔ لہٰذا ایسا شخص جس کے نفس پر ہول اور دہشت کا تصور ہوتا رہتا ہے اور وہ عالم خیال میں بسبب اپنی ذاتی شجاعت یا بسبب اُس جوش کے جو شجاعان ملک کے تاریخی واقعات پر نظر کرنے اور اُن مقامات کے دیکھنے سے جہاں معارک جدال و قتال واقع ہوئے ہول پیدا ہو جاتا ہے۔ مقابلہ کرتا رہتا ہے۔ اگر وہ شاعر ہوگا تو ضرور رزمیہ اشعار خوب کہے گا اور یہی حال اسکاٹ کا ہوا۔ فردوسی کے واقعات پر نظر کرنے سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بدو شعور سے اُس کو دہقان پیر کی زبانی اگلی سپاہگری کے معرکوں کی کہانی سننے میں لطف آتا تھا۔ اُس کی طبیعت میں انتہا کی جوانمردی تھی۔ اور جن ملکوں میں اُس کو سفر کرنا پڑا وہ نہایت ہی دشوار گزار اور ہولناک تھے۔ یہی اسباب جمع ہو کے شاہنامہ کی تصنیف کا باعث ہوئے۔ سعدی کی حیات سے ظاہر ہے کہ اسکو سنِ شباب میں ترک وطن کر کے بغداد آنا پڑا اور یہیں وہ طالب العلمی کر کے فاضل مستند کے درجہ پر فائز ہو

پھر اس کو متعدد سفر کرنا پڑے، اور دنیا کے نشیب و فراز دیکھے۔ بہت بڑا تاریخی انقلاب جو اُس کے زمانے میں ہوا وہ سلطنت عباسیہ کا زوال اور سلطنت مغلیہ کا عروج تھا۔ یہی سب امور اُسکے رنگ طبیعت کے موجب ہوئے۔ اُس کے اشعار سے انتہا کی تجربہ کاری پائی جاتی ہے۔ ظرافت و شاعرانہ کمال اُس کا ذاتی ہے جس نے اس کے اشعار کو نہایت ہی بامذاق کردیا۔

خلاصہ تقریر یہ ہے کہ ذاتی تجربہ کو اس فن میں بہت کچھ دخل ہے۔ تجربہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اتفاقات ایسے ہوں کہ اکثر اشیا کا مشاہدہ ہوجائے، مثلاً دور و دراز کا سفر، خانگی حالات، ملاقات احباب یا اور اسی قسم کے جو اسباب ہوں یا بذریعہ علم کے قصداً تجربہ کئے جائیں جیسا کہ علوم عقلیہ تجاربیہ کا معمول ہے اصطلاحاً جو امور بلا قصد پیش آتے ہیں اُن کو مشاہدہ اور جو بالقصد کیے جاتے ہیں اُن کو تجربہ کرتے ہیں

میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ ہمارے اکثر معاصرین تجربہ کم متصل و منفصل سے بے بہرہ ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ ذہناً اعداد اور ابعاد کا توہم نہیں کرسکتے اگرچہ اس کا علم بھی ہو۔ مثلاً زمین کا قطر تقریباً آٹھ ہزار میل ہے اور محیط پچیس ہزار میل۔ یہ اکثر صاحبوں کو معلوم ہوگا۔ مگر پچیس ہزار میل زبان سے کہہ دینا یا بذریعہ رقوم و اعداد کے کاغذ پر لکھ لینا ناکافی ہے۔ اس پچیس ہزار میل کا توہم حقیقی اُس کو ہوسکتا ہے جس نے کل زمین کا دورہ کیا یا یہ کہ مثلاً اور ذرائع سے اوس کا تصور حاصل کیا ہے۔ ایک یہ کہ اگر ریل گاڑی تیس ۳۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلے اور کسی جگہ نہ ٹھہرے تو آٹھ سو تینتیس گھنٹہ بیس منٹ میں زمین کا دورہ پورا ہوجائے گا جس کے چونتیس ۳۴ یوم سترہ ساعت بیس ۲۰ منٹ ہوتے ہیں۔ اگر اس مدت تک ریل گاڑی پر بیٹھے رہیں تو کس قدر کسل ہوگا۔ یا مثلاً پاپیادہ زمین کے گرد سفر کریں (بشرط امکان) اور بیس ۲۰ میل فی یوم چلیں تو بارہ سو پچاس دن یعنی تین سال قمری چھ ماہ گیارہ یوم میں دورہ کامل ہوجائیگا۔ (تین مہینہ ۳۰۔ اور تین مہینہ ۲۹ یوم کے۔)

اجرام سماوی میں سے آفتاب کا اثر تخیل پر سب سے زیادہ ہے، اور یہی سبب ہے کہ مذہب کی تاریخ کے ملاحظہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب پرستی بہت ہی قدیم مذہب ہے۔ اکثر زبانوں میں جہات اربعہ کے نام سے وضع سایہ شمس کی پائی جاتی ہے۔ مثلاً لفظ شمال کے معنی بائیں ہاتھ کے ہیں۔ اگر کوئی شرق کی طرف منہ کرکے کھڑا ہو تو ضرور شمال اوس کے بائیں ہاتھ کی طرف پڑے گا۔ آفتاب کی حرارت سے قوت قہری اور اشراق اور ضوء سے نور۔ اور ضوء اور حرارت کی آمیزش سے جلال کا تصور پیدا ہوتا ہے ہمارے ملکوں میں گرمی زیادہ ہے۔ اس لئے اس کا تصور الم سے خالی نہیں سرد ملکوں کے بسنے والوں

کا خیال نسبت آفتاب کے جداگانہ ہے۔ اُن کے نزدیک اُس میں شان محبوبیت پائی جاتی ہے اور اس کا انھیں وجدان ہوتا ہے۔ ہمارے ملکوں میں بھی ظہور نیر اعظم کے وہ اوقات جن میں حرارت اعتدال کے ساتھ ہے نہایت ہی پسندیدہ منظر دکھاتے ہیں۔

شفق سفیدۂ سحری اور طلوع آفتاب سے ہزارہا مضامین اخذ کئے گئے ہیں۔ چونکہ آفتاب کا جرم مرئی چھوٹا سا معلوم ہوتا ہے اور عام نگاہیں اُس کی عظمت کی حد تک نہیں پہونچ سکتیں، ایک اجمالی تصور اس امر کا کہ آفتاب زمین سے بڑا ہے شاید عام لوگوں کو بھی ہو مگر وہ کافی نہیں ہے۔ اس امر کا تصور دلوں میں بمشکل پیدا ہوسکتا ہے کہ آفتاب اور زمین کے قطروں میں (۷۹۱۲) امیال اور (۸۸۰۰۷۶) امیال کی نسبت ہے یا یہ کہ آفتاب زمین سے (۹۵۲۹۸۲۶۰) امیال کی دوری پر ہے۔ اور یہ امور تو اس سے بھی زیادہ بعید الفہم ہیں کہ اس قدر بُعد سے آفتاب زمین کو کھینچتا ہے۔

ماہتاب آفتاب سے استفادۂ حرارت و نور کرتا ہے کسب حرارت کی مثال آتشی شیشہ سے بہتر نہ ہوگی جو اس قدر بُعد سے اتنی حرارت جذب کرلیتا ہے کہ آگ لگا دینے کے لئے کافی ہو۔

سوائے ماہتاب کے اور سیارے بھی کسب نور کرتے ہیں اور بہ لحاظ قُرب و بُعد اور مسامتت اور عدم مسامتت کے کمی اور زیادتی نور کی مثل قمر کے اُن سیاروں میں بھی ہوتی رہتی ہے۔

اجرام سماوی کے اوقات ظہور و خفا اور حرکات مستقیمہ و رجعت وغیرہ سے شعرا نے بہت کام لئے ہیں۔

اشکال سماوی جن کا تعین اور تسمیہ محض وہمی تھا شاعری میں مدتوں سے جاری ہے۔ ہمارے شعرا کے خیالی آسمان میں اشکال و بروج وغیرہ زندہ موجود رہتے ہیں۔ اور اُن کی طرف صفات ذی حیات جانوروں کے منسوب کیے جاتے ہیں۔ مگر اب اوس میں کوئی اثر باقی نہیں رہا۔ اس لیے کہ اثر موہوم واقعیت سے بہت بعید ہوگیا ہے، اور اب جس قدر اثر باقی ہے وہ بہ سبب عدم علم کے ہے۔ ورنہ درحقیقت اُس میں کوئی لطف نہیں ہے۔

یہاں پر ایک نکتہ باریک یہ عرض کرنا ہے کہ ہر تشبیہ کی وسعت وجہ شبہ تک محدود ہے اُس سے زیادہ توسیع لغو محض ہے۔ مثال اُس کی یہ ہے کہ معشوقوں کے خط کو سبزہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اب اس سبزہ کے لئے کوئی جانور چرندہ قرار دینا یا اُس سبزہ کا خشک ہوجانا یا اُس سبزہ کا سوکھی گھاس بنکے بھاڑ میں جھونکا جانا یہ مضامین وجہ شبہ کی حد سے خارج ہیں فلہذا لغو ہیں۔

تشبیہوں کو اپنی حد پر رکھنا فطرت سلیم کا کام ہے ورنہ متقدمین اور متاخرین اکثر کے کلام میں یہ نقص پایا جاتا ہے غالباً اس قانون کی طرف توجہ نہ تھی۔

میں سابقاً عرض کر چکا ہوں کہ ہمارا آسمان ذہنی ہے ہم کو عالمِ خارجی کے مشاہدہ کا شوق ہی
نہیں، اس وجہ سے ہم کو ثوابت اور سیارات، ذوات الاذناب۔ شہاب۔ بروج و اشکال۔
کہکشاں۔ خسوف و کسوف۔ زمین۔ جوّ۔ فضا۔ اہویہ۔ بخارات طوفان۔ گردباد۔ سحاب۔ رعد۔
برق۔ باراں وغیرہ سے نئی نئی تشبیہیں مل سکتی ہیں۔ ورنہ یہ مبادی تشبیہہ ہمارے اور نیز ہمارے
بعد مدت ہائے مدید تک بلکہ تا قیامت شاعروں کے واسطے کفایت کرتے ہیں۔ مبدء فیاض کا
خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا۔ مگر لینے کے واسطے تمیز چاہیئے۔

زمین جس پر ہم آپ رہتے سہتے ہیں یہی کیا کم ہے۔ کوہستان۔ وادی۔ غار۔ میدان
جنگل۔ سمندر۔ دریا۔ چشمہ سار۔ آبشار۔ ترائی۔ سراب وغیرہ سب خدا کی قدرت کے نمونے ہیں
ان کے علاوہ زمین پر جو چیزیں پائی جاتی ہیں از قسم جمادات و نباتات و حیوانات۔ جمادات میں
سے طرح طرح کے خوشرنگ پتھر۔ الماس۔ یاقوت۔ زمرد۔ پکھراج۔ نیلم وغیرہ۔ نباتات میں سے
ہر قسم کے درخت، ان کے زنگارنگ پھول پات بیخ و شاخ و برگ۔ غنچہ۔ ثمر۔ نمو۔ رس۔ یا حیات
حیوانی میں سے صحت و مرض۔ استخوان۔ رباطات عضلات۔ دل۔ جگر۔ ریہ۔ معدہ۔ طحال۔ سر
مخ۔ دماغ۔ زبان۔ دست و بازو۔ ہاتھ پاؤں۔ پھر ان کے اجزا اور لوازم میں طرح طرح کی منفعتیں
اور خوبیاں ہیں جن کی تصویریں شاعروں کو ہو بہو دکھانا چاہیئے ہیں۔

حیوانات مخصوصہ مثل شیر و پلنگ۔ روباہ۔ خرس۔ گوسفند۔ گاؤ۔ اور دوسرے وحش و طیر
ہوا وغیرہ۔ وہوام غرضکہ یہ سب شعرا کے واسطے ہیں۔ مخلوقات آلٰہی کے ماورا انسانی مصنوعات
سے شعرا نے بہت کچھ مضامین اخذ کئے ہیں مثلاً جہاز و قصر و منار وغیرہ۔

حال کے مصنوعات مثل ریلوے انجن و تار برقی وغیرہ کو ابھی ہمارے ملک کے شاعروں نے
علٰحدہ رکھا ہے اس کی وجہ معلوم نہیں۔

فطرت کے ذخائر سے ابھی بہت ہی کم چیزیں ایسی ہیں جن سے ہمارے شعرا نے کام لیا ہے۔ مثلاً
اقسامِ طیور ہی کو لیجیے۔ اہلِ علوم نے تین ہزار سے زیادہ انواع طیور کا بیان کیا ہے۔ ہمارے شعرا کو
ان میں سے بلبل۔ کبک۔ طاؤس۔ طوطی۔ قمری۔ زاغ۔ ہما۔ عنقا۔ موسیقار۔ بس انھیں چند جانوروں
کا نام یاد ہے۔ ان میں سے موسیقار۔ ہما اور عنقا محض خیالی ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس درختوں میں بھی یہی کیفیت ہے۔

اب علوم کی طرف آئیے۔ آلٰہیات۔ ریاضیات۔ طبیعیات۔ علم تمدن۔ تدبیر منزل۔ علم اخلاق۔

ان علوم کے ان مسئلوں کو شعرا اس خوبصورتی سے بیان کر سکتے ہیں کہ سامع ہر چند کم فہم ہو مگر وہ اُسے سمجھ سکتا ہے۔ اگرچہ مبادی تشبیہ کو جس تفصیل کے ساتھ میں بیان کرنا چاہتا تھا وہ اس بے اطمینانی اور تشویش کے زمانہ میں مجھ سے نہ ہو سکا مگر پھر بھی آپ اگر ایک نظر اُن امور کی طرف کریں گے جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اور پھر اپنے ملک کی شاعری کو ملاحظہ کریں گے تو آپ پر واضح ہو جائیگا کہ ہماری شاعری کس درجہ محدود ہے۔ اور ملکوں کے شاعر دور دراز ملکوں میں جا کر آثار فطرت اور مصنوعات انسانی کا ملاحظہ کرتے ہیں۔ مثلاً یورپ کے شاعر ملک اطالیہ خصوصاً رومۃ الکبریٰ میں جا کر قدیم رومیوں کی عمارت تمدن معابد و ہیاکل کو دیکھنا لازم اور ملک سوئٹزرلینڈ کی جھیلوں کا تماشا واجب سمجھتے ہیں۔ ہمارے وطن لکھنؤ کے شاعروں میں سے اکثر کالے پہاڑوں تک نہ گئے ہونگے جو نافِ شہر سے دو تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ آپ خوب جانتے ہیں کہ ہر چہ از نگہ خیزد بر دل ریزد۔ خود شاعر کے دل پر جس چیز کا اثر پڑتا ہے جب اُسے وہ بیان کرتا ہے تو اور لوگ بھی اُس سے متاثر ہوتے ہیں۔ ایک ظاہری وجہ تو اس کی یہ ہے کہ جس امر کا تجربہ خود انسان کو نہیں ہوتا اُسے وہ بیان ہی نہیں کر سکتا۔

مخلوقات اور مصنوعات عالم خارجی کے سوا عالم ذہنی سے بھی بہت سے مضامین شعرا کو مل سکتے ہیں۔ یعنی اُن چیزوں سے جن کو ہم نے بذریعہ کسی حس کے دریافت نہیں کیا ہے بلکہ اُن کا وجود بالفعل ذہنی ہے۔ مثلاً بہشت۔ دوزخ۔ قیامت۔ میزان۔ صراط وغیرہ اس قسم کے مضامین مذہبی تخیلات کے واسطے بہت ہی مفید ہیں۔ علم تاریخ سے شعرا کو بہت مضمون مل سکتے ہیں۔ نامی گرامی شعرا کے کلام میں تلمیحات تاریخی ہوا کرتے ہیں۔ تلمیح کا رواج ہمارے شعرا میں کم ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ واقعات تاریخی نہ عام شعرا کو یاد ہیں نہ عام سامعین اور ناظرین ان کو سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی تلمیحات کو فروگذاشت کرنے کی کوئی وجہ کافی موجود نہیں بلکہ اگر اس کی مراعات لی جائے تو میدان شعر وسیع ہو سکتا ہے اور اُس کے ساتھ ہی یہ فائدہ بھی ہے کہ وہ واقعات جن کو شاعر نظم کر دیں گے وہ ضرور ہی مشہور ہو جائیں گے۔ ہمارے شہر بلکہ ہندوستان کے فخر دو شاعر مرزا دبیر اور میر انیس اعلی اللہ مقامہما نے احادیث و روایات کو نظم کرنے کا التزام لیا اور اس قسم کی تلمیحات اپنے کلام میں داخل کیے اُس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جو لوگ اُن کے کلام بلاغت نظام کے دیکھنے کا شوق رکھتے ہیں، اُن کو ہزارہا واقعات تاریخی سیرت انبیا اور آئمہ ہدا پر اطلاع ہو گئی۔ اخلاق پر اس سے بہت ہی عمدہ اثر پڑا۔ جیسی ان دو شاعروں کی تعظیم و توقیر ہوئی اور

شعرا کو نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ جس قدر زمانہ گزرتا جائے گا اُن کا کلام مطبوع ہوتا جائے گا۔ اس سے زیادہ اُن کا کلام قدر و منزلت کے لائق تھا، مگر افسوس کہ اُن کی شاعری کا تعلق فرق اسلام میں سے صرف ایک فرقہ کے ساتھ تھا۔ اگر اس مذہبی خصوصیت سے قطع نظر کرکے دیکھیے تو بھی یہ شاعری قابل قدر ہے۔ یہ خصوصیت تو باعتبار مضامین کے تھی، ایک خصوصیت باعتبار صورت ظاہری کے بھی ہے، وہ یہ کہ جزو اعظم اُن کے مرثیوں کا صرف ایک صنف شعر ترکیب مسدس کے ساتھ مختص ہے۔ ممکن تھا کہ ہر صنفِ شعر میں مرثیے کہے جاتے۔ یا سوائے اُن مضامین کے جو مرثیہ کے ساتھ مختص کر دیے گئے ہیں عام مضامین حکمت و اخلاق کے کہے جاتے۔

اس موقع پر مجھے یہ بھی کہنا پڑا کہ ہمارے شعرا نے نہ صرف از روئے معنویت بلکہ لفظاً بلکہ وزناً بھی اپنے کلام کو محدود کر دیا۔ بحور اور اوزان جو اُردو شاعری میں رائج ہیں وہ بھی بہ نسبت فارسی اور عربی کے کم ہیں۔

بعض صاحب یہ کہیں گے صرف وہی وزن از روئے طبیعت پسندیدہ ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ اوزان بحور مزاولت سے مطبوع اور پسندیدہ ہو جاتے ہیں یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ بعض اوزان جن کو میں خود غیر مطبوع تصور کرتا تھا مزاولت سے مطبوع ہو گئے اور مزاولت کے واسطے زیادہ محنت کی ضرورت نہیں ہے جو وزن اچھا نہ معلوم ہوتا ہو اُس میں چند شعر کسی شاعر کے کہے ہوئے یا اپنے آپ ہی چند شعر موزوں کرکے دس بارہ منٹ تک زبان سے پڑھے جائیں یا کم از کم الفاظ وزن کو زبان پر جاری کریں اور اگر مع ترنم ہو تو جلد تر اثر ہوگا۔

اوزان شعر میں اور تصرفات جائز بھی ہو سکتے ہیں بلکہ بعض تغیرات کیے بھی گئے ہیں اور وہ علی العموم پسندیدہ ہوئے۔

ایک اور امر بھی لائق غور ہے کہ ہمارے شعر کہنے کا کیا اصول ہے۔ آج کل عموماً غزل گو شاعر زیادہ ہیں، کہیں مصرع طرح کا دے دیا گیا یا خود کسی اُستاد کے دیوان کی کوئی طرح پسند کی یا خود ہی اپنی طبیعت سے کوئی نئی زمین نکالی، اب قافیوں پر نظر کی اور ہر ایک قافیہ کا لگاؤ ردیف کے ساتھ دیکھنا شروع کیا، اسی اثنا میں ہر قافیہ کے ساتھ مصرعہ کہنے لگے، اب اِن مصرعوں پر مصرعے لگا دیے چلیے غزل ہو گئی۔ مطلع کہنا فدا دقت طلب ہے اس لیے کہ اُس میں دو قافیوں کا باہمی ربط اور پھر ردیف کے ساتھ دونوں کا علاقہ دیکھنا پڑتا ہے۔ بہر صورت مضامین قافیوں سے پیدا کیے جاتے ہیں غزل اور غزل کے مثل جو اصناف شعر ہیں مثلاً قصیدہ اور ترکیب بند اور ترجیع بند

سب کی ترکیب کا اصل اصول یہی ہے۔ مرثیہ میں بند کا پہلا یا چوتھا یا چھٹا مصرعہ پہلے کہہ لیتے ہیں اور پانچ مصرعہ اور لگانا پڑتے ہیں۔ غزل میں مضمون کو سمیٹنا پڑتا ہے اور مسدس میں پھیلانا پڑتا ہے۔ رباعی میں بھی صرف ایک مصرعہ کہہ کے تین مصرعہ اور قوافی کی پابندی سے پیدا کئے جاتے ہیں۔

ان سب اصناف میں شاعر کی طبیعت کو قافیوں کی متابعت کرنا پڑتی ہے۔ مثنوی میں البتہ شاعر کسی قدر آزاد ہوتا ہے۔ ہر ایک مصرعہ اپنی طبیعت سے مضامین کی مناسبت کے ساتھ پیدا کرتا ہے اور دوسرا مصرعہ اس مصرعہ کے کسی قافیہ کی پابندی سے کہنا ہوتا ہے۔ اس لئے اکثر مثنوی کہنے والے دوسرے مصرعے برائے بیت لگا دیا کرتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مصرعہ کہا اور دوسرا مضمون جو اس سے دست و گریباں ہے اس مصرعہ کے قافیہ کے ساتھ نہیں آتا اس صورت میں سخت افسوس ہوتا ہے۔ نواب مرزا شوق مرحوم کا وہ شعر

عشق کیا چیز ہے بلا جانے ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

دونوں مصرعوں میں کیسی مناسبت ہے۔ گویا دوسرا مصرعہ اسی کے لئے تھا مگر قافیہ نہ ملا۔

اسی مشکل پر نظر کر کے متقدمین یونان اور متاخرین انگلستان نے قافیہ کی قید کو اڑا دیا، نظم بے قافیہ کہنی شروع کی۔ اس قسم کی نظم کو ہمارے براعظم میں نثر مرجز کہتے ہیں۔

جب پہلے پہل انگلستان میں نظم بے قافیہ میں لوگوں نے شعر کہے، ڈاکٹر جانسن سے جو اس وقت کے محققین لغت سے تھا لوگوں نے رائے طلب کی۔ جانسن نے کہا کہ پھر اس سے نثر ہی کیوں نہیں کہتے۔ اگر ہمارے ملک میں کوئی اس طرح کی نظم کہے (بلکہ بعض نے کچھ کہا بھی) تو اس کی نسبت یہی کہا جائیگا۔ راقم الحروف نے خود کئی مرتبہ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ واقعی کچھ بے تکی سی معلوم ہوتی ہے[۱]

سوا نثر مرجز کے ایک صنف نظم کی ایسی بھی ہے جس کو موزوں بغیر قافیہ کہہ سکتے ہیں یعنی فرد اس لئے کہ فرد میں بھی قافیہ کی قید نہیں ہے۔ بلکہ بعض محققین کے نزدیک عدم قافیہ فرد میں مشروط ہے اور جو دو مصرعہ مقفیٰ ہوں انھیں مطلع کہتے ہیں۔ اگرچہ راقم الحروف کے نزدیک فرد میں عدم تقصیہ واجب نہیں ہے، کیونکہ مطلع ایک جزو غزل یا قصیدے کا ہے کوئی مستقل صنف شعر نہیں ہے۔ بہر نوع ایک مجموع فردیات کو نظم بے قافیہ سمجھ لیجئے۔ اس صورت میں ایک خاص تصرف کرنا پڑیگا۔ وہ یہ کہ فرد میں ایک مضمون ایک ہی بیت میں ختم ہو جاتا ہے اور مجموع فردیات میں ایک فرد کے مضمون کو

---

[۱] بے تکی نظم واقعی اچھا نام ہے، اسلیے کہ ہندی میں قافیہ کو تک کہتے ہیں۔

دوسری فردوں سے تعلق رہے گا۔ ہمارے ملک میں بھی شاعری کا میلان اسی طرف ہے کہ نظم سے قافیہ کی قید حتی الوسع کم کردی جائے تاکہ شاعر کو خیالات کی آزادی سے موزوں کرنے کا موقع ہے اور یہ میلان اس وقت سے شروع ہوا ہے جب سے سنگلاخ زمینوں میں غزل کہنا ترک کیا گیا۔ ذوق کے اُستاد نَاصِر کا دیوان دیکھئے سرے سے اخیر تک سنگلاخ زمینیں بھری پڑی ہیں۔ اگرچہ اس سے شاعر کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے مگر کوہ کندن اور کاہ برآوردن کا سا مضمون ہے۔ خیالات اور جذبات کا لطف نہیں ملتا۔ ہمارے زمانے کے شعرا جن کا کلام مطبوع خاص وعام ہے۔ مثلاً نواب مرزا صاحب، داغ دہلوی یا جناب امیر احمد صاحب امیر مینائی یا حکیم ضامن علی صاحب جلال لکھنوی یا اور اساتذۂ حال، ان بزرگوں کے کلام میرے دیکھنے سننے میں آئے ہیں، میں نے سنگلاخ زمینیں نہیں دیکھیں۔ بخلاف اس کے اگلے شعرا میں اُس قسم کی زمینیں کم وبیش سب کے کلام میں پائی جائیں گی۔ اگلے شاعروں میں میر تقی میر بھی سہل اور شگفتہ[1] زمینوں میں شعر کہتے تھے۔

ایک تصرف اور راقم الحروف نے تجویز کیا ہے اگر اُس طرز پر کچھ نظمیں کہی جائیں تو عجب کیا کہ مطبوع ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ایک مصرعہ پر دو دو مصرعہ تین تین مصرعے یا زیادہ لگائے جائیں۔ اور اس قسم کے ہر ایک قطعہ کو اُن میں سے ایک دَور کہیں اور کم سے کم دو دَوروں کے اخیر مصرعے مقفّےٰ ہوں یہ کچھ ضرور نہیں کہ ہر دَور میں تعداد مصرعوں کی مساوی ہو بلکہ کم وزیادہ ہو تو کچھ حرج نہیں ہے۔ اور اس قسم کے بہت سے ادوار کا مجموعہ ایک نظم سمجھی جائے۔

مقصود ان تصرفات سے یہ ہے کہ شاعر کو اپنے خیالات آزادی سے نظم کرنے کی قوت حاصل ہو جب تک ایسا نہ ہوگا شاعری محدود رہے گی۔ پھر قافیہ کی قید بالکل ترک کر دینا یہ بھی پسندیدہ نہیں ہے پس کوئی نہ کوئی بات ایسی ہونا چاہیئے جس سے دونوں باقی رہیں۔ یعنی آزادیٔ مضمون اور قافیہ

مَیں نے مکرر کہا ہے کہ شاعری اور مصوّری دونوں ایک ہی طرح کی صنعتیں ہیں، یہ قول حکیم ارسطاطالیس کا ہے۔ اچھا اب یہ تصور کیجئے کہ مصوّر جب کسی شے کی تصویر بناتا ہے وہ کیا کرتا ہے۔

۱۔ ایک صورت عمل کی یہ ہے کہ اُس شے کو نظر کے سامنے رکھ کے اس کے اجزا کے تناسبات کے مطابق ہر تصویر کھینچتا ہے۔

۲۔ دوسری صورت عمل کی یہ ہے کہ (جبکہ شے جس کی تصویر کھینچنا منظور ہے موجود نہ ہو) کہ متخیلہ میں جو اُس شے کی تصویر موجود ہے سطح تصویر پر اُس کی نقل کرتا ہے۔

---

[1] شگفتہ زمین سے یہ مطلب ہے کہ اکثر قوافی غزل کے ردیف کے ساتھ مرتبط ہوں۔

۳۔ تیسری صورت عمل کی یہ ہے کہ (جبکہ ایسی شے کی تصویر بنانا ہو جو نہ خارج میں موجود ہو نہ ذہن میں) متخیلہ سے بعض اجزا کو بعض کے ساتھ ترکیب دے کے ایک جدید صورت اختراع کرتا ہے۔ مثلاً ایسا شخص جس کے دس سر اور سو ہاتھ اور ہزار پاؤں ہوں۔ یہی تین صورتیں صنعتِ شعر کی بھی ہیں۔

(۱) شے موجود فی الخارج حاضر ہو۔

(۲) شے موجود فی الخارج حاضر نہ ہو بلکہ ذہن میں اُس کی تصویر ہو۔

(۳) شے نہ خارج میں موجود ہو نہ ذہن میں بلکہ ایک جدید صورت اختراع کی جائے۔

ہمارے شعرا کا معمولی یہ طریقہ ان میں سے کسی میں داخل نہیں ہے۔ ہم قافیہ میں سے مضمون پیدا کرتے ہیں۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی　　کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان ست

نہ ہم خارج سے مضامین اخذ کرتے ہیں نہ ذہن سے۔ ہم کو اس پر قدرت ہی نہیں کہ کسی منظر کو دیکھ کے زبانِ قلم سے اُس کی تصویر کھینچ دیں۔

نظم ایک طرف، نثر میں بھی جہاں تک میں نے خیال کیا ہے یہی نقص پایا جاتا ہے۔ اکثر ناول جو اس زمانہ میں لکھے گئے اُن سب میں ایک ہی طرح کے منظر ہوتے ہیں، اور وہی ہر پھر کے آتے ہیں جیسے اس شہر میں ایک غریب تھیٹر تھا جسے لوگ مذاق سے جیتھڑا کمپنی کہتے تھے، اُس میں چند پردے تھے خواہ مخواہ تماشہ میں وہی پردے بار بار دکھائے جاتے تھے خواہ اُن کا محل ہو یا نہ ہو۔

اکثر تقلید پیشہ ناول نویسوں نے رینالڈ کے ناول انگریزی میں پڑھے ہیں۔ اُسی کے مضامین جس قدر یاد رہ گئے ہیں اُس کو اپنے ناولوں میں صرف کرتے ہیں۔ قصہ میں بھی کوئی جدت نہیں ہوتی۔ میں نے کسی انگریزی کتاب میں انگلستان کے ناول نویسوں کے پلاٹ (قصہ) کی ایک عام صورت پڑھی تھی۔ اُس کا ذکر اس موقع پر لطف سے خالی نہیں۔ واقعی ناولوں میں اس کے سوا ہوتا ہی کیا ہے۔

ایک باغ میں ایک خوبصورت نوجوان مس سے ایک صاحب بہادر کا سامنا ہوتا ہے۔ صاحب بہادر ایک جان سے ہزار جان عاشق ہو جاتے ہیں۔ مس صاحبہ سے اظہار تعشق کرتے ہیں اور شادی کا پیام دیتے ہیں۔ مس صاحبہ نیم راضی ہیں۔ صاحب بہادر مفلس ہیں اس لئے مس صاحبہ کے والد ماجد قطعی انکار کرتے ہیں۔ دلوں میں محبت رہتی ہے۔ مس صاحبہ کی شادی ایک اور صاحب سے ٹھہرتی ہے۔ یہ دوسرے صاحب بڑے دولتمند ہیں اس لیے مس صاحبہ کے والدین کو یہ شادی منظور ہے مگر بڈھے اور بدصورت ہیں۔ اس لئے مس صاحبہ کو منظور نہیں۔ پہلے صاحب سے پھر ایک باغ میں خفیہ

ملاقات ہوتی ہے۔ پینگ بڑھتے ہیں، مس صاحبہ کے والدین مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ پہلے صاحب بہادر مس صاحبہ کو بھگالے جانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ دونوں کی ایک رائے ہو جاتی ہے، صاحب ایک سیڑھی لے کے آدھی رات کو مس صاحبہ کے بنگلہ کی کھڑکی کے پاس سیڑھی لگا دیتے ہیں۔ مس صاحبہ اتر کے صاحب بہادر کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ کسی دور و دراز ملک میں جاکر شادی ہو جاتی ہے۔ والدین سے ترک ہو جاتی ہے، صاحب بہادر کے باپ مر جاتے ہیں، بہت سی دولت ہاتھ آتی ہے، مس صاحبہ کے والدین سے ملاپ ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ ہمارے ناول نویسوں کے لئے ایسا ہی ایک ڈھانچہ بنا دیا جائے، اسی پر ہزاروں ناول نام بدل بدل کر لکھ لیے جائیں۔

ایک اور خرابی ہمارے ملک کے ناولوں میں پردہ کے اصول کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ عوام عشق اور عاشقی کو ہر قصہ کی جان سمجھتے ہیں، لذت فراق، اور انتظار سب سے عمدہ مضمون خیال کیا جاتا ہے پھر اگر کسی پردہ نشین سے سامنا ہو بھی گیا تو بغیر اس کے کہ اس کی عصمت پر دھبہ لگے، پیام سلام، وعدے وعید۔ فراق۔ انتظار یہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا اور جب تک یہ نہ ہو قصہ کا مزا کیا۔ لہذا لازم ہوا کہ ہر قصہ میں ناجائز محبتوں کا تذکرہ ہو اور یہ موجب خرابی اخلاق کا ہے۔ ناول پر کیا موقوف اور قصے بھی اسی طرح کے ہیں۔ نواب مرزا شوق کی مثنویوں میں زنا بالجبر کے ارتکاب کا مصنف نے خود اعتراف کیا ہے۔ آفتاب الدولہ قلق نے مثنوی طلسم الفت میں جمع بین الاختین کو جائز رکھا ہے۔ قدیم مثنویوں میں میر حسن کی مثنوی بہت مقبول ہے اُس میں بھی پہلے ناجائز طور سے وصال ہوا پھر فراق کے بعد شادی ہوئی۔ خلاصہ یہ ہے کہ گناہگاریوں کا ذکر قصوں کی جان سمجھی گئی ہے۔ اس سے اخلاق پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ ملکی قانون نے فحش الفاظ کے استعمال سے روک دیا ورنہ اور بھی فصاحتیں صرف کی جاتیں۔ اگلے قصوں میں ایسے مضامین بھی ضرور ہی ہوتے تھے۔ کوئی قصہ اس سے پاک نہیں ہے اور اس سب کا سبب کلی یہ ہے کہ فطرت کے ملاحظہ کا ہمارے ملک میں بہت ہی کم شوق ہے جمال اور عظمت کے تصورات سے اذہان قاصر ہیں، نئے مضمون کیونکر نکلیں اور اگر نکلیں بھی تو ردیف اور قافیوں کی قیود کی وجہ سے موزوں نہ ہو سکیں گے۔ اور اگر کوئی موزوں کرے اور بعض تصرفات کو دخل دے تو نشانۂ تیر ملامت ہوگا۔ اعتبار کے دائرہ سے خارج ہو جائے گا، اُستادی میں بٹّہ لگ جائیگا۔

اس سے پیشتر کسی مراسلہ میں ہم نے مبادی تشبیہ کو بیان کیا ہے۔ اب ہم بعض اقسام تشبیہ کو ایک جدید اصول سے بیان کرتے ہیں

باعتبار غرض کے تشبیہ کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں:-

(۱) وہ تشبیہ جس سے مشبّہ کی توضیح مقصود ہو۔
(۲) وہ تشبیہ جس سے کوئی وجدان خاص پیدا کرنا مقصود ہو۔
پہلی غرض علمی ہے یعنی مفید ہے علم کے لئے، دوسری غرض وجدانی ہے جس سے فیض و بسط مطلوب ہو۔
مثلاً پوپ شاعر کے ایک شعر کا یہ مضمون ہے:۔
"کہ انسان کی حیات کا جہاز عقل کی رسیوں اور خواہش کی ہوا کے زور پر چلتا ہے۔"
اس تشبیہ میں یہ لطف ہے کہ جس طرح بادِ مخالف جہاز کی رسیوں کو توڑ کے جہاز کو درہم برہم کر دیتی ہے یہی حال ہماری خواہشوں کا ہے کہ جب وہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہوتی ہیں تو گویا انسانی حیات کا جہاز طوفانی ہو جاتا ہے، اور انجام اس کا غرق ہے، یا سعدی کا وہ مشہور شعر

رعیت چو بیخ است و سلطاں درخت   درخت اے پسر باشد از بیخ سخت

صائب اور غنی کے اشعار اسی قسم کے ہیں، ان لوگوں نے اکثر ایسے ہی اشعار کہے ہیں

بر تواضع ہائے دشمن تکیہ کردن ابلہی ست   پائے بوسِ سیل از پا افگند دیوار را

اس آخر شعر میں سیل کو ذوی العقول میں سے فرض کر لیا ہے مگر اس قسم کی تشبیہوں میں قوت کم ہوتی ہے اس لئے کہ بعض صورتوں میں عکس غلط ہو جاتا ہے۔ سعدی کا یہ شعر نہایت ہی عمدہ مثال ہے ؎

نہ محقق بود نہ دانشمند   چارپائے بر و کتابے چند

بعض صورتوں میں مشبہ بہ میں کچھ تصرف کر دیتے ہیں مثلاً پوپ شاعر نے علم و معرفت کو شراب سے تشبیہ دی ہے اور یہ کہتا ہے کہ ایسی ہے جس کے کم پینے سے نشہ ہوتا ہے اور زیادہ پینے سے دماغ صحیح ہو جاتا ہے۔ یہ خلافِ واقع ہے مگر شراب کو لفظ معرفت یا حقیقت کے ساتھ بیان کر دینے سے (جیسا کہ شاعر نے کیا بھی ہے) وہ اعتراض مرتفع ہو گیا۔
دوسری قسم وجدانی تشبیہوں کی غرضِ عقل سے بالکل مغائر ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی مشبہ کا اثر وجدان پر کم پڑتا ہوا معلوم ہو تو اُس اثر کو مشبہ بہ کے ذریعہ سے بڑھا دیں مثلاً ارسطاطالیس نے عدالت کو صبح کے ستارہ سے تشبیہ دی ہے۔ واقعی عدالت ایک امر معقول ہے اس کا محض ذکر ایسا کوئی اثر نہیں پیدا کر سکتا ہے جیسا کہ صبح کے ستارے کی تخئیل سے پڑ سکتا ہے۔

وہ تشبیہیں جن کا اثر وجدان پر پڑتا ہے، اصل اُن کی تصور الم یا لذت کا ہے، الم کا تصور لذت کے تصور سے زیادہ ترمؤثر ہے، اِسی لئے حکماء نے اُس افسانہ کو جس کا انجام غم پر ہوتا ہے زیادہ ترمفید اخلاق بیان کیا ہے۔ بہ نسبت اُن افسانوں میں کا انجام شادی پر ہے۔

وہ افسانے جس کا انجام غم ہے ٹریجڈی کہلاتے ہیں جس کو شیخ ابوعلی سینا نے طراغودیا کہا (دیکھو کتاب شفا جلد منطق ریطوریقیہ (خطابت) اور بوطیقیہ (شعر)۔ وہ افسانے جس کا انجام شادی ہے کمیڈی کہلاتے ہیں، اس کو شیخ نے کموذیا کہا ہے۔ وہ افسانے جنمیں ذکر جنگ وجدال کا کیا جاتا ہے ایک کہلاتے ہیں شیخ ان کو آنی کہتا ہے۔

علم نفس میں ثابت ہوچکا ہے کہ واقعی لذت اور الم سے جو اعصاب متاثر ہوتے ہیں وہی اعصاب اُس کے تخیل سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اگرچہ واقعی تحریک تخیلی تحریک سے باعتبار قوت کے بہت ہی اخف ہوتی ہے۔ اس درجہ خفت کا تدارک اور طریقوں سے کیا جاتا ہے، تاکہ اثر تاحد امکان زیادہ ہوجائے۔

وجدانی اثر کے پیدا ہونے کے لئے یہ شرطیں ہیں اول مشبہ بہ اور مشبہ میں بحیثیت تاثیر کے مطابقت ہو اور مشبہ بہ اقوی ہو۔ دوم مبتذل نہ ہو۔ سوم ایک حد خاص سے متجاوز نہ ہو۔

پہلی شرط تشبیہ کی ضرورت ذاتی سے پیدا ہوتی ہے۔ بالفرض اگر دو وجدان مغائر مشبہ بہ اور مشبہ سے پیدا ہوں تو ضرورت تشبیہ کی نوت ہوجاتی ہے۔ اگر قوت میں زیادہ نہ ہو تو تخیلی اثر میں بہ نسبت واقعی کے جو کمی ہے اُس کا تدارک نہ ہوگا۔ اگر مشبہ بہ اور مشبہ کی قوتوں میں نسبت مساوات کی ہو تو تشبیہ عقلی ہوجائیگی جس کی غرض محض بیان اور توجیہ ہے نہ تاثیر وجدانی اور اس حالت میں بھی اعرفیت مشبہ بہ کی مشروط ہے۔ اور اگر قوت میں کم ہو تو غرض تشبیہ کلیتہً فوت ہوجائیگی۔

دوسری شرط ما بہ الامتیاز ہے درمیان تشبیہ عقلی اور وجدانی کے۔ مبتذل سے مقصود وہی تشبیہ ہے جس کی تکرار اکثر ہوچکی ہے۔ جس قدر تکرار زیادہ ہوتی جائیگی غرابت کم ہوتی جائے گی۔ اور اعرفیت بڑھتی جائیگی۔ پس غرابت اور اعرفیت میں نسبت عکسی ہے، غرابت مفید ہے وجدان کے لئے اور اعرفیت مضر ہے۔ برعکس اس کے اعرفیت مفید ہے توجیہ کے لئے نہ صرف غرابت بلکہ لازم اور ملزوم کا بعد بھی تشبیہ وجدانی کے لئے مشروط ہے تاکہ تصادم ملائم کے لئے مفید ہو

تصادم ملائم اسی حالت میں پیدا ہوگا جبکہ لازم اور ملزوم میں بُعد ہو اور ایک کے ذریعہ سے
دوسرے کا علم بعد غور اور فکر کے حاصل ہو سکے۔ راقمہ

ادا کی شوخیوں سے اُٹھتے اُٹھتے جھک گئیں نظریں — مری قسمت سے اُن کے تیر بھی آئے کماں ہو کر

تیر کے کماں ہو جانے اور عدم تاثیر میں جس قدر غرابت اور بُعد ہے وہ ظاہر ہے۔ یہ تشبیہ قسم عقلی میں داخل
نہیں ہے اس لئے کہ باعتبار اعرفیت کے خود مشبہ زیادہ تر ادراکی ہے "یعنی عدم تاثیر افعال معشوق
بالنسبت عاشق" اور مشبہ محض ایک امر اختراعی وہمی ہے جس کے وقوع کو عقل خارج میں تسلیم ہی نہیں
کر سکتی۔ پس اثر اس تشبیہ کا محض وجدانی ہے جو غرابت تشبیہہ سے پیدا ہوتا ہے۔

تیسری شرط جس کو اعتدال سے تعبیر کرنا چاہیئے، شرائط استحسانیہ میں سے ہے مگر از بسکہ عدم
اعتدال وجدان کے باب میں اس درجہ مضر ہے کہ غرض اصلی فوت ہو جاتی ہے، اس لئے اس کو بھی
شرائط موجبہ فواتیہ میں سمجھنا چاہیئے مثال عدم اعتدال کی مثلاً معشوق کے ظالم ہونے کی تشبیہہ، مثلاً
معشوق کو باعتبار ظلم کے قصاب سے تشبیہہ دینا یا مصرعہ مشہور ع

دوسرا دنیا میں اب چنگیز خاں پیدا ہوا

کبھی ایسا کرتے ہیں کہ جب مشبہ، حد اعتدال سے زیادہ اقوی ہو تو اُس کی قوت کو کسی تصرف مناسب
کے ذریعہ سے کم کر کے حدِ اعتدال پر لے آئیں، مثلاً سید انشاء اللہ خاں مرحوم کا یہ مشہور شعر ؎

یہ غضب کا ماجرا ہے کہ بروز عیدِ قرباں — وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

اس شعر میں عید قرباں کی قید تشبیہہ حد اعتدال میں آ گئی، قصاب اور عید قرباں کے دن ذبح کرنے
والا اگرچہ دونوں کے فعل یکساں ہیں مگر باعث ان کے جداگانہ ہیں۔ تشبیہہ عقلی سے اثر وجدانی نہیں
پیدا ہوتا۔ لیکن تشبیہہ عقلی کو وجدانی کے ساتھ ترکیب دینے سے لطفِ تشبیہہ زیادہ ہو جاتا ہے۔ غالب

چال جیسے کڑی کمان کا تیر — دل میں ایسے کہ جا کرے کوئی

کڑی کمان کا تیر باعتبار سرعت سیر کے تشبیہہ عقلی ہے اور باعتبار قوت تاثیر کے تشبیہہ وجدانی ہے اور دلیل
اس امر کی کہ قصد شاعر دونوں پہلو سے وجہ شبہ کی لیئے ہوئے ہے۔ دوسرا مصرعہ ہے کما ہو ظاہر۔

ترکیب تشبیہہ عقلی اور وجدانی کی افصح العرب بعد النبی حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا
کا یہ مشہور شعر ہے ؎

جراحات السنان لہا التیام — ولا یلتام ما جرح اللسان

اس شعر میں قرینہ قصد وجدانی کا لفظ جَرَحَ ہے۔

استغنا اور دولتمندی کا محاکمہ

(از جناب ڈپٹی لال صاحب نگم ایم۔ اے دہلوی)

دنیا میں دولتمند کون ہے؟ اس کا جواب صاف الفاظ میں یہی دیا جاسکتا ہے کہ دولتمند وہ شخص ہے جس کے پاس دھن، دولت، روپیہ پیسہ افراط سے ہو۔ گویا دولتمند ہونیکا معیار روپیہ پیسہ ہوا۔ اب یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ایک وہ زمانہ تھا جبکہ روپے پیسے کو کوئی جانتا بھی نہ تھا تو کیا اس زمانہ میں کوئی شخص بھی دولتمند نہ ہوتا ہوگا اور سب لوگ مفلس قلاش ہوتے ہوں گے؟ نہیں اس زمانہ میں بھی لوگ دولتمند تھے۔ دولتمندی صرف روپے پیسے کی افراط کو نہیں کہتے ہیں بلکہ ضروریات زندگی کے علاوہ زائد سامان کی ملکیت کا نام دولتمندی ہے۔ تمدن کے ابتدائی زمانہ میں لوگوں کے پاس بھیڑ بکری گائے بیل، کھیت کیاریاں، مکان ہاٹ حویلی وغیرہ ہوتی تھیں۔ ان کے نزدیک یہی چیزیں دولت تھیں اور جن لوگوں کے پاس ان چیزوں کی بہتات ہوتی تھیں وہی امیر اور دولتمند کہلاتے تھے۔

یہ تو تھا دولتمندی کا وہ خیال جو آجکل عام طور سے دنیا پرست لوگوں کے دلوں میں بسا ہوا ہے۔ اب ہم ایک انوکھی بات بتاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اس جہان میں بہتیرے خدا کے بندے ایسے ہیں جو روپیہ پیسہ نہیں رکھتے لیکن پھر بھی امیر ہیں ان کی جیب میں ہاتھ ڈالو تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ نکلے گی۔ اور شاید ان کے کوٹ میں جیب تک نہ لگی ہو لیکن پھر بھی وہ امیر ہیں یعنی دل کے غنی۔

مالدار وہی ہے جس کا جسم تندرست ہو۔ ہاتھ پاؤں چلتے پھرتے ہوں کسی عضو بدن میں کسی قسم کی خامی نہ ہو، دماغ روشن ہو۔ دراصل اسی کا نام دولتمندی اور امارت ہے۔ کیا ہوا اگر کسی کے پاس کروڑوں روپے بھرے ہوں مگر بیمار اور کمزور ہو کر صاحب فراش رہے۔ تندرست ہڈیاں اور ہاتھ پاؤں سونے چاندی اور جائداد سے بہتر بلکہ افضل ہیں۔

اصلی دولتمندی دل کی خوشی میں ہے جو شخص دولت رکھتا ہے مگر خوش نہیں وہ امیر نہیں۔ بلکہ محتاج اور مفلس ہے۔ حقیقت میں دولتمندی اور خوشی کا بیر ہے۔ کیونکہ دولتمند کو ہمیشہ اپنے روپے کی فکر رہتی ہے جس سے اس کی تندرستی اور خوشی میں ضعف آجاتا ہے۔ لیکن اُس کی ہوس پر جوانی نکلسا

رنگ و روغن چڑھ جاتا ہے وہ دولت جمع کرنے میں ہمہ تن مصروف رہتا ہے اور یہ طمع اس کو بعض اوقات ایسا ذلیل کرتی ہے کہ وہ نہایت ہی مصیبت زدہ معلوم ہوتا ہے۔ الغرض دولتمندی کا انحصار روپے پیسے جاگیر وغیرہ پر نہیں بلکہ انسان کے دل اور خیال سلیم پر ہے۔

میرا دل ایک عظیم الشان سلطنت ہے مجھے اس میں ایسی مسرت حاصل ہے جو دنیا بھر کی نعمتوں اور خوشیوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ پھر میں ہمیشہ اس فکر میں کیوں غلطاں و پیچاں رہوں کہ تھوڑی سی زمین مل جائے۔ جب میں یہ جانتا ہوں کہ تمام دنیا میری ہے تو پھر تھوڑی سی زمین کی خواہش کیا معنی رکھتی ہے۔ جاگیردار اور زمیندار میرے گماشتے ہیں جو میری جائداد کی حفاظت کرتے اور اسکو میرے لئے اچھی حالت میں رکھتے ہیں۔ عجائب خانہ میرا ہے۔ اس میں ہر عجیب چیز میری ہے۔ عجائبات کے فراہم کرنے میں نہ مجھے کوئی دقت اٹھانی پڑی نہ کسی چیز کے لئے ایک پیسہ خرچ کرنا پڑا۔ تاہم وہ سب میری ہیں۔ میرا جب جی چاہتا ہے عجائب خانہ میں جاکر ہر چیز دیکھکر خوش ہولیتا ہوں۔ میں انکو اپنے گھر میں نہیں لانا چاہتا کیونکہ میں ان کی آرائش صفائی اور دیکھ بھال اسقدر نہیں کرسکتا جتنی کہ وہاں ہو رہی ہے۔ باغات مرغزار اور پارک سب میرے ہیں۔ میرا جب جی چاہتا ہے باغ میں جاتا ہوں پھول پتے دیکھکر دل خوش کرلیتا ہوں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھالیتا ہوں۔ مجھے پھولوں اور پودوں کی حفاظت کی فکر نہیں۔ اسکی فکر دوسروں کو ہے۔ میں صرف ان سے لطف اندوز ہونیکے لئے پیدا ہوا ہوں۔ میرے چاروں طرف ایسے لوگوں کا ہجوم ہے جو مجھے خوش کرنیکی غرض سے نئی چیزیں بناتے ہیں۔ اور پھر آپس میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کی نسبت مجھے چیز سستی دے۔

ایک کروڑپتی لاکھوں روپے خرچ کرکے اپنے گھر میں نگارخانہ بناتا ہے۔ مگر غریب شاعر تصاویر کے اس مجموعہ کو دیکھکر ایک لمحہ میں اس تخیل شاعرانہ میں محو ہوجاتا ہے جو مالک کے خواب وخیال میں بھی کبھی نہ آئی تھی۔

حرص و ہوا کے بندوں کی لغت میں "بس" کا لفظ ہی ندارد ہے۔ ان کو کتنا ہی روپیہ مل جائے مگر وہ ہمیشہ اسی فکر میں رہینگے کہ تھوڑا سا روپیہ اور ملے۔ خواہ رات کی نیند اور دن کی بھوک سب کچھ جاتی رہے لیکن روپے کا بھوت ان کے سر ایسا چڑھتا ہے کہ اتارے نہیں اترتا۔ وہ روپے کیلئے عزیز سے عزیز چیز کی قربانی کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ وہ روپے کا نہ خود لطف اٹھاتے ہیں نہ کسی محتاج کو دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب سکندر اعظم تمام دنیا فتح کرچکا تو رو کر کہنے لگا کہ "افسوس اب فتح کرنیکے لئے اور کوئی ملک باقی نہ رہا" حرص و ہوا کے غلام ہمیشہ اسی دھن میں رہتے ہیں کہ ہمیں کچھ اور مل جائے اور

اس "ادر" اور "اور" کی فکر سے ان کی روح کو ایسی فرحت ملتی ہے کہ وہ چین سے نہیں بیٹھ سکتے انکی حالت محتاجوں سے زیادہ قابلِ رحم ہوجاتی ہے حکیم افلاطون نے اپنی کتاب Republic میں ایک قصہ لکھا ہے جسکا ماحصل یہ ہے کہ جب شہنشاہ یولاؔ کی وفات ہوئی تو دیوتاؤں نے اس سے پوچھا کہ تم اگلے جنم میں کیا بننا چاہتے ہو۔ شہنشاہ نے جواب دیا کہ میں آئندہ جنم میں گمنام شخص بننا چاہتا ہوں اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شہنشاہ جو بادی النظر میں بہت ہی خوشحال اور قابل رشک خیال کئے جاسکتے ہیں وہ اس گمنام شخص سے بہتر نہیں ہیں جسکو دنیا میں کسی قسم کی فکر نہ ہو اور جو ہر وقت خوشی اور شادمانی کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔

دنیا میں دولتمند ہونا اچھا ہے لیکن دولت کا سانپ بننا اچھا نہیں۔ خدا نے روپیہ پیسا اسلئے دیا ہے کہ خود استعمال میں لاؤ اور غیروں کو دیکر ثواب کماؤ۔ اصلی دولتمندی اسی بات میں ہے کہ بیماروں کے لئے اسپتال کھلواؤ۔ یتیموں کے لئے یتیم خانے بنواؤ بیچاری دکھیا بیواؤں کے لئے "ودھوا آشرم" قایم کرو۔ بھوکے ننگوں کو روٹی کپڑا دو۔ اَن پڑھ لوگوں کیلئے مدرسے کھلواؤ۔ اصلی دولتمندی کی شان ان مبارک کاموں سے ظاہر ہوگی۔ یوں قارون کا خزانہ جمع کر کے رکھ جاؤ تو کس کام کا۔ مٹی کا انبار اور ایسا خزانہ یکساں ہے۔ بلکہ مٹی کا انبار ایسے خزانے سے بہتر ہے۔ کیونکہ اوّل الذکر کی حفاظت کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن موخرالذکر کیلئے بڑے اہتمام اور فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔

دولت اُن لوگوں کے پیچھے دوڑتی ہے جو اس سے مستغنی ہیں لیکن ان لوگوں کے آگے بھاگتی ہے جو اس کے خواہشمند ہیں۔ حریص لوگ چاہے جتنا مال خزانہ اکٹھا کرلیں وہ اس خزانچی کے مانند ہیں جو امپیریل بنک میں لاکھوں روپے گن ڈالتا ہے۔ اور پھر بھی ہمیشہ روپے کی فکر میں رہتا ہے کہ کہیں غلطی سے زیادہ خرچ نہ ہوجائے۔ حرص و ہوا کے بندے خزانہ کے پہرہ دار ہوتے ہیں خود روپے سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ مال و دولت انسان کو امیر نہیں بنا سکتی۔ بلکہ دل ہے جو انسان کو دولتمند بنا سکتا ہے۔ اگر انسان دل کا غنی ہوگا تو پھر اس کو دولت کی حاجت نہیں۔ اگر انسان میں سیر چشمی نہیں تو چاہے سلطنت مل جائے یا قارون کا خزانہ ہاتھ لگ جائے پھر بھی وہ غریب ہے۔

کالیداس، غالب، اور تلسی داس اپنے زمانہ کے شہرۂ آفاق شاعر بے بدل گذرے ہیں۔ وہ امیر تھے۔ گو ان کے پاس روپیہ نہ تھا۔ شاعرانہ خیالات کی بلندی اور بلند پروازی ان کے لئے جواہرات اور سونے چاندی کے خزانے سے بڑھکر تھی۔ پھول پتے، گھاس پات، ندی نالے، پہاڑ اور جنگل یہ سب ان کی جاگیر تھی۔ یہی انکی اصلی دولت تھی۔ ان کے اشعار پڑھو، کہیں ان نامور شعرا نے قدرتی

مناظر کا عجیب دلاویز نقشہ کھینچا ہے۔ یہی قدرتی مناظر اور شاعرانہ خیالات دنیا میں اُنکے لئے دولت اور خزانہ عامرہ کا درجہ رکھتے تھے۔ انھوں نے حریص لوگوں کی طرح کبھی دولت کی خواہش نہیں کی۔ اور اگر کبھی مل گئی تو خرچ کرنے میں بھی ذرا تامل نہ کیا۔ روپے کی ان کے دل میں اتنی بھی محبت نہیں تھی جتنی کہ اُڑد پر سفیدی۔ غالب جیسا عظیم الشان شاعر عمر بھر مفلس و فلاکت زدہ رہا لیکن اُس نے اپنے اشعار آبدار سے لوگوں کے خیالات کو مالا مال کر دیا۔ کالی داس اور تلسی داس جانتے تھے کہ انسان کو اس خوراک کی اتنی ضرورت نہیں ہے جو اس کے مُنہ کے ذریعے جسم میں داخل ہوتی ہے۔ ورنہ پھر انسان اور حیوان میں کوئی امتیاز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ انسانی زندگی کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کی غذا کی ضرورت ہے۔ وہ غذا خیالات سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اس غذا کے مہیا کرنے والے مشہور و معروف مصنف شعرا اور اعلیٰ درجہ کے اہل خیال ہیں۔ یہ وہ دولت ہے کہ جس سے فقیری میں امیری کا لطف حاصل ہوتا ہے۔

ساکھی منی گوتم چکرورتی راجہ کا بیٹا دولت و دنیا کو ہیچ سمجھنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ راج پاٹ کو لات مار جنگل کو سدھارا۔ اس نے راجدھانی پر صحرا نوردی کو ترجیح دی۔ وہ زہد و ریاضت اور اتقاء کو ایک لافانی اور لازوال خزانہ سمجھتا تھا۔ وہ فاقہ کشی کی کلفت کو راحت شمار کرتا تھا۔ وہ اخلاقی اصولوں اور پاکبازی کو انسان کے لئے دولت اور روٹی سے زیادہ ضروری خیال کرتا تھا۔ اُس نے خود فاقہ کشی کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ انسان بھوکا زندہ رہ سکتا ہے۔ لیکن اخلاق سے گرا ہوا انسان زندہ رہتے ہوئے بھی مردوں سے بدتر ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ انسان کی اخلاقی زندگی اس کے لئے روزافزوں خزانہ ہے انھیں اخلاقی اصولوں پر کاربند رہکر ساکھی منی گوتم نے مہاتما بُدھ کا درجہ حاصل کر لیا جنکے سامنے آج کسی مالدار سے مالدار شخص کی بھی کوئی وقعت نہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ جس شخص کے پاس روپیہ نہیں ہوتا وہ مفلس کہلاتا ہے لیکن جس شخص کے پاس روپے کے علاوہ اور کچھ نہیں وہ اول الذکر شخص سے بھی زیادہ مفلس ہے۔ مالدار شخص وہی ہے جو روپیہ نہ رکھتے ہوئے بھی خوش رہے۔ جو حریص ہے وہ لاکھوں روپے کا مالک ہوتے ہوئے بھی غریب و محتاج ہے۔ دولت کئی قسم کی ہے۔ ایک دولت علمی دولت ہے۔ جو شخص علمی مذاق رکھتا ہے وہ کسی حالت میں بھی مفلس نہیں کہلا سکتا۔ وہ ایک ایسے شغل کا دلدادہ ہے۔ جو اس کو ہمیشہ خوش اور محظوظ کرتا ہے۔ وہ شخص امیر شیر دل اور ہے جو افلاس اور سیاہ بختی کا مقابلہ نہایت مزانگی اور خوشی سے کرتا ہے۔ جس خوش قسمت شخص کا دل استغنا سے معمور ہے وہ معمولی دولت تو کیا چیز ہے اگر ہفت اقلیم کی

بادشاہت بھی ملتی ہو تو بیدریغ لات مار دیتا ہے۔ مگر یہ صفت پرماتما کے خاص مقبول بندوں ہی میں پائی جاتی ہے۔ جو لوگ دنیائے دنی کی دلفریبیوں کو حقیر سمجھتے ہیں انکا دل دولت سے مستغنی ہے کہتے ہیں کہ دیو جانس کلبی کو راہزنوں نے پکڑ کر غلام کے طور پر بیچ ڈالا تھا۔ اُس کے خریداروں نے اُسکو آزاد کر دیا۔ اور اپنے گھر کا انتظام اور بچوں کی تعلیم کا کام اس کے سپرد کیا۔ اُسکو دولت اور جھوٹی شان وشوکت سے دلی نفرت تھی اور ہمیشہ ایک ٹب میں پڑا رہتا تھا۔ اُس کا شہرہ سنکر ایک دن سکندر اعظم اس سے ملنے گیا اور حکیم کو ایسی ذلیل حالت میں رہتے ہوئے بھی خوش دیکھکر متعجب ہوا اور پوچھنے لگا "کیا آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟" حکیم نے جواب دیا "ہاں! مجھے اس بات کی ضرورت ہے کہ تم ذرا دھوپ چھوڑ کر کھڑے ہو جاؤ اور مجھے اس قدرتی نعمت سے محروم نہ کرو جو تم حشر تک مجھے نہیں بخش سکتے" یہ طنز آمیز جواب سنکر سکندر اعظم سُن رہگیا اور بیساختہ اس کی زبان سے یہ کلمہ نکل گیا "اگر میں سکندر نہ ہوتا تو پھر دیو جانس ہونیکی دعا مانگتا"

دلیر اور ایماندار آدمی روپے کی خاطر کام نہیں کرتے۔ وہ محبت عزت اور خوش چلنی کیلئے کام کرتے ہیں سقراط جان سے گذر گیا مگر اپنے اخلاقی اصولونکو نہ چھوڑا وہ لوگونکو پاکباز اور راست گفتار بنانا چاہتا تھا اور اس عمل کے مقابلہ میں جان کو بالکل بے حقیقت سمجھتا تھا۔ اس نے بلا تامل زہر کا پیالہ پی لیا اور مرتے دم تک لوگوں کو اخلاقی نصائح کرتا رہا۔

مفلس شخص کی پہچان یہ ہے کہ وہ سست ہو کام کرنیکو اسکو جی کبھی نہ چاہتا ہو کام کرنے والا آدمی کبھی مفلس ہو نہیں سکتا۔ روایت ہے کہ الہ آباد میں ایک نہایت ہی مالدار مہاجن تھا اتفاق کی بات دیکھئے کہ کام میں اسکو ایک سال بہت گھاٹا ہوا اور اس غریب کو اپنا دیوالہ نکالنا پڑا۔ جب شام کو گھر آیا تو بہت افسردہ خاطر تھا اور نہایت مایوسانہ لہجے میں اپنے شریف بیوی سے بولا "میری پیاری میں بالکل برباد ہو گیا ہوں جو دھن دولت میرے پاس تھا وہ سب اب قرضخواہوں کا مال ہے" بیوی ذرا سے سکوت کے بعد بولی "کیا قرضخواہ تمہیں بھی بیچ ڈالینگے" خاوند نے جواب دیا "نہیں!" پھر عقلمند بیوی نے پوچھا "کیا قرضخواہ مجھے بیچ ڈالیں گے" خاوند نے کہا "نہیں! تم کیسی باتیں کرتی ہو!" بیوی نے کہا تو پھر یہ باتیں نہ کہو کہ میں بالکل برباد ہو گیا ہوں۔ روپے پیسے کے چلے جانے پر اتنی مایوسی کی کیا ضرورت ہے روپیہ پیسہ ہمارے ہاتھ پاؤں کا میل ہے۔ اگر ہم سلامت ہیں تو پھر وہی روپیہ پیسہ ہو سکتا ہے۔ دولت ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ آج میرے پاس تو کل اس کے پاس۔ اس کے ملنے پر نہ خوشی ہونا چاہئے اور نہ اسکے جانے پر کچھ رنج کرنا مناسب ہے اگر ہم محنت کرینگے تو دوبارہ گئی ہوئی دولت واپس آسکتی ہے

مثنوی دریائے عشق

(از مسٹر صغیر احمد جان بی۔اے)

خدائے سخن میر نے بہ اعتبار فن شعروشاعری کی کوئی صنف ایسی نہیں چھوڑی جسمیں طبع آزمائی نہ کی ہو، قصیدہ، غزل، مثنوی، مرثیہ، واسوخت، قطعہ، رباعی وغیرہ سبھی کچھ لکھا مگر قصیدہ انکی افتاد طبیعت کے خلاف تھا وہ طبیعت کی شگفتگی اور جوش وخروش کہاں سے لاتے کہ قصیدہ کو قصیدہ بنا دیتے۔ مرثیہ کو انھوں نے کبھی نظر استحسان سے دیکھا ہی نہیں۔ محض مذہبی فریضہ سمجھکر جو کچھ بن سکا لکھ لیا۔ اسی لئے ان کے مرثیوں میں دماغی کاوش اور فنی خوش اسلوبیاں نظر نہیں آتیں۔ سودا نے انکے مرثیہ اور ایک سلام پر تنقید نظم کی ہے جو کلیات سودا میں موجود ہے اسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میدان میں میر کا مرثیہ شاعرانہ حیثیت سے کس قدر پست ہے۔

واسوخت کے موجد اردو میں بقول آزاد میر ہی ہوئے قطعہ، رباعی وغیرہ بھی کلیات میں موجود ہیں اور خوب ہیں۔ لیکن غزل اور مثنوی یہ دو صنفیں ایسی ہیں جن میں میر کی شاعری بے پناہ نظر آتی ہے۔ اہل تحقیق نے المیہ و حزنیہ انداز بیان کو غزل اور مثنوی کا لوازمہ بتایا ہے۔ اور یہ انداز بیان تاوقتیکہ دلمیں درد کی ٹیس نہ ہو پیدا ہونا محال ہے، میر کی پُرسوز اور دردناک طبیعت کے متعلق کچھ لکھنا عبث ہے اس پر زبان کی سلاست وفصاحت، انداز بیان کا جوش وصداقت سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ غرض غزل کے میدان میں انکا مرتبہ اسقدر بلند ہے کہ آج تک تمام اردو شعراان کے آگے شاگردی کا زانو تہ کرتے ہیں، اور زبان اعتقاد سے کہتے ہیں، ع آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں، یا اپنی کاوشوں اور دماغ سوزیوں کی ناکامی پر یوں نوحہ کرتے ہیں ع

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب

ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

میر نے متعدد مثنویاں لکھیں جو ان کے کلیات میں موجود ہیں، میں یہاں صرف عشقیہ مثنویوں کے نام گنواتا ہوں۔ شعلۂ عشق، دریائے عشق، جوش عشق، اعجاز عشق، معاملات عشق، اور خواب وخیال۔

ان مثنویوں میں شعلۂ عشق اور دریائے عشق کو چھوڑ کر باقی تمام مثنویاں کچھ زیادہ بلند پایہ نہیں ہیں۔ لیکن یہی دو مثنویاں میر کا مرتبہ بہ حیثیت مثنوی گو بہت بلند کر دیتی ہیں۔

میر کی عشقیہ مثنویوں سے جو سب حزنیہ (Tragic) ہیں۔ جہاں ایک طرف میر کی حرمان نصیبی اور حسرت کوشی پر روشنی پڑتی ہے وہاں دوسری طرف ان کا فلسفۂ زندگی بھی ہم پر روشن ہو جاتا ہے۔ بچپن ہی سے انھیں بے ثباتی دنیا کی تعلیم دی گئی تھی۔ جس کا اثر آخر دم تک ان کا رفیق حیات رہا۔ خوشدلی انکی راہ سے کوسوں دور تھی، بوالہوسیوں پر نظر نہ رکھتے تھے، شادکامی سے انھیں غرض نہ تھی قیس و فرہاد کے قصے پیش نظر تھے، عشق صادق کے دلدادہ تھے یہی وجوہات ہیں کہ عین جوش بہار میں بھی انھیں بلبل کی سی سرستی اور ازخود رفتگی نہیں سوجھتی وہ بہار کے رنگین پردوں پر خزاں کی بھیانک صورت اور خوفناک مورت دیکھتے ہیں۔ پھر ان کی شاعری کیوں نہ پرسوز ہو۔ اور ان کی مثنویاں کیوں نہ حزنیہ ہوں۔

میر کی مثنویوں کو عام طور پر کوئی شہرت نصیب نہ ہوئی۔ اسکی دو وجہیں ہوسکتی ہیں۔ اول تو یہ مثنویاں منفرد طور پر ایسی نہیں ہیں کہ علیحدہ علیحدہ شائع ہو کر شائقین کے ہاتھوں میں پہنچتیں، ڈھائی ڈھائی سو تین تین سو اشعار کی مثنویاں ہیں اور کلیات ہی کے ایک گوشہ میں پڑی ہیں دوسرے یہ تمام مثنویاں حزنیہ ہیں اور یہ بات عام طور پر ہندوستانیوں کی افتاد طبیعت کے خلاف ہے۔ کیونکہ جس قدر افسانہ جات اور مثنویاں ہمیں دستیاب ہوئی ہیں وہ یا تو نری طربیہ (Comic) ہیں یا مخلوط۔ یعنی حزنیہ و طربیہ (Trago-Comic) غرض انکا انجام طربیہ ہی ہوتا ہے۔ ابتک عوام حزنیہ ڈرامہ یا مثنوی کو پسند نہیں کرتے۔

اردو کی مشہور و معروف مثنوی سحر البیان کی خصوصیت تفصیل اور منظر نگاری ہے، ورنہ واقعات و کردار کم و بیش سب مافوق العادت ہیں۔ اگرچہ جزئیات تمام مطابق فطرت ہیں مگر کلی طور پر جو اثر دل پر ہوتا ہے وہ مافوق العادت ہی ہوتا ہے، وہ واقعات اور حادثات جو تمام قصے کی روح رواں ہیں سب اتفاقیہ ہیں، انسانی فطرت اور انسانی کوشش و سعی کو ان میں کچھ دخل نہیں۔

مثنوی دریائے عشق کئی حیثیتوں سے حزنیہ ڈرامہ سے ایسی ملتی جلتی ہے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو کے خزانے ڈرامہ سے یکسر خالی نہ تھے،

حزنیہ ڈرامہ کی خوبیاں بلکہ اصول یہ بیان کئے گئے ہیں قصے کا مفرد ہونا۔ قصے کی تدریجی ترقی یعنی اس میں گوناگوں واقعات کے الجھاوے نہیں ہونا چاہئے، ان واقعات کا فطرت کے قریب ترین ہونا جن سے قصہ ترقی پاکر اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ کردار نویسی کی وضاحت اور صداقت، واقعات و جذبات کی مصوری طرز ادا، اور بیان کی ندرت وغیرہ۔ انھیں اصولوں کی روشنی میں یہاں دریائے عشق پر نظر تنقید ڈالی

جاتی ہے، مثنوی کے شروع میں تیئیس اشعار حضرت عشق کی شان میں ہیں ۔ جن میں انکی نیرنگ سازیاں اور طرفہ کاریاں بیان کی گئی ہیں۔

کشش اسکی ہے ایک اعجوبہ　　ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا
کون محروم وصل یاں سے گیا　　کہ نہ یار اسکا پھر جہاں سے گیا
کام میں اپنے عشق پکا ہے　　ہاں یہ نیرنگ ساز یکتا ہے
جسکو ہو اس کی التفات نصیب　　وہ ہی مہمان چند روزہ غریب
ایسی تقریب ڈھونڈ لاتا ہے　　کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے

یہ اشعار بطور صنعت براعت الاستہلال لکھے گئے ہیں، اور تمام قصے کا لب لباب پیش کرتے ہیں۔

پرانے مغربی ڈرامہ کا یہ قاعدہ تھا کہ ڈرامہ نویس شروع میں کسی شخص کی زبانی کل قصے کو مختصراً ادا کرتا تھا۔ تاکہ حاضرین کو ڈرامہ کے سمجھنے میں دقت نہ واقع ہو، اس تقریر کو انگریزی میں پرولوگ PROLOGUE کہتے ہیں، اب پرولوگ کا دستور نہیں رہا، لیکن بڑی بڑی کمپنیوں میں تماشہ کے قبل تمام ڈرامہ کا لب لباب چھپا ہوا حاضرین میں تقسیم کر دیا جاتا ہے یہاں اس سے بحث نہیں کہ یہ ترقی مفید ثابت ہوئی یا غیر مفید، صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ قصے کا ماحصل بتا دینے کا پہلے بھی دستور تھا اور اب بھی ہے،

مثنوی دریائے عشق کے یہ تیئیس شعر اچھے خاصے پرولوگ کا کام دے سکتے ہیں میر نے ہر ایک عشقیہ مثنوی میں اس قسم کے اشعار نہایت اہتمام کے ساتھ لگائے ہیں۔ اور ان اشعار کی علت غائی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ قارئین پر خوب اچھی طرح واضح ہو جائے کہ وہ اب آگے کیا پڑھنے والے ہیں اور آغاز ہی سے ان کے دل و دماغ پر حزنیہ انجام کے لئے اثرات قائم ہو جائیں۔

یہ طریقہ کچھ میر کی ایجاد نہ تھا پرانی مثنویوں میں بھی پرولوگ ساقی نامہ کے طور پر لکھا جاتا تھا اور اس میں بھی قصے یا اس کے کسی خاص حصے کے، انجام کے اثرات قائم کر دئے جاتے تھے،

اس تمہید کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے اور وہ یہ ہے :-

ایک جوان عنا لالہ رخسار و سرو بالا نے کسی مغرفے میں ایک مہ پارہ کے جمال ہوشربا کو دیکھکر بیک نظر دل اور ہوش و حواس حضرت عشق کی نذر کئے اور مجنوں صفت اس رشک لیلی کے کوچے کی گرد اپنے سر پر ڈالنے لگا۔ رفتہ رفتہ اس مہ پارہ کے اعزا کو خبر ہوئی انھوں نے بپاس ننگ و ناموس لڑکی کو اس کی دایہ کے ہمراہ نینس میں بٹھا کر دریا پار کسی دوست کے یہاں بھیجا۔ یہ مجنوں بھی آہیں بھرتا پیچھے پیچھے روانہ ہوا جب دریا پر پہنچا تو محبوب اور دایہ کو کشتی میں سوار ہوتے دیکھکر اپنی بے کسی

اور محبوب کی دوری پر فریاد و فغاں شروع کی۔ دایہ نے بکمال حیلہ سازی اس بیخود عاشق کو بھی "سفینے" میں سوار کرلیا اور عین منجدھار میں پہونچکر اس پرفن نے محبوب کی کفشِ پا عاشق کو دکھا کر دریا میں پھینک دی۔ اور کہا عجیب ہے اس عشق پر محبوب کی کفش "امواج تلاطم" سے ہم آغوش ہو اور تو سفینے میں بیٹھا دیکھا کرے، اسے بھلا اتنی تاب کہاں، فوراً دریا میں کودا۔ "امواج زنجیر پا ہوگئیں" اور قعر دریا کی طرف کشاں کشاں لے گئیں۔

ایک ہفتہ کے بعد اس محبوب نے دایہ سے کہا کہ وہ "فرومایہ" تو اب غرق ہوگیا اور وہ "ننگ دریاں" سے جاتا رہا میں یہاں بہت پریشان ہوں اب چاہئے کہ گھر واپس چلیں۔ دایہ رضامند ہوئی اور دونوں سوار ہوکر روانہ ہوئے جب دریا پر پہنچے تو اس محبوب نے دایہ سے کہا کہ جہاں وہ "آرزومند" ڈوبا تھا وہ جگہ مجھے بھی دکھا تاکہ میں بھی "موجۂ گرداب" کی سیر کروں دایہ اصل مطلب نہ سمجھی اور وہ جگہ دکھادی کہ یہاں وہ کودا تھا محبوب فوراً اسی جگہ کود گئی اور آن واحد میں نظروں سے غائب ہوگئی۔

یہ صرف ایک مفرد قصہ ہے اس قصے کو ضمنی قصوں کی آمیزش سے گنجلک نہیں کیا گیا ہے اس کے علاوہ قصہ بتدریج ترقی کرتا گیا ہے اور ترقی کی ہر منزل پر جزئیہ نے بھی آہستہ آہستہ ترقی کی ہے۔ غیر متعلق واقعات اور اتفاقی حادثات سے ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہیں کی گئی ہے وہ واقعات جن سے جزئیہ آغاز ہوتا ہے اور وہ واقعات جن پر جزئیہ ختم ہوجاتا ہے محض اتفاقی نہیں ہیں ان میں کسی قسم کا مافوق العادت عنصر نہیں پایا جاتا۔ بلکہ واقعات انسانی فطرت کے مطابق ہیں اور آئے دن معمولی زندگی میں مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں۔

اس مثنوی کی دوسری نمایاں خصوصیت جو اس کو ڈرامہ کے قریب تر کردیتی ہے اسکی کردار نویسی ہے اشخاص جس قدر کم ہیں اسی قدر ان کی جزئیات سے قطع نظر کی گئی ہے۔ مکالمہ اور دیگر ذرائع سے ان کی مکمل شخصیتوں سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ صرف انھیں اشخاص کو ابھارا گیا ہے جنکا تعلق براہ راست ہے۔

ہیرو۔ صورت شکل۔ (ایک جا) اک جوان رعنا تھا   لالہ رخسار و سرو بالا تھا

اسکی فطرت۔ عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم   دل تو رکھتا تھا موم سے بھی نرم

شوق تھا اسکو صورتِ خوش سے   اُنس رکھتا تھا وضعِ دلکش سے

تھا طرحدار آپ بھی لیکن   رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن

سر میں تھا شوق۔ شوق دل میں تھا   عشق ہی اسکے آب و گل میں تھا

اس کا عشق صادق ہے اور اس راہ میں وہ اپنی جان تک کی پروا نہیں کرتا معشوق کی کفش پا کو دریا میں

گرتے ہوئے دیکھ چکا ہے۔ دایہ کے تیر دخنجر صفت الفاظ سُن چکا ہے۔ اب تاب کہاں کہ سفینے میں گرداب بلا سے محفوظ بیٹھا رہے اور کشش یار موجوں کے تھپیڑے سہے۔

بے خبر کار عشق کی تہ سے　　جست کی ان نے اپنی جاگہ سے

نتیجہ:۔　تھا سفینے میں یا کہ دریا میں　　موج زنجیر ہو گئی پا میں

کھینچ گیا قعر کو یہ گو ہر ناب　　تھی کشش عشق کی مگر تو آب

کہتے ہیں ڈوبتے اچھلتے ہیں　　ڈوبے ایسے کوئی نکلتے ہیں

ہیروئن:۔ ہیروئن کا تعارف ہم سے پہلے نہیں کرایا گیا۔ لیکن ہیرو سے اسے بھی عشق ہے اور ہے بھی صادق۔

کہنے لاگی کہ اب تو اے دایہ　　ہوگیا غرق وہ فرو مایہ

اب تو وہ ننگ دیریاں سے گیا　　آرزومند اس جہاں سے گیا

تھے جو ہنگامے اسکے حد سے زیاد　　ساتھ اسکے گئے وہ شور و فساد

شور و فتنے تھے اس تلک سارے　　اب تو بدنامیاں نہیں بارے

ان اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دل کو دل سے راہ تھی۔ انداز بیاں سے جو حسرت ٹپکتی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ دریائے عشق اسکو اپنی طرف کھینچ رہا ہے کہ آ تیرے لئے آغوش عافیت وا ہے۔

دل تڑپتا ہے متصل میرا　　مرغ بسمل ہے نالہ دل میرا

وحشت طبع اب تو افزوں ہے　　حال جی کا مرے دگرگوں ہے

بے دماغی کمال ہوتی ہے　　جان تن کی وبال ہوتی ہے

دل کوئی دم میں خون ہوویگا　　آج کل میں جنون ہوویگا

بیکلی جی کو تاب دیتی ہے　　طاقت دل جواب دیتی ہے

مصلحت ہے کہ مجھکو لے چل گھر　　ایک دو دم رہینگے دریا پر

دریا پر پہنچ کر اضطراب شوق نے ایک حشر برپا کر دیا ہے دایہ سے بے صبری کے عالم میں رہ رہ کر سوال کرتی ہے،

حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ　　یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ

موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش　　تھا تلاطم سے کس طرف ہمدوش

تجھکو آیا نظر کہاں آکر　　پھر جو ڈوبا تو کس طرف جاکر

مجھکو دیجو نشان اس جا کا　　میں بھی دیکھوں خروش دریا کا

ہوں میں ناآشنائے سیر آب　　ناشناسائے موجہ و گرداب

تجربہ کیا لطمہ کس کو کہتے ہیں گھر میں ہم نام سنتے رہتے ہیں
ہیں میسر کہاں یہ سیر عبور اتفاقی ہیں اس طرح کے امور

ان اشعار سے علاوہ جوش اضطراب کے ہیروئن کی عقل و فراست پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ کسطرح اظہار شوق کرتے کرتے "ہوں میں نا آشنائے سیر آب۔ ناشناسائے موجۂ و گرداب" کہکر بات کو ٹال دیتی ہے۔ تاکہ دایہ کو جو کہ "استاد کار حیلہ و فن" ہے کسی طرح کا شبہ نہ ہو جائے۔ لیکن جب اس ناشکیب عشق کو یہ بتایا جاتا ہے کہ :۔

بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف
یاں وہ بیٹھا حباب کی مانند پھر نہ تھا کچھ سراب کی مانند

تو اس طرح تکمیل عشق ہوتی ہے اور اس طرح حرماں نصیب عاشقوں کا وصال ہوتا ہے :۔

سنتے ہی یہ کہاں کہاں کرکے گر پڑی قصد ترک جاں کرکے
سوج ہر اک کمند شوق تھی آہ لپٹی اس کو برنگ مار سیاہ

تیسری اہم شخصیت دایہ کی ہے اور یہی شخصیت قصہ میں حزنیہ انجام کا موجب ہے ہیرو جب محبوب کو کشتی میں سوار ہوتے دیکھتا ہے اور خود کو بیکس اور بے یار و مددگار پاتا ہے تو مصروف آہ و بکا ہوتا ہے۔ یہ گریہ و زاری دایہ کے گوش زد ہوتی ہے۔

گوش زد دایہ کے ہوئے یہ سخن تھی وہ استاد کار حیلہ و فن
پاس اس کو بلا تسلی کی وعدۂ وصل سے تشفی دی
کاے ستم دیدۂ غم دوری ہوچکا اب زمان مہجوری
زار نالے نہ کر شکیبا ہو عشق کا راز تا نہ افشا ہو
دیکر اس کو فریب ساتھ لیا دل عاشق کو اپنے ہاتھ لیا
لیک دربردہ اس نے یہ ٹھانی کیجئے اس سے خصمی جانی

اور عین منجدھار میں پہونچکر اپنے حیلہ اور فریب کو بروے کار لاتی ہے۔

بیچ دریا کے دایہ نے جا کر کفش اس گل کی اسکو دکھلا کر
پھینکی پانی کی سطح پر اکبار اور بولی کہ او جگر افگار
حیف تیری نگار کی پاپوش موج دریا سے ہوئے ہم آغوش

صرف اسی قدر نہیں بلکہ عاشق صادق کو طعن و تشنیع سے موئے پر سو درے لگاتی ہے

اور آتش عشق پر پٹرول چھڑکتی ہے۔

یہ روا ہے تو اپنے حال پہ رو مفت ناموس عشق کو مت کھو

جی اگر تھا عزیز اے ناکام کیوں عبث عشق کو کیا بدنام

گو دایہ استاد کار حیلہ وفن ہے۔ لیکن ہر فرعونے راموسے، آخر عورت ذات ہے خود بھی دھوکا کھا جاتی ہے، ہیروئن کی بیقراری اور جگر تابی کی گفتگو سنکر:۔

یہ نہ سوچی کہ بد بلا ہے عشق گھات میں اپنے لگ رہا ہے عشق

اور گھر واپس چلنے کا عزم کر لیتی ہے اور جب ہیروئن اس سے دریافت کرتی ہے کہ :۔

یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ

تو:۔ گرمیں گرچہ دایہ تھی کامل لیک تہ سے سخن کے تھی غافل

یہ نہ سمجھی کہ ہے فریب عشق ہے یہ مہ پارہ ناشکیب عشق

اس کے بعد ہیروئن کے اعزا کا کردار ہے، یہ زیادہ نمایاں نہیں۔ لیکن جس قدر ہونا ضروری تھا اتنا ہے اور بالکل فطری ہے شریفوں کو اسی طرح اپنے ننگ و ناموس کا خیال ہوتا ہے جب راز عشق فاش ہو جاتا ہے تو وہ قصد کرتے ہیں:۔

وارث اس کے بھی بدگمان ہوئے درپئے دشمنی جان ہوئے

مشورت تھی کہ مار ہی ڈالیں دفعتاً اس بلا کے تئیں ٹالیں

پھر یہ ٹھیری کہ ہونگے ہم بدنام سنکے آخر کہیں گے خاص و عام

کیا گناہ تھا کہ یہ جواں مارا کن نے مارا اسے کہاں مارا

حزنیہ ڈرامہ کے لئے طرز ادا کی متانت اور سنجیدگی لب ولہجہ میں جوش اور سیاق کلام کا پُر درد ہونا خاص طور پر ضروری ہیں۔ اور یہ سب باتیں اس مثنوی میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ اوّل کے تیس اشعار جو حضرت عشق کی شان میں ہیں اور بطور پرولوگ لکھے گئے ہیں انہیں سے حزنیہ اثر دلوں پر قائم ہو جاتا ہے۔ عشق کی تعریف میں فلسفیانہ قافیہ پیمائی اور صوفیانہ نغمہ سرائی نہیں کی گئی ہے بلکہ واقعات کا اظہار نہایت متانت اور پرجوش صداقت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ انداز بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ خود شاعر پر گذر چکا ہے۔ اور صورت حال کی ترجمانی پُر درد طریقہ سے کی جا رہی ہے۔

اشعار ذیل میں کلام کی متانت اور طرز ادا کا سوز و گداز ملاحظہ ہو:۔

دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا کہیں سینے میں آہ سرد ہوا

کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا — کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
کہیں رونا ہوا ندامت کا — کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا
گہ نمک اس کو داغ کا پایا — گہ پتنگا چراغ کا پایا
کہیں باعث ہر دل کی تنگی کا — کہیں موجب شکستہ رنگی کا
ہے کہیں دل جگر کی بیتابی — تھا کسی مضطرب کی بیخوابی
ایک دل سے اٹھے ہی ہو کر دود — ایک لب پر سخن ہے خوں آلود
کہیں بیٹھے ہے دل میں ہو کر چاہ — کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ
کہیں شیون ہے اہل ماتم کا — کہیں نوحہ ہے جان پر غم کا
آرزو تھا امیدواروں کی — دردمندی جگر فگاروں کی

دل نہ سمجھا کہ اضطراب کیا — شوق نے کام کو خراب کیا

آہ جو ہمدمی سی کرتی ہے — اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے

اب ٹھہرنا نہیں ہے پائے ثبات — ایک میں اور کتنے تصدیعات

جس سے جی کو کمال ہو الفت — جس سے دل کی ذرت ہو نسبت
خلش اسکی پلک کو گر داں ہو — دل میں یاں کاوش نمایاں ہو
واں اگر ہو شکست کا سو باب — یاں رگ جاں کو ہووے پیچ و تاب
واں اگر پاؤں میں لگے ہے خار — دل سے یاں سر نکالے ہے یکبار
یار کو درد چشم گر ہووے — چشم عاشق لہو میں تر ہووے
چاک داماں ہیں واں پئے زینت — یاں گریباں ہے چاک گل کی صفت
واں دہن تنگ یاں ہے دل تنگی — حسن اور عشق میں ہے یکرنگی

واقعہ نگاری اور مصوری، مثنوی کے لوازمات سے مانے جاتے ہیں اور واقعہ بھی یونہی ہے کہ مثنوی کیلئے واقعہ نگاری اور مصوری لازمی چیز ہیں۔ ان کے بغیر مثنوی، مثنوی کے درجہ سے گر جاتی ہے۔ اس لحاظ سے مثنوی سحر البیان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ لیکن مصوری واقعات اور مصوری جذبات کے لحاظ سے دریائے عشق کا پایہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ نیچرکی مصوری کے ساتھ بیان کی صفائی نے اس میں اور بھی لطافت پیدا کر دی ہے۔ بے ساختگی سے حیرت انگیز زور پیدا ہو گیا ہے۔

ہیرو بیک نظر ہیروئن پر عاشق ہوتا ہے اسکی تصویر ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:-

تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی　　وہ نظر ہی وداع طاقت تھی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ　　صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ
بیقراری نے کج ادائی کی　　تاب وطاقت نے بیوفائی کی

ہیروئن جب غرفے سے غائب ہوجاتی ہے تو عاشق صادق کی بیقراری ملاحظہ ہو۔

وہ گئی اس کے سر بلا آئی　　خاک میں مل گئی وہ رعنائی
دل پہ کرنے لگا تپیدن ناز　　رنگ چہرہ کا کر گیا پرواز
ہاتھ جانے لگا گریباں تک　　چاک کے پھیلے پاؤں داماں تک
طبع نے اک جنوں کیا پیدا　　اشک نے رنگ خوں کیا پیدا
سوزش دل نے جی میں جا کی　　داغ نے آ جگر کو آتش دی
بستر خاک پر گرا وہ زار　　درد کا گھر ہوا دل بیمار
خلق اس کی ہوئی تماشائی　　پر جو وہ دیکھنے کبھو آئی
کچھ کہا گر کسو نے شفقت سے　　رو دیا اس نے ایک حسرت سے

ہیروئن نے دایہ سے یہ دریافت کیا کہ وہ ناکام عاشق کہاں ڈوبا تھا دایہ بتاتی ہے:-

بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف　　یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف

وہ اس جگہ پہونچ کر سفینے سے کود پڑتی ہے۔ اس کی تصویر اس طرح کھینچی ہے:-

سنتے ہی یہ کہاں کہاں کرکے　　گر پڑی قصد ترک جاں کرکے

واقعہ نگاری اور مصوری میں عام طور پر مادی اشیا کا نقشہ کھینچا جاتا ہے مگر نفس انسانی اور اسکے مخفی اور نازک جذبات کی مصوری اس سے بہت زیادہ دشوار ہے اسمیں ایک خاص قسم کی لطافت اور نزاکت ہوتی ہے جس کے اظہار سے مصور کا موقلم عاجز ہے یہ نظر ایک باریک بیں اور قادر الکلام شاعر ہی کا کام ہے کہ ان غیر مادی اور غیر مرئی جذبات وحسیات کے مرقعے نہایت صداقت اور لطافت کیساتھ پیش کرتا ہے خصوصاً میر کی جذبات نگاری اور کیفیات بحروہ کی مصوری بہت نازک اور لطیف ہے مثلاً عاشق کی یاس وحسرت کی تصویر ملاحظہ ہو:-

نام کو بھی تیرے نہ جانا آہ　　تجھسے کیونکر سخن کی نکلے راہ
ناامیدانہ گرد ہوں ہوں نگاہ　　دیکھتا ہوں ہزار روز سیاہ
کوئی مشفق نہیں کہ ہووے شفیق　　بیکسی بن نہیں ہے کوئی رفیق
آہ جو ہمدمی سے کرتی ہے　　اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے

ہیروئن کے مخفی جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے:-

کہنے لاگی کہ اب تو اے دایہ　　ہوگیا غرق وہ فرومایہ
اب تو وہ ننگ دسیاں سے گیا　　آرزومند اس جہاں سے گیا
تھے جو ہنگامے اسکے حد سے زیاد　　ساتھ اسکے گئے وہ شور وفساد

شور فتنے تھے اس تلک سارے　　اب تو بدنامیاں نہیں بارے

یا مثلاً ہیروئن کے دریا میں کودنے کو اس طرح دکھایا ہے:-

سنتے ہی یہ کہاں کہاں کرکے　　گر پڑی قصد ترک جاں کرکے

لفظ کہاں کہاں میں جذبات اور اضطراب شوق کا ایک سمندر ہے کہ موجیں مار رہا ہے۔ ہزار بار پڑھئے ہر بار ایک نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔

جوش بیان اور بیساختگی تو میر کی غزلیات اور مثنویات کا خاص جوہر ہیں۔ ان خصوصیات کو واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ ہر شعر جوش بیان، بے ساختگی، اور آمد کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ ہے مزید براں زبان میں وہ صفائی اور روانی ہے کہ باید و شاید، آج سے سوا سو برس پہلے کی زبان ہے۔ اور سوائے چند متروک الفاظ اور محاورات کے آج ہی کی زبان معلوم ہوتی ہے، بلکہ آج اگر کوئی شاعر اس بے تکلفی اور صفائی سے دس شعر بھی موزوں کرے تو میر کی زبان انکی شاعری اور انکی قادر الکلامی کی حقیقت معلوم ہو۔

مثنوی سحر البیان میں جس چیز کی فراوانی ہے دریائے عشق میں اسی چیز کا فقدان ہے یعنی اس میں منظر نگاری نہیں ہے اور جو کچھ ہے بھی تو وہ مرتبہ میں بہت کم ہے اول تو دریائے عشق میں ایسے مواقع ہی بہت کم ہیں جہاں منظر نگاری سے کام لیا جاتا۔ اور جہاں کہیں ایسا موقع نکل بھی سکتا تھا اسکو باحسن وجوہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ البتہ ایک موقع پر دریا ایسا حائل ہوتا ہے کہ منظر نگاری کرنی ہی پڑتی ہے۔

آب کیا تھا کہ بحر تھا ذخار　　تند و مواج و تیرہ و تہ دار

موج کا ہر کنایہ طوفاں پر　　مارے چشمک حباب عماں پر

ہمکنار بلا ہر اک گرداب　　لجۂ سرمایہ بخش تیرہ سحاب

گذر موج جب نہ تب دیکھا　　ساحل اسکا نہ خشک لب دیکھا

کشتی اک آن کر ہوئی موجود　　ہو فلک سے ہلال جیسے نمود

اشعار زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ "مانو یا نہ مانو ہمیں جس نے لکھا ہے اس نے کبھی دریا دیکھا ہی نہیں۔ گوشۂ عزلت میں فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرتا رہا ہے ورنہ دریا میں تو وہ وہ لطافتیں، وہ دلفریبیاں، وہ وہ جوش و خروش ہوتے ہیں کہ زور قلم ختم ہو جائے۔ اور دریا زور و شور کم نہ ہو" آخری شعر کہتا ہے۔" واہ! تشبیہ کا حق ادا ہو گیا۔ اس سے بڑھکر نادر اور لطیف تشبیہ کوئی کہاں سے پیدا کرے گا۔ مگر "کشتی اک آن کر ہوئی موجود" بھلا کہاں سے ؟ لایا کون ؟ اگر ان جزئیات کو بھی باندھا ہوتا تو کلام میں کسی قدر صداقت اور جوش پیدا ہو جاتا"۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر کارے و ہر مردے۔ یہ بات ازل سے میر حسن ہی کے حصے میں آئی تھی۔ میر دنیائے دل کے بادشاہ ہیں۔ جذبات اور احساسات پر حکومت کرتے ہیں۔ وہ کیا جانیں باغ و راغ۔ رزم و بزم، کوہ و دشت، خشکی و تری کسے کہتے ہیں۔

چاہ کن را چاہ در پیش

(از جناب مرزا فدا علی صاحب خنجر لکھنوی)

(۱)

سرداؤد، خوبصورت لائبریری میں سر جھکائے متفکر و متردد بیٹھے ہیں۔ برقی روشنی وجیہہ و مغرور چہرے کی معنی خیز وحشت اور زبردستی پھیل جانیوالی زردی کو نمایاں کر رہی ہے۔ میز پر کھلا ہوا خط رکھا ہے۔ متحیر نگاہیں نامعلوم کشش کے ماتحت عبارت ترجم کر رہ گئی ہیں۔

یہ خط صبح کی ڈاک سے موصول ہوا تھا۔ اس گھڑی سے یہ وقت ہوا کہ دو چار نہیں سینکڑوں بلکہ ہزاروں بار پڑھا جا چکا ہے لیکن سیری نہیں ہوتی۔ قیامت یہ ہے کہ ہر دفعہ کا مطالعہ کچھ نہ کچھ دلی افکار میں اضافہ کر دیتا ہے اور وہ میز پر ہاتھوں کی دونوں کہنیاں ٹیک اور ہتھیلیوں پر ٹھڈی رکھکر کسی گہرے سوچ میں ڈوب جاتے ہیں۔ جو قوق آنکھوں سے دلی انتشار ٹپکنے لگتا ہے۔

اس حالت میں بھی کم و بیش ایک گھنٹہ گذر گیا۔ یکایک خشک لبوں کو حرکت ہوئی۔ بھرائی ہوئی پُرخوف آواز نے لائبریری کی ساکت فضا میں ہلکا سا تموج پیدا کر دیا۔ سرداؤد نے خط کی عبارت کو زیر لب دوہرایا۔

"سرداؤد! معلوم ہوا ہے کہ تم نے بظاہر ستاجری کے ذریعہ لکھو کھا روپیہ فراہم کیا ہے۔ تم تنہا ہو تمہاری کثیر دولت کا کوئی وارث نہیں تاہم طمع زر دامن نہیں چھوڑتی اور تم دونوں ہاتھوں سے روپیہ بٹورنے میں جائز و ناجائز تدبیر کی پرواہ نہیں کرتے۔ محض اس نقطۂ نظر سے فیصلہ کیا ہے کہ ضروری مصارف پورا کرنیکے واسطے تمہاری کمائی سے استفادہ کیا جائے۔ لہٰذا اس یادداشت کے ذریعہ ہدایت کیجاتی ہے کہ ۱۱ بجے شب کو لائبریری کی عقبی کھڑکی کھلی رکھکر انتظار کیا جائے۔ میں موعودہ وقت پر آکر سر دست ایک ہزار گنی کا مطالبہ کروں گا۔ اگر یہ رقم خاموشی اور انسانیت سے حوالے نہ کی گئی تو ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے پولیس میں تمہارے مجرمانہ افعال کا پردہ فاش کر دیا جائیگا۔ پھر جو ہوگا تم اس سے بے خبر نہیں ہو"

"راقم کا نام تمہاری لوح قلب پر مرتسم ہے"

اس دھمکی نے سرداؤد کی نگاہوں کے سامنے قید فرنگ کا ہولناک مرقع پیش کر دیا۔ دل میں طرح طرح کے

وسوسے گھر کرنے لگے اور وہ پھر غوطہ میں آگئے ماتھے پر موٹی موٹی شکنیں رونما ہوئیں مرجھائی صورت گرگٹ کی طرح جلد جلد رنگ بدلنے لگی۔ پھٹی پھٹی آنکھیں امید وبیم کی آماجگاہ بنکر رہ گئیں۔

دیوار میں لگے ہوئے کلاک نے پہلے ساڑھے نو ـــــ دس، پھر ساڑھے دس کا اد ھا بجادیا۔ دفعتاً سر داؤد کے افسردہ چہرے پر شگفتگی کی لہر دوڑ گئی۔ کسی فوری خیال کے ماتحت دونوں آنکھیں چمکنے لگیں کرسی پر بیٹھا نہ گیا۔ دلی منصوبے کو عملی شکلیں دینے کیواسطے اٹھے دوسرے کمرے سے لیبل لگی ہوئی چھوٹی سی شیشی نکال لائے جس میں ہلکے سنہرے رنگ کا عرق بھرا تھا۔ مرمریں میز پر وہسکی کی بوتل شیشہ کا گلاس، برف کا ظرف اور سوڈے کی دو بوتلیں رکھی تھیں۔ سر داؤد بالمرّہ شب کو ان چیزوں سے سرور کیف حاصل کرتے تھے لیکن آج معمول کے خلاف تفکرات نے اس جانب متوجہ ہونیکا موقعہ نہ دیا تھا۔ اب کرسی پر بیٹھکر اطمینان کی سانس لیتے ہوئے وہسکی انڈیل کر سوڈا ملایا اور برف کے چند ٹکڑے ڈالکر گلاس منہ سے لگالیا جب غٹ غٹ کی دو چار آوازوں کے بعد گلاس میں ایک گھونٹ سے بھی کچھ کم شراب رہ گئی تو چھوٹی شیشی کا کاگ کھول کے سنہری عرق کے چند قطرے ٹپکا دیے بعد ازاں ڈاٹ لگا کر شیشی کو بحفاظت جیب میں رکھ لیا۔

اب دلی انتشار دور ہوچکا تھا اور دونوں آنکھوں سے فاتحانہ مکروہ چمک نمودار تھی۔ بزعم خود انھوں نے اس عیارانہ تدبیر سے حریف کو مغلوب کرلیا تھا چند منٹ تک سرنگوں رہکر اپنی چالاکی پر خوش ہوتے رہے پھر مے نوشی کا جملہ سامان میز پر چھوڑ کر بغلی کمرے میں جا بیٹھے۔ دروازے کا پردہ برابر کردیا اور نتیجے کا انتظار کرنے لگے

(۲)

لائبریری میں گھڑی کی ٹک ٹک کے سوا کوئی آواز سامعہ نواز نہ تھی لیکن سر داؤد کے کان اسی جانب لگے تھے۔ وقت رسمی رفتار سے گذرتا رہا جتنی دیر میں چھوٹی سوئی دس کے ہندسے سے سرک کر گیارہ کے ہندسے پر پہونچی اُتنے عرصہ میں بڑی سوئی نے پورے دائرے کا چکر کاٹ کر بارہ کے نشان پر دم لیا۔ ایک خفیف گھرانے کیساتھ چھوٹی موگری نے آہنی پیالی پر یکے بعد دیگرے گیارہ ضربیں لگائیں۔ سر داؤد کا دل زور زور دھڑکنے لگا۔ اضطرابی کیفیت سے نچلا نہ بیٹھ سکے نشست سے اٹھکر پردے کے قریب جا کھڑے ہوئے بیم ورجا نے سرخ وسفید چہرے پر ہلدی کا سا زرد غازہ پھیر دیا۔ دل تو بہت چاہا مگر پردے کی آڑ سے لائبریری میں جھانکنے کی جرأت نہ ہوئی۔

یکایک کھٹکے کی آواز کے ساتھ ہی لائبریری کی عقبی کھڑکی کے دونوں پٹ پاٹوں پاٹ کھل گئے اور ایک چھ سات فٹ کا بھاری بھرکم جوان چوکھٹ بازو کے سہارے اوپر چڑھکر لائبریری میں داخل ہوگیا۔ وہ سر سے پاؤں تک کالے لبادے میں لپٹا ہوا تھا۔ نائٹ کیپ (رات کی ٹوپی) سامنے کی جانب اتنا جھکا کے

پہنی گئی تھی کہ چہرے کے خدوخال تک روشنی کا گذر محال ہو گیا تھا۔

نووارد نے پہلے تو گشتی نظر دوڑا کر چاروں طرف دیکھا پھر مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا اسی کرسی پر جا بیٹھا جس پر بیٹھ کر سردار داؤد نے چند دقیقے پیشتر بزعم خود کامیاب تجویز کی مسرت میں جرعہ مئے نوش کیا تھا۔

اس وقت اچھی خاصی سردی تھی۔ اگرچہ نووارد نے سرمائی مضر اثرات سے بچنے کا بہت کافی انتظام کر لیا تھا۔ پھر بھی راستے کی ٹھنڈی ہوا نے یخ کی طرح ہاتھ پاؤں سرد کر دیئے تھے۔ کلیجے میں کپکپی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اور ابھی یہاں بیٹھ کر مقررہ وقت تک سردار داؤد کا انتظار کرنا نہایت ضروری بلکہ ناگزیر تھا۔ اس نے اس گھر کو خانۂ بے تکلف خیال کرتے ہوئے وسکی اور سوڈے سے گلاس بھرا۔ عادتاً برف کی دو تین کنکریاں ڈالیں اور جام کو لبوں تک لایا۔ ہنوز تھوڑا فصل باقی تھا کہ ایک خوفناک خیال نے ہاتھ پکڑ لیا۔ گلاس بدستور میز پر رکھ دیا اور دل ہی دل میں کسی اہم مسئلے کے حل میں غرق ہو گیا۔ غیر معمولی ذہانت نے بہت جلد راز کی حقیقت ظاہر کر دی۔ غیظ و غضب سے دونوں آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ مُنہ لال انگارا ہو گیا۔ مگر اس حالت کو استقلال نصیب نہ ہوا۔ آناً فاناً میں جذبات پر قابو پا کے سابق کی طرح مطمئن و پُرسکون نظر آنے لگا۔ لبوں پر حقارت آمیز تبسم نمودار ہوا۔ اُس نے دو چار دفعہ آہستہ آہستہ سر کو جنبش دیتے ہوئے گلاس کی نصف شراب وسکی کی بوتل میں ڈال دی۔ بقیہ مقدار کو ہاتھ میں لئے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور مصنوعی اضطرار ظاہر کرتے ہوئے دو چار چکر لگائے۔ پھر ہاتھ اس طرح ڈھیلا کیا کہ گلاس چھوٹ کر گرا۔ اور گرتے ہی چور چور ہو گیا۔ شراب کی چھینٹیں کئی کئی قدم تک اڑ کر پہنچیں۔ اس کے بعد خود بھی تیورا کر فرش پر آ رہا۔ دھماکے کی آواز فضا میں گونج کر گم ہو گئی اور لائبریری میں پھر وہی سکوت طاری ہو گیا۔ یہ تمام واقعات چند منٹوں میں واقع ہو گئے۔

(۳)

برابر کے کمرے سے دھماکے کی آواز سنتے ہی سردار داؤد خوشی سے اُچھل پڑے۔ خوف زدہ چہرے پر مسرت کی سُرخی دوڑ گئی۔ کامیابی کے غرور میں سینہ تان اور سر بلند کئے لائبریری میں داخل ہوئے۔ یوں ـــــ جیسے فتح مند جرنل مفتوحہ قلعہ میں داخل ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اُن کی متجسس نگاہیں گلاس کے ریزوں اور شراب کی بوندوں پر پڑیں۔ جو برقی روشنی میں الماس و گوہر کی طرح بکھری ہوئی ضوفشانی کر رہی تھیں۔ ان کا قیاس یقین سے بدلنے لگا۔ پھر گشتی نظر اس نظارے سے گذرتی ہوئی ایک انسانی پیکر سے ٹکرائی جو بیجان لوتھ کی مانند فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ گرتے وقت سر میز کے پائے سے ٹکرا کر کھُل گیا تھا۔ اور زخم سے جیتا جیتا خون برس رہا تھا۔ اینٹھے ہوئے ہاتھ پاؤں سے جان کنی کا راز فاش ہو رہا تھا جو ٹوپی آگے کی طرف جھک کر چہرے کو نقاب کی طرح چھپائے تھی اب سر سے جدا ہو کر کئی فٹ کے فاصلے پر جا گری تھی اور بجلی کی

روشنی میں اجل رسیدہ کے خدوخال صاف صاف نظر آرہے تھے۔ مرنے والا بھی سر داؤد کی طرح بارعب وپروجاہت تھا۔ لباس قیمتی نفیس اور شریفانہ تھا۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس لباس فاخرہ میں کوئی انسانیت سوز ہستی ملبوس نہیں ہے؟ جس صورت پر ہمیشہ کبر وتمکین کی دوہری دوہری نقابیں پڑی رہتی تھیں، اُسے مرگ ناگہانی نے عریاں کرکے مٹیالے رنگ سے رنگ دیا تھا۔

اس بے جان قالب پر سر داؤد نے وہی نگاہ ڈالی جو شکاری خاک وخون میں لتھڑے ہوئے شکار پر ڈالتا ہے اور دل ہی دل میں اپنی قدر اندازی پر خوشی مناتا ہے۔ وہ لاش کے قریب کھڑے ہوکر کئی منٹ تک عمیق نظروں سے گھورتا رہا۔ گویا صحیح حالات کی جانچ میں مصروف ہے۔ پھر کسی خیال سے اکڑوں بیٹھ کر چہرے کو بغور دیکھا، سینے پر ہاتھ رکھ کر قلب کی حرکت معلوم کی اور عُجب ونخوت سے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا "مرگیا؟ موت نے دونوں ہونٹ سی دیئے۔ اب افشائے راز کا خوف باقی نہیں (لاش سے خطاب کرکے) "دوست ہار ولن؟ مجھ سے اور ہزار گنی کا مطالبہ؟ عدم ادائگی کی صورت میں گرفتار کرادینے کی دھمکی؟ خوب؟ خوب؟؟ احسان مانو کہ میں نے تمھیں وارد ئے مرگ پلاکر مالی مشکلات اور کشاکش حیات سے مستغنی کردیا۔ جاؤ، عالم ارواح میں ابدی زندگی کے دن پورے کرو اور اگر ممکن ہو تو وہاں سے افشائے راز کی کوشش کرو۔"

سر داؤد سیدھے کھڑے ہوگئے حیلہ طراز دماغ نے اس بلا کو سر سے ٹالنے کی عجیب تجویز پیش کی۔ انھوں نے ٹیلیفون کے قریب جاکر ریسیور اٹھایا۔ ایکسچنج آفس سے پولیس اسٹیشن کا نمبر طلب کیا اور سب انسپکٹر کو پکار کر کہا۔ "ہلو مسٹر؟ آپ ہیں، سب انسپکٹر؟ میری لائبریری میں ایک لاش پائی گئی ہے جلد تشریف لائیے بڑی مہربانی ہوگی۔"

(۴)

سر داؤد ریسیور رکھکر پھر اپنی کرسی پر آبیٹھے۔ چہرے سے فکر وغور کی علامتیں ٹپکنے لگیں اور وہ ان واقعات کی تصنیف میں مشغول ہوگئے جو موجودہ باب میں تھانے دار سے بیان کرنا تھے۔ ابھی گھڑی نے ساڑھے گیارہ کا آدھا بجایا تھا کہ سب انسپکٹر چند کانسٹبلوں کے ساتھ موقعہ واردات پر آموجود ہوا اور لاش پر اُچٹتی نظر ڈالکر سر داؤد سے کہا ——"مہربانی فرماکر واقعہ کی تفصیل ارشاد کیجئے۔"

سر داؤد ——"واقعات بالکل مختصر لیکن نہایت حیرت انگیز ہیں۔ لائبریری میں میری نشست معمولاً ساڑھے دس بجے رات تک رہتی ہے۔ چنانچہ آج بھی حسب دستور مقررہ وقت تک موجود تھا پھر آرام کے ارادے سے خوابگاہ میں چلا آیا۔ ہنوز سونے کے انتظام میں مصروف تھا کہ دھماکے کی آواز سنکر لائبریری میں واپس آنا پڑا۔ یہاں پہنچ کر ایک اجنبی کو فرش پر مرا ہوا دیکھ کر فوراً آپ کو ٹیلی فون سے مطلع کیا۔"

سب انسپکٹر "اس کے علاوہ اور کوئی نئی بات؟"

سر داؤد "کوئی نہیں" ۔
سب انسپکٹر نے سر جھکا کر کچھ غور کیا۔ پھر لاش کی طرف متوجہ ہوا قریب پہنچکر جھکا، مردنی چھائی ہوئی صورت پر گہری نظر ڈالی۔ مُنہ کے پاس ہاتھ لیجا کر سانس معلوم کی اور آخر میں نبض ٹٹول کر دیکھی تو حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ اس طرح کھٹا کھٹ چل رہی تھی جیسے تندرست آدمیوں کی نبض چلتی ہے!

سب انسپکٹر نے اپنا تعجب ظاہر کرنے کیواسطے لبوں کو جنبش دی۔ پوری طور پر آواز نہ نکلی تھی کہ وہ حرکت اعجاز عیسوی بن گئی۔ قالب بیجان میں روح حلول کر گئی اور وہ اٹھ بیٹھا۔ اس واقعہ نے حاضرین پر سکتہ طاری کر دیا سب کے سب پتھر کی مورتیں بنکر رہ گئے۔

ہارون کی شعلہ بار آنکھوں سے نفرت وحقارت پیدا تھی۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر سر کے زخم سے خون پاک کیا۔ پھر سر داؤد کی طرف قہر کی نگاہوں سے گھورتے ہوئے تھانیدار سے مخاطب ہوا۔

"داروغہ صاحب؟ متعجب نہ ہوجیئے۔ یہ بھی ایک رول تھا۔ شکر ہے میری ایکٹنگ کامیاب رہی اور مقصد حاصل ہوگیا۔ (جیب سے خط نکال کر دیتے ہوئے) ملاحظہ ہو۔ یہی وہ خط ہے جو میں نے سر داؤد کو لکھ کر ملاقات کا وقت مقرر کیا تھا۔ انھوں نے میری خواہش کے موافق لائبریری کی کھڑکی کھلی چھوڑ دی لیکن مجرمانہ ذہانت نے انوکھی چال کھیلنے پر ابھارا اور انھوں نے جن مکارانہ تدبیروں سے بے انتہا دولت پیدا کی ہے انھیں میں سے ایک تدبیر کو عملی تشکیل دیکر میرے لبوں پر سکوت دائمی کی مہر ثبت کرتے ہوئے جرائم پر پردہ ڈالنا چاہا۔ انھوں نے شراب میں زہر کی آمیزش کی اور اسے اس نیت سے میز پر چھوڑ کر روپوش ہوگئے کہ میں انکی عدم حاضری میں مے نوشی کرتے ہوئے فنا ہوجاؤں۔ کوئی شبہ نہیں کہ انکی چال کارگر ہو چکی تھی لیکن عین وقت پر میری نگاہ پڑ گئی اور جام میں کچھ سنہری ذرات چمکتے دکھائی دئے۔ چونکہ مجھے قبل سے ان کے پاس سم قاتل ہونے کا علم تھا اس لئے تھوڑی فکر میں سارا معمہ حل ہوگیا۔ واقعات آئینے کی طرح جھلکنے لگے اور میں ان کی غداری پر بھینٹ چڑھنے سے بال بال محفوظ رہا۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ ان کی چال کو انھیں پر الٹ دوں اس خیال کے ماتحت میں نے گلاس توڑ ڈالا۔ اور مردہ بن کر گر پڑا۔ اگرچہ سر میں خفیف سی چوٹ آئی مگر کچھ مضائقہ نہیں یہ کامیابی کا صدقہ ہے۔ دھماکے کی آواز سر داؤد کے کان میں پڑی اور وہ فوراً لائبریری میں واپس آئے۔ مجھے بیجان دیکھکر جان میں جان آئی۔ خوشی سے بغلیں بجائیں۔ چند مہمل جملے استعمال کئے پھر آپ کو ٹیلی فون دیکر طلب کیا۔ یا بالفاظ دیگر میری تمنا پوری ہوئی۔ (سر داؤد کی جانب اشارہ کرکے) میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ان مہربان کو اقدام قتل کے جرم میں گرفتار کرلیں"۔

سرداؤد کی صورت سے شکستگی ظاہر تھی۔ چہرے پر ایک رنگ آتا ایک رنگ جاتا تھا۔ وہ دلی اضطراب پر قابو پانے کی ناکام سعی میں مصروف تھی کہ سب انسپکٹر نے مڑکر دیکھتے ہوئے کہا..... "آپ کیا عذر پیش کرینگے؟"

سرداود "یہ شخص جھوٹا ہے..... بالکل جھوٹا! محض کاذب! میں نے آج بلکہ اس وقت سے پہلے اسکی صورت بھی نہیں دیکھی۔ پھر زہر دینے کی کوشش کے کیا معنی؟ معلوم ہوتا ہے کسی دشمن نے اغوا کرکے اسے میری تخریب و تذلیل پر آمادہ کیا ہے۔ یہ خیال درست نہیں تو پھر اسکی دیوانگی میں جائے کلام نہیں۔"

ہارون "سرداود، جرم ثابت ہے۔ اب تردید میں مفر نہیں۔ بہتر ہے کہ اقبال جرم کرتے ہوئے اپنے آپ کو عدالت کے رحم پر چھوڑ دو!"

سرداؤد "ہرگز نہیں۔ میں تمھیں غلط الزام لگانیکے جرم میں قانون سپرد کروں گا (تھانیدار سے) اسکی غلط بیانی کا ثبوت ابھی حاصل ہوا جاتا ہے۔ میں اس بوتل سے جسمیں یہ زہر ہونا بیان کرتا ہے چند گھونٹ پی کر دکھلائے دیتا ہوں کہ اس کا لگایا ہوا الزام بے بنیاد افترا سے زیادہ وقیع نہیں۔"

ہارون "ٹھہرو ٹھہرو۔ جلد بازی میں تمہاری جان کا خطرہ ہے۔"

سرداؤد "کوئی خطرہ نہیں میں ضرور اس بوتل کی شراب پیکر تمہارا جھوٹ واضح کروں گا!"

ہارون "سرداود، ایسی غلطی نہ کرنا کیونکہ میں نے سم آلود شراب گلاس سے بوتل میں انڈیل دی ہے اور اس کے اندر وہی زہر موجود ہے جو تم نے گلاس میں ڈالا تھا۔"

سرداؤد "تم دھوکا دیکر مجھ پر جرم عاید کرانا چاہتے ہو مگر یاد رکھو میں تمہارے فریب میں آنیوالا نہیں"

جملہ ختم کرتے ہی سرداؤد نے بوتل منہ سے لگاکے بڑے بڑے گھونٹ حلق سے اتارنا شروع کئے۔ جب تک ہارون نے اسکے ہاتھ سے بوتل چھینی کئی گھونٹ معدے میں پہنچ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تیورا کر گرے آنکھیں الٹ گئیں۔ الٹی سانسیں چلنے لگیں، اور نزع کی حالت طاری ہوئی۔ تھانیدار نے ڈاکٹر بلانا چاہا لیکن ہارون نے کہا......"اب کوشش فضول ہے۔ سرداؤد اپنی مجرمانہ چالوں کا شکار ہو چکا۔ ڈاکٹر کے آنیسے پہلے جرموں کی سزا بھگتنے کو خدائی عدالت میں پہنچ جائیگا۔ ہر چند اتفاقات نے دنیوی پاداش سے بچالیا لیکن اُخروی مواخذے سے محفوظ رہنا محال ہے۔ سچ ہے ؎

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

تنقید کتب

بیوہ[1]

یہ دلچسپ ناول ہندوستان کے مایۂ ناز اور مشہور و معروف ناول نویس اور فسانہ نگار منشی دھنپت رائے المعروف بہ "پریم چند" کی تصنیف لطیف ہے، چھوٹی تقطیع کے ۲۳۶ صفحات پر معمولی لکھائی چھپائی اور کاغذ کے ساتھ حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔

ہندوستان میں عموماً اور صوبجات متحدہ میں خصوصاً ایک ناول نگار اور فسانہ نویس کی حیثیت سے جس قدر شہرت اور ہر دلعزیزی منشی پریم چند نے حاصل کی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اگر بنگال اپنے ٹیگور، اور سرت چندر چاٹو پادھیا پر ناز کر سکتا ہے تو ہمارا صوبہ منشی پریم چند پر بجا طور سے فخر و مباہات کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پریم چند صاحب جو کچھ لکھتے ہیں وہ پورے جوش، پورے انہماک اور پورے خلوص کے ساتھ لکھتے ہیں اور چونکہ "بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے" اس لئے پریم چند کا کوئی ناول ہو یا افسانہ پڑھنے کے بعد دل پر ایسا اثر کرتا ہے کہ زبان سے فوراً بیساختہ واہ واہ اور مرحبا نکل جاتی ہے۔

کردار نویسی میں پریم چند کو کمال حاصل ہے، ان کے افسانوں کا ہر شخص اپنے کیرکٹر کے لحاظ سے مکمل ہوتا ہے پریم چند انسانی نفسیات کے زبردست ماہر ہیں۔ اور جس وقت وہ اس بحر ناپیدا کنار میں غوطہ زن ہو کر باہر آتے ہیں ان کا دامن آرزو گوہر مراد سے معمور ہوتا ہے۔ انھوں نے دیہاتی سوسائٹی کا اس قدر غور و خوض اور انہماک کے ساتھ مطالعہ کیا ہے کہ جب وہ کچھ لکھنے بیٹھتے ہیں تو آنکھوں کے سامنے جیتی جاگتی تصویریں پھرتی نظر آتی ہیں۔ دیہاتی زندگی کی مصوری میں شاید ہندوستان میں ان کو وہی درجہ حاصل ہے جو روس میں کاونٹ ٹالسٹائی کو حاصل تھا۔ منشی پریم چند کی تحریروں میں ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ ان کے افسانوں میں پند و نصائح کی ٹھونس ٹھانس نہیں ہوتی، بایںہمہ وہ اپنی سادہ عبارت میں کہیں کہیں علم و حکمت کے بیش بہا موتی اس سلیقہ اور خوش

---

[1] قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ: زمانہ بک ایجنسی نیا چوک کانپور

اسلوبی سے پروتے چلے جاتے ہیں کہ پڑھتے ہی دل سے واہ واہ کی صدائے اختیار بلند ہونے لگتی ہے۔ ہم کتاب زیر نظر میں سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں جو ہمارے قول پر شاہد ہیں۔

"اپنی تعریف سُنکر ہم اتنے متوالے ہو جاتے ہیں کہ پھر ہم میں اچھا بُرا سمجھنے کی تمیز ہی نہیں رہ جاتی، بڑے سے بڑا مہاتما بھی اپنی تعریف سنکر خوشی سے پھُول اُٹھتا ہے، ہاں تعریف کرنے والے کے لفظوں میں بھگتی (عقیدت) کی جھلک ہونا ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شعرار کو جھوٹی تعریفوں کے پُل باندھنے کے لئے راجے مہاراجے انعام واکرام کیوں دیتے۔ بھاٹ راجہ صاحب تیغ کی آواز سُنکر چونک پڑتے ہیں، کانوں میں اُنگلی ڈال لیتے ہیں اور گھر میں بھاگتے ہیں۔ مگر دربار کا شاعر اُنھیں شجاعت میں ارجن اور درونا چارج سے دو ہاتھ اور اونچا اُٹھا دیتا ہے۔ تو راجہ صاحب کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ اُنھیں مطلق یہ خیال نہیں ہوتا کہ میرا مضحکہ اُڑایا جارہا ہے۔ ایسی تعریفوں میں ہم الفاظ کو نہیں اُن کے اندر چھپے ہوئے جذبات کو دیکھتے ہیں۔" (بیوہ صفحہ ۳۹)

سطور بالا میں پریم چند نے فطرت انسانی کی کس قدر سچی تصویر کھینچی ہے اور انسان کی نفسیاتی کمزوریاں کس دلآویز پیرایہ میں دکھائی ہیں۔ یہ عبارت ان لوگوں کیلئے بھی شمع ہدایت ہے جو ہندوستان اور ہندوستانی زبان کے سچے محب اور خدمتگذار بننا چاہتے ہیں۔ اگر پریم چند چاہتے تو بہت آسانی سے ارجن اور درونا چارج کی جگہ رستم و اسفندیار استعمال کر سکتے تھے لیکن جب ہمارے یہاں رستم و اسفندیار سے بھی زیادہ سورما ارجن، بھیم، بھیشم پتامہ، درونا چارج، ابھیمنیو، کرن اور پرسرام جی وغیرہ گذرے ہیں تو کیا ضرورت ہے کہ ہم ان کے نام نہ لکھیں اور اپنے گھر سے ہزاروں میل فاصلہ پر پہونچکر ایران و توران کی خاک چھانتے پھریں۔ اسی طرح جب ہمارے یہاں گنگا اور جمنا جیسے پاک اور مقدس دریا موجود ہیں تو ہم کیوں توران سے جیحون، سیحون یا عراق سے فرات و دجلہ لاکر ہندوستان میں بہائیں۔

ناداری و تنگدستی کی مذمت ملاحظہ ہو:۔

"دست نگری سے بڑی مصیبت بدنصیبی کے بھی خزانہ میں نہیں ہے۔" (صفحہ ۴۸)

تعلیم اخلاق دیکھئے:۔

"کثیف برتن سے صاف پانی بھی گندہ ہوجاتا ہے۔ نفرت سے بھرا ہوا دل پاک مذاق بھی نہیں پیدا کر سکتا۔" (صفحہ ۱۰۷)

دیکھئے ذیل کے مکالمہ میں کس قدر مؤثر اور دلچسپ پیرایہ میں اصلاح رواج و رسوم کا درس دیا گیا ہے:۔

سومترا:۔ تو تمہاری مامی (ممانی) امیر گھرانے کی لڑکی ہونگی؟

پورنا :- کیسا امیر گھرانا ؛ مول لائی گئی تھیں، ماموں صاحب کی پہلی بیوی مرگئی تھیں تو انھیں مول لے آئے تھے۔

سومترا :- کیا کہتی ہو بہن ! کہیں عورتیں بکتی ہیں ؟

پورنا :- عورتیں اور مرد دونوں ہی بکتے ہیں۔ لڑکی کا باپ کچھ لیکر لڑکی بیاہے اور لڑکے کا باپ کچھ لیکر بیاہے، یہ بِکنا نہیں تو اور کیا ہے۔" (صفحہ ۱۴۵)

ہزاروں کتھائیں اور ہزاروں سبھائیں اس قدر اثر نہیں ڈال سکتیں جس قدر اس مکالمے کی ان چند سطروں سے ناظرین کے دل پر پڑ سکتا ہے۔

ایک عفت پرور اور عصمت پرست عورت کیا معنی خیز اور سبق آموز فقرہ کہتی ہے :-

"بدھوا پر بدچلنی کا الزام لگتے کتنی دیر لگتی ہے۔" (صفحہ ۱۵۰)

"کیلے کے لئے تو مٹی کا ٹھیکرا بھی تیز چاقو بن جاتا ہے۔" (صفحہ ۱۶۰)

بیوہ کی مشکلات کا فوٹو کیا خوب کھینچا جاتا ہے :-

"پانی میں رہکر اس کے تھپیڑوں سے بچا رہنا تمہاری (یعنی بیوہ کی) طاقت سے باہر ہے۔ بے لنگر کی کشتی لہروں میں ساکت نہیں رہ سکتی، پڑی ہوئی دولت کو اُٹھا لینے میں کسے تامل ہوتا ہے۔" (صفحہ ۱۷۵)

"جلتے ہوئے دل سے دھوئیں کے سوائے اور کیا نکل سکتا ہے؟" (صفحہ ۱۷۷)

محبت کے متعلق فرماتے ہیں :-

"محبت کی رفتار روانیِ آب کی طرح ہے جو ذرا دیر کے لئے رک جائے مگر اپنی چال نہیں تبدیل کر سکتی۔" (۲۰۰)

ایک جگہ لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں :-

"جو پرچڑیا کو جال کے نیچے بکھرے ہوئے دانہ کی طرف لے جائیں انکا اُکھڑ جانا ہی اچھا۔" (۲۰۷)

الغرض کہاں تک لکھا جائے ع داماںِ نگہ تنگ گلِ حسن تو بسیار۔

پریم چند کی ایک خصوصیت اور ہے یعنی جس سوسائٹی کا وہ نقشہ کھینچتے ہیں اس کی زبان اس قدر کمال کے ساتھ لکھتے ہیں کہ وہ انہیں کا حصہ ہو جاتی ہے، اصل یہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس قدر خوبی سے لکھتے ہیں جس سے وہ ایک صاحب طرزِ خاص ہو گئے ہیں۔ اس ناول میں پریم چند نے امرت رائے، دان چند کملا پرشاد تین مردوں اور پریا، سومترا اور پورنا تین عورتوں کا کیرکٹر دکھایا ہے جن میں پریا اور سومترا کا کیرکٹر مکمل اور قابل تعریف ہے۔ پلاٹ میں بیواؤں کی حالت زار، اوباشوں کے ہتھکنڈے، اصلاح رسوم کی ضرورت اور قومی خدمات کی اہمیت دکھائی گئی ہے۔ تمام ناول دلچسپ ہونے کے علاوہ اصلاحی ہے۔ اور ایسے ہی ناولوں کی ملک و قوم کو ضرورت بھی ہے، ہم سفارش کرتے ہیں کہ ہر شخص جو اردو جانتا ہو وہ اس نفیس کتاب کا مطالعہ کرے۔

مشاہیر اُردو کے خطوط

مرتبہ مہیش پرشاد صاحب مولوی فاضل۔ پروفیسر عربی، فارسی و اُردو ہندو یونیورسٹی بنارس۔
یہ کتاب زبان اُردو کے بیس مشاہیر کے منتخب خطوط کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ جس بزرگ کے خطوط درج کئے گئے ہیں، اُن کے شروع میں فاضل مؤلف نے کاتب الحروف کی مختصر سوانح عمری بھی درج کر دی ہے، جس سے معلومات میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں خطوط کی ترتیب ایسی رکھی گئی ہے جس سے اُردو انشاء و ادب کی تدریجی ترقیوں کا معقول پتہ چل سکتا ہے۔ شروع میں خطوط کی اہمیت اور خصوصیات کے متعلق مولوی عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد، علامہ سید سلیمان ندوی، مولوی محمد امین صاحب زبیری مارہروی، مولوی مرزا محمد عسکری بی۔اے۔ خواجہ الطاف حسین حالی کی تحریروں کے اقتباسات بھی دیے ہیں۔ کتاب بحیث المجموع اچھی اور طلبہ کے لئے مفید ہے
قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ: رائے صاحب رام دیال اگروالا۔ الہ آباد۔

چراغ

چراغ، آہ۔۔۔۔۔۔ چراغ کہاں ہے، اسے حُسن خواہشات کی چنگاری سے روشن کردو۔ چراغ ہے، جیسے "چراغ سحر" کی طرح ایک بار بھڑک کر بجھ جانے سے واسطہ نہیں۔ میرے حبیب دل! کیا تیری قسمت کا بھی یہی عالم ہے؟ آہ! اس سے "موت" بہتر ہے۔

مصائب تیرے دروازے پر دستک دیتے ہیں، کہ تیرا مالک بیدار ہے۔ اور اس تاریک رات میں تیری "محبت کا امتحان" چاہتا ہے۔ عروس شب نے بادلوں کا سیہ نقاب لیا ہوا ہے۔ اور بارش۔ اپنے اہتمام سے بےخبر، آہ، میں نہیں جانتا کہ میرے دل میں وہ "جذبہ" کیا ہے۔ جو مجھے رہ رہ کر اچھال رہا ہے۔

۔۔۔۔۔ اور آہ! ۔۔۔۔۔ اس کا مطلب ۔۔۔۔۔؟

برق بیتاب کی ہلکی سی چمک، میری نگاہوں پر آلام کا تاریک پردہ گرا دیتی ہے۔ اور میرا دل ۔۔۔۔ بیتاب و بیقرار دل! اس تاریکی میں اس راستہ کی جستجو میں محو ہو جاتا ہے ۔۔۔۔۔ جہاں سے "موسیقی شب" مجھے دعوت دیتی ہوتی ہے۔

چراغ۔۔۔۔ آہ۔۔۔ چراغ کہاں ہے؛ اسے "حسن خواہشات" کی جلتی ہوئی آگ سے روشن کردو۔
طوفانی رات ـــــ سراسر طوفان ہے۔ باد تند اپنے پورے جوبن پر ہے۔ اور سیاہی شب کس قدر خوفناک!
تاخیر کے صدقے۔ اپنے آپ کو وقف ظلمات نہ کرو۔ اور "قندیل محبت" کو اپنی "آتش حیات" سے روشن کردو۔

(ٹیگور)

یادِ رفتگاں

سید حسن امام مرحوم

اک نفس پر ہے کاروبارِ حیات
آدمی کی بھی کوئی ہستی ہے
(جگر بریلوی)

ابھی چھ مہینے بھی گذرنے نہیں پائے کہ مادرِ ہند سر علی امام مرحوم کی وفات حسرت آیات کا صدمہ اُٹھا چکی ہے، افسوس کہ ۱۹۔ اپریل ۱۹۳۳ء کو دوسرے عالمِ قانون یعنی سر علی امام مرحوم کے چھوٹے بھائی سید حسن امام کے غم میں صفِ ماتم بچھانا پڑی، آہ ؎ غروب ہوگئے شمس و قمر زمیں کے تلے۔
اللہ اللہ! جن ماں باپ کی آنکھوں کے سامنے عالمِ پیری میں آفتاب و ماہتاب کے ایسے درخشاں فرزند یکے بعد دیگرے دنیا سے اُٹھ جائیں اُن کے قلب وجگر کا کیا حال ہوا ہوگا۔ سید حسن امام کی وفات سے دس ہی دن بعد یعنی ۳۰۔ اپریل ۱۹۳۳ء کو ان کی والدہ محترمہ فرطِ غم والم سے رہگرائے عالمِ بقا ہوگئیں اب رہے آپ کے والد ماجد شمس العلماء نواب امداد امام ان کا حال خود ان کے ایک شعر سے واضح ہے ؎

چھپاؤں میں لاکھ سوزِ غم کو فغاں کا شعلہ بھڑک اُٹھے گا
دل و جگر جب اثر جلیں گے تو آگ کیونکر نہاں رہے گی

خاندان | سید حسن امام ۳۱۔ اگست ۱۸۷۱ء کو بمقام پٹنہ پیدا ہوئے تھے، آپ کا خاندان ضلع پٹنہ میں تقریباً سات سو برس سے آباد ہے، سلسلۂ نسب حضرت زید سے ملتا ہے۔ اگرچہ شرافت و نجابت اور علم و فضل ورثہ آبائی تھا مگر چار پشتوں سے اس خاندان کو قانونی موشگافیوں سے خاص شغف وانہماک رہا چنانچہ آپ کے پردادا سید امداد علی صاحب انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں عہدۂ ججی پر ممتاز تھے اور ان کے جدِ امجد خان بہادر سید وحید الدین صاحب پہلے ہندوستانی تھے جو ڈسٹرکٹ جج کے ممتاز عہدہ پر فائز ہوئے۔ آپ کے والد شمس العلماء نواب امداد امام ایک بے عدیل حکیم، بے مثل شاعر، سحر طراز ادیب اور جادو نگار مصنف ہیں اثر تخلص فرماتے ہیں آپ کی کئی کتابوں کا ترجمہ یورپین زبانوں میں ہوچکا ہے۔

ابتدائی حالات سید حسن امام نے ابتدائی تعلیم پٹنہ میں پائی، بعدازاں ۱۸۸۹ء میں آپ انگلینڈ تشریف لے گئے جہاں ۱۸۹۲ء میں آپ نے بیرسٹری پاس کی، اور مڈل ٹیمپل بار میں داخل ہو گئے۔
اس کے بعد آپ ہندوستان واپس آکر پٹنہ میں پریکٹس کرنے لگے۔ بعدہٗ ۱۹۱۱ء میں آپ کلکتہ چلے گئے جہاں ۱۹۱۲ء میں کلکتہ ہائیکورٹ کے جج مقرر ہو گئے۔ لیکن جب ۱۹۱۶ء میں پٹنہ میں ہائیکورٹ قائم ہوگئی تو آپ ججی سے مستعفی ہوکر پھر پٹنہ چلے آئے اور پریکٹس کرنے لگے۔ اور تادم مرگ یہیں رہے۔

خدمات سید حسن امام قوم پرست مسلمان تھے، فرقہ وارانہ تعصبات سے آپ ہمیشہ بالاتر رہے۔ قومی خدمت کے میدان میں آپ نے سب سے پہلا قدم ۱۹۰۸ء میں رکھا، اور کانگریس کے اجلاس منعقدہ مدراس میں شریک ہوئے۔ آپ نے ملک و قوم کی خدمات میں اس قدر پرخلوص انہماک دکھایا کہ آپ کو کانگریس کے اسپیشل اجلاس کا جو ستمبر ۱۹۱۸ء میں بمبئی میں منعقد ہوا تھا پریسیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ آپ انڈیا ہوم رول لیگ کے بھی صدر تھے۔ ۱۹۲۱ء میں آپ لندن تشریف لے گئے جہاں آپ نے اس کانفرنس میں جو بمقام لندن بسلسلہ صلحنامہ ٹرکی منعقد ہوئی تھی بحیثیت ڈیلیگیٹ شرکت فرمائی، اور معاہدہ سیورے میں ترمیم کے لئے مسٹر لائڈ جارج پر جو اس وقت وزیر اعظم تھے خاص زور دیا۔ آپ نے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے تحقیقاتی وفد کی صدارت فرمائی اور ایسے نازک وقت میں قوم کے اس مایۂ ناز ادارہ کو بچا لیا۔
۱۹۳۰ء میں آپ نے مع اپنی اہلیہ محترمہ اور صاحبزادیوں کے کانگریسی تحریک میں سرگرم حصہ لیا۔ اور ۱۹۲۳ء میں آپ نے مجلس اقوام کے اجلاس میں ہندوستان کی طرف سے نمایندگی کے فرائض بھی انجام دیئے۔

سید حسن امام مرحوم جس کام کو کرتے تھے اُسے تکمیل کو پہونچا دیتے تھے۔ جب آپ انگلستان میں قانون پڑھتے تھے تو آپ نے مڈل ٹیمپل کی تمام لائبریری چاٹ ڈالی تھی، اور جب مسٹر ولیم ڈگبی نے ملک ویلز کا دورہ کیا تو آپ اپنی معلومات بڑھانے کے لئے ان کے معتمد خصوصی بن گئے۔ ۱۸۹۱ء میں جب مسٹر دادا بھائی نوروجی پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے کھڑے ہوئے تو آپ نے بھی نہایت تندہی سے مسٹر دادا بھائی نوروجی کی طرف سے کام کیا۔ آپ نے اس اثنا میں فن خطابت کا پورا کورس بھی پڑھکر امتحان پاس کیا۔ بہرحال آپ کو ہمیشہ اپنی قابلیت میں اضافہ کرنے کا خیال دامنگیر رہا۔ ۱۹۱۸ء میں ڈاکٹر بسنٹ نے آپ کو کانگریس کا پریسیڈنٹ تجویز کرتے ہوئے صحیح فرمایا تھا کہ:-

"آپ نے جوڈیشل بنچ پر ہندوستان کی عظمت وشان کو قائم رکھا ہے آپ شاہی ہائیکورٹ کی کرسی سے اُتر کر قوم کی ہائیکورٹ (کانگریس) میں اس لئے تشریف لائے ہیں کہ اپنی تمام تعلیم وتربیت اپنی ذہانت"

اپنا علم و فضل، اپنی عقل و فہم، اپنی روشن دماغی، اپنی اصابت تخئیل جن کے باعث وہ ہندوستان کے ججوں میں اعلیٰ اور ممتاز رہے ہیں، قوم کی خدمت کے لئے پیش کریں۔"

آپ کی قانونی قابلیت مشہور زمانہ تھی۔ آپ کی وفات پر پٹنہ ہائیکورٹ کے فل بنچ نے آپ کی قانونی قابلیت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا تھا:-

"سید حسن امام نے اپنے قانونی مشوروں سے ہمیشہ ججان ہائیکورٹ کی رہنمائی کی۔ سید مرحوم نہایت علم دوست، مخلص، راست گو، اور حلیم الطبع شخص تھے۔ آپ کی ادبی معلومات نہایت وسیع تھی؛ اور آپ تاریخ و فلسفہ میں کامل عبور رکھتے تھے۔ آپ کے انتقال پر تمام ہندوستان کا ماتم گسار ہونا ضروری بلکہ لازمی ہے۔"

بقول مسٹر آرٹ جج ہائیکورٹ پٹنہ" فی زمانہ وکالت میں سید حسن امام مرحوم کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اور اُن کی قانونی قابلیت نے ججوں کا کام آسان کر دیا تھا۔"

حسنِ اخلاق کے آپ پتلے تھے، اور باوجودیکہ آپ کی آمدنی پچیس تیس ہزار روپیہ ماہوار تھی بایں ہمہ منکسر مزاجی آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ آداب صحبت اور خوش اخلاقی میں آپ اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ آپ کا چہرہ ہمیشہ شگفتہ رہتا تھا اور جو شخص بھی آپ سے ملنے جاتا اس سے خندہ پیشانی اور خلوص کے ساتھ ملتے تھے۔ کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جس میں آپ کو ہر دلعزیزی حاصل نہ ہو۔ ہر شخص آپکی عزت اور محبت کرتا تھا اور ہر شخص آپ کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ ایک طرف کانگریسی مرحوم کو اپنا لیڈر سمجھتے تھے تو دوسری طرف غیر کانگریسی ان کو اپنا مربی و سرپرست جانتے تھے۔

اس طرف کچھ عرصہ سے آپ نے سیاسیات میں حصہ لینا چھوڑ دیا تھا، بایں ہمہ آپ تمام سیاسی واقعات میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ آپ کے تدبر و سیاست دانی کا یہ حال تھا کہ جس روز صبح کو وھائٹ پیپر شائع ہوا تو آپ نے اس کو خوب غور سے پڑھا اور سمجھا، اور اسی روز شام کو جب مسٹر سچدانند سنہا کے دولتخانہ پر جمع ہوئے تو آپ وھائٹ پیپر پر بحث کرنے کے لئے اس طرح تیار تھے جیسے کوئی طالب علم امتحان کے لئے تیاری کرتا ہے۔ آپ نے تمام وھائٹ پیپر کا خلاصہ چند جملوں میں بیان کر دیا۔ ہندوستان کے ایسے نازک دور میں ایسے ہوشیار، ذہین اور تجربہ کار سیاست داں کا دنیا سے اُٹھ جانا واقعی مادرِ ہند کے لئے ناقابل برداشت صدمۂ عظیم ہے۔ آپ نے دو بیٹے اور تین بیٹیاں اور بےشمار دولت چھوڑی۔ خدا مرحوم کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

شری دیومت دھرمپال بُدھ بھکشو

۲۹-اپریل ۱۹۳۳ء کو بدھ دھرم کے نامور علمبردار شری اناگارک بھکشو دیومت دھرمپال کا بمقام سارناتھ متصل بنارس انتقال ہوگیا جس کی وجہ سے ہندوستان کی مذہبی دنیا کو صدمۂ عظیم پہونچا ہے۔ آپ کا وطن جزیرہ سیلون اور آپ کے والدین متوسط درجہ کے خوشحال لوگ تھے۔ وطن ہی میں اعلیٰ درجہ کی انگریزی تعلیم حاصل کرکے آپ سرکاری ملازمت میں داخل ہوگئے تھے لیکن چونکہ اوائل عمر ہی سے طبیعت کا رجحان مذہب اور روحانیات کی طرف تھا اس لئے آپ چند ہی سال کے بعد ملازمت سے کنارہ کش ہوکر مذہب کی تبلیغ و اشاعت پر کمربستہ ہوگئے۔ ابتدائی کوششیں اپنے وطن تک ہی محدود رہیں۔ جہاں آپ جزیرہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کرکے دیہات میں اپنا کام کرتے رہے۔ بدھ مت کی مقدس کتابوں کے مطالعہ کا آپ کی طبیعت پر اس قدر اثر ہوا کہ آپ نے "دنیا ہیچ است و کار دنیا ہمہ ہیچ" کا نعرہ بلند کیا اور سنیاس لیکر تارک الدنیا ہوگئے۔

بھکشو ہونے کے بعد اپنے آقا و رہنما بُدھ بھگوان کی جنم بھومی یعنی ہندوستان میں بدھ مت کو پھر زندہ کرنے کی دھن میں آپ ۱۸۹۱ء میں ہندوستان آئے اور جنوری ۱۸۹۱ء میں بودھوں کے مقدس مقام بُدھ گیا کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ آپ کے آنے سے چند ماہ قبل گورنمنٹ نے عظیم الشان مہابودھی مندر ایک ہندو مہنت سمّی ہیم نراین گر کے حوالہ کر دیا تھا۔ آپ کو جب یہ حال معلوم ہوا تو فوراً یہ تہیا کرلی کہ جس طرح ممکن ہو اس مندر کو مہنت کے انتظام سے نکالکر ہندوستان میں بدھ مت کی اشاعت کی جائے اور جس طرح مہاراجہ اشوک نے جزیرہ لنکا کو بُدھ مت کی نعمت بخشی تھی اسی طرح آپ بھی مہاراجہ موصوف کے وطن ہندوستان میں اس قدیم دھرم کا پرچار کریں۔ اس طرح ۱۸۹۱ء سے تادمِ مرگ دھرمپال بھکشو نے اپنی زندگی ایک عظیم الشان جد وجہد میں بسر کردی اور بالآخر ان کو اپنے عزم و استقلال کی بدولت اپنے مشن میں کامیابی نصیب ہوئی

ماہ مئی ۱۸۹۱ء میں آپ نے مہابودھی سوسائٹی کی بنا ڈالی اور اُسی سال سوسائٹی مذکور کا آرگن "مہابودھی جرنل" جاری کیا جس کے ذریعہ سے ان کے خیالات کی رسائی مفکرین عصر تک ہونے لگی۔ اور جس نے ان کے لئے عالمگیر شہرت کی راہیں کھول دیں۔

۱۸۹۳ء میں بمقام شکاگو امریکہ مذاہب عالم کی جو عظیم الشان کانفرنس ہوئی تھی اسمیں بدھ مت کے علمبردار کی حیثیت سے بھکشو جی بھی شریک ہوئے تھے۔ یہاں سے واپسی پر آپ بحرالکاہل کے جزیرہ ہونولولو

میں بھی چند روز مقیم رہے اور یہاں آپ کی ملاقات ایک متمول خاتون مسز میری ای. فوسٹر سے ہوئی اور وہ آپ کے خیالات اور تبلیغ سے متاثر ہوکر بدھ دھرم میں داخل ہوگئیں۔

یہ واقعہ بھکشوجی کی زندگی کا اہم ترین واقعہ تھا کیونکہ اس کے بعد ان کے دل کی تمام مرادیں یکے بعد دیگرے پوری ہوتی چلی گئیں۔ مسز فوسٹر ایک امیر کبیر خاتون تھیں اُنھوں نے بدھ دھرم کی اشاعت کے لئے بھکشوجی کی زرکثیر سے مدد کی۔ اور وہ اُن کی "دھرم ماں" بن گئیں۔ دولت ہاتھ میں آتے ہی بھکشوجی نے کالج اسکوائر کلکتہ میں مشہور شری دھرم راجک وہارا اور اسی کے ساتھ اقامت گاہ تعمیر کی، اور قدیم مولگندھ کٹی وہارے کی مرمت کرکے اس کے ساتھ بھکشوؤں اور برہمچاریوں کے لئے آشرم تعمیر کرائے۔ سارناتھ میں جو بنارس کے قریب بدھ مت کا ایک متبرک مقام ہے (یہاں بدھ بھگوان کا سب سے پہلا اپدیش ہوا تھا) ایک عظیم الشان دہارا، ایک اسکول اور ایک کتب خانہ تعمیر کرایا، جس کی بدولت یہ مقام ہزاروں سال تک زمانہ کی دست برد کا شکار رہنے کے بعد اب آباد و بارونق بستی بن گیا ہے۔ اور یہاں قدیم زمانہ کی طرح چین وجاپان، سیلون و برہما کے لوگ تیرتھ یاترا کرنے آتے ہیں۔ اگر دیگر خدمات اور کارناموں کو نظرانداز کردیا جائے تو بھی "ایسی پاٹن سارناتھ" کی از سرنو تعمیر جہاں بدھ بھگوان نے اپنا مشہور و معروف وعظ کہا تھا، ایک عظیم الشان کارنامہ ہے جو شری دھرمپال کے مقدس نام کو تا قیام قیامت زندہ رکھیگا۔ بھکشوجی نے بدھ بھگوان کا پیغام لیکر چار مرتبہ تمام دنیا کا چکر لگایا، انگلستان میں "برٹش مہابودھی سوسائٹی" قائم کی اور ممالک مغرب میں بدھ مت کی تبلیغ و اشاعت کے دو مرتبہ تاریخی وفود بھیجے۔

فی الحقیقت بھکشوجی کی ذات ایک عظیم الشان ذات تھی جس نے بدھ مت کی تمام دنیا میں بیداری پیدا کردی۔ افسوس ہے کہ ۱۹۳۲ء میں بھکشوجی کی "دھرم ماتا" مسز فوسٹر کا انتقال ہوگیا تھا اور اب ایک سال بعد وہ خود بھی اپنی ماتا کی گود میں پہونچ گئے۔

آپ کو بدھ مت کی تبلیغ و اشاعت کا اس قدر شوق تھا کہ انھوں نے مرنے سے پہلے جو الفاظ فرمائے تھے وہ یہ تھے

"مجھے جلد مرنے دو اور جلد پیدا ہونے دو، میری تمنا ہے کہ میں پچیس مرتبہ مرکے پیدا ہوں اور بدھ بھگوان کا دھرم پھیلاؤں"

ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ بھکشوجی نے مرتے وقت یہ فرمایا کہ:-

"میں مرکر بنارس کے کسی برہمن خاندان میں پیدا ہونگا اور اپنے مشن کو پورا کرونگا"

آپ تمام عمر برہمچاری رہے اور بمقام سارناتھ ۶۸ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ اور یکم مئی کو سارناتھ ہی میں ایک مجمع کثیر کے سامنے آپکا کریا کرم ہوا پہلے ارادہ یہ تھا کہ آپکی لاش کو کمبو لیجائی جائے لیکن بعد میں یہ تجویز فسخ کردی گئی۔

عالمِ نسواں

وسط اپریل گذشتہ میں فتحپور کی ضلع کایستھ کانفرنس میں جو ایڈیٹر صاحب زمانہ کی زیر صدارت منعقد ہوئی تھی تین ریزولیوشن طبقۂ نسواں کی اصلاح و ترقی کے متعلق بھی پاس ہوئے۔ ایک کا تعلق موجودہ رسم پردہ کی منسوخی سے تھا، دوسرے ریزولیوشن میں بیواؤں کے پُنر لواہ کی سفارش کی گئی۔ تیسرے میں شادیوں میں رسم جہیز کی ممانعت کی گئی۔ یہ تجاویز قریب قریب اتفاق رائے سے پاس ہوئیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کی پوزیشن کے متعلق عام خیالات میں ایک انقلاب عظیم ہوگیا ہے۔

ریاست کشمیر میں ہندو بیواؤں کے ازدواج ثانی کا قانون جاری ہوگیا ہے۔ ہر بیوہ جس کی عمر سولہ سال سے کم نہ ہو اپنی مرضی سے دوسرا بیاہ کرسکتی ہے۔ سولہ سال سے کم عمر ہونے کی حالت میں بیوہ کا دوسرا بیاہ اس کے مرد عزیزوں اور رشتہ داروں کی اجازت سے ہوسکے گا

---

۱۳ و ۱۴ مئی گذشتہ میں کانپور میں ایک اتحاد کانفرنس ہوئی تھی جس کی ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مردوں کے علاوہ اکثر معزز خواتین نے بھی حصہ لیا تھا چنانچہ بیگم ڈاکٹر حبیب خاں لودھی مجلس استقبالیہ کی صدر تھیں اور لیڈی وزیر حسن مسز سوشیلا سریواستو، مسز ہون۔ مسز چٹرجی۔ بیگم صاحبہ حسرت موہانی اور مسز شلانے کانفرنس میں ممتاز حصہ لیا۔ لیڈی وزیر حسن صاحبہ (اہلیہ محترمہ سر وزیر حسن چیف جج چیفکورٹ اودھ) نے اپنی تقریر میں ہندو مسلم اتحاد کی پرزور حمایت کی اور فرمایا کہ مدارس میں ایسی تاریخ پڑھائی جانا چاہیئے جس سے ملک میں صحیح اور خوشگوار فضا پیدا ہو۔ طلبا، ہر قوم کی ملکی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں اور اس طرح ملک میں باہمی خوش اعتقادی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا دور دورہ ہوجائے۔ آپ کے علاوہ مسز ہون مسز ایم۔ اے بشا مسز سوشیلا سریواستو اور مسز چٹرجی نے بھی تقریریں کیں۔ لیڈی وزیر حسن نے ایک لیڈی کلب قائم کرنیکی تحریک کی جو بالاتفاق منظور ہوئی۔

گورنمنٹ صوبجات متحدہ امسال اس صوبے کی کسی گریجویٹ خاتون کو ٹیچری کی ڈگری حاصل کرنے کیلئے ایک سرکاری وظیفہ دینے والی ہے جس کے لئے ایک انتخابی کمیٹی مقرر کی گئی ہے جس کے ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیم صوبہ اور مسٹر جسٹس نعمت اللہ ممبر نامزد ہوئے ہیں۔ کمیٹی مذکور کے سامنے نو امیدوار خواتین پیش ہوئی ہیں جن میں سے ایک کا انتخاب کیا جائیگا۔

خوشی کی بات ہے کہ امسال لکھنؤ یونیورسٹی کے امتحانات میں کئی خاتونیں کامیاب ہوئی ہیں، اور بی۔اے کے نتائج کی فہرست میں چوٹی کے تین کامیاب امیدوار تینوں صنف نازک سے تعلق رکھتی ہیں، اور لطف یہ ہے کہ اول ایک مسلم خاتون، دوم ایک کرسچین لیڈی اور سوم ایک ہندو دیوی ہیں ہم ان تینوں خوش قسمت خاتونوں کو مبارکباد دیتے ہیں۔ یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ فرسٹ ڈویژن میں جو لڑکی فرسٹ آئی ہے وہ شیخ شاہد حسین صاحب مرحوم تعلقہ دار گدیہ کی لائق صاحبزادی مس عطیہ شاہد حسین ہے جو دو سال پیشتر انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں بھی یونیورسٹی بھر میں سب سے اول آئی تھیں۔ حال ہی میں آپ کی شادی خان بہادر مسٹر حبیب اللہ صاحب ممبر کونسل صوبہ کے صاحبزادے سے ہوئی ہے۔

امسال مس کاما نے ناگپور یونیورسٹی سے قانون کا امتحان پاس کیا ہے، اب آپ ناگپور بار میں شامل ہوکر اپنے پدر بزرگوار خان بہادر جے۔کے۔آر۔ کاما بیرسٹر کے ساتھ بحیثیت جونیر کام شروع کرینگی۔ مس موصوف بمبئی کے مشہور و معروف پارسی محب وطن سر فیروز شاہ مہتہ کی نواسی ہیں۔ صوبہ متوسط کی آپ پہلی لیڈی گریجویٹ ہیں جنھوں نے وکالت کی ڈگری حاصل کی ہے۔

حال میں ہز ہائینس مہاراجہ سندھیا گوالیار کی ہمشیرہ راجکماری کملا راجہ نے کاروے نسواں یونیورسٹی پونہ کا سیکنڈری اسکول سرٹیفکٹ امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا، آپ کو فن موسیقی میں امتیاز خاص ملا ہے۔

مسز سروپ رانی کچلو صاحبہ آل انڈیا نسواں کانفرنس کی شاخ گوالیار کی سکریٹری منتخب ہوئی ہیں۔ آپ گوالیار میں عورتوں کی ایک مشہور لیڈر ہیں۔

مس جوتر موئی گنگولی ایم۔اے اور مسز کمودنی بوس بی۔اے کلکتہ کارپوریشن کی کونسلر منتخب ہوئی ہیں۔ یہ بنگال میں پہلی خاتونیں ہیں جنھوں نے کارپوریشن کے انتخابات عامہ میں کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا۔

مسز نیلی سین گپتا جو مسٹر جے۔ایم۔ سین۔ گپتا کی اہلیہ محترمہ ہیں، کلکتہ کارپوریشن کی "ایلڈرمین" منتخب ہوئی ہیں۔ آپ پہلی خاتون ہیں جنھیں یہ اعزاز نصیب ہوا ہے۔

ستاروں سے خطاب

(از جناب منوہر لال صاحب طالب بکوالی بی اے ایل ایل بی)

خواب سے نفرت ہے یا راحت سے تم کو عار ہے؟　　نیند سے بیزار ہو یا تم سے وہ بیزار ہے؟
موہنی صورت نے کسکی کر دیا شستدر تمھیں؟　　دلربا کس مہ لقا کا پرتوِ رخسار ہے؟
صورتِ آئینہ کیوں حیراں ہے چشمِ انتظار　　اشتیاقِ دید ہے یا حسرتِ دیدار ہے؟
شوخیِ حسنِ ازل ہو؟ جلوۂ نورِ خدا؟　　ہے چمک اپنی کہ عکسِ نورِ حسنِ یار ہے؟
حسن سے مخمور چشمِ اخترِ شب زندہ دار　　کس لیئے بیدار مثلِ نرگسِ بیمار ہے؟
کاٹتے ہو رات کیوں آنکھوں میں تم میری طرح　　تم پہ بھی کیا چشمِ لطفِ آہ آنشار ہے؟

نور کا موجب تمہارا سوزِ دردِ دل نہو!
سوز کا موجب کہیں حسنِ مہِ کامل نہو!

رُباعی

(از جناب ڈھٹی لال صاحب نگم ایم۔اے)

اپنا دیکھا ہے اور پرایا ہم نے　　دنیا میں ہے سب کو آزمایا ہم نے
سب کو مطلب کا دوست دیکھا ہے نگم　　اپنے مطلب کا اک نہ پایا ہم نے

غزالِ رعنا

(از جناب سید شمس الدین حیدر شمیم)

نہاں تھا مہرِ اُفق کے سنہرے بادل میں
پیامِ صبح صبا دے رہی تھی جنگل میں

لہک رہے تھے کسانوں کے کھیت میں سبزے
ڈھکی ہوئی تھی زمیں رنگ رنگ پھولوں سے

فضا میں گونج رہے تھے طیور کے نغمے
کہ قصرِ خلدِ بریں میں تھے حور کے نغمے

ہوائے سرد کے جھونکوں سے جھرجھری سی تھی
کھڑا تھا میں مرے پہلو میں گدگدی سی تھی

کہ دفعتاً مجھے کچھ دُور پر نظر آیا
وہی کلیم کو جو طور پر نظر آیا

تجلی نظر افروز و جلوۂ رنگیں
طلسم کاریٔ صانع کی صنعتِ زریں

کھڑی تھی سبزے پہ اک رشکِ گلشنِ خوبی
گلِ ریاضِ حیا، سروِ باغِ محبوبی

وفورِ کیف میں سیلاب کی روانی تھی
شباب جوش پہ اُمنڈی ہوئی جوانی تھی

وہ مستیاں کہ برستی ہوئی گھٹائیں تھیں
وہ شوخیاں کہ سنکتی ہوئی ہوائیں تھیں

جو کوئی پتہ کھڑکتا تھا چونک پڑتی تھی
ہوا کی شوخیوں پر دمبدم بگڑتی تھی

چھپا ہوا تھا دھندلکے میں چہرۂ روشن
چراغ نور کا ہو جس طرح تہِ دامن

تڑپ اُٹھا دلِ مضطر مثالِ پروانہ
وہ دشتِ نجد تھا اور میں تھا قیس دیوانہ

قریب جا کے ان آنکھوں سے ہائے کیا دیکھا
غموں میں حسن کی دیوی کو مبتلا دیکھا

سحر کے وقت جوانی اُسے سلاتی تھی
قدم قدم پہ مگر مفلسی جگاتی تھی

وہ آہ کی کہ دھواں سا اٹھا مرے دل سے
کلیجہ تھام کے پوچھا یہ میں نے مشکل سے

بڑی ہے تجھ پہ مصیبت وہ کون سی ایسی
کہ چھپتی پھرتی ہے جنگل میں با چکِ دشتی

کوئی شرر کی لپک تھی کہ برق کی رو تھی
یہ سُن کے مثلِ غزالِ چمن سُبک رو تھی

ہے دل کو آرزو گفت و شنید کی اب تک
ہوس نگاہوں کو ہے بازدید کی اب تک

شبِ فراق کی اپنی سحر نہیں آتی
تلاش کرتا ہوں لیکن نظر نہیں آتی

صبا بلطف بگو آں غزالِ رعنا را
کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ مارا

گورستان

(از پنڈت اندجیت شرما صاحب)

ہنگامۂ ہستی کا سرانجام عیاں ہے محرومیِ تقدیر کی حسرت کا نشاں ہے
نظارۂ غمناک ہے وحشت کا سماں ہے یہ شہرِ خموشاں ہے یہ تاریک جہاں ہے
بربادیِ عالم کی ہے تصویر سراپا
ناکامیِ انساں کی ہے تفسیر سراپا

جس سمت نظر ڈالیے سنسان فضا ہے پتہ کو بھی جنبش نہیں وہ بند ہوا ہے
تاروں کے تبسم میں نہاں آہ و بکا ہے فق چہرۂ مہتاب ہے دھندلی سی ضیا ہے
ذرے وہ پریشاں ہیں زمیں پر جو پڑے ہیں
ہیں عالمِ سکتہ میں جو اشجار کھڑے ہیں

افسردہ ہیں اس خاک میں ہستی کے شرارے یا ظلمتِ خاموش میں پنہاں ہیں ستارے
مدفون ہیں ان ذروں میں دکھیوں کے سہارے سوتے ہیں تہِ خاک بڑے راج دلارے
جو چاند کے ٹکڑے تھے وہ پیوندِ زمیں ہیں
افسوس کہ افلاک نشیں خاک نشیں ہیں

رہنے کے لئے جنکے فلک بوس تھے ایواں چھائے ہوئے تھے دہر پہ جو صورتِ طوفاں
قبضہ میں سمجھتے تھے جو سب عیش کے ساماں تھی جنکے گماں سے بھی بروں گردشِ دوراں
آتے ہی اجل ہوگیا برگشتہ زمانا
جز گور ملا اُن کو نہ پھر کوئی ٹھکانا

دنیا کے مناظر میں نرالا ہے یہ منظر اِک گھر کے مکیں آج ہیں کمزور و دلاور
اِک نشہ میں سرشار ہیں نادار و تونگر سوتے ہیں یہاں شاہ و گدا دونوں برابر

مجبور کے نزدیک ہے مختار کا ڈیرا
اقبال کے پہلو میں ہے ادبار کا ڈیرا

دنیا کے تماشوں کا یہ انجام ہے افسوس ہستی کے لئے موت کا پیغام ہے افسوس
ہر صبح تمنا کے لئے شام ہے افسوس یہ ماحصل ہستی ناکام ہے افسوس

ہر وقت یہاں سامنے ہے موت کا ساماں
انساں نہ کرے بھول کے بھی زیست کا ارماں

روح جذبات

(از حضرت نہال عظیم آبادی)

خوشا وہ آنکھ جو فرقت میں تیری گریاں ہے خوشا وہ دل جو ترے ہجر میں پریشاں ہے
تو ہی چھوڑ دے تو دست جنوں کہیں چھوٹے گلے میں یہ مرے پھانسی ہے یا گریباں ہے
لگا کے وار یہ کہتی ہے اُن کی تیغ نگاہ تڑپ لے خوب تڑپنے کا تجھکو ارماں ہے
یہ شرم اُس پہ یہ نظریں تری خدا کی پناہ اسی ادا پہ تو لاکھوں کی جان قرباں ہے
کیا جنوں نے تعلق سے پاک صاف مجھے خدا کا شکر کہ اب جیب ہے نہ داماں ہے
بتا گئیں وہ نگاہیں مزا تڑپنے کا سکھا دیا مجھے مرنا بتوں کا احساں ہے
وہی اُمنگ وہی دل وہی ہے جوشش اپنا وہی ہوں میں وہی خانہ خراب ارماں ہے
بس اب تو خلق یہ کہنے لگی ہے کون نہال
وہ بت پرست۔ فقط نام کا مسلماں ہے

قطعہ

(از جناب ڈپٹی لال نگم صاحب ایم۔ اے۔ دہلوی)

دوست جو ہیں وہ رکابی پہ نظر رکھتے ہیں جو ہیں دشمن وہ خرابی پہ نظر رکھتے ہیں
ہیں جو ہمسایہ وہ ہیں برسر پرخاش نگم سب غرض تیری تباہی پہ نظر رکھتے ہیں

علمی خبریں اور نوٹ

آجکل افغانستان میں تصنیف و تالیف کی طرف بھی خاص توجہ دی جارہی ہے، چنانچہ سررشتہ تعلیم کے ماتحت ایک دارالمصنفین قائم ہوا ہے جس کی نگرانی کے لیئے افغانستان کے سررشتہ تعلیم نے مشہور ترکی عالم آغائے رفیق علی بے کو مشیر کار سررشتہ تعلیم بنایا ہے۔

ٹرکی میں غیر ملکی زبان کے الفاظ کا اخراج بڑی سرعت سے عمل میں آرہا ہے، اور اس تحریک میں خود مصطفےٰ کمال پاشا بڑی دلچسپی لے رہے ہیں، اسی وجہ سے یہ تحریک اب اس قدر ترقی کر گئی ہے کہ ترکی کے مسلمان اپنے عربی ناموں کو ترکی ناموں میں تبدیل کر رہے ہیں۔ ترکی شہروں اور قصبوں کے نام بھی تبدیل کیئے جائیں گے، مثلاً "دیار بکر" کا نام جو عربی ہے بدلکر اب اس کا ترکی نام "لوعوزا ایلی" رکھا گیا ہے۔ نوجوان طالبعلم اور پولیس کے سپاہی اس تحریک میں بہت نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔ غرض اس وقت ترکی میں عربی الفاظ کے خلاف سخت جدوجہد ہو رہی ہے۔

انگلستان میں علمی تحقیقات پر کس الوالعزمی سے روپیہ صرف کیا جاتا ہے اس کا ثبوت حال کے ایک واقعہ سے ملتا ہے۔ آجکل کیمبرج میں علم حیوانات کے متعلق ایک وسیع پیمانہ پر دارالتجربہ تعمیر ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس کی عمارت پر پچھتر ہزار پونڈ خرچ کیا جائیگا اور دس ہزار پونڈ سے اس کا اندرونی ساز و سامان مہیا ہوگا۔

حال میں افغانستان کے مشہور خطاط آغا سید داؤد خاں کے کمال فن کا ایک نیا ثبوت ملا ہے۔ آپ نے ایک انچ کے مختصر سے رقبہ میں گلستان سعدی کا دیباچہ لکھا ہے جس کے ۵۱۵ کلمات اور ۲۲۷۰ حروف ہیں۔ اس سے پہلے آپ ایک پوسٹ کارڈ پر ۹۴۳۵ کلمے یا ۳۰۵۹۰ حروف لکھ چکے ہیں

جو صاف پڑھے جاتے ہیں۔

زار روس کے عہد میں صرف تیس فیصدی روسی لکھ پڑھ سکتے تھے مگر سوویٹ روس کی پنچسالہ اسکیم کے ماتحت ساڑھے چار برس کے اندر دو کروڑ نوّے لاکھ روسی شہریوں کو نوشت وخواندگی کی لیاقت حاصل ہوگئی ہے، جس سے اب روس میں خواندہ اشخاص کی تعداد نوّے فیصدی ہوگئی ہے۔

گورنمنٹ نے اس زمانہ میں تعلیم پر ایک کروڑ پچپن لاکھ روبل خرچ کئے ہیں۔ اس وقت اسکولوں میں ایک کروڑ اٹھاسی لاکھ طلبا موجود ہیں، اور پانچ لاکھ بچے کنڈر گارٹن اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔

۱۹۱۳ء میں روسی اخباروں کی تعداد ۸۵۹ تھی، انکی اشاعت پچیس لاکھ تھی۔ ۱۹۳۱ء کے اوائل میں ان کی تعداد ۵۰۰۰ اور تعداد اشاعت اکتیس کروڑ اسی لاکھ ہوگئی۔ یہ اخبار چوراسی زبانوں میں شائع ہوتے ہیں۔

خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کے مشہور نعت گو علامہ محسن کاکوروی کے "کلیات نعت" کا ایک پاکٹ ایڈیشن طبع ہوگیا ہے۔ جسمیں "خورشید بدر" اور مفید فٹ نوٹ کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ قیمت فی جلد ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک ہے۔ اور طاہر محسن صاحب کاکوروی سے مل سکتا ہے۔

قاضی رفیق احمد صاحب ڈپٹی انسپکٹر مدارس بلند شہر نے ایک نقرئی تمغہ "مارٹن میڈل" کے نام سے اس مضمون نگار کو دینے کا اعلان کیا تھا جو "دیہات کی بیداری و ترقی میں اساتذہ کے فرض" پر بہترین مضمون لکھے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ یہ تمغہ سید ریاض حسین اشرفی ساکن کچھوچھہ ضلع فیض آباد نے حاصل کیا۔ اسی طرح سید امانت حسین صاحب وائس چیرمین ڈسٹرکٹ بورڈ سیتاپور کے مختلف مضامین کے صلے میں مسٹر دیا شنکر دارشنی بی۔ اے میرٹھ کالج کو چار تمغے دیئے ہیں، آپ اس سے قبل اروِن میڈل بھی حاصل کر چکے ہیں ایک تمغہ بابو کیشو سرن گوپل ساکن تکونہ گنج ساہوکارہ بریلی کو ملا۔

پچھلے ماہ میتھلی ساہتیہ پریشد کا دوسرا سالانہ جلسہ بمقام کھوکھا ردیش دربھنگہ زیر صدارت ڈاکٹر رومیش مصرا ایم۔ اے۔ منعقد ہوا۔ سکریٹری صاحب نے جو رپورٹ اس کانفرنس میں پڑھکر سنائی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ادبی انجمن نے ابتک میتھلی زبان کے ایکسو اٹھاسی قلمی نسخے فراہم کئے ہیں جنمیں سے پینتالیس ۴۵ ایسے اصلی ڈرامے ہیں جو ہنوز شائع نہیں ہوئے۔

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ نواب حیدر یار جنگ بہادر علامہ علی حیدر صاحب نظم طباطبائی کا حیدر آباد میں انتقال ہوگیا ہے۔ آپ کی خود نوشت سوانحمری اور تصویر زمانہ بابت فروری ۱۹۳۳ء میں شائع ہوچکی ہے۔

محمد طاہر

فہرست مضامین زمانہ جلد ۵۸ جنوری لغایتہ جون ۱۹۳۲ء

تصاویر:۔ پیام محبت (رنگین) دربار مہاراجہ پرتھوی راج چوہان دہلی۔ سورداس۔ پنڈت مدن موہن مالوی۔ آنریبل سر محمد شفیع۔ مہاراجہ جے چند رراٹھور کا دربار۔ ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور۔ حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں۔ ہز ہائینس جام صاحب نوانگر۔ مسٹر دال چند ہیرا چند۔ آنریبل مسٹر بیگ۔ سر جیمس ڈیوڈ سفٹن۔ آنریبل سر ڈبلیو بھور مشیر تجارت گورنمنٹ ہند۔ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد۔ شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ مولانا شبلی نعمانی سر سید احمد خاں۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ رائے بہادر بابو انند سروپ صاحب مرحوم۔

مضامین نثر

نظم

فہرست مضامین زمانہ جلد ۵۹ جولائی لغایتہ دسمبر ۱۹۳۲ء

تصاویر:۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور۔ سر سی۔ وی۔ رمن ہز اکسلنسی نواب سر سکندر حیات خاں قائم مقام گورنر پنجاب۔ شہزادی فرطیس بانو۔ پروین کجکلاہ طہرانی۔ مہاتما گوتم بدھ۔ حضرت شوق قدوائی مرحوم۔ "درخت کے سایہ تلے" (اٹھارہویں صدی کی راجپوت مصوری کا نمونہ) یسوع مسیح صلیب پر۔ سر علی امام مرحوم۔ حضرت بسمل الہ آبادی۔

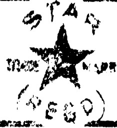
مضامین نثر

نظم

ڈابر (ڈاکٹر ایس کے برمن) لمیٹڈ

پچاس برس سے مشہور و معروف دیسی پیٹنٹ دواؤں کا ہندوستانی وسیع کارخانہ

استار ٹریڈ مارک



فوری اثر کرنے والی

ہیلنگ

REGD.

سریاتینا

REGD

(کٹے جلے چوٹ وغیرہ پر لگانے کا مشہور مرہم)
یہ صرف جڑی بوٹیوں سے ہی بنا ہے۔ اس
میں چربی نہیں ہے۔ آگ سے جلنے کا آبلہ زہریلے
جانوروں کے کاٹنے کی جلن چھری وغیرہ سے
کٹنے گرنے پھسلنے وغیرہ ناگہانی آفات کی
تکلیف سے وقت پر شفا اور آرام پانے کے
لئے چھوٹے بڑے سبھوں کو ہمیشہ اپنے پاس
رکھنا چاہیے۔

قیمت

فی ڈبہ دس آنہ ۱۰/

ڈاک محصول تین ڈبی تک سات آنہ ۷/

قیمت ڈبی نمونہ دو آنہ ۲/

جو صرف ایجنٹوں ہی سے مل سکتی ہے۔

(دردِ سر و ریاحی درد کی ٹکی)
(ادویہ کو ہشتاقی ہے)
آدھے یا سارے سر میں کیسا ہی درد
کیوں نہ ہو اس کو کھاتے ہی جاتا
رہے گا۔ خواہ کسی عضو میں کیسا ہی درد
ریاح کیوں نہ ہو اسے یہ فوراً دور
کرتی ہے۔

قیمت

فی شیشی نو آنہ ۹/

ڈاک محصول

آٹھ شیشیوں تک سات آنہ ۷/

نوٹ۔ دوائیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ اپنے مقامی ہمارے ایجنٹ سے خریدتے وقت اسٹار ٹریڈ مارک
اور "ڈابر" نام ضرور دیکھ لیا کریں۔

صیغہ نمبر ۶۷ پوسٹ بکس نمبر ۵۵۴ کلکتہ

ایجنٹ:۔ کان پور نیا گنج میں محمد حفیظ محمد نصیر

منتخب کتابیں

تاریخ

کتاب	قیمت
تاریخ مغربی یوروپ	عگر
تاریخ ہند قدیم	۸ر
تاریخ الدولتین	عہ/۸ر
تاریخ الامت (۷ حصے)	عـــلہ

سوانح

کتاب	قیمت
سیرت محمد علی	ســـے ر
تلاش حق (۲ حصے)	۶ر
حیاۃ حافظ	عہ/۸ر
سیرۃ عمرو بن العاص	عہ ر
ٹالسٹائی	۳ر
خادمات خلق	۱۰ر

ڈرامے

کتاب	قیمت
پردۂ غفلت	عہ ر
کھیتی	۶ر
گناہ کی دیوار	۸ر
صید زبول	۱۰ر

ادب

کتاب	قیمت
سیر المصنفین (دو حصے)	عہ/۸ر
کیمیاگر (افسانے)	عہ ر
دیوان غالب (جرمنی)	۶ر
دیوان شید (جرمنی)	۶ر
انتخاب میر	۱۲ر
انتخاب سودا	۱۲ر
انتخاب حسرت	۱۲ر
نیرنگ (ادبی مضامین)	عہ/۸ر

متفرق

کتاب	قیمت
نفسیات شباب	ســـے ر
آزادی (ترجمہ لبرٹی)	عہ/۸ر
مشاہدات سائنس	عہ/۸ر
ترکی جمہوریہ	عہ/۸ر
اسلامی تہذیب	۴ر
مسلمانوں کی تعلیم	۲ر
نہرو رپورٹ (مکمل)	۶ر

مکتبہ جامعہ دہلی

پرنٹر پبلشر مری لبھہ بھیروال پریس کاہو کوٹھی کانپور — ایڈیٹر و پبلشر میا نرائن نگم بی-اے